حیات و کارنامے

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (رحمۃ اللہ علیہ)

صدر جمعیۃ العلماء ہند و شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

مرتب

ڈاکٹر رشید الوحیدی (جامعہ ملیہ اسلامیہ)

کنوینر سیمینار

الجمعیۃ بکڈپو، جمعیۃ بلڈنگ گلی قاسم جان دہلی ۶

فہرست

عرضِ مُرتّب

دارالعلوم کا قیام جن علماء اور اہل اللہ کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا وہ نرے عالم یا صوفی نہ تھے بلکہ ایسے منفرد و باکمال لوگ تھے جن کے دماغوں میں ایک انقلابی ہلچل، علم کے ساتھ کچھ کر گذرنے کی تڑپ۔ اور باطن میں منہاج شریعت و سنت رسولؐ کی روشنی بھی تھی۔

دارالعلوم میں آغازِ قیام ہی سے دینی تعلیم کا کام اگرچہ برابر چل رہا تھا یعنی ملت اسلامیہ کو ضعف سے بچانے اور دینی احساس کو قائم و دائم رکھنے کا عمل جاری تھا۔ اور یہ اس حد تک بہت برمحل خدمت تھی کہ، انگریزی تسلط کے بعد، اخلاق و مذہب کی بربادی کے جو مہلک ترین آثار نظر آرہے تھے کم از کم اس سے محفوظ رکھنے کا سامان تو ہو ہی گیا تھا۔ مگر یہی سب کچھ تو نہیں تھا، صرف اتنے مقصد کا حاصل ہوجانا، سچ پوچھئے تو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز تلاطم، اور تھکا دینے والی جدوجہد کے بعد، تھوڑی دیر دم لینے اور پھر آگے بڑھنے کے لئے صرف ایک منزل تھی اور بس!

بانیان مدرسہ کے سامنے، ملت اسلامیہ کو ضعف سے بچا لینے کے بعد، اب ملت کی رگوں میں جہاد حریت کی حرارت پیدا کرنے کا کام تھا، اسی طرح، دینی احساس کی بقا کی اس خدمت کے بعد، ابھی اِسی احساس کے تصور کو اور بھی وسیع کرنا تھا اتنا وسیع کہ اس میں اتباع سنت کے ساتھ ساتھ، خدمت خلق، اور حق گوئی کے اوصاف بھی شامل ہوجائیں تاکہ ۱۸۵۷ء کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر جوڑا جاسکے

از تو دل برنکنم تا دل و جانم باشد
می برم جور تو تا وسع و توانم باشد

اور یہ ایک انقلابی کام تھا۔ اس کے لئے مدتوں ایک ایسے جوہر قابل کا انتظار کرنا پڑا جو لاکھ باصلاحیت سہی مگر ایک عالم دین ہی نہ ہو بلکہ عزیمت و شہامت جرأت وہمت کا مالک بھی ہو، نیز ایک طرف علوم دینیہ اور فنون اسلامیہ میں رسوخ اور امتیازی شان بھی رکھتا ہو، دوسری جانب بانیان مدرسہ کی انقلابی اور مجاہدانہ آرزوؤں کو بروئے کار لانے کا جذبہ اور حوصلہ بھی رکھتا ہو، کیونکہ بنیادی طور پر یہی وہ اسپرٹ تھی جس کیلئے علم و دانش کی یہ بساط آراستہ کی گئی تھی جس کا نام — دارالعلوم دیوبند ہے۔

قیام دارالعلوم کے کم و بیش بائیس تئیس سال بعد ایسا باہمت اولوالعزم فرزند، مولانا سید حسین احمدؒ مدرسے میں داخل ہوا اور حاجی امداد اللہؒ کی دعا، صبح گاہی، مولانا قاسمؒ کی تڑپ، شیخ الہندؒ کے جذبۂ جہاد کو جس قالب کی تلاش تھی اس طالب علم کی ذات میں وہ مل گیا تھا، بالاکوٹ اور شاملی کی امانت کو جسے یہ تینوں بزرگ سنبھالے ہوئے کسی پاکباز وفادار مجاہد کی راہ تک رہے تھے، اب اس امانت کا صحیح امین اور روح حریت کا اصل وارث پیدا ہو چکا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ کام دارالعلوم میں پڑھنے پڑھانے والے طالبعلموں میں سے ہر ایک کے بس کا نہ تھا، یہ تو اُسی کے بس کی بات تھی جسے اللہ پاک کچھ مخصوص صفات ودیعت فرمادے، اور یہ حسین احمد ہی کے لئے مقدر ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر کیلئے دارالعلوم کی ابتدائی ۲۳ سالہ سرگرمیوں پر ایک اجمالی نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ اس مقدس اور رخارزار وادی کی بادہ پیمائی اور اس امانت کی حفاظت و پاسداری نہ حسین احمد سے پہلے کسی کے بس کی بات تھی نہ بعد میں کوئی

اس معیار پر پورا اترتا نظر آرہا ہے۔

دارالعلوم کے قیام کے تناظر میں بار بار ذکر کئے گئے اور لکھے گئے اس واقعہ کو ذہن میں لائیے جس کو تاریخ کسی حال میں نظر انداز نہیں کرسکتی ہے۔ مولانا قاسم صاحب میرٹھ سے پریس کا کام چھوڑ کر دارالعلوم کے لئے چل پڑے" کہ ان کے جذبہ جہاد کو ایک میدان دارالعلوم کی صورت میں ہاتھ آگیا تھا۔ انار کے نیچے ایک محمود کے سامنے ایک دوسرے محمود نے زانوئے تلمذ تہہ کیا" اس دوسرے محمود، بعد کے شیخ الہند نے، اپنے علم و جہاد کا سارا نشہ ایک وجود کو منتخب کرکے اس کے رگ و پے میں ودیعت کردیا۔[1]

اور بھی اساتذہ تھے، طلبار کا ہجوم تھا، دارالعلوم کے کاروبار کو ہر ایک سے توانائی بھی مل رہی تھی، مگر بات اس پوشیدہ امانت اور در پردہ چھپی ہوئی روح کی تھی جس کی بنیاد پر حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہ نے اپنے استاذ، حضرت شیخ الہند کی ایک روایت بیان کی ہے،

" حضرت (شیخ الہند) فرمایا کرتے تھے" دارالعلوم کا اصل کام تو پچاس سال کے بعد ہی پورا ہوچکا تھا۔ پچاس سال کے اس عرصے کو جمعیۃ الانصار، خلافت تحریک، ریشمی رومال تحریک، مولانا عبیداللہ کی جدوجہد، مالٹا کی قید سب پر پھیلا کر آخری کڑی، مولانا سید حسین احمد مدنی" پر ختم کردیجئے۔

مولانا مدنی" ایسے سپاہی تھے جس نے اس تمام جدوجہد کی شمع کو تنہا اپنی ذات سے روشن رکھا تا آنکہ " تن رسد بجاناں" کی معراج حاصل کرلی، اسطرح

---

[1] اس میں شک نہیں کہ حضرت شیخ الہند کی نظر عنایت مجھ نالائق کے حال پر اس زمانے بھی نہایت متوجہ رہی۔ از مولانا حسین احمد (مقدمہ اسیر مالٹا ص ۲)

اس پچاس سالہ امانت کے آخری امین مولانا حسین احمد مدنیؒ خود تھے، اور اب یہ بات سمجھنی کچھ مشکل نہیں ہے کہ شروع ہی سے، دارالعلوم کی بظاہر پُرسکون بہتی ہوئی موجوں کی تہہ میں ایک خفیہ لہر بھی تھی، جو دارالعلوم کی اصلی روح کے طور پر کام کر رہی تھی اور تاریخی صداقت یہ ہے کہ اس کا رشتہ حاجی امداد اللہؒ، مولانا قاسمؒ شیخ الہندؒ سے ہوتا ہوا اب مولانا حسین احمدؒ کے ہاتھوں میں تھا۔

مجھے کہہ لینے دیجئے کہ دارالعلوم میں ولی اللہی، امدادی، قاسمی اور گنگوہی مقصد اور تصور کو، ہمہ جہت قومی اور شان کے ساتھ، اگر کسی نے زندہ رکھا، پھیلایا اور بعد کی نسلوں کو اُن تمام اقدارِ عالیہ سے روشناس کرایا اور پھر ان نسلوں کے سپرد کر دیا تو وہ تنہا شیخ الاسلام مولانا سیدی حسین احمدؒ تھے۔

اور آج اُس وراثت اور اس کے جاں باز فرزند کے حالات سے موجودہ اور آئندہ نسلوں کو روشناس کرانا حضرت مدنیؒ کے متوسلین اور خدام کا فرض اور ان پر یہ قرض ہے، اسی جذبے اور مقصد کے تحت "حضرتؒ کی حیات اور آپ کے کارناموں" کے عنوان سے ۱۸ ر ۱۹ مارچ ۱۹۸۸ء کو ایک سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔

۷- کچھ سیمینار کے بارے میں

متوسلین شیخ الاسلامؒ کے اصرار اور راقم الحروف کی گذارش پر ارباب جمعیۃ خصوصاً صدر جمعیۃ علماء ہند مولانا سید اسعد مدنی مدظلہٗ نہ صرف اس بات پر راضی ہو گئے کہ حضرت مدنیؒ سے متعلق سیمینار کر لیا جائے بلکہ جمعیۃ العلماء کی طرف سے مالی تعاون کا وعدہ بھی فرما لیا۔ ان حضرات کی مصروف ترین مشغولیات کے پیش نظر سب سے زیادہ مشکل مسئلہ سیمینار کے لئے ان سے دو دن کا وقت لینے کا تھا، جو عقیدتمندان شیخؒ کی دلجوئی کے خیال سے آسان ہو گیا، اگرچہ

جمعیۃ العلماء کے گوناگوں مشاغل کے پیش نظر وقت کے تعین میں بار بار دقتیں پیش آئیں، خاصی دشواریوں کے بعد تاریخ کا یہ تعین ہوسکا۔

اس سلسلے میں متوسلین شیخ کو جو انتظار کرنا پڑا اس کا ہمیں احساس ہے اور ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

کارکنان جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اخلاص، جوش عمل اور حسن کارکردگی سے جس طرح راقم الحروف کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل کیا اس نے کام کو بہت سہل اور آسان بنادیا، اسی کے نتیجے میں ہند و پاک اور عالم عرب کے اہل علم، اہل قلم اور دانشور حضرات سے رابطہ قائم کرنے، مقالات حاصل کرنے اور ملک کی سربرآوردہ شخصیات سے مراسلت کرنے کا باطمینان موقع میسر آگیا۔

میں بہت بہت شکر گذار، سراپا نیاز اور اخلاق کریمانہ کا معترف ہوں ان بزرگوں، دانشوروں اور اکابر کا جنھوں نے میری گذارش پر مبسوط و طویل مقالے اس موقع کے لئے عنایت فرمائے، اور جو مقالے نہیں لکھ سکے انھوں نے بھی ازرہِ اخلاق و کرم مناسب مشورے دیئے۔

مقالہ عنایت فرمانے والوں میں کیسے کیسے مفکر، علماء اور بزرگ حضرات شامل ہیں کتاب کی فہرست سے اس کا اندازہ ہوجائے گا، نہایت افسوس ہے کہ پاکستان سے جناب ڈاکٹر ابوسلمان صاحب شاہجہانپوری اور ڈاکٹر وقار رضوی، جناب نثار الحق صاحب مدظلہم باوجود پوری آمادگی اور قبولیت کے تشریف نہیں لاسکے لیکن خوشی ہے کہ ان حضرات کے قیمتی رشحاتِ قلم شریک بزم ہیں، اور ہم اس سے مستفیض ہوسکیں گے، اسی طرح پاکستان میں مولانا یوسف لدھیانوی مفتی احمد الرحمٰن صاحب، مولانا ضیاء القاسمی صاحب، قاضی عطاء الرحمٰن صاحب ڈاکٹر عبدالواحد قاضی احسان الحق صاحب مولانا مجاہد صاحبان مدظلہم اور

حضرت رح کے دوسرے متوسلین وتلامذہ حضرات کو توجہ دلائی گئی (ڈاکٹر ابو سلمان صاحب
کے گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ اکثر حضرات نے مقالے تحریر فرمائے تھے، اور تشریف
آوری کیلئے تیار تھے مگر کیا مانع پیش آگیا، خدا ہی جانے!
ہم تو سراپا انتظار ہی رہے، خدا کرے آئندہ صحبت میں زیارت نصیب ہو سکے
اس طرح، بحمد اللہ، ۱۹ مارچ کو عصر سے قبل اس عظیم الشان سیمنار کا اختتام
حضرت مولانا اسعد مدنی کی اختتامی تقریر اور مفتی نسیم احمد فریدی امروہوی مدظلہ
کی دعا پر ہوا۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کو شیخ الاسلام رح کی زندگی پر کامل اتباع کی توفیق نصیب
فرمائے۔
مولانا نجم الدین اصلاحی مدظلہ نے (اللہ تعالیٰ موصوف کو تا دیر سلامت رکھے
سیرت شیخ الاسلام رح میں کسی جگہ تحریر فرمایا ہے۔

"زندگی کے کسی پہلو سے متعلق اگر سنت کا علم نہ ہو اور معلوم کرنا چاہیں
تو حضرت شیخ رح کی زندگی میں وہ پہلو دیکھ لیں سنتِ نبی کا پتہ
چل جائیگا (مفہوم)"

اس طرح ہم حضرت رحمۃ اللہ کی اتباع کر کے انشاء اللہ سنت سے قریب ہو سکیں گے
اور قرآن کا حکم ہے "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ" اللہ ہم سے راضی ہو جائیگا (انشاء اللہ)
اس بات کا دکھ کے ساتھ اظہار کرنا پڑ رہا ہے کہ حضرت مولانا قاری فخر الدین
گیاوی مجاز حضرت شیخ رح جنھیں اس سیمینار کے انعقاد سے قلبی مسرت اور اس میں
شرکت کا شدید اشتیاق تھا اور حضرت قاری صاحب نے ایک طویل مقالہ بھی ارسال
فرما دیا تھا مگر قدرت کو منظور تھا کہ بجائے سیمینار کے وہ جنت الفردوس میں حضرت
ہی سے جا ملیں اور سیمینار سے کافی پہلے وہ عالم جاودانی کو سدھار گئے رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ وفات

اسی طرح جناب خان غازی کابلی ذوق وشوق سے مقالہ لکھ رہے تھے اور بار بار احقر کو گرامی نامہ لکھ کر مشورہ دے رہے تھے. حوصلہ افزائی فرما رہے تھے مگر بتاریخ کو وہ بھی خدا کو پیارے ہو گئے۔

بالکل آخر میں ایک اور حادثے سے ہمیں دوچار ہونا پڑا جب کہ پاکستان میں حضرت مدنی رہ کے جلیل القدر خلیفہ عالم ومتقی حضرت مولانا حامد میاں صاحب صدر جمعیۃ العلماء پاکستان کے انتقال کی دردناک خبر ہمیں سننے کو ملی، رحمہم اللہ تعالیٰ علیہ۔

اس طولانی گذارش کے بعد (نیاز مند کنوینر) بے چین قاری اور حضرت شیخ رہ کے مقدس حالات کے درمیان سے رخصت ہوتا ہے اور عاجزانہ دعاء کا خواستگار ہے۔

(ڈاکٹر) رشید الوحیدی

جامعہ ملیہ۔ ۲۹ مارچ ۱۹۸۸ء

ڈاکٹر عبدالکریم نائک کا بمبئی سے پیغام

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ حیات و کارنامے سمینار جو ۱۸ ار ۱۹ مارچ ۱۹۸۸ء کو منعقد ہوگا کے افتتاحیہ اجلاس کے لئے دعوت نامہ موصول ہوا، بہت بہت شکریہ۔ مجھے امید ہے اور میری دعا ہے کہ اللہ آپ کی مدد کرے اور مسرتوں سے نوازے۔ میری یہ بھی دعا ہے کہ اللہ آپ کو قوت، صلاحیت، جذبہ تیزی اور شفا عطا فرمائے تاکہ آپ سماج اور ملت کی خدمت کرسکیں سیمنار کی عظیم الشان کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔

میں اپنے کالج کے دنوں میں ۱۹۴۶ اور ۱۹۵۰ء کے دوران مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ملا ہوں، میں ان کے نصب العین، ان کی حقیقت پسندی اور جذبات انگیز تقریروں سے بہت متأثر رہا ہوں، انھیں سیاست، مذہب اور دیگر علوم سے گہری واقفیت تھی وہ رپورٹوں، تحقیقی مقالوں بالخصوص کے لئے رپورٹ سے حوالے دیا کرتے تھے، اللہ ان کی روح کو جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائے آمین،

موجودہ نوجوان نسل کو مولانا حسین احمد مدنیؒ کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہئے اگر وقت نے اجازت دی تو میں ۱۹ یا ۲۰ کو سمینار میں شرکت کے لئے آنے کی کوشش کروں گا، اگر میں نہ پہنچ سکا تو معذرت قبول کریں، براہ کرم سمینار میں پڑھے گئے مقالے مجھے روانہ کردیں، میں اخراجات ادا کردوں گا۔

برادرانہ خلوص کے ساتھ
ڈاکٹر عبدالکریم نائک

محمد عثمان عارف نقشبندی

عالم باعمل، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا نام محتاج تعارف نہیں ہے، مولانا حسین احمد مدنی اس شخصیت کا نام ہے جو علم وعمل اور شریعت وطریقت کا مجمع البحرین ہے، اگر یوں کہا جائے کہ وہ ایک طرف اتباع سنّت اخلاق نبوت، سیرت صحابہ اور اسوۂ مشائخ کا سرچشمہ ہے تو دوسری جانب وہ ایسا بحر بیکراں ہے جس سے جذبات حریت، ترقی ملّت، حب وطن، ہمدردی خلق خدا، غم خواری بنی نوع انسانیت اور ان کے لئے ایثار وقربانی کے بے پناہ چشمے ابلتے رہتے ہیں، اس کا قلب حامل شریعت ہے اور عمل تفسیر شریعت۔

کسی کی زندگی میں یہ بڑا مشکل کام ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت گفتار اور کردار دونوں کا غازی بن جائے۔ بقول علامہ اقبال کے ؎

گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

لیکن اس مصرعہ کے بالکل برخلاف اگر دیکھا جائے تو مولانا حسین احمد مدنیؒ بیک وقت گفتار کے بھی غازی تھے اور کردار کے بھی، گفتار کے غازی کے روپ میں مولانا کا یہ عالم تھا کہ بولتے تھے تو پھول جھڑتے تھے، زبان میں دریا

کی روانی تھی، تخیلات اور خیالات میں فرشتوں کی پاکیزگی تھی، تو طینت وکردار میں مکمل غازی بننے کا شرف یوں حاصل تھا کہ بغیر تفریق مذہب وملت ہر رنگ و نسل، فرقہ ومذہب کا پیروان کے حلقۂ احباب میں شامل تھا۔

مولانا کو ایک طرف تو اپنے کردار کی پختگی اور حب الوطنی کے جذبہ کے تحت انگریزوں کی مخالفت برداشت کرنی پڑی جس کی پاداش میں جیل جانا پڑا، اور دوسری طرف پاکستان کے قیام سے انکار کرکے مسلمانوں کے سامنے معتوب ہونا پڑا، لیکن یہ کردار کا غازی زندگی کے آخری لمحہ تک تقسیم ہندوستان کو غلط ہی مانتا رہا، جس کے لئے مسلمانوں کی مخالفت بھی برداشت کرنی پڑی، لیکن مولانا ان حادثات سے کبھی بددل نہیں ہوئے، اس کے بعد ایک وہ وقت بھی آیا کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کو مولانا کے نصب العین کا احترام کرنا پڑا۔

مولانا ایک صوفی منش شخصیت کے علمبردار تھے، سادگی، صاف باطنی ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن گئی، اور پھر نتیجے میں ان کے اخلاق عالیہ اور علوم فقر پر مبنی نظر سے متأثر ہوکر بے شمار لوگ ان کے بہی خواہ اور مرید بن گئے

جناب بشمبھر ناتھ پانڈے، گورنر اڑیسہ

آزادی اور اتحاد کے مشعل بردار
مولانا حُسین احمد مدنی

مقالہ نگار کو ۴۴-۱۹۴۳ء میں مولانا حسین احمد مدنی کے بہت نزدیک آنے کا موقعہ ملا جب دونوں نے نینی سینٹرل جیل میں تقریباً پندرہ مہینے ایام اسیری ساتھ گذارے۔

مدرسہ دارالعلوم دیوبند میں جن لوگوں نے اوّل اوّل داخلہ لیا. ان میں مولانا محمود حسن تھے جن کی عملی طور پر ساری زندگی مدرسہ میں گزری، پہلے طالب علم کی حیثیت سے، اس کے بعد دارالعلوم کے استاذ اور بعدہٗ سربراہ کی حیثیت سے وہ ۱۸۵۱ء میں بریلی میں پیدا ہوئے. جب ۱۸۵۷ء میں وطن کے جاں نثاروں نے پہلی جنگ آزادی شروع کی تو وہ اس وقت اپنے والد کے ساتھ میرٹھ میں تھے گھر پر انھوں نے محبّان وطن کی شجاعت کے کارنامے سنے اور برطانوی مظالم کی لرزہ خیز واقعات بھی ان کے کانوں میں آئے، انھوں نے شمالی ہند کے شرفار کی دور دور تک پھیلی ہوئی تباہی بھی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی، ان واقعات اور مشاہدات نے ان کی روح کو آہنی عزم بخشا۔

جس وقت محمود حسن دیوبند کے مدرسہ میں داخل ہوئے، اس وقت ان کا سن صرف پندرہ برس کا تھا، تحصیل علم کی تکمیل کے بعد ۷۶-۱۸۷۵ میں وہ دارالعلوم میں درس دینے لگے، ان کے اساتذہ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد

گنگوہی جیسے مشفق اور جید عالم تھے۔ان سے مولانا محمود حسن کو علم تقویٰ اور ملک کی آزادی سے محبت کے اوصاف ملے۔

۸۸-۱۸۸۷ء میں وہ دارالعلوم کے سربراہ کے مرتبہ تک پہنچے، انھوں نے شروع سے اپنی زندگی کا جو نصب العین بنالیا تھا، اپنی آخری سانس تک وہ اس پر ثابت قدم رہے۔ان کا مقصد حیات تھا ہندوستان کی آزادی، ۱۹۰۵ء میں انھوں نے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد تیز کر دی اور بیک وقت دو محاذوں پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر دونوں محاذوں پر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے مسلح بغاوت ہونی تھی۔

ہندوستان میں ان کی تحریک کا صدر مقام دیوبند تھا اور اسکی شاخیں دہلی، دیناپور، امروٹ، کراچی، کھیڑا اور چکوال میں قائم تھیں ہندوستان کے باہر شمالی مغربی صوبہ سرحد کے قریب چھوٹی سی آزاد ریاست یاغستان تحریک کی سرگرمیوں کا مرکز تھا، سیداحمد شہیدؒ، مولوی عنایت علی، اور شرافت علی کو ماننے والے وہاں انگریزوں کی حامی فوجوں کے خلاف عَلَم جہاد بلند کئے ہوئے تھے، حاجی ترنگ زئی کو ان کا لیڈر مقرر کیا گیا، یہ توقع تھی کہ ہمسایہ قبیلے، ان کے حامی اور ہندوستان کے رضاکاران کی صفوں میں شامل ہو جائیں گے، یہ بھی امید تھی کہ تحریک کو امیر افغانستان کی حمایت حاصل ہو جائے گی۔

یہ مسلح بغاوت کا منصوبہ خالص مسلمانوں کے لئے نہیں بنایا گیا تھا، پنجاب کے سکھوں اور بنگال کی انقلابی پارٹی کے ممبروں کو تعاون کرنے کی دعوت دی گئی،ان کی رہائش کے لئے مولانا محمود حسن کی رہائش گاہ کے قریب ایک مکان کرایہ پر لیا گیا، یہ ساری تیاریاں خفیہ طور پر کی گئی تھیں، مولانا عبیداللہ سندھی دیوبند میں کام کر رہے تھے، انھوں نے جمعیۃ الانصار منظم کی، بعد میں انھیں دہلی بھیجا گیا جہاں

مدرسہ نظارۃ المعارف" قائم کیا گیا، حکیم اجمل خاں اور علی گڑھ کے وقار الملک اس کے سرپرست تھے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں ۱۹۱۱ء بہت اہم سال تھا۔ تقسیم بنگال کی تجویز پر نظر ثانی کی گئی اور ملک کا دار الخلافہ کلکتہ سے دہلی کو منتقل کیا گیا۔ جنگ بلقان خلافت عثمانیہ کے خلاف مسیحی صوبوں کی بغاوت تھی، اس کے کچھ عرصہ بعد پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی جس میں ترکی کا اتحاد جرمنی کے ساتھ، برطانیہ اور اسکے حواریوں کے خلاف تھا، چین کے سرحدی صوبہ سنکیانگ نے برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

ان واقعات سے مولانا محمود حسن بہت متأثر ہوئے اور انھوں نے محسوس کیا کہ برطانوی سامراج کے خلاف مسلح بغاوت کا وقت آگیا ہے، مسلح بغاوت کا منصوبہ تیار کیا گیا اور ریشمی رومالوں پر خطوط منصوبے میں شریک تمام لوگوں کو بھیجے گئے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان بھیجا گیا تا کہ وہ خود سرحد کی طرف مراجعت کر سکیں۔ اس منصوبے کی بد نصیبی یہ تھی کہ امیر حبیب اللہ کو منصوبے کی حمایت کے لئے آمادہ نہیں کیا جا سکا۔ اس کے برخلاف وہ انگریزوں کو ہندوستانی انقلابیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں مطلع کرتا رہا، بعد میں امیر حبیب اللہ نے انڈو جرمن مشن کی نقل و حرکت کے بارے میں برطانوی سامراج کو باخبر کیا جس کی کابل میں آمد کا مقصد یہ تھا کہ افغانستان کو مرکزی طاقتوں (ترکی، جرمنی، وغیرہ) کے حق میں مداخلت کیلئے آمادہ کیا جا سکے، ہند جرمن مشن کی واپسی کے بعد راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ جو اس مشن کے اراکین تھے کابل میں رہے اور انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھا اس مرحلے پر مولانا محمود حسن کو یہ علم ہوا کہ حکومت ہند نے انھیں گرفتار

کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی مدد سے وہ ہندوستان سے ۱۹۱۴ء میں مکہ معظمہ روانہ ہوگئے۔ حجاز میں ان کی ملاقات غالب پاشا سے ہوئی، جو اس وقت حجاز کے ترک حاکم تھے، انھوں نے غالب پاشا کو اس بات کے لئے آمادہ کیا کہ وہ ایک خط لکھدیں جس میں برطانیہ کے خلاف ہندوستان کی بغاوت سے مکمل ہمدردی اور حمایت کا اظہار کیا جائے۔ یہ خط خفیہ طور پر ہندوستان بھیجا گیا اور اس کی نقلیں تقسیم کی گئیں۔

کچھ عرصہ بعد ترکی کے وزیر دفاع انور پاشا اور جنوبی فوجوں کے کمانڈر جمال پاشا مکہ معظمہ تشریف لائے، مولانا محمود حسن نے ان سے مطالبہ کیا کہ ان کے استنبول اور ہندوستان کی سرحد جانے کا انتظام کیا جائے، بدنصیبی یہ ہوئی کہ انگریزوں کے اشتعال پر شریف مکہ نے خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کر دی، مولانا محمود حسن، ان کے عزیز شاگرد مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر دو ساتھیوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا، انگریزوں نے انھیں مالٹا جلاوطن کرکے قید کر دیا۔

جنگ کے خاتمہ کے بعد مولانا محمود حسن اور ان کے ساتھیوں کو بمبئی لایا گیا اور چار برس کی قید کے بعد انھیں جنوری ۱۹۲۰ء میں رہا کیا گیا۔ علالت اور پیرانہ سالی کے باوجود رہا ہونے کے بعد وہ سیدھے خلافت کمیٹی کے دفتر پہنچے اور تن من دھن کے ساتھ وہ تحریک خلافت میں شامل ہوگئے، انھوں نے علی گڈھ کا دورہ کیا اور یونیورسٹی کے طلبار اور اساتذہ سے اپیل کی کہ وہ انگریزوں کی مدد پانے والے ادارے کا بائیکاٹ کریں اور نئی قومی درسگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں میں داخل ہوجائیں جس کے قیام میں ان کی مدد شامل تھی۔

انھوں نے دہلی میں جمعیۃ العلمار کے اجلاس کی صدارت فرمائی اور ۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء کو اسکے اجلاس کے خاتمہ پر انھوں نے ہندوستان کی سیاست کے بارے

میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے علمار اسلام سے اپیل کی کہ وہ مقامات مقدسہ پر مسلمانوں کے اقتدار کی بحالی کے لیۓ اپنا جہاد جاری رکھیں اور ہندوستان کی برطانوی سامراج سے آزادی کی جدوجہد میں بھی شریک رہیں، انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان رشتۂ اتحاد اور سماجی یکجہتی کو برقرار رکھیں۔

آپ کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ملک میں نفاق رہا تو اس کی وجہ سے ملک کی آزادی ناقابل حصول ہو جائے گی، نوکرشاہی کے آہنی قوانین کا پنجہ روز بروز سخت ہوتا جائیگا اور اسلامی اثر کے جو دھندلے نشانات باقی رہ گئے ہیں وہ بھی صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گے، اس لئے اگر ہندوستان کے دو فرقے جس میں سکھوں کا جنگجو فرقہ بھی شامل ہے اگر تینوں دوستی اور امن کے ساتھ رہیں تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی چوتھا فرقہ خواہ وہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، کس طرح تشدد اور مطلق العنان حکومت کے ذریعہ ہندوستانیوں کو ان کے مشترک مقاصد کے حصول میں شکست دے سکتا ہے؟۔

سارے ہندوستان کے پانچسو علمار اس اجتماع میں شریک تھے جس میں اس فتوے پر دستخط ہوئے، جس میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ حکومت کے ساتھ عدم تعاون کریں اور تمام شہری اور فوجی ملازمتوں سے دست بردار ہو جائیں۔

اس کانفرنس کے تھوڑے عرصہ کے بعد مولانا محمود حسن کا انتقال ہو گیا، ان کی تحریک کی قیادت ان کے عزیز اور لائق شاگرد مولانا حسین احمد مدنی کے حصے میں آئی وہ مولانا محمود حسن کے ساتھ اسیر مالٹا رہے تھے اور احیار اسلام اور تحریک آزادی کے سلسلے میں اپنے استاذ کے خیالات کے حامی اور مؤید تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں مولانا حسین احمد مدنی (۱۸۷۹-۱۹۵۷) مولانا محمود حسن کے محبوب شاگرد تھے، ان کی تعلیم پوری نہ ہونے پائی تھی کہ ان کے والد نے مکہ ہجرت کرنے

کا قصد کیا، چنانچہ ۹۰-۱۸۸۹ء میں ان کا پورا خاندان مکہ معظمہ روانہ ہوگیا، مولانا حسین احمد مدنی کے اگلے سولہ برس خاص طور پر حجاز میں گزرے، اس درمیان وہ ہندوستان وقتاً فوقتاً آتے رہے، جب ۱۹۱۶ء میں مولانا محمود حسن مکہ معظمہ تشریف لائے تو مولانا حسین احمد ہندوستان کی تحریک آزادی کے پرجوش حامی بن گئے، اس سے قبل انھیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، سعادت مند شاگرد اپنے استاد کا معتمد اور مشیر بن گیا، مالٹا میں اسیری اور جلاوطنی کے دور میں وہ اپنے رہنما کے ساتھ تھے، رہائی کے بعد وہ تحریک خلافت اور کانگریس کی سرگرمیوں میں پرجوش حصہ لینے لگے۔

مولانا حسین احمد نے اپنے محترم استاد اور رہنما مولانا محمود حسن کی تحریک سے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا مگر ان کی سیاست جذباتی نہیں تھی مملکت اور سماج کے مسائل کے متعلق ان کا رویہ دانشمندانہ تھا، ہندوستانی سیاست، اقتصادیات اور بین الاقوامی امور کے بارے میں ان کی تحریروں سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے مذہبی معاملات میں ان کے علم میں غیر معمولی وسعت اور گہرائی تھی، انھوں نے ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی تاریخ اور مغربی طاقتوں اور اسلامی ملکوں کے بین الاقوامی روابط کے بارے میں وسیع معلومات جمع کی تھیں، اس میں شک نہیں کہ عالم اسلام کے مرکز مکہ معظمہ میں پندرہ برس قیام اور مالٹا میں پانچ برس اسیری کے عرصہ میں ان کا سابقہ اسلامی ملکوں کے افراد کے علاوہ یورپ کے لوگوں سے بھی پڑا، ان میں جرمن، آسٹریائی، اطالوی اور دیگر قوموں کے لوگ بھی تھے، ان کی صحبت سے انھوں نے بین اقوامی معاملات کے بارے میں کافی واقفیت حاصل کی۔

عالم دین کی حیثیت سے ان کا ایمان تھا کہ قرآن جو کلام الٰہی ہے اور احادیث نبوی میں دین و دنیا کے لئے مکمل ہدایت موجود ہے، اس کا مفہوم یہ تھا کہ دین وہ نظریہ حیات ہے جو ہمہ گیر اور عالمگیر ہے، عقیدے، عبادت اور اخلاق کو مذہب کے مطابق

ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ سماجی، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی امور میں بھی دین کی رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے، اس طرح دین اور دنیا کے معاملات میں کوئی تضاد نہیں ہے

سچا مسلمان وہ ہے جو فکر، قول اور عمل میں رضائے الٰہی کا پابند ہوتا ہے اور اس کے برخلاف کسی حکومت کے احکام کی تعمیل نہیں کرتا، اس اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان کسی حالت میں اپنی آزادی کسی ایسے غیر ملکی حاکم کو گروی نہیں رکھ سکتا جس کے قانون اور جس کی حکومت کا مقصد اسلامی طریق زندگی اور اصولوں کو تباہ کرنا ہو۔ اس لئے ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کے مطابق ہندوستان سے برطانوی حکومت کو ختم کرنے کی ہر امکانی کوشش کریں، انھوں نے بہت سے اقتباسات پیش کئے جن کے مطابق مسلمانوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کردیں اور دوسرے ہندوستانی فرقوں کے تعاون سے اپنی غلامی سے نجات حاصل کریں۔

اس اپیل کے ساتھ بغاوت کا مفصل جواز پیش کیا گیا تھا، ان کی خود نوشت کے ۳۳۶ صفحات میں دو سو سے زائد صفحات میں ہندوستان میں برطانوی سامراج کے تباہ کن نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان میں انھوں نے مندرجہ ذیل امور کا ذکر کیا ہے۔

(۱) نسلی اور قومی امتیاز برت کر عوام کی تذلیل کی گئی ہے، اور انھیں اعلیٰ ملازمتوں سے محروم کیا گیا ہے۔

(۲) ملک میں لگان، کے بندوبست اور صنعت و تجارت کی بربادی سے ملک کو اقتصادی طور پر تباہ کیا گیا ہے۔

(۳) غلط عدلیہ نظام نے مقدمہ بازی اور بدعنوانیوں کو فروغ دیا ہے، انصاف مہنگا اور اس میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔

(۴) ہندوستانیوں کو قانون سازی کے کام سے الگ رکھا گیا ہے
(۵) غیر ملکی حکومت کی وجہ سے عوام میں اخلاقی پستی اور انحطاط کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔

خود نوشت کے دوسرے حصے میں تفصیل سے اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ کس طرح مغربی طاقتوں نے اسلامی ملکوں سے خاص طور پر خلافت عثمانیہ سے معاملات میں معاہدوں کی خلاف ورزی کی ہے اور کس طرح بد معاملگی کے مرتکب ہوئے ہیں، یہ بھی واضح کیا گیا کہ ان معاملات میں برطانوی سامراج کا ریکارڈ بدترین ہے۔
ان حقائق سے یہ نتیجہ نکالنا ناگزیر ہے کہ انگریز مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں اس لئے مسلمانوں کے اور ان کے آئندہ وجود کے حق میں یہ لازم ہے کہ وہ اس برطانوی سامراج کو ختم کردیں جو ایشیا اور افریقہ کے عوام کے لئے خطرہ ہے۔

مولانا مدنی کا خیال تھا کہ دنیا کے مسلمانوں کی نجات ہندوستان کی آزادی پر منحصر ہے، اس مقصد کے حصول کے لئے انیسویں صدی کے آغاز میں شاہ ولی اللہ کی تعلیمات پر مبنی ایک تحریک شروع ہوئی تھی جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی شکل میں جاری رہی، بغاوت کے بعد زبردست مظالم کا جو دور آیا، اس کی وجہ سے تحریک کی شدت میں کمی آگئی، اور اس جدوجہد کو ایک نیا موڑ دینے کی ضرورت تھی، یہ کام انڈین نیشنل کانگریس نے کیا جس نے روز اول سے فرقہ وارانہ اتحاد کی اشد ضرورت کو محسوس کرلیا تھا۔

مولانا حسین احمد سمجھتے تھے کہ کانگریس حصول اقتدار کا خاص وسیلہ ہے اختلافات اور اشتعال کے باوجود وہ اپنے موقف سے نہیں ہٹے اور کانگریس کی حمایت کرتے رہے، بالخصوص جب کانگریس نے یہ اعلان کردیا کہ ہندوستان کا نصب العین مکمل آزادی ہے، ان کا خیال تھا کہ حصول آزادی کے لئے ہندوستان کے

عوام کو بلا امتیاز مذہب ایک متحدہ قوم بن کر حصول آزادی کے لئے اور مشترک بہبود کی حکمت عملی پر کاربند ہونا چاہیئے، اپنی ایک تقریر میں انھوں نے کہا تھا کہ موجودہ دور میں قوموں کی تشکیل مذہب اور نسل کے بجائے علاقائی بنیادوں پر ہوتی ہے۔

سر محمد اقبال کا خیال تھا کہ قومیت کی بنیاد مذہب ہے۔ نسل زبان اور علاقے کی بنیاد پر قومیت کا تصور باطل ہے۔ اقبال نے مولانا مدنی کی رائے سے اختلاف کیا اور ایک مضمون میں یہ بحث کی کہ عرب فلسفے اور اسلامی ادب سے مولانا مدنی کی رائے کی توثیق نہیں ہوتی، اقبال نے مولانا مدنی کے علم و فضل کے بارے میں نازیبا باتیں کہیں اور شعر میں ان کا مذاق اُڑایا۔

مولانا حسین احمد مدنی کو اس کا جواب لکھنا پڑا کیونکہ اقبال کے خیالات کا قوم پرستوں کے مسلک پر مضر اثر پڑ سکتا تھا، انھوں نے ایک رسالہ لکھا جس کا عنوان تھا ۔متحدہ قومیت اور اسلام۔ اس میں مولانا مدنی نے اپنے علم و فضل کی بنیاد پر مسئلے کے دونوں پہلوؤں پر بحث کی ہے (۱) قوم کی تعریف اور اس کا مفہوم کیا ہے؟ اور ملت اور قوم میں کیا فرق ہے (۲) قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام سے اس مسئلے پر کیا روشنی پڑتی ہے؟ مولانا حسین احمد نے قدیم، متوسط، اور جدید عربی لغات کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ دیگر معنوں کے علاوہ قوم سے مراد مردوں اور عورتوں کا وہ گروہ ہے جو کسی مشترک مقصد کے حصول کیلئے یکجا ہو، یہ ضروری نہیں کہ وہ مقصد مذہبی ہو۔

قرآن مجید میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اس سے بھی قوم کے اس مفہوم کی توثیق ہوتی ہے۔ قرآن میں اللہ کے نبیوں اور ان کو نہ ماننے والوں کی مشترک قومیت کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً محمدؐ اور قریش، قرآن میں مختلف مذہبوں کے ماننے والوں کے مشترک فرقہ کا تصور پیش کیا گیا ہے مثلاً عاد اور فرعون کے ماننے والوں کا۔

اس تعریف اور مفہوم کے حق میں سب سے زیادہ مضبوط دلیل نبی کریم کی مثال ہے، اپنی نبوت کے چودھویں برس میں حضرت محمدؐ نے مدینہ کے مسلمانوں اور یہودیوں کو ایک اہم معاہدے کی بنا پر متحد کیا تھا تاکہ وہ ان کافر عربوں کا مقابلہ کرسکیں جو مدینہ منورہ پر چڑھائی کی تیاریاں کررہے تھے. اس معاہدے کی شرائط میں ایک اہم شرط یہ تھی کہ ہر فریق کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی لیکن دیگر معاملوں میں یہودی اور مسلمان ایک فرقہ سمجھے جائیں گے۔

ملت کی اصطلاح کا مفہوم مختلف ہے، اس کا نفاذ ایمان اور شریعت کو ماننے والوں پر ہوتا ہے، اس کا اطلاق ہر مذہبی فرقہ پر ہے جس کا مذہب مشترک ہو۔

اس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ متحدہ قومیت کی تشکیل میں کوئی رکاوٹ نہیں پیش کرتا بلکہ اس کی واضح طور پر حوصلہ افزائی کرتا ہے، دوسری مصلحتوں کے تحت بھی اس نظریہ کو زبردست حمایت حاصل ہے بیشتر ہندو اور مسلمان ایک نسل سے تعلق رکھتے ہیں، ایک ملک میں صدیوں سے ساتھ رہنے کی وجہ سے طریق زندگی اور مسائلِ حیات کے بارے میں ان کا رویہ مشترک ہے، ان کی زبانیں مشترک ہیں. ان کی تاریخی روایات مشترک ہیں، اپنے انفرادی عقیدے اور ذاتی قوانین کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے مشترک ثقافت ادب موسیقی اور فنون لطیفہ کی تعمیر کی ہے، دیہاتوں اور شہروں میں کتنے ہی معاملے ایسے ہیں جن میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں، اقتصادی معاملات میں، اسکولوں اور کالجوں میں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں میں صوبائی اسمبلیوں میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، مختصراً مولانا مدنیؒ نے متحدہ قومیت کی مندرجہ ذیل الفاظ میں تعریف کی ہے۔

• متحدہ قومیت سے میرا مطلب اس طرح کی متحدہ قومیت ہے جس کی بنیاد

نبی کریمؐ نے مدینہ میں رکھی تھی یعنی میں یہ چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے تمام باشندے خواہ ان کا مذہب کچھ بھی ہو ہندوستانیوں کی حیثیت سے ایک ملک کے رہنے والوں کی حیثیت سے ایک قوم بن جائیں، کوئی دوسرے کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کرے بلکہ ہندوستان میں رہنے والے سب لوگ اپنے مذہبی عقیدوں اصولوں اور عبادت کے طریقوں کو برتنے میں پوری طرح آزاد ہوں۔ انھیں اپنے مذہبی رسم و رواج اور اصولوں پر عمل کرنے کی مذہب کے مطابق آزادی ہو، جہاں تک اس پر پُرامن طریقے سے عمل کرنے کی اجازت ہو۔

مولانا حسین احمد مدنی کی ذات میں حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، ملک کی آزادی کیلئے انھوں نے دس برس ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک جیلوں میں گزارے وہ ہندو مسلم ایکتا اور فرقہ وارانہ اتحاد کے علمبردار تھے۔ قرآن کریم پر ان کی گہری نظر نے انھیں یہ نظریہ بخشا تھا کہ تمام مذاہب کے بنیادی اصول یکساں ہیں۔ اپنے نظریہ اور عقیدے کی بنا پر اپنے مخالفوں کے ہاتھوں انھیں تذلیل اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ جن میں کٹر انتہا پسند مسلم لیگی پیش پیش تھے۔ لیکن اپنے اصولوں اور عقیدوں کے بارے میں وہ کبھی متزلزل نہیں ہوئے۔

آزاد ہندوستان کے شہری انھیں آزادی کیلئے ان کی قربانیوں اور تکلیفوں کے لئے یاد رکھیں گے انھوں نے اتحاد کا جو پیغام دیا وہ ہندوستان کی موجودہ نسل کے لئے مشعل راہ ہے۔

حوالہ جات :- ۱؎ اس مقالے کی تیاری میں مولانا حسین احمد مدنی کی خود نوشت (نقش حیات ۱۹۵۴ء) سے مدد لی گئی ہے اس سے پہلے انھوں نے ۱۹۲۲ء میں سفرنامہ شیخ الہند لکھی تھی جس میں حالات کے تقاضوں کے پیش نظر بعض واقعات یا تو حذف کر دیئے گئے تھے یا ان کو اعتراف نہیں کیا گیا تھا۔ ۲؎ ایضاً ص۳۲ ۳؎ حسین احمد مدنی، نقش حیات (اردو) دو جلدیں اور ڈاکٹر تاراچند کی تاریخ تحریک آزادی حصہ سوم ص۲۵۹ ۴؎ حسین احمد مدنی، متحدہ قومیت اور اسلام (اردو) شائع کردہ ناظم مجلس قاسم المعارف دیوبند ص۲۶ ۵؎ ایضاً ص۲۲

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

چودہویں صدی ہجری میں "حمیت و عزیمت" کا پیکر مثالی

ابوالحسن علی ندوی

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

حضرات!

میں نے رابطۂ ادب اسلامی کے ایک جلسہ میں جو ابھی کچھ عرصہ قبل ہوا تھا "أدبُ التَّراجم" کے عنوان سے شخصیتوں کے تعارف، سوانح نگاری کے آداب ونفسیات، اور تاریخ نویسی کی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا، کہ جس طرح انسانی جسم، خارجی اشیاء، موسموں، مقامات اور شہروں کا درجۂ حرارت و برودت (TEMPERATURE) ہوتا ہے، اسی طرح الفاظ واوصاف کا بھی ایک درجۂ حرارت وبرودت (TEMPERATURE) ہوتا ہے اور ان کا استعمال اسی اعتبار کے ساتھ صحیح محل ومقام اور مورخ و مصنف کے اعتبار سے ہونا چاہئے، اگر اس میں تناسب و مطابقت اور احتیاط واحساس ذمہ داری اور ادائے شہادت کے فریضہ کا احساس نہیں کیا گیا، تو وہ الفاظ اپنی قدر وقیمت کھو دیں گے، اور نہ صرف یہ کہ ان کی قدر و قیمت جاتی رہے گی، بلکہ جن کے لئے وہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کی قدر وقیمت

---

[1] یہ مضمون راقم سطور کے ادبی مضامین کے عربی مجموعہ "نظرات فی الادب" مطبوعہ بیروت میں شائع ہو گیا ہے۔

اور ان کی عظمت و اہمیت کا احساس بھی نہیں ہو سکے گا، اور ایک واقف و باخبر انسان، نقاد معاصر اور غائر نظر سے مطالعہ کرنے والے کو حسرت کے ساتھ کہنا پڑیگا کہ

ع اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی!

لیکن یہ ایک تلخ تاریخی حقیقت، اور ادبی و تصنیفی المیہ ہے کہ ان تعارفی و توصیفی الفاظ کا اکثر اور خاص طور پر پچھلے دور میں بڑی فیاضی اور بے احتیاطی کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ "ایثار و قربانی"، "جانبازی و سرفروشی"، "مجاہدانہ کارنامے"، "مجتہدانہ فکر و نظر" حتیٰ کہ سرآمد روزگار، نادرۂ عصر، اور عبقری شخصیت (GENIUS) جیسے الفاظ کا استعمال بھی اکثر مبالغہ آرائی کے ساتھ اور ضروری احساس ذمہ داری کے بغیر ہوا ہے۔

انھیں تعارفی و توصیفی الفاظ میں "حمیت" و "عزیمت" کے عمیق بلند پایہ اور امتیازی اوصاف بھی ہیں، جن کی مصداق اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت، اصلاح و انقلاب اور جہد و جہاد میں ہر دور میں معدودے چند شخصیتیں ہوئی ہیں، جو کسی مخالف اسلام یا دشمنِ حق جبروتی طاقت کے مقابلہ پر آئیں "سلطان جائر"[1] (جو کبھی رائے عامہ، مقبول قیادت، اور عوامی جوش و خروش کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے) کے منہ پر کلمۂ حق کہا، کبھی کسی صاحب شوکت و سطوت سلطنت کے مقابلہ میں صف آرا ہوئیں جس کا ستارۂ اقبال بلند تھا، اور جس کے متعلق کبھی کبھی کہا جاتا تھا کہ "اس کی مملکت میں سورج غروب نہیں ہوتا" جنھوں نے دین کی حمیت اور حق کی حمایت میں ہمیشہ "رُخصت" پر "عزیمت" کو اور سکون و اطمینان کی زندگی اور اعزاز و افتخار کے مناصب و مواقع پر قید و بند اور طوق و سلاسل کو ترجیح دی، اور جن کی اسلام کی بے کسی، مسلمانوں کی بے بسی، شعائر اسلام کی اہانت، آزاد و باعظمت اسلامی سلطنتوں

---

[1] صحیح حدیث میں آتا ہے: الا انّ افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر۔ (مسند احمد ابن حنبل ج ۳ ص ۱۹، مسند ابی سعید الخدری)

اور ملکوں کی پامالی پر راتوں کی نیند حرام اور دن کا سکون غائب ہوگیا، اور جن کی زبان حال کہتی تھی ؎

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے، اک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم رات کو اُٹھ کر روتے ہیں، جب سارا عالم سوتا ہے

لیکن ان الفاظ "حمیت و عزیمت" کا استعمال بھی ہمارے پچھلے دور کے سوانحی لٹریچر اور سیاسی و دینی جلسوں کے اسٹیج پر ہونے والی تقریروں میں ایسی فراخ دلی اور اس کثرت کے ساتھ ہوا کہ ان الفاظ میں کوئی بھی جاذبیت اور وزن نہیں رہا چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا ذکر کرتے ہوئے میں نے پہلے "مکتوبات شیخ الاسلام" مرتبہ مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی کے حصہ دوم (شائع شدہ ۱۹۵۴ء) کا مقدمہ لکھتے ہوئے پہلی بار لکھا تھا کہ:

"ایک جامع فضائل ہستی کے بارے میں یہ اندازہ لگانا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فضائل و کمالات میں مرکزی و نمایاں صفت کون سی ہے جس کو اس کی شخصیت کی کلید قرار دیا جائے اور جس سے اس کی زندگی و خصوصیات کو سمجھنا آسان ہو جائے؟ مولانا کو بہت سے لوگ ایک عالم اور محدث کی حیثیت سے جانتے ہیں، بہت سے لوگ ایک شیخ طریقت اور سالک کی حیثیت سے جانتے ہیں، بہت سے لوگ ایک سیاسی رہنما اور مجاہد کی حیثیت سے جانتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات کو ان سب فضائل سے آراستہ کیا ہے، لیکن میری کوتاہ نظر میں دو صفتیں آپ کی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں جنھوں نے آپ کو اپنے معاصرین میں ممتاز بنایا ہے، ایک "عزیمت" دوسرے حمیت۔"[1]

---

[1] مقدمہ "مکتوبات شیخ الاسلام" ص ۱۱۔

پھر ۱۹۸۰ء میں اپنی کتاب "پرانے چراغ" کے حصۂ اول میں (اس مضمون میں جس میں مولانا کے بارے میں اپنے دید وشنید اور مشاہدات وتأثرات کا ذکر کیا ہے) اسی مضمون کو مختصراً دہرایا ہے[1] لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ان اوصاف میں عزیمت یا عزیمت و حمیت کا عرصہ سے ایسا موقعہ بے موقعہ استعمال کیا گیا تھا اور گوش ونظر ان کے صحیح وزن اور ان کے درجۂ حرارت اور ان کے سلسلہ میں اقبال کے الفاظ میں، "دنوں کی تپش اور شبوں کے گداز" پھر ان کے ہدف ونشانہ کی بلندی اور ان کے میدان کی وسعت اور اس میدان کی دشوار گذاری اور خارزاروں کے اتنے ناآشنا تھے کہ لکھنے والے کا یہ احساس غالباً خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ مولانا کے عقیدت مندوں کے وسیع حلقہ میں ان مضامین کے پڑھنے والوں میں سے ایک تعداد نے اس کو مولانا کی بلند پایہ ذات کے ساتھ ناانصافی شمار کیا اور اس کو مضمون نگار کی (جس کو خواہ مخواہ اس مجموعۂ مکاتیب پر مقدمہ لکھنے کی زحمت دی گئی) نظر کی نارسائی اور قلم کی کوتاہ بیانی پر محمول کیا، لیکن مجھے اس حقیقت کے اظہار میں اب بھی کوئی تردد یا اس اظہار خیال پر ندامت وشرمساری کا کوئی احساس نہیں ہے، اور میں اب بھی ان دونوں امتیازی صفات کو مولانا کی کثیر الجہات اور عظیم الصفات والکمالات ذات میں مرکزی مقام اور ان کو ان کی انفرادیت سمجھنے کے لئے "شاہ کلید" (MASTER KEY) کا درجہ دیتا ہوں۔

لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ جس جبروتی طاقت اور عظیم سلطنت کے مقابلہ میں وہ میدان میں آئے اس کا (جہاں تک اسلام اور مسلمانوں، خلافت اسلامی اور آزاد ممالک اسلامیہ اور خود ہندوستان کا تعلق ہے) تاریخی کردار، اسکی اسلام دشمنی، اسلامی سطوت ووحدت کی بیخ کنی، اور خلافت اسلامیہ اور سلطنت عثمانیہ

---

[1] ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصہ اول ص ۱۰۶ تا ۱۰۷۔

کے زوال واستیصال میں اس کا قائدانہ حصہ، جزیرۃ العرب، حجاز مقدس اور ان عرب ممالک پر اثر و نفوذ قائم کرنے کی کامیاب جدّ وجہد جو دعوت اسلامی کا منبع و سرچشمہ مقامات مقدسہ پر مشتمل اور مسلمانوں کی عقیدت و محبت کا مرکز ہیں، نیز ہندوستان کی اس عظیم و مردم خیز، تاریخ ساز، تجدیدی و اصلاحی تحریکوں اور علوم دینیہ و اسلامیہ کے آخری مرکز ہندوستان پر غاصبانہ قبضہ اور وہاں کی اس مسلم آبادی پر جس نے اس ملک پر آٹھ سو سال تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی، تمدنی و تہذیبی علمی و فکری سیاسی و انتظامی طور پر اس کو چار چاند لگائے اور اس کو پہلی مرتبہ سیاسی وحدت و مرکزیت اور انسانی وحدت و مساوات اور سماجی عدل و انصاف سے آشنا کیا، ان سفاکانہ مظالم کی داستان بھی سامنے ہو جن کا اعتراف انگریز مصنفین و مؤرخین اور عسکری و انتظامی شعبے کے ذمہ داروں نے بھی کیا ہے اور جن کو پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

تاریخی عہد کے تقدّم و تأخّر کے لحاظ سے ہم پہلے یہ داستان ہندوستان ہی کی کہانی سے شروع کرتے ہیں، جو انیسویں صدی کے وسط کا زمانہ ہے اسکے بعد خلافت اسلامی سلطنت عثمانیہ اور بلاد عربیہ کے سلسلہ میں اس کے مجرمانہ سیاسی کردار کا ذکر کریں گے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (جس کو انگریز مصنفین کی تقلید میں ۵۷ء کا غدر کہا جاتا رہا ہے) صحیح معنی میں عوامی اور قومی جدوجہد تھی، اور ہندو مسلمان سب اس میں شریک تھے، ہندوستان نے وطن دوستی، اتحاد و گرم جوشی، اور جوش و ولولہ کا ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا جیسا کہ اس وقت دیکھنے میں آیا، پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ قیادت اور رہنمائی کے میدان میں مسلمانوں کا پلڑا بھاری تھا، اس کے اکثر قائد مسلمان ہی تھے[1] اور جیسا کہ سر ولیم ہنٹر نے لکھا ہے: "اس جنگ میں وہی چنگاریاں کام کر رہی

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" کا باب "ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ" ص۱۵۲

تھیں جو حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اور مجاہدین نے فروزاں کی تھیں"۔ جنگ آزادی کی یہ کوشش جب ناکام ہوئی تو انگریزوں نے ہندوستانیوں سے سخت انتقام لیا جس کی داستان لرزہ خیز اور ہوش ربا ہے، یہ ایک قتل عام اور نسل کشی تھی، لیکن مسلمان خاص طور سے اس کا نشانہ تھے اس لئے کہ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ یہ اسلامی جہاد تھا اور مسلمان اس بغاوت کے بانی اور قائد و رہنما ہیں۔

ایک انگریز مصنف (HENRY MEAD) کہتا ہے۔

"اس سرکشی کو موجودہ مرحلہ میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جا سکتا، یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا، لیکن بہت جلد اس کی حقیقت آشکارا ہوگئی، یعنی یہ کہ یہ اسلامی بغاوت تھی"[1]

ایک معاصر مؤرخ لکھتا ہے:

"ایک انگریز کا شیوہ یہ ہوگیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا، ہر ایک سے پوچھتا ہندو ہے یا مسلمان؟ جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی مار دیتا"[2]

پھر پھانسی کا سلسلہ شروع ہوا، عام شاہراہوں، سڑکوں پر پھانسی کے تختے لگا دیئے گئے، اور یہ جگہیں انگریزوں کی تفریح اور دلچسپی کا مرکز بن گئیں، جہاں آکر وہ پھانسی پانے والوں کے سسکنے اور دم توڑنے کے وقت کا لطف لیتے، سگریٹ کا کش لگاتے اور آپس میں باتیں کرتے رہتے، جب پھانسی کا کام پورا ہوجاتا اور وہ مظلوم شخص آخری سانس لیتا تو ہنسی اور مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرتے ان بدنصیبوں میں بڑے بڑے ذی وجاہت اور اشراف تھے، بعض مسلم محلے اس طرح

---

[1] LORD ROBERTS "FORTY ONE YEARS IN INDIA" P. 152

[2] ۱۸۵۷ء از غلام رسول مہر

تہہ تیغ کردیئے گئے کر ایک فرد بھی باقی نہ بچا۔
ایک معاصر مؤرخ لکھتا ہے:

"ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی، سات دن برابر قتل عام رہا اس کا حساب نہیں، اپنے نزدیک گویا نسل تیموریہ کو نہ رکھا مٹا دیا بچوں تک کو مار ڈالا، عورتوں سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے[1]"

میلی سن لکھتا ہے:

ہمارے فوجی افسر ہر قسم کے مجرموں کو ارتے پھرتے تھے، اور کسی درد و تاسف کے بغیر انھیں پھانسیاں دے رہے تھے، گویا وہ کتے تھے یا گیدڑ، یا نہایت ادنیٰ قسم کے کیڑے مکوڑے[2]"

فیلڈ مارشل لارڈ رابٹس نے ۲۱ جون ۱۸۵۷ء کو اپنی والدہ کو ایک خط میں لکھا:

"سزائے موت کی سب سے زیادہ مؤثر صورت یہ ہے کہ مجرم کو توپ سے اڑا دیا جائے، یہ بڑا ہی خوفناک نظارہ ہوتا ہے، لیکن موجودہ وقت میں ہم احتیاط پر کاربند نہیں ہو سکتے، ہمارا مقصد ان بدمعاش مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی مدد سے انگریز اب بھی ہندوستان کے مالک رہیں گے[3]"

ان سفاکانہ مظالم اور قتل عام کے بعد دوسرا قدم یہ تھا کہ مسلمانوں پر معاش کے دروازے بند کئے جائیں، ان کے اوقاف اور جائیدادوں کو ضبط کیا جائے جن سے

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم، از سید کمال الدین حیدر ص ۴۵۴
[2] میلی سن، جلد دوم ص ۱۷۷
[3] EDWAD THOMPSON THE OTHER SIDE OF THE MEDAL P.40 (1926)

ان کے مدارس اور ادارے چلتے ہیں، ایسے مدارس کھولے جائیں اور ایسا تعلیمی نظام قائم کیا جائے جس سے مسلمان فائدہ نہ اٹھا سکیں، اسی کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی متعدد جلیل القدر ہستیوں کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا دے کر انڈمان روانہ کردیا گیا[1]۔ جن میں سے کئی حضرات نے وہیں وفات پائی۔

یہ حالات و حقائق تھے جنھوں نے اہل حمیت مسلمانوں اور خاص طور پر ان علمائے ربانی اور اساطین ایمانی کے (خالص دینی حمیت، انسانی غیرت اور حب الوطنی کے جذبہ سے) دلوں کو زخمی کردیا، ان میں سر فہرست حضرت سید احمد شہید" کی جماعت قدسیہ کے باقی ماندہ افراد، مسلک ولی اللہی کے حامل اور وہ عالی نظر علما تھے جو انگریزی حکومت اور اقتدار کو اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا حریف، مادی و لادینی تحریک کا علمبردار پورے مشرق و ایشیا کی عزت کو خاک میں ملانے والا، اور دنیا کی تہذیب و سیاست کو ایسا رُخ دینے والا سمجھتے تھے، جس میں روحانیات، اخلاقیات، بلکہ انسانی قدروں کے بھی پنپنے اور باقی رہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلامذہ نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا اور اس کی قیادت کی

ہندوستان کے اس حصہ کو ہم اسی جگہ چھوڑتے ہوئے اب خلافت اسلامیہ سلطنت عثمانیہ اور بلاد عربیہ کی طرف آتے ہیں۔

مغربی طاقتوں نے خلافت اسلامیہ اور سلطنت عثمانیہ کو ہمیشہ اس نظر سے دیکھا کہ وہ ایک طرف اسلام کی پاسبان، مسلمانوں کی عزت و عظمت کا نشان، حجاز مقدس، جزیرۃ العرب، اور مقامات مقدسہ کی امین اور ان کی حفاظت کا حصار، اور مسلمانوں کی سیاسی طاقت، وحدت، خود اعتمادی و خود شناسی کی ضامن و محافظ

---

[1] مثلاً مولانا محمد یحییٰ صاحب صادق پوری، مولانا محمد جعفر تھانیسری، مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی وغیرہ

ہے، دوسری طرف وہ یورپ کے سینہ پر ایک کیل ہے جس نے اس کو صدیوں سے بے چین کر رکھا ہے۔ اس احساس میں برطانیہ جس نے چھٹی صدی ہجری اور بارہویں صدی عیسوی میں جنگ صلیبی میں بھی قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ اور "شیر دل" رچرڈ نے اس کی نمائندگی کی تھی، پیش پیش تھا، اسی کی تحریک اور اشارہ سے بلقان کی جنگ کا طویل سلسلہ شروع ہوا، جس کا مقصد یورپ میں ترکی مقبوضات اور مستعمرات کو آزاد کرانا اور ترکی سلطنت کو کمزور اور محدود سے محدود تر کر دینا تھا، اسی سلسلہ کا ایک اہم حصہ شریف مکہ (شریف حسین) کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنا اور ان کو خلافت کے منصب پر فائز کرنے کا وعدہ تھا، ۱۹۱۴ء میں جب جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو برطانیہ کے نمائندے اور مصر کے امور کے ذمہ دار لارڈ کچنر نے شریف حسین کو ان کے صاحبزادے شاہ عبداللہ اور دوسرے با اثر لوگوں کے ذریعہ اتحادیوں کا ساتھ دینے، اور خلیفۂ عثمانی کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کر لیا، اور ان کو منصب خلافت پر فائز ہونے اور حجاز کا مطلق العنان حاکم بننے کے سبز باغ دکھا کر اور مؤکد وعدوں اور تحریری دستاویزوں کے ذریعہ اس اقدام پر آمادہ کر لیا، جو مسلمانوں کی پچھلی تاریخ میں عرصۂ دراز تک ایک بدنما داغ اور ایک شرمناک واقعہ کے طور پر ذکر کیا جاتا رہے گا، ۳۰ اگست ۱۹۱۵ء سے ۱۸ فروری ۱۹۱۶ء تک حکومت برطانیہ کے مؤقر نمائندوں اور شریف مکہ کے درمیان خطوط اور رسائل کا تبادلہ ہوتا رہا اور ان کو یقین دلایا جاتا رہا کہ ان کو اس اقدام کا پورا صلہ اور انعام ملے گا، لیکن جنگ عظیم کے خاتمہ پر ۱۹۱۸ء میں جب روز روشن کی طرح یہ حقیقت سامنے آگئی کہ یہ سب وعدے سیاسی، فریب اور نقش بر آب تھے، ان کے بلند حوصلہ صاحبزادہ فیصل بن حسین کو شام سے جس کو انھوں نے اپنے سابقہ وعدوں کی بنا پر اپنے قبضہ میں لے لیا تھا "بیک بینی و دو گوش" نکلنا پڑا، اور فرانس نے اس ملک کا چارج سنبھال لیا، اسی طرح لبنان پر فرانس نے اور فلسطین و بیت المقدس

پر برطانیہ نے اپنا انتداب قائم کیا تو ان سب معاہدات کی قلعی کھل گئی، جو برطانیہ اور شریف حسین کے درمیان ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں جب عرب پورے اخلاص کے ساتھ خلافت عثمانی کے بالمقابل اتحادیوں کے حلیف بن کر ترکوں سے لڑ رہے تھے، روس میں کمیونسٹ انقلاب آیا اور ۱۹۱۷ء میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوگئی اسوقت وہ تمام خفیہ معاہدے منظر عام پر آگئے جو قیصر کی حکومت کے زمانہ میں ہوئے تھے، یا جس میں وہ ایک فریق تھے، انھیں معاہدات اور دستاویزوں میں سائکس بیکو کا وہ معاہدہ تھا جو برطانیہ اور فرانس کے درمیان ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا جس میں فریقین نے جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد مشرق وسطیٰ میں سلطنتِ عثمانیہ کو مردہ آدمی کے ترکہ کی طرح تقسیم کیا تھا، اور اس کے حصے بخرے کر دیئے تھے، شریف حسین کو ترکوں کے واسطہ سے جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے سر میکموہن سے اس کی حقیقت معلوم کی انگریزوں نے اس وقت بھی یہی کہا کہ وہ اپنے قدیم وعدوں پر قائم ہیں اور وہ عربوں کی آزادی اور عربی وحدت کے اعلان کا بھی عزم کر چکے ہیں، لیکن جلد اس فریب کا پردہ چاک ہوگیا، اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو برطانیہ اور فرانس نے سائکس بیکو کے معاہدہ ہی کے مطابق شام و فلسطین و عراق کو تقسیم کرلیا، جس میں شام صوبۂ بیروت جبل لبنان و کیلیکیا شام کے حصہ میں، فلسطین و عراق انگریزوں کے حصہ میں آئے اور شریف حسین کو حجاز چھوڑ کر پہلے اپنے صاحبزادہ شاہ عبداللہ کے پاس عمان پھر قبرص میں پناہ لینی پڑی، جہاں انھوں نے غریب الوطنی اور کس مپرسی کی حالت میں ۱۹۳۱ء میں جان دیدی، عرب فاضل محمد جمیل بیہم اپنے فاضلانہ مقالہ انتفاضات العرب القومیۃ شائع شدہ مجلہ مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق (ستمبر ۱۹۶۴ء) میں لکھتے ہیں کہ:

"میں شریف حسین سے قبرص میں جو ان کی جلاوطنی کی جگہ تھی جب ۱۹۲۹ء

میں ملا نور روئی کے ایک تھیلہ میں بندھے ہوئے ان معاہدات کو انھوں
نے مجھے دکھایا جب میں نے ان سے ان کی یادداشتوں کے ایک
سلسلہ میں ترتیب دینے کی اجازت طلب کی تو انھوں نے کہا فتوکلوا
علی برکات اللہ[1]

راقم سطور جب ۱۹۵۱ء میں بیت المقدس حاضر ہوا تو مسجد اقصیٰ کی ایک حاضری کے موقعہ پر ایک معمر بزرگ سے ملاقات ہوئی جو مفتی سید امین الحسینی صاحب مرحوم کے رفیق اور معتمد رہ چکے تھے، انھوں نے کہا کہ میں ایک مرتبہ مفتی صاحب کی ہمرکابی میں شریف حسین کی عیادت کے لئے عمان گیا، ہمیں دیکھ کر شریف مکہ نے کہا کہ مجھے بٹھا دو، ان کو بٹھا دیا گیا انھوں نے شاہ عبداللہ کو خطاب کر کے کہا کہ یا عبد اللہ اعتبر، اذکر، اتعظ، عبداللہ عبرت حاصل کرو، ہوش کی آنکھیں کھولو، سبق لو، یہ انگریز کسی کے نہیں ہیں، شاہ عبداللہ نے کہا کہ آرام فرمایئے، آرام فرمایئے! اور ان کو لٹا دیا۔

ترکی کے حصے بخرے کرنے اور بلاد عربیہ اور جزیرۃ العرب پر اپنا سیاسی نفوذ اور تسلط قائم کرنے سے زیادہ خطرناک وہ دوررس، انقلاب انگیز اور منحوس فیصلے اور تبدیلیاں تھیں جو برطانیہ نے ترکی کی نئی قائم ہونے والی سلطنت سے (جس کی قیادت مصطفےٰ کمال پاشا کر رہے تھے) کرائیں اور جنھوں نے ترکی کو خلافت اسلامی کا امین و محافظ ایک پرجوش، جاں نثار، حامی اسلام، سرکیف مجاہد، اور جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کا متولی اور خادم بننے کے بجائے ایک لادینی، آزاد، مغربی طرز کی سیکولر سلطنت بننے میں تبدیل کر دیا، مارچ ۱۹۲۴ء کی تاریخ تھی جب قسطنطنیہ کی مجلس وطنی نے الغاء خلافت کا فیصلہ کیا، یہ فیصلہ مغربی طاقتوں بالخصوص برطانیہ کے اشارہ بلکہ اصرار سے عمل میں آیا، تاریخ الدولۃ العثمانیۃ کا مصنف ڈاکٹر علی حسون لکھتا ہے

---

[1] مجلۃ ص ۶۸، ۷۔

• انگلستان نے اس اعلان کے فوراً بعد ترکی کو بحیثیت ایک آزاد
سلطنت کے تسلیم کیا، اور اس کی فوجیں ترکی کے حدود سے باہر نکل
آئیں، برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے مجلس عوام (HOUSE
OF COMMON) میں اس کارروائی پر احتجاج کیا۔ اس کا جواب
کرزن نے ان الفاظ میں دیا کہ:

"مسئلہ یہ ہے کہ ترکی کا ایسا زوال عمل میں آگیا ہے کہ اس کے بعد پھر
اس کا عروج نہیں ہوگا۔ اسلئے کہ ہم نے اسکی روحانی و معنوی طاقت
(خلافت اسلامی) کو ختم کر دیا ہے"[1]

اس کے ساتھ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ لوزان کانفرنس میں برطانوی وفد کے
صدر کرزن نے ترکی کو تسلیم کرنے کیلئے چار شرطیں رکھی تھیں، خلافت اسلامیہ کا مکمل خاتمہ
خلیفۃ المسلمین کی جلاوطنی، ان کے مال و جایداد کی ضبطی، حکومت کے لادینی (سیکولر) ہونے
کا اعلان، جس کو اگرچہ ترکی وفد نے اس وقت منظور نہیں کیا، لیکن کمال اتاترک کی
کوششوں سے بالآخر ترکی پارلیمنٹ نے اس کو منظور کیا اور مغربی طاقتوں کا جس میں
برطانیہ پیش پیش تھا وہ خواب پورا ہوا جو عرصہ سے دیکھ رہی تھیں۔

یہ وہ تاریخی سانحہ اور المیہ تھا جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اور ان میں
سب سے زیادہ علماء کے طبقہ کو اور ان میں بھی اس جماعت کو جس کے دل میں حمیت
اسلامی کا دریا جوش مار رہا تھا، اور جس کو اپنے اسلاف سے عزیمت و جہاد، حُب فی
اللہ اور بغض فی اللہ کی دولت ورثہ میں ملی تھی بے چین اور مضطرب بنا دیا، اور مغربی
طاقتوں، بالخصوص برطانیہ کے خلاف ایک ایسی نفرت، بیزاری پیدا کر دی جس کی
نظیر برطانیہ کے دوسرے مقبوضہ ممالک میں دیکھنے میں نہیں آئی ان کی اس حمیت اسلامی

---

[1] تاریخ الدولۃ العثمانیۃ ص ۲۰۳، مطبوعہ مکتبہ اسلامی دمشق، بیروت

نے تحریک خلافت کی شکل میں وہ عظیم تحریک پیدا کی جس کی دوسرے اسلامی ملکوں میں نظیر نہیں ملتی، طبقۂ علماء میں اسکے نمایاں ترین قائد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی مولانا قیام الدین، عبدالباری لکھنوی، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا حسین احمد مدنی مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی وغیرہ، اور طبقۂ علماء کے باہر رئیس الاحرار مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، حاذق الملک حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ تھے

دسمبر ۱۹۱۶ء میں حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کو جن میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مولوی عزیر گل صاحب، حکیم مولوی نصرت حسین صاحب اور مولوی سید وحید احمد صاحب تھے حجازی حکام نے گرفتار کر کے انگریزی حکومت کے حوالہ کر دیا جس نے انھیں پہلے مصر پھر مالٹا میں اسیر و نظر بند رکھا، یہ حضرات وہاں تین سال دو ماہ رہ کر فروری ۱۹۲۰ء میں رہا ہو کے جون ۱۹۲۰ء میں ہندوستان آئے، لیکن حکیم نصرت حسین صاحب کو وہاں کا دہیں انتقال ہوا[1]

تحریک خلافت نے ہندوستان میں جو جوشِ ایمانی، غیرتِ اسلامی، حمیّتِ دینی بلند نگاہی اور مصائب و محن پر صبر و استقامت کی شان پیدا کر دی تھی، اس کو "حمیّت و عزیمت" کے الفاظ سے بہتر الفاظ (بشرطیکہ ان کے صحیح وزن اور درجۂ حرارت کو سمجھا جائے) نہیں مل سکتے، اور اس کا مظہر اتم اور نمونۂ کامل حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح تھے جن کی انگریز دشمنی اور حمیّت دینی فکری و اعتقادی حدود سے آگے بڑھ کر قلبی و جذباتی نفرت و عداوت اور قتال سے آگے بڑھ

[1] انتقال کے وقت ان کی عمر ۲۹ سال تھی۔

حال میں تبدیل ہوگئی۔[1]

اس موقعہ پر مولانا کے ایک مکتوب کا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کی دینی حمیت، انگریز دشمنی اور حب الوطنی کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔ اور اسکے اسباب پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کی مزید تفصیل اور شرح وبسط "نقش حیات" میں ملیگا۔[2]

"میرے محترم دوست! آپ کو معلوم ہے کہ اگرچہ تمام غیر اسلامی مذاہب اور ان کے ماننے والے اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں مگر سب دشمن ایک طرح کے نہیں ہوتے کوئی بڑا ہے کوئی چھوٹا ہے، ہر دشمن سے اس کے درجہ کے موافق مقابلہ کرنا لازم ہوگا، جب سے اسلام نے ظہور کیا ہے، انگریز کے برابر اسلام اور مسلمانوں کو کسی قوم نے نقصان نہیں پہنچایا ہے، انگریز دو سو برس سے زیادہ عرصہ سے اسلام کو فنا کر رہا ہے۔ اس نے ہندوستان کی اسلامی طاقت کو فنا کیا، بادشاہو اور نوابوں اور امرار کو قتل کیا، ان کی نوجوں کو برباد کیا، حکومتہائے اسلامیہ کو تہہ وبالا کیا، خزانوں کو لوٹا، اپنے اقتدار کا خزانہ قائم کیا، اپنے قوانین کو جاری کیا، ہندوستان کی تجارت، صنعت وحرفت علم وتہذیب وغیرہ کو برباد کیا، ٹیکسوں اور لگانوں وغیرہ کے ذریعہ سے ہر قسم کی مالی لوٹ جاری کر کے اپنے ملک کو غنی اور ہندوستان کو کنگال بنایا، ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو انتہائی ذلیل

---

[1] اس کا کسی قدر اندازہ مولانا کی مجلس میں بیٹھنے والوں اور فجر کی نماز میں قنوت نازلہ سننے والوں کو ہو سکتا تھا، کہ جب مولانا دشمنان اسلام کے لئے اللّٰھم دمّر دیارھم ونکّس اعلامھم وزلزل اقدامھم وخذّل حدھم واھزم جُندَھم، اللّٰھم خذھم اُخذ عزیز مقتدر کے الفاظ ادا کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ محراب میں اسکے اثر سے شگاف پڑ جائیں گے۔

[2] ملاحظہ ہو ص۱۳۱ تا آخر کتاب ص۲۳۶

نادار، بے کار، بے روزگار بنایا، مسلمانوں سے ہندوستان کے دوسرے مذہبوں والوں کو متنفر کر کے دشمنی کی آگ بھڑکائی اور ہر جگہ بے ہتھیار اور کمزور کیا، ہندوستان میں اسلامی قوانین کے خلاف شراب اور منشیات کی آزادی، زنا اور بدکاری کی آزادی، الحاد و زندقہ وارتداد کی آزادی، عدالتوں میں خلاف اسلام قانون کا اجرا، اور وہاں کے موافق فیصلہ جات جاری کئے، محکمۂ قضا کے خلاف معاہدہ مٹا کر مسلمانوں کے اسپیشل قوانین کو ملیامیٹ کیا وغیرہ وغیرہ، ہندوؤں کو قصداً بڑھا کر ہر محکمہ اور ہر شعبۂ زندگی میں قوی تر کیا، اور سود در سود کو جاری کیا، غرضکہ ہر طرح سے اسلام اور مسلمانوں کو ہندوستان میں برباد کیا، اور جبکہ مسلمانوں نے اپنے فطری اور شرعی حق آزادی کے لئے جدوجہد کی تو ان پر اس قدر مظالم کئے کہ ان کی یاد سے بھی دل تھرا آتا ہے، ۱۸۵۷ء کی تاریخ اور اس سے پہلے کے واقعات دیکھئے، معاہدات اور وعدے جو ۵۷ء سے پہلے کئے تھے اور ۵۷ء میں ہوئے ان کو بار بار توڑتے رہے، غرضکہ ہندوستانی مسلمانوں کے خصوصًا اور تمام ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ عمومًا وہ شرمناک معاملے کئے کہ وہ ہندوستان جو کہ کبھی جنت نشان تھا جہنم نشان بن گیا، وہ ہندوستان جو کہ دولت و ثروت کا مرکز تھا وہ فقر و فاقہ افلاس و تنگدستی کا اڈہ ہو گیا، وہ ہندوستان جو کہ علم و حکمت کا سمندر تھا وہ جہالت اور بددینی کا چٹیل میدان ہو گیا، وہ ہندوستان جو تمام دنیا کا محتاج الیہ تھا، وہ سب سے زیادہ مفلس، قلاش، مسکین، فاقہ مست، بے کمال، بے روزگار، گرانی اور پسماندگی کا

شکار ہوگیا، یہ مظالم تو تھے ہی جن میں مسلمان سب سے زیادہ تباہ ہوئے[1]

برطانیہ کی اسلام دشمنی کا دوسرا ثبوت اور ممالک عربیہ اور مقامات مقدسہ کو (جن کی وحدت اور آزادی کے وعدہ پر شریف حسین کو خلیفۃ المسلمین اور سلطنت عثمانیہ کے خلاف آمادہ کیا تھا) ہمیشہ کے لئے داؤ پر لگا دینے کا منحوس اقدام، فلسطین میں اسرائیل کی آزاد حکومت کا قیام ہے جو ۱۹۴۸ء میں خالص برطانیہ کی سرپرستی میں عمل میں آیا۔ اور جو عالم عرب کے جسم میں ایک ناسور کی حیثیت رکھتا ہے، اور جس نے پورے فلسطین، ضفہ غربیہ اور سینا اور لبنان کو یہودیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اسلام دشمنی اور عربوں کے مفاد کے خلاف اس پچھلے عہد میں کسی مغربی طاقت کی طرف سے کوئی منصوبہ یا اقدام وجود میں نہیں آیا۔

اس مضمون کے آخر میں اس تاریخی حقیقت کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان جیسے عظیم ملک پر سات سمندر پار کی ایک بدیشی قوم کا جس کی تہذیب، زبان، مذہب اور سیاسی مقاصد اس ملک سے کوئی میل نہیں کھاتے تھے، حکومت کرنا ایک غیر فطری، غیر عقلی اور غیر اخلاقی صورت حال تھی، جس میں زیادہ دنوں تک باقی رہنے کی صلاحیت نہیں تھی، کسی نہ کسی دن ملک کی روح اور ضمیر کا اس کے خلاف بغاوت کرنا اور اس کی حکومت کے جوئے کو اتار کر پھینک دینا اور ملک آزاد ہوجانا ایک فطری عمل تھا، اور زمانۂ قریب وبعید میں اس ملک کا آزاد ہونا تقدیر الٰہی اور اقوام وملل کی تاریخ کا پرانا تجربہ، اور بار بار پیش آنے والا واقعہ تھا، اس لئے اس جنگ آزادی میں جو اس ملک کے محبانِ وطن اور باعزت اور باضمیر انسانوں نے انیسویں صدی کے آخر ہی میں شروع کردی تھی، مسلمانوں کا قائدانہ حصہ لینا، اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ طبقۂ علماء کا پیش پیش ہونا نہ صرف حُبّ الوطنی کا تقاضہ

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام حصۂ دوم ص ۸۱ – ۸۲ – ۸۳ مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی۔

اور اس ملک کا (جس میں انھوں نے صدیوں تک امن وامان اور سکون واطمینان کیساتھ آزاد مذہبی زندگی گذاری تھی اور دین وعلوم دینیہ کی خدمت کی تھی) اخلاقی ودینی فرض تھا، بلکہ دینی بصیرت، بالغ نظری، حقیقت پسندی اور انجام بینی کا بھی تقاضہ تھا، اسلئے کہ جس ملک کو اجنبی طاقت سے آزاد کرانے میں اہل دین کا قائدانہ حصہ نہیں ہوتا، اس ملک کے آزاد ہونے کے بعد ان کو اس ملک میں اپنے ملی تشخص کی بقا اور اس سرزمین پر عزت واعتماد کے ساتھ رہنے کا مطالبہ کرنے اور اس کے لئے جدوجہد کرنے کا موقعہ نہیں رہتا، اور وہ اس ملک کی جدید تعمیر وتشکیل میں آزادانہ ومساویانہ حصہ لینے کے مدعی اور طلب گار نہیں بن سکتے کہ الغُنم بالغُرْم (نقصان اٹھانے کے بقدر فائدہ حاصل کرنے کا استحقاق ہوتا ہے) کا اصول ہر زمانہ میں تسلیم کیا گیا ہے۔

شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ ان کی جماعت (جمعیۃ العلماء) ان کے رفقار کار، اور جنگ آزادی میں حصہ لینے والے، اور اس کے سلسلہ میں قید وبند کی مصیبتیں اٹھانے والے اور مخالفین کی ناراضگی اور مقاطعہ کا نشانہ بننے والے علماء اور اہل دین کا (جن کے سرخیل اور پیشوا شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ تھے) ملت اسلامیہ ہندیہ پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اپنی قربانیوں، خلوص وبے غرضی، ہمت وعزیمت اور صبر واستقامت سے (جو اکثریت کے بڑے سے بڑے قائدین کی قربانیوں سے کم نہیں) ہندوستان کی ملت اسلامی کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اس سرزمین پر اعزاز وافتخار کے ساتھ سر اونچا کر کے چلے، بڑی سے بڑی سیاسی اور مدعی ایثار وقربانی جماعت سے آنکھیں ملا کر بات کرے، اور اپنے دین وشریعت، اپنی زبان وتہذیب اپنے عائلی قانون (پرسنل لا) اور ملک کی آئین سازی اور نظام تعلیم میں اپنے تشخص اور اپنی ملی ضروریات کے تحفظ کا (احساس کہتری کے ادنیٰ شائبہ کے بغیر) مطالبہ کرے اور اس کے لئے جدوجہد کو جائز ہی نہیں ضروری سمجھے،

یہ ملت پر اتنا بڑا احسان ہے کہ جس سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی، اور تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی، ان دینی قائدین اور مجاہدین آزادی کو بانگ دُہل یہ اعلان کرنے کا حق ہے کہ ؎

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخون دل -
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

حضرات ! ہندوستان کی ملت اسلامی ملک کے آزاد ہونے کے ۳۰-۴۰-سال بعد پھر ایک ایسے دوراہے پر پہنچ گئی ہے جہاں سے ایک راستہ ملت کے اپنے دینی، تہذیبی، لسانی و ثقافتی تشخص کے ساتھ باقی رہنے کی طرف جاتا ہے، دوسرا راستہ اپنے ہر قسم کے ملی، دینی و تہذیبی تشخص (IDENTITY) سے محرومی اور تعلیمی پالیسی، لسانی فارمولے، ذرائع ابلاغ، یکساں سول کوڈ (UNIFORM CIVIL CODE) اور جارحانہ احیائیت کے ذریعہ معنوی نسل کشی کی طرف لے جاتا ہے اس موقع پر پھر ایسے رہنما یا رہنماؤں کی ضرورت ہے جو حضرت مدنیؒ کی ہمت و عزیمت کے ساتھ میدان میں آئیں اور اس ملت کو عرصہ تک کیلئے ان خطرات سے محفوظ کر دیں

آخر میں اس مقالہ کو خود حضرت مدنی کے ایک پسندیدہ شعر پر ختم کرتا ہوں جس کو انھوں نے اپنا اصول زندگی بنالیا تھا اور جس کا مفاد یہ ہے کہ "وہ شاہ خوباں" (خدائے بالا و برتر) اپنی رضا و مقبولیت اور خلق خدا میں اعتماد و قبولیت کا جام، "سرکشیدہ" کے بجائے "سر بریدہ" کو اور خود بینی و خود پرستی کے بجائے ایثار و قربانی کو اپنا شعار بنانے والے کو، اور ان کو عطا فرماتا ہے جو "فنا" کے راستے سے "بقا" تک پہونچتے ہیں۔

یہ شعر مولانا نے اپنے ایک مخلص خادم کو لکھا تھا اور وہ خط ہمارے خاندانی مرقعہ خطوط میں محفوظ ہے۔

نمی دانی کہ آں شاہِ نکو نام
بدستِ سر بُریدہ می دہد جام

قوموں کی تقدیر وہ مرد درویش

خلیق احمد نظامی

محدث مجاہد پیر طریقت —

جوانانی بکر، ان تین عظیم الشان حیثیتوں کا جامع ہو، اس کی شخصیت کی عظمت و دل آویزی الفاظ کے سہارے بیان نہیں کی جا سکتی، اس کے نام کے ساتھ کتنی ہی مختلف النوع تصویریں ہیں جو یکے بعد دیگرے پردۂ ذہن پر ابھر آتی ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ درس و تدریس، دعوت و عزیمت، سلوک و ارشاد کی ایک دنیا نظروں کے سامنے پھیل گئی ہے اور جس منظر کو دیکھئے جی چاہتا ہے کہ دیکھتے ہی رہئے

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

کبھی اس کے درس حدیث سے دارالعلوم کے بام و در گونجتے سنائی دیتے ہیں، کبھی وطن سے ہزاروں میل دور مصر اور مالٹا کے قید خانوں میں وہ اپنے جذبات حریت اور احساسات دینی کی ایک دنیا اپنے خون دل سے سجاتا نظر آتا ہے، اور فضائیں تک پکار اٹھتی ہیں ؎

بنا لیتا ہے موج خون دل سے اک چمن اپنا
وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

کبھی عزم و عزیمت کی راہ پر گامزن کراچی کی

برطانوی عدالت میں دار و رسن کو اس طرح دعوت دیتا ہے گویا اس کے انتظار میں برسوں سے بے چین گھڑیاں گذار رہا تھا، کبھی رات کی تنہائیوں میں اپنے رب کے حضور میں سر بسجود زار و قطار روتا اور یہ شعر پڑھتا سنائی دیتا ہے ؎

چہ بودے کہ دوزخ زمن پرشدے
مگر دیگراں را رہائی شدے

زمانہ جس طرح مادی سرگرمیوں میں ڈوبتا جاتا ہے، اس کی آنکھوں کی نمی بڑھتی جاتی ہے وہ انسان کو مقصد حیات سے آشنا کرنے کیلئے بے چین ہو جاتا ہے. جب انسانیت دم توڑتی نظر آتی ہے تو وہ اپنے دنوں کی تپش اور راتوں کا گداز اس کی بقا کے لئے جدوجہد میں صرف کرتا ہوا جان، جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہے ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

مولانا حسین احمد مدنی" اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، ان کے کام کی وسعت ایک ادارہ کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھی. ان کے افکار کی گیرائی ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکی تھی، ایسی تحریک جس نے ایک طوفانی دور میں مسلمانوں کی عظیم الشان علمی، تہذیبی اور روحانی قدروں کی پاسداری کی تھی، ان کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا ؎

ترا چہ آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید
چہ گنج ہائے سعادت زیان جان آمد

اگر تاریخ کے واضح اشاروں سے چشم پوشی نہ کی جائے تو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ مولانا مدنی' ہماری اس بزم رفتہ کے آخری رکن رکین تھے، جس کی صدر نشینی کبھی شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز نے کی تھی، یہ محض اتفاقی

بات نہیں تھی کہ وہ جب درس بخاری شروع کرتے تو پہلے شاہ ولی اللہ تک اپنی سند حدیث بیان کرتے تھے، ان کی زندگی اس چراغ کی آخری لو تھی، مدرسہ رحیمیہ نے جب دم توڑا تو فیروز شاہ کوٹلہ کی مسند علم و درس دیوبند کو منتقل ہو گئی اور ایک ایسے دور میں جب ذہن پژمردہ، مذہبی فکر ماؤف اور دینی بصیرت عنقا تھی انھوں نے اسلاف کا چراغ علم و عرفان تیز اور تند ہواؤں کے درمیان روشن رکھا، بڑے بڑے طوفان گھر گھر کر آئے لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ پیدا کر سکے، وہ عزم و عزیمت کی چٹان بنے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہے، ان کی ذات میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے سوز، مولانا رشید احمد گنگوہی کی استقامت، شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کی سرشاری اور مولانا محمود حسن کی بصیرت کا پرتو نظر آتا تھا، وہ خود کو "ننگ اسلاف" کہتے تھے، لیکن حقیقت میں ان کی ذات "فخر اسلاف" بن گئی تھی، وقت کا قافلہ جتنی تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا ہے، ان کے نقش پا اور روشن ہوتے جاتے ہیں اور ان کی ذات، علم و عمل اور سلوک کا ایک روشن مینارہ بن کر دعوت فکر و عمل دیتی نظر آتی ہے۔ ؎

سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ ام

کسی شخص کی عظمت و بزرگی کو جانچنے کا پہلا پیمانہ یہ ہے کہ وہ کیسا انسان ہے؟ جس دنیا میں انسان بڑھتے اور انسانیت گھٹتی جاتی ہو، وہاں اس سے زیادہ اہم پیمانہ اور ہو بھی کیا ہو سکتا ہے! پھر اگر کسی کے دینی مرتبہ کا اندازہ لگانا ہو تو گفتار و کردار میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جتنا زیادہ گہرا اثر ہو گا، اتنا ہی اس کا مرتبہ بلند اور انسانیت دل نواز ہو گی۔

سنت نبوی کے اتباع میں مولانا مدنی کی استقامت اور بہ حیثیت انسان، دردمندی

خلق اور تواضع ان کی سیرت کی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جن کو زمانہ آسانی سے بھلا نہ سکیگا کہ۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

تاریخ میں وہ ایک اور حیثیت سے بھی اپنا بلند مقام رکھتے ہیں، ان کی ذات میں وہ خصوصیات جمع ہو گئی تھیں جو قدرت شاذ و نادر ہی کسی وجود میں جمع کرتی ہے ایک ایسے زمانہ میں جب علم، عمل سے بیگانہ ہوتا جاتا تھا، خانقاہیں رات کے آغوش میں تسبیح و مناجات میں مصروف تھیں، لیکن زمانہ پکار رہا تھا کہ

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ نے وقت کی آواز کو سنا، سمجھا اور اس پر لبیک کہا، مدرسہ کو خانقاہ سے اور خانقاہ کو مدرسہ سے قریب لائے، ایک ہاتھ میں جام شریعت لیا دوسرے میں سندان عشق، چشتیہ سلسلہ کے سوز و گداز اور نقشبندیہ سلسلہ کی تہذیب و احتیاط، دونوں کو اپنا رہبر بنایا، دیوبند کا علمی رشتہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے اور روحانی رشتہ خواجہ معین الدین چشتیؒ سے اس طرح استوار کیا کہ دینی زندگی میں نئی توانائی پیدا ہو گئی، پھر جب آزادیٔ وطن کے لئے قربانی دینے اور قید و بند کے مصائب برداشت کرنے کا وقت آیا تو ایسے سرفروشانہ انداز میں سرگرم عمل ہوئے کہ شاملی کے جہاد کی صدائے بازگشت دیوبند سے مالٹا تک گونج اٹھی، وہ ایک کڑی ہیں اس عظیم الشان تحریک کی جو بالاکوٹ سے سید احمد شہیدؒ کی قیادت میں اٹھی اور شاملی میں نیا پیکر اختیار کر کے یاغستان کے پہاڑوں اور مالٹا کے بیابانوں تک پہنچی

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ ایک شخص بیک وقت روحانی زندگی

اور سیاسی زندگی کے تقاضوں کو اس طرح پورا کرسکا ہو کہ جیسے مولانا مدنیؒ۔ اس کا راز صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ ان کی ذات میں یہ دونوں زندگیاں ایک ہی مقصد کے تابع تھیں، ان کا عقیدہ تھا کہ رب کائنات سے جس نے اپنا رشتہ نہیں جوڑا وہ مقصد حیات سے بیگانہ رہا، جس نے غلامی کی زنجیروں کو نہیں توڑا اُس نے اپنے احساس اور خودداری کی دنیا کو ویران کردیا۔ عبادت انسان کی تخلیق کا مقصد ہے، اور آزاد زندگی اس کا پیدائشی حق، یہ دونوں ایک ہی نوع کی جہد وسعی کے دو رُخ ہیں، ان میں تضاد نہیں بلکہ مقصد کا اتحاد ہے، یہ دونوں انسان کو انسان بناتے ہیں اور اسکے پیکر خاکی میں وہ قوت بیدار کرتے ہیں جس کے بغیر وہ صحیح معنی میں خلیفۃ اللہ فی الارض کا مستحق نہیں ہوسکتا،

تلاش وجستجو کی نظر جب مولانا مدنیؒ کی زندگی کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے تو انسانیت، دلنوازی خلق، اور آفاقی فکر کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے، جس کا آب و رنگ چشتی خانقاہوں کا فیضان ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے پوچھا گیا کہ بہترین طاعت کیا ہے؟ فرمایا:

درماندگان را فریاد رسیدن

و حاجت بیچارگاں روا کردن و

گرسنگان را سیر گردانیدن

(سیر الاولیاء ص ۴۶)

پھر فرمایا، خدائے تعالیٰ اس کو عزیز رکھتا ہے جس میں دریا کی سی سخاوت، آفتاب کی سی شفقت اور زمین کی سی تواضع ہوتی ہے (سیر الاولیاء ص ۴۶)

یہ شان ربوبیت ہے کہ جب سورج افق پر نمودار ہوتا ہے تو محلوں اور جھونپڑوں دونوں کو یکساں سورج کی گرمی اور روشنی پہنچاتا ہے۔ دریا کی فیض بخشیاں اپنے، پرائے

کا امتیاز نہیں کرتیں، وہ امیر و غریب، عاصی و عابد، سب ہی کی تشنگی کو دور کرنے کے لئے بے چین رہتی ہیں، زمین کا دامن ہر ذی روح کو پناہ دینے کے لئے کھلا رہتا ہے جب تک انسان عملاً الخلق عیال اللہ کا قائل نہ ہو جائے وہ اس زمین پر اپنی خلافت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، اس کے پیش نظر ہمیشہ یہ رہنا چاہیے کہ ؎

بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء اپنی مجلسوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ بغیر کسی کو کھانے میں شریک کئے کبھی کھانا نہ کھاتے تھے بعض اوقات مہمان کی تلاش میں میلوں نکل جاتے، ایک دن ایک مشرک مہمان تھا اس کو شریک طعام کرنے میں ان کو کچھ تامل ہوا۔ وحی نازل ہوئی: "ابراہیم! ہم اس شخص کو جان دے سکتے ہیں اور تو کھانا نہیں دے سکتا!"

چشتیہ سلسلہ کی یہ تعلیم مولانا مدنی کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی انھوں نے اسی کی روشنی میں اپنی فکر و نظر کی دنیا بسائی تھی، ایک مرتبہ مولانا محمد الیاس نے ان سے کہا کہ مولانا مسلمانوں کے لئے دعا فرمایئے۔ فوراً فرمایا: کیا غیر مسلم مخلوق خدا نہیں؟ ــــــ یہ مرکزی نقطہ تھا اس فکر کا جو چشتیہ سلسلہ سے ان کو ملی تھی، ان کا عقیدہ تھا کہ خالق کائنات کی ربوبیت، انسان کو اعلیٰ انسانی مقاصد کی چاکری میں مصروف دیکھنا چاہتی ہے کیونکہ آفاقی نقطۂ نظر کے بغیر زندگی کی اعلیٰ قدریں بے جان رہتی ہیں، ان کے سماجی روابط کی بنیادیں، ان کی اجتماعی سیاسی جد و جہد کا پس منظر یہی تصور تھا، ان کا خیال تھا کہ جس طرح انسان کو زمین پانی اور سورج سے محروم نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اس سے آزادی نہیں چھینی جا سکتی، وہ سیاست میں اقتدار کی تمنا میں داخل نہیں ہوتے تھے، بلکہ ایک انسانی فریضہ کی بجا آوری کا جذبہ اس میدان

میں لے آیا تھا، ہندوستان میں صرف دو شخصیتیں ایسی ہیں جنھوں نے آزادی کے لئے
سب کچھ قربان کردینے کے باوجود اس سے فائدہ نہیں اٹھایا، جب آزادی کا خواب شرمندۂ
تعبیر ہوا تو گاندھی جی فرقہ واریت کی آگ کو بجھانے میں لگ گئے، مولانا مدنی رحمہ نے روحانی
اور اخلاقی قدروں کو بیدار کرنے میں اپنی بقیہ زندگی صرف کردی، سچ ہے ؎

قوموں کی تقدیر وہ مرد درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

اس مضمون میں مولانا مدنی رح کو بہ حیثیت محدث، مجاہد اور پیر طریقت دیکھنے
کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ان تینوں حیثیتوں پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب
ہے کہ بہ حیثیت انسان ان کی شخصیت و کردار کی بنیادی حقیقتیں سمجھ لی جائیں۔
انسان دوستی اور غم گساری سے مولانا مدنی رح کا خمیر تیار ہوا تھا، ان کی پوری
زندگی تفسیر ہے حالی کے ان اشعار کی ؎

چیست انسانی! تپیدن در غم ہمسائگان
از سموم نجد در باغ عدن پژماں شدن
خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس
در شبستان تنگ دل از محنت زنداں شدن

جو دنیا کے تمام گنہگاروں کو عذاب سے بچانے کے لئے خود دوزخ میں جانے کی
دعائیں مانگے، اسکے قلب کی وسعت ہمارے فہم و ادراک کی سرحدوں سے بہت
دور ہے، ابن بطوطہ نے دمشق کے ایک وقف کا ذکر کیا ہے کہ اس کی آمدنی اس
لئے وقف تھی کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو راحت پہنچانے میں صرف کی جائے، مولانا
مدنی رح کی زندگی خود ایک ایسا وقف بن گئی تھی جو دن رات دلوں کو راحت پہنچاتی

اور انسان کو اس کی حقیقی راحت کا راستہ دکھاتی تھی، احول کی برہمی کبھی ان کے دل پر بوجھ نہ بن سکی، نہ کبھی لب پر گلہ آیا، نہ کبھی دل میں شکوہ پیدا ہوا بلکہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی طرح شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ کے یہ شعر زبان پر آنے لگے:

ہر کہ مارا یار نبود، ایزد او را یار باد

و آنکہ مارا رنجہ دارد، راحتش بسیار باد

ہر کہ او در راہ ما خارے نہد از دشمنی

ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد

جب انسان اس منزل پر پہنچ جائے تو انسانیت خود اس پر ناز کرنے لگتی ہے،

مولانا مدنیؒ کی طبیعت کا انکسار اور ہر شخص کو، خواہ وہ ان کا مرید ہی کیوں نہ ہو، اپنے سے بہتر سمجھنا، صوفیہ متقدمین کی سیرت کی یاد تازہ کر دیتا ہے، ان کا انکسار، ان کی طبیعت کا حقیقی اظہار تھا، اس میں خود بینی کی خاموش دلفریبی کا گزر نہ تھا، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنے عزیز مرید شیخ سعدیؒ کو رخصت کرتے ہوئے ایک نصیحت کی تھی، جس میں انسانیت کی روح اور تصوف کی تعلیم کا عطر پیش کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

مرا پیر دانائے مرشد شہاب

دو اندرز فرمود بر روئے آب

یکے آنکہ بر غیر بد بیں مباش

دوم آنکہ بر خویش خود بیں مباش

"خود بینی" اور "بد بینی" کو مولانا مدنیؒ نے کبھی اپنی زندگی میں جھانکنے بھی نہیں دیا وہ ہمیشہ پاک دل، پاک ذات پاک صفات رہے، ہر شخص سے انتہائی انکسار

سے ملتے اور مریدوں کو ہدایت کرتے کہ لوگوں سے حسن اخلاق سے پیش آئیں ۔

(مکتوبات ج ۲ ص ۴۴)

بعض اوقات ایک ایک ہزار خطوط جمع ہو جاتے وہ انتہائی خندہ پیشانی اور دل نوازی کے ساتھ ایک ایک کا جواب دیتے، چشتی جماعت خانہ کی فضا ان کے مہمان خانے میں ہوتی، مریدوں سے ایسے گفتگو کرتے گویا خود ان کی دعاؤں کے محتاج ہیں، کسی نے سچ کہا ہے ؎

فروتنی است دلیل رسیدگان کمال
کہ چوں سوار بہ منزل رسد پیادہ شود

علمی زندگی

مولانا مدنی رح کی علمی زندگی کے سرچشمے دو تھے، دیوبند اور حجاز مقدس، آج سے تقریباً سو سال قبل ۱۳۰۹ھ میں جب انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں قدم رکھا تو شیخ الہند رح کی فراست دینی نے محسوس کیا کہ

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

انھوں نے کم و بیش نصف صدی تک براہ راست یا بالواسطہ اس گلشن علم و عرفان کی آبیاری کی اور متعلم اور معلم دونوں حیثیتوں سے ممتاز رہے، جن اساتذہ کے سامنے انھوں نے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا ان کے نام "نقش حیات" میں بڑے احترام سے درج کئے ہیں، لیکن ان کے ذہنی نشو و نما اور علمی تربیت کا سہرا حقیقتاً شیخ الہند مولانا محمود حسن رح کے سر ہے، مولانا مدنی رح نے خود بھی ان کو اپنی علمی زندگی کا منبع فیض قرار دیا ہے ۔

(نقش حیات ص ۱۵۴)

پھر حجاز کے قیام نے مولانا مدنیؒ کی علمی زندگی، ان کے افکار و جذبات، ان کی سیرت و کردار پر وہی اثر کیا جو سونے پر سہاگہ کرتا ہے۔ وہاں انھوں نے اُس وقت کے مشہور ادیب اور عالم شیخ آفندی عبدالجلیل برادہ سے اکتساب فیض کیا، دیار رسول صلعم کے روز و شب نے ان کو عشق رسول کی شکل میں مقصد کی تپش عطا کی، ہندوستان کی علمی اور دینی تاریخ کی یہ حقیقت کبھی بھلائی نہیں جا سکتی کہ بعض مشاہیر علماء و مشائخ جنھوں نے اپنی زندگیاں علوم اسلامی کی تجدید و احیاء کے لئے وقف کر دی تھیں، حجاز مقدس ہی میں انھوں نے اپنی زندگی کا چراغ جلایا تھا اور وہیں سے ایک بیدار ملی شعور اور متحرک علمی دلولہ لے کر آئے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رہ اور شاہ ولی اللہ دہلوی رہ کی دینی فکر اور خدمت حدیث کا جذبہ حجاز کی آب و ہوا میں پرورش پایا تھا اس ارض مقدس سے ان کو وہ قوت ملی جس نے ان کی زندگی کو با مقصد، ان کے افکار کو تابندہ اور ان کے عزائم کو پائندہ بنا دیا تھا، وہاں انھوں نے یہ محسوس کیا کہ

چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُر ناب

مولانا مدنیؒ وہاں بہ حیثیت طالب علم بھی رہے، اور وہاں درس بھی دیا، اس طرح ان کے دل و دماغ پر پوری طرح اس حجازی ماحول کا، جس پر اسلامی زندگی اور اسلامی علوم دونوں کی تاب و توانائی کا انحصار ہے، گہرا اثر قائم ہو گیا، ان کی درس و تدریس کی عظیم الشان صلاحیت نے حجاز مقدس میں بھی اپنا لوہا منوا لیا مولانا عاشق الٰہی مرحوم "تذکرۃ الرشید" میں لکھتے ہیں۔

"مولانا حسین احمد صاحب کا درس بحمد اللہ حرم نبوی میں بہت عروج پر ہے اور عزت و جاہ بھی حق تعالیٰ نے وہ عطا فرمایا ہے کہ

ہندی علمار تو کیا، یمنی اور شامی بلکہ مدنی علمار کو بھی وہ بات حاصل نہیں"

کسی عالم دین کی غیر معمولی علمی صلاحیتوں کے لئے اس سے بڑی سند نہیں ہوسکتی کہ اہل زبان اس کے علمی تبحر کو خراج عقیدت پیش کریں۔

شیخ الہند رح نے ان کو وصیت کی تھی کہ "پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہیے چاہے ایک دو ہی طالب علم ہوں" چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی میں درس و تدریس کو کبھی ترک نہیں کیا۔ بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ ان کے تلامذہ کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ ہے (تذکرہ مشائخ دیوبند، مفتی عزیزالرحمٰن ص ۳۸۶) ایک اندازے کے مطابق ۱۳۴۶ھ سے ۱۳۷۷ھ تک ۶۶۳۰ طلبار فارغ التحصیل ہوئے جن میں سے ۳۸۵۶ مولانا مدنی رح کے شاگرد تھے (الجمعیۃ، مضمون قاری محمد میاں ص ۱۰۹)

مولانا مدنی رح نے حدیث کے درس میں گو بیشتر اپنے اساتذہ کی روش ہی کا اتباع کیا، لیکن بعض پہلوؤں کو خاص طور پر اجاگر کرکے ایک نئے طرز تعلیم کی بنیاد ڈالی، ان کی مجتہدانہ بصیرت نے علوم دینی بالخصوص حدیث کی تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھالا کہ وہ وقت کے تقاضوں کو پورا کرسکے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح نے مشکوۃ کا انتخاب کیا تھا کہ اس سے بعض ان فتنوں کا سدباب ممکن تھا جو اکبری دور میں پیدا ہوگئے تھے، شاہ ولی اللہ دہلوی رح نے موطا کو اپنے درس میں اہمیت دی تاکہ وہ اجتہادی روح بیدار ہوسکے جو حجاز کے ماحول میں پرورش پائی تھی اور جس کے ذریعہ نئی فکری اصلاحیں عمل میں آسکیں اور اجتہاد کی صحیح راہ دینی فکر کی روشنی میں تلاش کی جاسکے۔

مولانا مدنی رح نے اپنے دور کے دینی رجحانات پر غور کیا، بالخصوص فقہ سے بڑھتی ہوئی دوری کو محسوس کیا، اور اپنے نظام تعلیم کو اس طرز پر ڈھالا کہ اس سے فقہ کی عظمت، حدیث کی روشنی میں مضبوط بنیادوں پر قائم کی جاسکے، فکری بحران

کے زمانہ میں تقلید ہی دینی نظام کے ڈھانچے کو برقرار رکھ سکتی ہے، چنانچہ ترمذی کا انتخاب اسی مصلحت پر مبنی تھا، حدیث کے سلسلہ میں ان کے بعض بنیادی تصورات اور کیفیات کو سمجھ لینا ضروری ہے،

(۱) درس حدیث کا معاملہ ان کے لئے اسناد، اسماء الرجال، استنباط و استدلال تک محدود نہ تھا، وہ حدیث کے چراغ سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں روشنی حاصل کرنے کے خواہش مند تھے، ان کے درس حدیث میں عشق رسول کا والہانہ جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا، دورۂ بخاری کی آخری شب میں در و دیوار سے کیفیت ٹپکنے لگتی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زمان و مکان کی ساری پہنائیاں سمٹ گئی ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے سب اسی ماحول میں پہنچ گئے ہیں، جہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس شمع محفل بنی ہوئی ہے، جن بزرگوں کو ان کے دورۂ حدیث میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی ہے آج بھی ان روز و شب کی یاد اُن کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دیتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا مدنی رہ نے درس حدیث کے ذریعہ ذات نبوی سے تعلق پیدا کرنا اور اتباع سنت کے جذبات کو بیدار کرنا اپنی تعلیمی جد و جہد کا مقصد و منہاج بنا لیا تھا۔

(۲) مولانا مدنیؒ نے جن اسباب کی بنا پر ترمذی کو اپنے نصاب تعلیم میں مرکزی حیثیت دی تھی وہ بے حد اہم تھے، ویسے تو مولانا رشید احمد گنگوہی رہ بھی ترمذی کے بہت قائل تھے، ان کے افادات "الکوکب الدرّی" کے نام سے مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ نے جمع کر دیئے ہیں، شیخ الہند کے ساتھ مالٹا میں بھی ترمذی اور مشکوٰۃ تھیں لیکن مولانا مدنی رہ نے اس کو خصوصی طور پر اپنے درس کے لئے منتخب کیا تھا، اور یہ فیصلہ ترمذی کی بعض غیر معمولی خصوصیات پر مبنی تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ترمذی میں رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور زندگی

ایک عجیب متحرک انداز میں نظر آتی ہے۔ تذکرۃ الحفاظ (ج ۲ ص ۲۰۸) میں ہے کہ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ۔۔

من کان فی بیتہ ھذا الکتاب فکانما فی بیتہ نبی یتکلم۔

یعنی جس کے گھر میں یہ کتاب موجود ہو، اسکے گھر میں گویا نبیؐ بول رہا ہے، ظاہر ہے کہ ترمذی کی یہ کیفیت مولانا مدنیؒ کے احساسات کی پوری ترجمان تھی اور ان کا اس سے لگاؤ بالکل قدرتی امر تھا، گو ترمذی کو بخاری اور مسلم کے بعد کا درجہ دیا گیا ہے لیکن بقول شاہ ولی اللہ صاحبؒ، اس میں بخاری، مسلم اور ابو داؤد تینوں کی اچھی خصوصیات جمع ہو گئی ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۱۲۱)

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ تو بستان المحدثین میں لکھتے ہیں کہ

۔ ایں جامع ترین آں کتب است بلکہ بہ بعضے وجوہ وحیثیات از جمیع کتب خوبتر واقع شدہ۔

جہاں تک علمی اور افادی پہلو کا تعلق ہے یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ بعض نئے مذہبی رجحانات جو مکتب خیال سے بڑھ کر فرقوں کی حیثیت اختیار کر رہے تھے، براہ راست فقہ حنفی کو مجروح کرنے لگے تھے، ترمذی کا مطالعہ اس صورت حال کی مدافعت کے لئے بہترین ذریعہ تھا، شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے، کہ جامع ترمذی مجتہد کیلئے کافی اور مقلد کے لئے دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے اور اس کی وجہ بتاتے تھے کہ اس میں مختلف ائمہ کے فقہی مذاہب، ان کے دلائل اور استنباط کو جمع کر کے ان کی مناسب شرح بھی کر دی گئی ہے، شیخ الاسلام اسمٰعیل ہروی کہا کرتے تھے کہ ترمذی، بخاری اور مسلم سے زیادہ نفع بخش ہے، ان دونوں کتابوں سے صرف صاحب نظر و کمال ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن ترمذی سے ہر طبقہ کے لوگ مستفید ہو سکتے ہیں۔ (مقدمہ احوذی)۔ اس کی ترتیب ابواب فقہ کے طرز

پر ہے اور آخر میں نہایت مفید کتاب العلل بھی شامل ہے

(۳) حدیث کے چھوؤں مشہور مجموعوں، صحاح ستہ کے مصنفین مسلکاً شافعی تھے اس لئے فقہی مسائل میں حنفی مسلک کی تائید کے لئے علم حدیث بالخصوص صحاح پر غیر معمولی نظر کی ضرورت تھی، مولانا مدنیؒ کا کمال یہ تھا کہ ان مجموعوں ہی سے حنفی فقہ کی تائید کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔

(۴) دورۂ حدیث میں مولانا مدنیؒ نے مذاہب اربعہ سے بحث کو ضروری قرار دیدیا تھا، یہ فیصلہ گو شاہ ولی اللہ کی روش سے مختلف تھا لیکن مصلحت وقت کے عین مطابق تھا، اس وقت بعض مذہبی تحریکیں مذاہب ائمہ کی مخالفت پر آمادہ تھیں اور ان کی عظمت کو کم کرنے کیلئے مختلف تدابیر اختیار کر رہی تھیں، اس صورت حال کا مقابلہ صرف ترمذی ہی کے ذریعہ ممکن تھا جو طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلنے والے ہوتے ان کے ذہنوں پر فقہ کی عظمت اسی طرح نقش کی جا سکتی تھی

مولانا مدنیؒ میں فقیہانہ بصیرت اور ژرف نگاہی بے پناہ تھی، وہ رائے کے اظہار سے پہلے مسئلہ کے ہر پہلو پر غور کرتے تھے، اور بعض اوقات ان کا فیصلہ تعجب خیز معلوم ہوتا، لیکن اس کی مصلحت بعد کو واضح ہو جاتی، فقیہانہ بصیرت ایک بالکل علیحدہ خصوصیت ہے جو علم کی پیداوار ضرور ہے لیکن اس سے بہت ماوراء ہے، مولانا مدنیؒ کے فقیہانہ کارناموں پر تفصیلی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

(۵) معلم کی حیثیت سے مولانا مدنیؒ کا ایک امتیاز یہ تھا کہ وہ دورۂ حدیث کے طلباء جو ان کے درس میں شرکت کرتے تھے ان کی تعداد دو سو سے زائد ہوتی تھی وہ ایک ایک طالب علم کا نام یاد رکھتے تھے، جو لوگ درس و تدریس کا تجربہ رکھتے ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کام کتنا دشوار ہے اور غیر معمولی قوت حافظہ ہی اس کا احاطہ کر سکتی ہے، ان کی تنبیہ میں محبت اور ان کی سختی میں تربیت کے پہلو پنہاں

ہوتے تھے، انھوں نے تعلیم کے ساتھ تربیت کو بھی اہمیت دی، اور علم کا رشتہ عمل سے کبھی ٹوٹنے نہیں دیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ جو علم سیرت و کردار، فکر و عمل پر اثر انداز نہ ہوسکے اس سے جاہل رہنا بہتر ہے۔

(۶) مدینہ منورہ کے علمار دوران تدریس کتاب ہی نہیں بلکہ شروح و حواشی بھی سامنے رکھتے تھے، مولانا مدنی رہ کا طرز یہ تھا کہ کتاب خود اپنے سامنے نہ ہوتی تھی بلکہ طلبار سے پڑھواتے تھے، بعض لوگوں نے اس کو خیرآبادی طرز تعلیم سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن دونوں میں محرکات کا بہت بڑا فرق ہے، خیرآبادی علمار نے جوش استدلال میں یہ انداز اختیار کیا تھا، مولانا مدنی رہ کے یہاں یہ طرز وفور علم کی پیداوار تھا، ان کا مطالعہ حدیث اس منزل پر پہنچ چکا تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے بھی متون کا درس دے سکتے تھے، جب کسی حدیث کی تشریح کرتے تو اس کے سیاق و سباق، اسناد و رجال، اس طرح ذہن میں مستحضر ہوتے گویا چشم تصور میں کتابیں کھلی ہوئی ہیں۔

(۷) مولانا مدنی رہ کی مصروف زندگی نے ان کو حدیث سے متعلق کسی تصنیف کا موقع نہیں دیا، لیکن اگر ان کے تلامذہ جنھوں نے ان کے درس کے باقاعدہ نوٹس لئے ہیں ان کو ایک جگہ "افادات شیخ الاسلام" کے نام سے جمع کر دیں تو یہ خود ایک عظیم خدمت ہوگی، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی تفسیر عزیزی کچھ اسی طرح مرتب ہوئی تھی، بخاری ترمذی وغیرہ سے متعلق بعض شرحیں اسی نوعیت کی ہیں، ممکن ہے کہ اس طرح وہ روانی اور ربط نہ پیدا ہوسکے جو ایک مصنف ہی اپنی تصنیف میں پیدا کر سکتا ہے، لیکن اس کی افادیت بہرحال اپنی جگہ مسلم رہے گی ؎

کس بمیداں نمی آید سواراں را چہ شد

سیاسی جد وجہد:۔

مولانا مدنیؒ کے سیاسی افکار اور ان کی سیاسی جد وجہد کے بنیادی خطوط کا مطالعہ ان کے دو بیانات کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ پہلا ۱۹۲۱ء کا وہ بیان جو کراچی کی عدالت میں انھوں نے دیا تھا، دوسرا وہ بیان جو اکیس سال بعد ۱۹۴۲ء میں مراد آباد کی عدالت میں ہوا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں کراچی کے مقدمہ میں انھوں نے مذہبی حیثیت سے اپنی جد وجہد کا جواز پیش کیا تھا، اور جب ان کے جوش قربانی نے دار ورسن کو اس طرح دعوت دی تھی کہ

"اگر لارڈ ریڈنگ اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کو جلا دیں، حدیث شریف کو مٹا دیں اور کتب فقہ کو برباد کر دیں تو سب سے پہلے اسلام پر جان قربان کرنے والا میں ہوں"

تو مولانا محمد علیؒ بے اختیار ان کے قدموں پر گر پڑے تھے (کراچی کا تاریخی مقدمہ ج ۱ ص ۱۲۵) کراچی جیل میں ان کے ہاتھ ہتھکڑیوں اور پیر بیڑیوں سے بوجھل تھے جوار کا پتلا دلیہ کھانے کو ملتا تھا، لیکن عزم وہمت کا یہ عالم تھا کہ ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنے مسلک پر قائم رہے اور سامراجی قوتوں کو متنبہ کیا کہ قوت سے جسموں کو پارہ پارہ کیا جا سکتا ہے لیکن دلوں کو زنجیریں نہیں پہنائی جا سکتی۔ فرماتے ہیں۔

"مادی قوت لپٹ مارنے والے شعلہ کو دبا سکتی ہے مگر دلوں میں سلگنے والی آگ کو نہیں بجھا سکتی" (ج ۲ ص ۱۶۹) ان کے ذوق سرفروشی نے ہندوستان کے مسلمانوں کو قربانی اور عزیمت کا وہ سبق پڑھایا جس سے ملک کی آزادی کی تحریک ایک درہی منزل پر پہنچ گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ ع

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی

اپریل ۱۹۴۲ء کے بیان میں انھوں نے مسئلہ کو دوسرے ہی انداز سے دیکھا ہے، یہاں آزادی کے لئے اقوام کی جدوجہد، ہندوستانیوں کی متحدہ کوشش کی ضرورت اور تاریخ سے ہندو مسلم اتحاد کی مثالیں پیش کی ہیں۔

اگر ان محرکات ذہنی کا تجزیہ کیا جائے جو مولانا مدنی کو سیاسی میدان میں لے گئے تو اندازہ ہوگا کہ یہ وقتی جذبات و احساسات نہیں تھے بلکہ اس کے پیچھے ایسے عوامل کام کر رہے تھے جن کی جڑیں تاریخ میں بہت دور تک چلی گئی تھیں۔

سب سے پہلا اثر ان پر اپنے باپ کا تھا، وہ ایک انتہائی دینی سرشاری کی حالت میں یہ شعر پڑھتے ہوئے ؎

بصارت تیز کرتی ہے حبیب اس کوچہ کی مٹی
دل وجاں خانماں سب بیچ وہ سرمہ لگانا ہے

ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے، اور وہاں مہینوں تک ایک وقت کھچڑی اور ایک وقت نمکین بیجھ پر ان کے پورے کنبے کا گذارا ہوتا تھا (نقش حیات ج ۱ ص ۳)
انھوں نے ایک بار اپنی اولاد کو جمع کر کے فرمایا تھا،

"میں نے تم سبھوں کو اس لئے پرورش کیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں جہاد کرو اور کچھ کر کے شہادت حاصل کرو (نقش حیات ج ۱ ص ۴)

باپ کی یہ نصیحت مولانا مدنی کے دل و دماغ میں اتر گئی۔ ان کے ذوق سرفروشی کی بنیاد باپ کی یہی وصیت تھی۔

(۲) دوسرا اثر تاریخ کے مطالعہ کا تھا، اسکول میں ان کو تاریخ اور جغرافیہ سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی، اسی مطالعہ نے ان کے اندر سیاسی شعور بیدار کیا، انھوں نے انگریز مورخین اور مصنفین مثلاً سر ولیم ڈگبی (ALEXANDER HAMILTAN) وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے بغور مطالعہ کئے تھے۔ برطانوی تسلط

سے ملک کی فارغ البالی جس طرح تباہ ہوئی اور یہاں کے عوام معاشی بدحالی کا شکار ہو گئے اس کا پورا نقشہ ان کی تاریخی بصیرت نے کھینچ لیا تھا اور اس سلسلہ کے بے اندازہ اعداد و شمار ان کے حافظے میں محفوظ ہو گئے تھے، لکھتے ہیں

ہندوستان کی پرانی تاریخی عظمتوں اور جغرافیائی قدرتی ہمہ گیر برکتوں نے نہایت گہرا اثر کیا اور اہل ہند کی موجودہ بے کسیوں کا اثر روز افزوں ہوتا رہا۔

اس نوع کے مطالعہ کی افادیت کا ان کو اتنا احساس ہو گیا تھا کہ ۳۶-۱۳۳۵ھ میں انھوں نے ہفتہ میں ایک دن (روز شنبہ) عصر سے مغرب تک تاریخ، اقتصادیات و سیاسیات پر لیکچر کے لئے مقرر کر دیا تھا تاکہ طلبا، حالات گرد و پیش سے ناآشنا نہ رہیں۔

تاریخ کا علم انھیں سیاست کے میدان میں لایا، مذہبی جذبے نے ان کے قدم مضبوط کئے، اور مشائخ سلسلہ کی روایات نے ان کے قلب و جگر کو گرمایا ۱۹۵۰ء میں جب میں نے "شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے سیاسی مکتوبات" کا ایک نسخہ انکی خدمت میں بھیجا تو انھوں نے اپنے مکتوب گرامی میں بڑی مسرت کا اظہار کیا اور لکھا کہ شاہ ولی اللہ رح کے متعلق ان واقعات کا ہم کو علم نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی خوشی کا باعث یقیناً یہ بھی جذبہ تھا کہ وہ جس مسند علم پر متمکن تھے، اس کی روایات کا مطالبہ وہی تھا جو وہ خود کر رہے تھے، شاہ ولی اللہ رح کا عمل بڑی سے بڑی سند تھی جو ان کو مل سکتی تھی اپنی جہد و سعی کے جواز میں۔

(۳) سید احمد شہید رح کی تحریک نے جس طرح سارے ملک میں احیاء دینی کی روح بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضوں سے آشنا کیا تھا اور قومی جذبات کو یہ کہہ کر آواز دی تھی کہ "تاجران متاع فروش" اور "بیگانگان

بعید الوطن "سے ملک کو آزاد کیا جائے اور ان کی جماعت جو "اہل فقر و مسکنت" پر مشتمل ہے وہ۔

"ہرگز ہرگز از دنیا داران جاہ نیستند"

مولانا مدنی رح کی ذات میں تحریک کی یہ روح سما گئی تھی، انھوں نے پورے مجاہدانہ عزم کے ساتھ سیاسی جنگ میں حصہ لیا۔ اور جب وہ مقصد حاصل ہو گیا تو عملاً "از دنیا داران جاہ نیستند" کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی مسند درس کی طرف لوٹ گئے، کہتے ہیں کہ جب مولانا سید احمد شہید رح دیوبند کے علاقے سے گذرے تھے تو فرمایا تھا۔ یہاں سے علم کی بو آتی ہے " (علمائے حق حصہ اول ص ۲)

مولانا سید احمد شہید رح کی تحریک نے مولانا مدنی رح کے بزرگوں کے قلب و جگر کو بھی گرمایا تھا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح کے پیر شیخ نور محمد جھنجھانوی رح کے پیر شاہ عبدالرحیم شہید رح سید احمد شہید رح کی جماعت مجاہدین کے اہم رکن تھے حاجی صاحب رح کے مرشد اول مولانا سید نصیر الدین دہلوی رح کا بھی جماعت سے گہرا تعلق تھا، اس طرح جہاد کی وہ روح جس کی تمنا میں مومن جیسا شاعر پکار اٹھا تھا۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

ان بزرگوں کی رگ و پے میں موجزن تھی؛ بالاکوٹ کی چنگاری سے شاملی کا شعلہ بھڑکا، شاملی ہماری تحریک آزادی میں ایک منزل ہے جہاں ہمارے قافلے نے بظاہر شکست لیکن حقیقتاً فتح پائی تھی، میاں جی نور محمد جھنجھانوی رح کے خلیفہ حافظ ضامن شہید رح نے یہاں خدمت دار و رسن انجام دی تھی۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح، مولانا رشید احمد گنگوہی رح، مولانا محمد قاسم نانوتوی رح سب نے انگریزی تسلط کے خلاف عملاً حصہ لیا تھا، یہ سب روایات

مولانا مدنی" کو نہ صرف عزیز تھیں بلکہ ان کی شخصیت کا اس طرح جزو بن گئی تھیں کہ ان کا ریشہ ریشہ پکارتا تھا ؎

عمر یست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

(۴) چوتھا اہم محرک جس نے مولانا مدنی رہ میں سیاسی جد و جہد کی ضرورت کا احساس بیدار کیا اور ان کے ذہنی افق میں وسعت پیدا کی وہ ممالک اسلامیہ، عرب مصر اور شام وغیرہ کے حالات کا جائزہ تھا۔ خود لکھتے ہیں۔

"میں نے دیکھا کہ یوروپین، ایشیاٹک، افریقنس آزاد اقوام کس طرح اپنی آزادی کے گیت گاتی ہیں اور اس کے لئے ہر قربانی کو ضروری سمجھتی ہیں، ان امور کے مشاہدہ کی بنا پر مجھ میں وہ قومی جذبات پیدا ہونے ضروری تھے کہ جن کے ہوتے ہوئے میں ہندوستان کی محبت اور اس کی آزادی میں بیش از بیش سعی اور جد و جہد میں کوتاہی کو روا نہ رکھوں"

(۵) پانچواں سبب ایک مہینہ مصر میں حیزہ کے سیاسی قید خانہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن رہ کے ساتھ قیام تھا، اس قید خانہ میں مصریوں کا آزادی پسند طبقہ مقید تھا، ان کی صحبت میں جذبہ آزادی کی پرورش کا سامان فراہم ہوگیا۔

(۶) چھٹا محرک مالٹا کی اسارت تھی، اس نے ان جذبات کو تیز تر کر دیا جب مالٹا میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے تو وہاں بھی اتفاق سے یورپ اور ایشیا کے چوٹی کے سیاسی اور فوجی لوگ مقید تھے، ڈیڑھ ہزار جرمن، ڈیڑھ ہزار اسٹرین، بلگیرین، ترک عرب وہاں تھے چار سال تک (۱۹۱۸ء - ۱۹۱۵ء) تک ان لوگوں سے صحبت رہی اور ان کے جذبات حریت میں ایک مستقل حرکت اور

بے چینی پیدا ہو گئی
(۷) ساتواں سبب شیخ الہندؒ کی صحبت کا اثر تھا، خود مولانا مدنیؒ نے اپنی علمی اور سیاسی زندگی کا حقیقی سرچشمہ ان ہی کو قرار دیا ہے، شیخ الہندؒ نے جب ملک کی آزادی کے لئے افغانستان میں اپنی خفیہ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور ریشمی خطوط غالب نامہ وغیرہ کے واقعات پیش آئے، اس وقت مولانا مدنیؒ نے کافی عرصہ افغانستان میں رہ کر مجاہدانہ خدمات انجام دیں، مدینہ منورہ میں مولانا مدنیؒ نے انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقاتیں کیں اور تقریر بھی کی، ۱۹۲۰ء میں جب علی گڈھ کے طلباء نے شیخ الہند سے ترک موالات کا فتویٰ حاصل کیا تھا تو انھوں نے فرمایا تھا۔

"جو فرض شرعی قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے تو اسکے ادا کرنے میں ذرہ بھر تاخیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے"

انھوں نے تعاون و موالات کو "اعتقاداً و عملاً" ترک کرنے اور سرکاری اسکولوں سے تعلق منقطع کرنے اور صرف ملکی اشیاء و مصنوعات کے استعمال کرنے کا مذہبی جواز پیش کیا تھا، شیخ الہندؒ کی یہ آواز جب انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک آگ کی طرح پھیل گئی تھی تو ناممکن تھا کہ مولانا مدنیؒ کے لئے جہد و سعی کا ایک نیا میدان نہ پیدا کر دے۔

یہ تھے وہ محرکات جنھوں نے مولانا مدنیؒ میں سیاسی احساس بیدار کیا اور جذبات حریت کو بھڑکایا، جب ۱۹۱۹ء میں وہ مالٹا سے ہندوستان واپس آئے تو رولٹ ایکٹ جلیانوالہ باغ کے واقعات پیش آچکے تھے، برطانوی سامراج نے اپنی پوری قوت جذبات آزادی کو کچلنے ہی میں لگا دی تھی، تحریک خلافت اور ترک موالات میں مولانا مدنیؒ نے عزم و ہمت کے ساتھ حصہ لیا، اور پکارا۔

"تمام افراد کو اسی مطالبہ اور اسی مقصد پر ثابت قدم رہنا چاہیئے،
خلافت آزاد ہو، جزیرہ عرب آزاد ہو، ہندوستان آزاد ہو، پنجاب کے
مظالم کی تلافی ہو۔

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

(سرگذشت مولوی حسین احمد مہاجر مدنی اسیر مالٹا ص ۵۲)

یہ شعر ان کے جذبات کا مکمل ترجمان ہے، اب حصول مقصد کے لئے انھوں نے جان کی بازی لگا دی تھی، اور سر بکف میدان میں آ گئے تھے۔

مولانا مدنی کا یہ محکم خیال تھا کہ آزادی کی جنگ ہندو مسلمان دونوں کو شانہ بہ شانہ لڑنی چاہیئے، شیخ الہند نے جمعیۃ العلماء کے اجلاس منعقدہ دہلی کے خطبہ میں فرمایا تھا۔

"استخلاص وطن کے لئے برادران وطن سے اشتراک عمل جائز ہے
مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو"

اسی پر مولانا مدنی نے اپنی سیاسی زندگی کی بنیاد رکھی ۱۹۲۲ء میں مراد آباد کی عدالت میں بیان دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا۔

"میرا عقیدہ ہو گیا تھا کہ فرقہ داری کی تنگ وادیوں سے نکل کر تمام
ہندوستانی قوم اور جملہ باشندگان ہند کو آزاد ہونا از بس ضروری ہے
میں نے بیرونی ممالک میں مشاہدہ کیا تھا کہ دیگر ممالک میں ہندوستانی
خواہ مسلمان ہوں یا ہندو یا سکھ یا پارسی وغیرہ وغیرہ ایک ہی نظر
حقارت سے دیکھے جاتے ہیں، اور سب کو نہایت ذلیل غلام کہا
جاتا ہے۔

اپنے اُس سیاسی مسلک پر جو انھوں نے اپنی زندگی کے بہت ہی ابتدائی سالوں میں طے کرلیا تھا وہ آخر دم تک مضبوطی سے قائم رہے۔

مولانا مدنی رح کی سیاسی جدوجہد، تحریک آزادی میں ان کی قربانیوں، مالٹا مصر، یاغستان میں ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی پوری تفصیل اب تک سامنے نہیں آئی۔ "نقش حیات" میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی منکسرانہ فطرت، دراخفار راز کے جذبے نے اُن کا قلم روک لیا ہے اور اپنے کارناموں کی تفصیل بیان کرنے پر اپنی طبیعت کو آمادہ نہیں کرپاتے، ضرورت ہے کہ اس موضوع پر مستقل تحقیق کے بعد ایسی تصنیف تیار کی جائے جس میں ان کی تقریروں کے علاوہ ان کے خطوط اور وہ نوٹس بھی شامل ہوں جو انھوں نے برطانوی عہد کی پیدا کی ہوئی اقتصادی بدحالی کے متعلق جمع کئے تھے، برطانوی اقتدار کے خلاف جذبات ابھارنے میں ان معلومات کا بڑا حصہ تھا، مولانا سید محمد میاں صاحب کے بیان کے مطابق انھوں نے اخبارات سے جو یادداشتیں جمع کی تھیں (ان کا) بیش بہا ذخیرہ ہزارہا صفحات کا اس وقت حضرت موصوف کے پاس موجود ہے" (علمائے حق ص ۱۹۱) مدینہ منورہ میں قیام کے زمانہ میں انھوں نے جس طرح لارنس کی تحریک سے باشندگان دیار نبی کو محفوظ رکھا اس کی تفصیل بھی ان کی سیاسی جدوجہد کا ایک اہم حصہ ہے۔ ان تمام کارناموں کو اب تفصیل کے ساتھ آنا چاہیے۔

نظام اصلاح وتربیت

مولانا مدنی رح کی روحانی شخصیت کی تعمیر میں جو عوامل واثرات کارفرما رہے ان کا تجزیہ کچھ اس طرح کیا جاسکتا ہے، اُن کا خاندان مشائخ کا خاندان تھا، اُن کے مورث اعلیٰ شاہ نورالحق صاحب کی روحانی عظمت اور بزرگی کے شاہ فضل رحمٰن

صاحبؒ بھی قائل تھے (نقش حیات)

انیسویں صدی کے ہندوستان کی دو عظیم المرتبت روحانی شخصیتوں ــــ شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ، اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ ــــ سے اُن کا روحانی رشتہ تھا۔ اگر ہندوستان میں ان علمی اور دینی تحریکوں کا جائزہ لیا جائے جنھوں نے انیسویں صدی میں اپنے اثرات بہت دور تک پھیلا دیئے تھے، تو ان سب کا منبع و مخرج یہی دو شخصیتیں نظر آئیں گی، حقیقت یہ ہے کہ جو قوم ایسی برگزیدہ اور ہونہار و زرخیز (AEMINAL) شخصیتوں کو جنم دے سکے، اس کے متعلق یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اس کی روحانیت کا چشمہ دور انحطاط میں سوکھ گیا تھا،

مولانا مدنیؒ کے والد، شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ کے عزیز مرید اور خلیفہ تھے، انھوں نے جو اعمال و اذکار اپنے مرید مولوی حبیب اللہ کو بتائے تھے ان سب کی اجازت انھوں نے مولانا مدنیؒ کو ۱۳۲۷ھ میں دیدی تھی

(نقش حیات ص ۴۵)

یہ روحانی تعلیم و تربیت کی خشت اول تھی جو رکھی گئی، حجاز میں مولانا مدنیؒ نے کچھ وقت، گو مختصر ہی، حاجی صاحبؒ کی خدمت میں گزارا تھا، پھر مولانا گنگوہیؒ کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے، لکھتے ہیں کہ ان کی خدمت میں ڈھائی مہینہ سے زیادہ رہنا نصیب نہیں ہوا (مکتوبات ص ۳۰) مگر ان کی حیثیت وہی تھی جو شیخ بہار الدین زکریا ملتانیؒ کی شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے یہاں ـ کہ چند دن ان کی خدمت میں رہ کر سب کچھ حاصل کر لیا، اور جب لوگوں نے تعجب کا اظہار کیا تو شیخ سہروردیؒ نے فرمایا کہ وہ خشک لکڑی کے مانند آئے تھے فوراً آگ پکڑ لی۔

شیخ گنگوہیؒ نے ان کو چاروں مشہور سلسلوں چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ سہروردیہ ــــ میں بیعت کرنے کی اجازت دی تھی، اور اس کا سبب یہ بتایا تھا کہ ایک سلسلہ میں بیعت ہو کر اسی سلسلہ کی تفضیل اور ترجیح بلکہ غلو میں مبتلا ہو جاتے ہیں (مکتوبات ص ۲۸۱)

مولانا مدنیؒ پر چشتیہ سلسلہ کا رنگ غالب رہا، ان کے ذریعہ ویسے تو چشتیہ سلسلہ کی اشاعت سارے ہندوستان میں ہوئی، لیکن مشرقی علاقوں بالخصوص آسام اور بنگال میں ان کا فیض بہت پھیلا، ان کے خلفاء کی تعداد ۱۶۷ تھی جس میں سو سے زائد آسام اور بنگال کے تھے۔ ۲ر شوال ۱۳۷۶ھ کو عاصم گنج آسام میں انھوں نے ایک مجلس میں ۷، ۸ ہزار آدمی کو بیعت کیا تھا (الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن۔ ۲۷ر مئی ۱۹۵۷ء) روحانی رہبر کی حیثیت سے مقبولیت کی ایسی مثال اس دور میں نہیں ملتی۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے علم، عمل اور اخلاص ــــ ان تین ستونوں پر اپنی تعلیم و تربیت کی بنیاد رکھی تھی ــــ مولانا مدنیؒ کی روحانی تعلیم کا مرکزی نقطہ بھی یہی تھا لیکن زمانہ کے حالات اور عوام کے مزاج کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنا نظام بہت سہل بنا دیا تھا، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے ایک بار فرمایا تھا۔

> میں نے سلوک کو نہایت آسان کر دیا ہے اور وہ تعلیم مقرر کر دی ہے کہ ضعیف سے ضعیف اور کمزور سے کمزور بھی اس پر عمل کر کے منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہے۔ (تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۲۰۰)

مولانا مدنیؒ نے اصلاح و تربیت کا کام خطوط کے ذریعہ انجام دیا، ان خطوط کی نئے طرز سے ترتیب اگر عنوانات کے مطابق کی جائے تو خود مولانا کی زبان میں ان کے نظام اصلاح و تربیت پر مستقل تصنیف تیار ہو سکتی ہے۔

مولانا مدنیؒ کی روحانی تعلیم کے اہم پہلو یہ تھے۔

(۱) اللہ سے تعلق پیدا کرنا۔ ان کی تمام دینی جہد وسعی کا مرکزی نقطہ اور روحانی تربیت کا واحد مقصد یہی تھا۔ انھوں نے ایک شعر جو بظاہر بہت سادہ اور معمولی ہے۔ اپنے خطوں میں بار بار نقل کیا ہے۔

بابا سب سے رشتہ توڑ
بابا رب سے رشتہ جوڑ

(مکتوبات ص ۳۴، ۹۳، ۱۴۲، ۱۵۲، ۱۶۱ وغیرہ

ایک بار ان کے خط کی بنیادی کیفیت سے ہم آہنگی پیدا ہوجائے تو یہ شعر اعماق روح میں اس طرح گونجنے لگتا ہے گویا کوئی دُرویش خدامست، مادیت میں غرق انسان کو پکار پکار کر مقصد حیات سے آگاہ کر رہا ہے۔!

وہ یہ رشتہ "ذکر" کے ذریعہ جوڑتے تھے۔ روحانی اشغال واذکار پر ان کا ایک مختصر خطبہ جو مدراس میں دیا تھا بہت پرتاثیر ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سلوک کو کس طرح وہ سنت کے سایہ میں رکھتے تھے

(۲) اللہ کے لئے جینے کی ہمت اور صلاحیت پیدا کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیتے تھے، یہ فکر ونظر کا وہ انقلاب ہے جو زندگی کے ہر عمل کو ایک روحانی حقیقت بنا دیتا ہے، انسان رنج و راحت دونوں حالتوں میں اطمینان اور سکون حاصل کرلیتا ہے، ایک ہندی شعر وہ بڑے درد سے پڑھتے تھے۔

جب پیت بھئی تب لاج کہاں سنسار ہنسے تو کیا ڈر ہے
دکھ درد پڑے تو کیا چنتا اور سکھ نہ رہے تو کیا ڈر ہے

(مکتوبات ص ۹۴)

یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان اپنی زندگی کو کسی اعلیٰ مقصد کی چاکری

میں دے دیتا ہے۔

(۳) خدمت خلق کا جذبہ بیدار کرنا۔ جیسا کہ پیچھے گذر چکا ہے مشائخ متقدمین نے خدمت خلق کو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا تھا۔ مسلم کی وہ حدیث قدسی ان کے پیش نظر رہتی تھی جس میں اللہ تعالیٰ ابن آدم سے کہتا ہے کہ وہ بھوکے اور بیمار کے پاس ملتا ہے۔ مولانا مدنی رح نے اپنے روحانی نظام میں اس کو خاص اہمیت دی تھی۔

(۴) اخلاقی زندگی کے بغیر انسان کو اپنی منزل کا نشان نہیں مل سکتا، اس سے انفرادی زندگی میں طمانیت اور اجتماعی زندگی میں تقویت پیدا ہوتی ہے۔

(۵) حقوق العباد کی ادائیگی انسانی فریضہ ہے جس کو ادا کرنے میں کوتاہی نہیں ہونی چاہئے (مکتوبات ص ۱۸۰)

مولانا مدنی رح کے مکتوبات میں اس پر جگہ جگہ زور دیا گیا ہے، اور یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جو انسان اس طرف سے بے توجہ ہوتا ہے وہ کوئی روحانی درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

اگر بغور دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ پانچ اصول جن کے گرد مولانا مدنی رح کا روحانی نظام بنا تھا حقیقت میں چشتی مشائخ کی تعلیم کا نچوڑ اور سلسلہ کی فکری تنظیم کی بنیاد تھے۔

معاصر علماء اور مشائخ مولانا مدنی رح کے مرتبے کو پہچانتے اور اُن کی بڑی عزت اور توقیر کرتے تھے، جس وقت شیخ الہند رح نے ان کو کلکتہ جانے کا حکم دیا اس وقت خود شیخ بستر مرگ پر اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کر رہے تھے، انھوں نے مولانا مدنی رح کا ہاتھ پکڑا، اپنے سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا، سینے سے چمٹایا اور تمام بدن پر اس کو پھیرا، بوڑھے استاد نے جس کی ہڈیاں ملت کے غم میں پگھل چکی

تھیں اپنے شاگرد کی بے پناہ صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا تھا اور مستقبل کے لئے اسکی امیدوں کا واحد مرکز وہی تھا، مولانا احمد علی لاہوری ؒ ان کو اس زمانہ کے اولیاء کا امام کہتے تھے (تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۲۹۰) مولانا اشرف علی تھانوی ؒ ان کی تواضع اور مجاہدہ کے قائل تھے، مولانا محمد الیاس صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جس دریا کا ایک پیالہ بھی ضبط کرنا مشکل ہے مولانا مدنی ؒ اسکے سات سمندر چڑھائے ہوئے ہیں اور پھر بھی ضبط موجود ہے، کیا مجال کہ ساغر چھلک جائے، مولانا عبد القادر رائے پوری کا قول ہے کہ جہاں شیخ مدنی ؒ کے قدم تھے وہاں اپنا سر پڑا دیکھا۔ مولانا محمد یعقوب مجددیؒ ان کی ذات کو مسجد سے تعبیر کرتے تھے، اور ان کی جوتیاں سیدھی کرنا اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے تھے (ملفوظات - اہل دل)

مولانا مدنیؒ نے حدیث، تصوف، فقہ تینوں کو ایک رشتہ میں جوڑ لیا تھا، حدیث کا سایہ تو ان کے فکر و عمل کے ہر گوشہ پر رہتا ہی تھا، تصوف میں سنت کو رہبر اور فقہ کو حدیث کا پرتو مانتے تھے ــــ گو ائمہ اربعہ کی حدیث سے مطابقت کرتے تھے لیکن امام ابو حنیفہ ؒ کو "سراج امتان مصطفٰے" کا درجہ دیتے تھے اور زندگی کے ہر شعبہ میں ان سے روشنی حاصل کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے،

حقیقت یہ ہے کہ علم حدیث، جذبہ جہاد، صوفیانہ جذب و شوق ـــــ ان تین نے مل کر مولانا مدنی ؒ کے فکر و عمل کی راہیں متعین کی تھیں۔

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیل ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

از قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

میں نے کہیں لکھا تھا کہ۔ "ہر چیز کا کمال اس مقصد کے اعتبار سے ہوتا ہے جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے"

انسان کا مقصد تخلیق یہ ہے کہ وہ اپنے مولی کے آگے سر جھکائے اور اسکے احکام بجا لائے۔ ارشاد ربانی ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون میں نے جنوں اور انسانوں کو فرمانبرداری ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔

نماز، روزہ، حج اور دوسری تمام عبادتیں اسی وقت مقبول ہیں جب کہ ان کا مقصد رضاء مولیٰ کا حصول ہو اور وہ اس کے حکم کے مطابق ادا کی جائیں، اگر ایسا نہ ہو تو وہ عبادتیں نہ صرف بیکار بلکہ مستوجب سزا ہیں، ہجرت ایک ایسی اہم عبادت ہے جس میں ہر قسم کی قربانی کو دخل ہے، ایک مہاجر اپنے عزیزوں کو چھوڑتا ہے، اپنے مال و دولت کو قربان کرتا ہے اور اس راہ میں ہر قسم کے مصائب برداشت کرتا ہے مگر وہ بھی اگر خدا کے لئے نہیں ہے بلکہ کسی دنیوی مقصد کی اس میں آمیزش ہے، تو محض بیکار ہے۔ بخاری شریف کے بالکل شروع ہی میں فرمایا گیا ہے

فمن کان ھجرتہ الی اللہ ورسولہ

فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت

لهجرته الی دنیا یصیبها او امرأۃ
ینکحها فهجرته الی ما هاجر الیہ

اس لئے بندہ کا کمال یہی ہے کہ اس کی پوری زندگی مرضیات خداوندی کے تابع ہو، اطاعت شعاری اور فرماں پذیری کا نمونہ ہو، اس کا کوئی قدم اس کے رسول کی سنت کے جادۂ مستقیم سے ہٹا ہوا نہ ہو۔ الغرض "عبدیت" انسان کے کمالات کا سرچشمہ اور اس کا بہترین طغرائے امتیاز ہے۔

اسی لئے خیر البشر، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معراج کا مرتبہ اعلیٰ عطا کیا گیا اور آپ کو قرب خداوندی کا جو مقام بلند حاصل ہوا جس سے تمام انسان تو کیا دوسرے پیغمبران کرام بھی محروم رہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے آپ کی اسی صفت عبدیت کا ذکر کیا گیا اور فرمایا گیا۔

سُبحٰن الّذی اسریٰ بعبدہ لیلاً مِن المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ لِنریہ من اٰیاتنا۔	پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے خاص بندہ کو، راتوں رات خانۂ کعبہ سے مسجد اقصیٰ تک جس کے اردگرد ہم نے برکتیں نازل کی ہیں تاکہ ہم اسے اپنی قدرت کی کچھ نشانیاں دکھائیں۔

اور اسی لئے کلمۂ شہادت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی اوصاف کا ذکر فرماتے ہوئے "عبدہٗ ورسولہٗ" کہا گیا۔

یہاں ایک مقصد تو یہ تھا کہ پرانی امتوں نے اپنے رسولوں کو جو خدائی کا درجہ دیدیا تھا، مسلمانوں کو اس سے باز رکھا جائے، دوسری طرف اس طرف بھی اشارہ کرنا تھا کہ "عبدیت اور بندگی" انسان کا بہترین وصف ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انسان کا بہترین وصف اور اس کے کمالات کا کل سرسبد صفت عبدیت ہی ہے۔ اسی سے اس کے دوسرے کمالات و اوصاف کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

ہمارے ممدوح اور آج کی گفتگو کے موضوع شیخ الاسلام، محدث مسجد نبوی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کی پوری زندگی، اور زندگی کا ہر پہلو انسانیت کے اسی وصف اعلیٰ کا آئینہ دار تھا۔ آپ کی سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا نمونہ تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ قرآن کریم کی ترجمان، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کان خلقہ القرآن، آپ کمال عبدیت میں اپنے معاصر علماء وصلحاء میں اسی طرح ممتاز تھے جس طرح چاند ستاروں میں جگمگاتا نظر آتا ہے۔

جس شخص کو بھی آپ کی مقدس مجلس کے آداب کا تھوڑا سا بھی علم ہے وہ جانتا ہے کہ آپ کو یہ بات بالکل پسند نہ تھی کہ آپ مجلس میں تشریف لائیں تو حاضرین آپ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوں۔ میری رائے ناقص میں اس مسئلہ میں گنجائش ہے اسی خیال کی بنیاد پر ایک مرتبہ خاکسار نے اس مسئلہ میں حضرت سے گفتگو کی گستاخی بھی کی۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں حضرت والا تشریف لائے ہوئے تھے۔ خاکسار بھی اس جلسہ میں حاضر تھا، نماز فجر کے بعد چائے سے پہلے حضرت بعض عقیدت مندوں کو ایک کمرہ میں بیعت فرما رہے تھے، برابر کے دوسرے کمرے میں چائے کا انتظام تھا، جہاں مہمانان خصوصی حضرت کی تشریف آوری کے منتظر تھے یکایک کمرے کا دروازہ کھلا اور حضرت برآمد ہوئے، بعض بے تمیز زائرین حسب عادت آپ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے۔ ان کے ساتھ میں بھی کھڑا ہوگیا مگر حضرتؒ دروازہ پر ہی رک گئے اور سب کو بیٹھ جانے کا حکم دیا، جب سب بیٹھ گئے تب قدم

آگے بڑھایا۔

جب مجلس میں چائے کا سلسلہ شروع ہوا تو چائے نوش فرماتے ہوئے حضرت نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ آپ بھی کھڑے ہو گئے، کیا آپ نے یہ حدیث نہیں پڑھی۔

لا تقوموا کما تقوم الاعاجم یعظم بعضہم بعضا	جس طرح عجمی لوگ ایک دوسرے کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تم نہ کھڑے ہو۔

میں نے عرض کیا، حدیث سے یہ بھی تو معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے — حضرت سعد بن معاذ کی آمد پر انصار کو حکم دیا تھا کہ

قوموا الی سیدکم ۔	تم اپنے سردار کی تعظیم کیلئے کھڑے ہو جاؤ

حضرت نے پوچھا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کب اور کس موقع پر یہ بات فرمائی تھی میں نے عرض کیا کہ غزوۂ خندق کے بعد، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کا محاصرہ کیا اور انھوں نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے تو انھوں نے اپنے معاملہ میں خود حضرت سعد بن معاذ کو حَکَم بنایا۔ وہ جب فیصلہ کرنے کے لئے تشریف لانے لگے تو آپ نے انصار کو حکم دیا کہ "اپنے سردار کی تعظیم کیلئے اٹھو"

حضرت نے فرمایا اس وقت حضرت سعد کس حال میں تھے، میں نے عرض کیا زخمی تھے، آپ نے فرمایا، حضرت سعد کو اس وقت دوسروں کی مدد کی ضرورت تھی تاکہ ان کو بٹھائیں، اسی لئے آپ نے ارشاد فرمایا قوموا الیٰ سیدکم، یہ نہیں فرمایا قوموا لسیدکم، مطلب یہی تھا کہ سعد کی طرف بڑھ کر ان کو سنبھالو۔ نہ یہ کہ ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔

بہر حال علمار نے اس پر گفتگو کی ہے، اور اگرچہ اس میں دوسرے پہلو کی بھی

گنجائش ہے مگر حضرت کی افتاد مزاج اور میلان طبع کا یہی تقاضا تھا کہ اپنے لئے کسی تعظیم کو پسند نہیں کرتے تھے اور عام خدام میں ملے جلے رہتے تھے، کسی نئے آنے والے کو یہ اندازہ بھی نہ ہوتا تھا کہ آپ دارالعلوم جیسے عظیم دینی مرکز کے صدر نشین ہیں۔

آپ سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اپنے مہمانوں کی ہر خدمت انجام دینے کے لئے تیار رہتے تھے، حضرت کو دیکھنے والے اور برتنے والے ابھی ہزاروں خدام موجود ہیں، سب کو اس کا تجربہ ہے۔

جب آپ اندرون خانہ سے برآمد ہوتے تو مردانہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو حکم تھا کہ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہیں، پھر خود تشریف لا کر چمڑہ کا دسترخوان بچھواتے بلکہ بچھاتے، حاضرین ارد گرد جمع ہو جاتے اور سب کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھانا نوش فرماتے۔

میری ناقص رائے میں اگرچہ اس معاملہ میں بھی گنجائش ہے، قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ لیس علیکم جناح ان تاکلوا جمیعا او اشتاتا (نور) مگر حضرت کی مساوات پسندی اور انکسار طبع کا تقاضا تھا کہ آپ رسول اکرم کی عام عادت کے مطابق مل جل کر کھانا تناول فرمائیں۔

مہمانوں کی خاطر مدارات ہی نہیں بلکہ بعض اوقات آپ ان کی خدمت گذاری بھی فرماتے، وہ بھی اس طرح کہ مہمان کو اس کی خبر بھی نہ ہو، اور اس میں دیندار اور غیر دیندار کا کوئی امتیاز نہ تھا۔

مشہور کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر اشرف ایک مرتبہ آپ کے مہمان ہوئے۔ تو رات گئے آپ نے خاموشی کے ساتھ ان کے پاؤں دبانے شروع کر دئے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے جب محسوس کیا کہ کوئی شخص میرے پاؤں دبا رہا ہے۔ تو میری آنکھ کھل گئی، دیکھا تو حضرت شیخ الاسلام ہیں، بدحواس وحیران و پریشان رہ گیا۔ بڑے

ادب کے ساتھ حضرت کو روکا۔ حضرت نے فرمایا: مجھے آپ اس ثواب سے کیوں محروم کرتے ہیں، کیا میں اس قابل بھی نہیں کہ اپنے مہمان کی خدمت کرسکوں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی عادت تھی کہ مہمانوں کی بہ نفس نفیس خدمت کرتے اس میں کافر و مسلم کا بھی فرق نہ تھا۔ وفد ثقیف اور وفد حبش جب مدینہ منورہ آئے تو آپ نے خود ان کی خدمت گذاری کی، صحابۂ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اس کے لئے کافی ہیں، آپ نے فرمایا انھوں نے میرے ساتھیوں کی خدمت اور مدد کی ہے، میں خود ان کی خدمت کروں گا۔

دراصل یہ حضرت رہ کا مزاج بن گیا تھا، دوستوں اور پرانے ساتھیوں کے ساتھ اور بھی بے تکلفی تھی، عزت اور عظمت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد بھی، جن سے طالب علمی کے زمانے میں تعلقات تھے ان سے برملا اسی بے تکلفی بلکہ چھیڑ چھاڑ کا برتاؤ کرتے تھے۔

میرٹھ کے حکیم محمد اسحٰق صاحب مرحوم طالب علمی کے زمانہ کے حضرت کے ساتھیوں میں سے تھے، جب دیوبند سے دہلی یا دہلی سے دیوبند جانا آنا ہوتا تو اکثر ان سے ملنے آتے، پھر آتے ہی چھیڑ چھاڑ ہی نہیں بلکہ کشتم کشتا شروع ہوجاتی۔ حضرت رہ ان کی جیب میں سے زبردستی ان کا بٹوا نکالتے۔ حکیم صاحب بظاہر مزاحمت کرتے مگر پھر بار مان لیتے۔ حضرت اس میں سے جو رقم نکلتی اس کی مٹھائی منگاتے اور سب حاضرین کی دعوت ہوتی۔

حکیم صاحب بھی ہوشیاری سے کام لیتے تھے، مولانا کے آنے سے پہلے ہی اپنی جیب کا جائزہ لیتے اور دو تین روپے چھوڑ کر (جو اس زمانہ میں بہت ہوتے تھے) باقی رقم علیحدہ کرلیتے تھے۔

یہ منظر ایک دو دفعہ نہیں بار بار کا دیکھا ہوا ہے، اور سرکار نامدار صلی اللہ علیہ وسلم

کے بدوی دوست حضرت زاہر سے آپ کے مزاح کا وہ واقعہ یاد آجاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ حضور کو بازار میں مل گئے جہاں وہ اپنی گاؤں سے لائی ہوئی چیزیں فروخت کررہے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھرے بازار میں پیچھے سے جاکر ان کو اپنی گود میں دبوچ لیا۔ انھوں نے بھی جب محسوس کیا کہ سرکار دو عالمؐ ہیں تو اپنی پیٹھ اور بھی سینہ سے ملادی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چیخ کر فرمایا۔ "کون اس غلام کو خریدتا ہے"۔

زاہر نے کہا مجھ جیسے شخص کو جو خریدے گا خسارہ ہی میں رہے گا۔ حضورؐ نے فرمایا نہیں اللہ کے نزدیک تمھاری قیمت بہت زیادہ ہے۔

مگر یہی متواضع، خاکسار، سراپا انکسار، جب بڑے بڑے ظالم و جابر حاکموں کے سامنے جاتا تو شیروں کی طرح گرجتا اور دنیا کی اس عظیم ترین حکومت کو خاطر میں نہ لاتا جس کے حدود میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

ذرا چشم تصور کے سامنے خالق دین ہال کراچی کا دلوں کو دہلا دینے والا منظر لائیے، اس ہال کو ڈھائی سو فوجیوں نے اپنے اسلحہ کے ساتھ گھیر رکھا ہے، آج یہاں برطانوی عدالت میں کراچی کے مشہور مقدمہ بغاوت کا فیصلہ سنایا جانے والا ہے، ان ہولناک انتظامات کو دیکھ کر بڑے بڑے بہادروں کے پتے پانی ہو رہے ہیں

آخر مسلح پولس کی حفاظت میں مجرمین بغاوت کی گاڑی احاطہ میں داخل ہوتی ہے، یہی اللہ کا عاجز بندہ ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا ہال میں داخل ہوتا ہے اور وقت کے فرعون کے سامنے شیروں کی طرح گرج کر کہتا ہے کہ

بے شک میں نے یہی کہا اور پھر کہتا ہوں کہ برطانیہ کی فوج میں مسلمانوں کی شرکت حرام ہے "

یہاں عبدیت کا یہی تقاضا تھا کہ فراعنہ وقت کے سامنے اللہ کا بندہ نہ جھکے اور ان کے کبر و غرور کو اپنے پیروں تلے مسل دے،

قیصر وکسریٰ کے درباروں میں جب اسلام کے سفیر پہنچے تو انھوں نے اپنے نعرۂ حق سے ان کے ایوانوں میں زلزلہ ڈال دیا کہ (افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر)۔

اس تفصیل کے بعد میں عرض کروں گا کہ بزرگوں کی سیرت کے تذکرہ کا مقصد وقتی مجلس آرائی یا تفریح طبع نہ ہونا چاہیئے، ہم متوسلین کی خصوصیت کے ساتھ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی مقدس زندگی کو شمع راہ بنائیں اور ان کے نقش قدم پر اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ ورنہ دنیا میں سبھی اپنے بزرگوں کی تعریف وتوصیف میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتے ہیں، لوگ ہمارے ان تذکروں کو بھی اسی قسم کی رسمی چیز سمجھ کر نظر انداز کردیں گے، اور نشستند وگفتند وبرخواستند کے سوا اس کا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ

والسلام علی الہ واصحابہ واولیائہ وصلحائہ اجمعین

اوران کا سیاسی پہلو

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

حضرت مجدد الف ثانی کے خطوط کے بعد حضرت شیخ الاسلام کے مکاتیب تصوف، طریقت، شریعت، دعوت اصلاح، تبلیغ واشاعت اسلام، احیائے دین، تزکیہ تعلیم کتاب وحکمت، اصلاح عقائد ورسوم، قیام ملت اسلامیہ اور وقت کے اہم دینی تقاضوں کے مضامین کا سب سے بڑا مجموعہ ہیں

لیکن وقت کے مسائل میں رہنمائی کے سلسلے میں حضرت مجدد اور حضرت شیخ الاسلام کے افکار میں ایک بنیادی فرق بھی صاف نظر آتا ہے، حضرت مجدّد ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ عروج کے مصلح ہیں، اس وقت مسلمانوں کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا، حضرت شیخ الاسلام ہندوستان میں مسلمانوں کے دور زوال اور عہد محکومی کے رہنما ہیں، جب کہ مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہو چکا تھا، سلطنت کا نقش مٹ چکا تھا اور ہندوستان کی تاریخ ایک نئے دور میں داخل ہو چکی تھی، حالات نے مسلمانوں کو اس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں انھیں فیصلہ کرنا تھا کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کے وسیع تر ملی مفادات کا تقاضا کیا ہے، آیا انھیں ملک کی ملی زندگی میں اپنا مقام پیدا کرنا ہے یا اپنے لئے کسی گوشۂ خلوت میں عافیت کی تلاش کرنی ہے؟

بلاشبہ کسی ایسے گوشے کا تصور نہایت خوش کن تھا جہاں مسلمان اپنی علمی، تہذیبی دینی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اپنے لئے ایک کامل آزادانہ ماحول پیدا کرنے اور اپنے ذوق و فکر کے مطابق سیاسی زندگی کا نقشہ بنانے میں آزاد ہوں لیکن ہندوستان کی ہزار سالہ تاریخ میں مسلمان اور دوسری اقوام معاشرتی اور سماجی زندگی میں جس طرح گھل مل گئے تھے، اس سے انھیں الگ کرنا اور کسی ایک گوشے میں جمع کرلینا ممکن نہ تھا، خواہ اس بارے میں کتنے ہی بلند عزائم اور نیک خواہشات کیوں نہ ہوں، مسلمانوں کے وسیع تر اجتماعی مفاد کا تقاضا تھا کہ وہ پسپائی اور فرار کی زندگی کا خیال دل میں لائے بغیر ہندوستان کی اقتصادی، سیاسی اور ملی جلی زندگی میں اپنا مقام پیدا کریں اور ایک وسیع علاقے میں مسلمانوں کے مفادات اور اسلامی دعوت کے بہترین ثمرات اور ملک کے طول و عرض میں اسلامی زندگی کے نشانات، تہذیبی علامات، تاریخی آثار اور اپنے عظیم الشان علمی اور تاریخی اداروں اور مرکزوں کی وراثت سے دست بردار نہ ہوں، خواہ انھیں اس راہ میں وقت کی تلخ کامیوں کا سامنا کرنا پڑے،

حضرت شیخؒ کے سامنے زندگی کے جو مسائل اور وقت کے جو تقاضے تھے حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے لئے مسلمانوں کے دورِ عروج اور عہد اقتدار کاملہ میں ان کا تصور بھی ممکن نہ تھا، حضرت شیخ الاسلام نے دعووں کی بلند آہنگی اور ظاہری خوش نمائی کے مقابلے میں مسلمانان ہند کے وسیع تر اجتماعی مفاد کی راہ کو اختیار فرمایا، اگرچہ انھیں اس راہ پر چل کر شدید ترین مخالفتوں اور اپنوں اور بیگانوں کی نفرتوں کا ہدف بننا پڑا۔

حضرت مجدد کی دعوت مسلمانوں کی اصلاح اور اسلامی زندگی کے قیام کی عظیم الشان تحریک تھی جس کے اثرات مسلمانوں کے ذہنوں اور ان کی زندگی اور ان کی اصلاحی اور اسلامی تحریکوں پر صدیوں کے بعد آج تک موجود ہیں، لیکن جو

دور حضرت شیخ الاسلام کو ملا تھا اس میں حضرت مجدد کی دعوت کے داخلی رخ ہی
سے کام لیا جا سکتا تھا، ملک کی ملی جلی اور اجتماعی زندگی کے لئے اس میں کوئی رہنمائی نہ
تھی، حضرت مجدد کی دعوت کا ایک پہلو کہ غیر مسلموں اور ہنود کو رسوا کرو، ذلیل کرو،
انھیں قتل کرو، ان کی قوت مٹا دو، ان کا زور توڑ دو، انھیں سیاسی زندگی میں اقتدار
سے الگ کر دو تاکہ وہ عزت کی زندگی سے محروم ہو جائیں اور سر اٹھا کر نہ چل سکیں،
نہ اس وقت قابل عمل تھا نہ جہانگیر و شاہجہاں کے دور میں بلکہ عالمگیر کے عہد سعادت
تک اس پر عمل کیا گیا اور نہ کیا جا سکتا تھا، حضرت شیخ الاسلام کے عہد کے تقاضے
تو بالکل ہی مختلف تھے. اس زمانے میں مسلمانوں لئے وہی لائحہ عمل درست تھا جس
کی طرف حضرت شیخ الاسلام نے رہنمائی فرمائی تھی، مجھے یقین ہے کہ اگر اس دور میں
حضرت مجدد بھی ہوتے تو اسی سلطان وقت اور اسکندر عزم کے جھنڈ کے نیچے نظر
آتے۔

جانشینی شیخ الہندؒ:۔

حضرت شیخ الاسلام کے بارے میں یہ بات واضح ہے کہ وہ اپنے عہد میں امام
الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تحریک کے سب سے بڑے رہنما تھے. ان
کے سلسلۂ فکر میں اس روایت کی بڑی اہمیت ہے جو ان کے عہد کو حضرت شاہ صاحب
کے عہد اور ان کی تحریک سے ملاتی ہے اس روایت کی شخصیات حضرت شیخ الہند
مولانا محمود حسن، حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم، حضرت مولانا مملوک علی، حضرت مولانا
شاہ محمد اسحاق و شاہ محمد یعقوب اور حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہم اللہ اجمعین) تھیں، یہ
شخصیات مستقل بالذات بھی تھیں اور الگ الگ نظام شمسی کی مالک تھیں جن سے
علم و فضل کے بہت سے ثوابت و سیارے وابستہ تھے، ایک دوسرے دائرے میں

بھی حضرت امام الہند کی روایت موجود تھی لیکن تاریخی اور روایتی طور پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد تحریک ولی اللّٰہی کا مرکز دہلی سے دیوبند منتقل ہو گیا تھا اور اسی سے متعلق علمار کی ایک جماعت اس روایت کی امین اور تحریک کی داعی تھی، بعد میں جب جمعیۃ علمار ہند کا قیام عمل میں آیا اور حضرت مفتیٔ اعظم مولانا کفایت اللہ شاہجہانپوری ثم دہلوی اور ان کے بعد حضرت شیخ الاسلام اس کے صدر ہوئے اور اس دائرے کے علمائے کرام نے بھی اس کے انداز فکر نظام اور لائحہ عمل کو اختیار فرمالیا تو گویا ولی اللّٰہی فکر کے مرکزِ دہلی کے انتقالِ دیوبند پر تاریخ کی مہر لگ گئی۔

بلاشبہ حضرت شیخ الہندؒ زندہ رہتے اور انھیں جمعیۃ علمار کی رہنمائی کا موقع ملتا تو وہی اس نظام فکر کی مرکزی شخصیت ہوتے لیکن حضرت کو زندگی نے مہلت نہ دی، حضرت مفتیٔ اعظم کے ذوق علمی و صحت نے زیادہ دنوں تک جمعیۃ کی رہنمائی کی اجازت نہ دی، پھر بھی حضرت مفتی صاحب جمعیت علمار کی تاریخ رہنمائی کی ایک قابل احترام اور صف اول کی شخصیت تھے، جمعیۃ علمار کی رہنمائی کا سب سے زیادہ طویل عرصے تک حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کو موقع ملا۔ ان کا بواسطۂ شیخ الہند حضرت امام شاہ ولی اللہ سے نہایت قومی تعلق تھا اس لئے وہ نہ صرف جانشین شیخ الہند تھے بلکہ اپنے وقت میں حضرت امام الہند محدث دہلوی کی وراثتِ فکری اور فلسفہ عمرانی وسیاسی کے سب سے بڑے داعی اور رہنما وہی تھے۔

حضرت شیخ الاسلام کو نہایت طویل زمانے تک کامل یکسوئی کے ساتھ حضرت شیخ الہند کے فیضان تعلیم وتربیت کا موقع ملا تھا، وہ شیخ الہندؒ کے ذوق ومزاج کے سب سے بڑے آشنا، ان کے افکار کے سب سے زیادہ واقف اور عزائم

کے رازداں تھے، حضرت نے اپنے دورِ صدارت میں اور اس سے پہلے سے انھیں افکار و عزائم کے مطابق جمعیت علمائے ہند کی رہنمائی فرمائی۔

حضرت شیخ الاسلام کا نظام فکر و عمل :-

جمعیۃ علمائے ہند وقت کسی سیاسی تحریک یا جماعت کی طفیلی تھی نہ کسی سے متأثر اور نہ حضرت شیخ الاسلام کے فکر پر وقت کے کسی سیاسی فلسفہ و نظام کی چھاپ تھی، جمعیۃ علماء کا پورا نظام فکر مستقل بالذات تھا، اس نے سیاسی زندگی کے میدان اور قومی و ملی تحریکوں میں جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا، وہ اس کے اپنے غور و فکر کے نتیجے میں اس کی اپنی صوابدید پر تھا، حضرت شیخ الاسلام کی صدارتِ جمعیت کے بہت تھوڑے عرصے بعد ہی جمعیۃ کے نظام فکر و عمل اور حضرت کے وجود گرامی کا افتراق ختم ہو کر ملک کی سیاسی و اجتماعی زندگی میں حضرت کے سیاسی، عمرانی، تعلیمی، دینی اور تہذیبی افکار کا ایک نظام اور لائحہ عمل نمایاں ہو گیا تھا،

حضرت شیخ الاسلام نے کبھی کسی رجعت پرستانہ فکر و تحریک سے مفاہمت نہ کی لیکن بغیر سوچے سمجھے وقت کی کسی انقلابی اور قومی تحریک کا ساتھ بھی نہ دیا۔ حضرت کے نظام فکر کا ذرا بھی غور سے مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ہر فکر اور عمل کا ایک دائرہ ہے اور ہر قسم کے کام ان حدود اور دائروں ہی میں انجام پاتے ہیں مثلاً۔

(۱) ــــــ سب سے پہلے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کے تقاضے اور ضرورتیں سر اٹھاتی ہیں، حضرت ان ضرورتوں کے مطابق مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے زیادہ سے زیادہ ابتدائی اسلامی مدارس کے قیام، تبلیغ و اشاعت اسلام، تنظیم و اتحاد بین المسلمین کے سرزمین ہند میں سب سے بڑے داعی اور مبلغ تھے، تاریخ کے ایک دور میں متعدد حضرات نے نہایت جوش کے ساتھ اسلامی مدارس کے قیام، مناظرین کی تربیت

تبلیغ واشاعت اور اتحاد وتنظیم کی ضرورت کو محسوس کیا، اس لئے جماعتیں اور انجمنیں قائم کیں، رسالے نکالے، مناظرین کے دستے تیار کئے اور اپنے اوقات عزیز کو ان کاموں کے لئے وقف کر دینے کے عزائم کا اظہار کیا، لیکن یہ تمام ولولے وقتی ثابت ہوئے، حضرت شیخ الاسلام کے نزدیک یہ کوئی کام بھی وقتی اور کسی خاص تحریک سے متاثر ہو کر کرنے کا نہ تھا، بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اسلامی زندگی اور ان کے ملی تشخص کے قیام واستحکام کے لئے دائمی اور مستقل ضرورت تھے، جمعیت علماء کے نظام میں ان کے مستقل شعبے قائم تھے اور ۱۹۴۷ء تک جمعیت کی ۲۸ رسالہ زندگی میں یہ شعبے کبھی اپنے رہنما کی عدم توجہ کا شکار نہ ہوئے، نہ ان کی سرگرمیاں ماند پڑیں، بلکہ ہر آنے والے دور میں بھی نہایت زور وشور کے ساتھ ہر دائرے میں کام ہوتا رہا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس نے سب سے زیادہ کام کے آدمی پیدا کئے، سب سے زیادہ لوگوں میں خدمت کا جذبہ پیدا کیا، سب سے زیادہ تبلیغی، اصلاحی لٹریچر پیدا کیا، اسلامی مدارس کے قیام میں سب سے زیادہ سرگرمی دکھائی اور پورے ملک میں اسلامی مدارس کا جال بچھا دیا، اس نے مناظرین اسلام کی تربیت کا خواہ کوئی مدرسہ نہ کھولا ہو لیکن اسلام کی تبلیغ واشاعت اور فتنۂ ارتداد کے انسداد کے لئے سب سے زیادہ مخلصین اسی نے پیدا کئے اور سب سے زیادہ منظم اور نتیجہ خیز تحریک اسی نے چلائی، اسی طرح جمعیۃ علمائے ہند کے تمام بزرگ اور خورد اگرچہ اپنے معتقدات میں نہایت راسخ اور اپنے مکتبۂ فکر سے نہایت قوی تعلق رکھتے تھے، لیکن اتحاد بین المسلمین کی سب سے اہم اور مؤثر تحریک جمعیت علمائے ہند ثابت ہوئی

(۲) ـــــ مسلمانوں کی ملی واسلامی اجتماعی زندگی کے قیام کے لئے داخلی امور کی انجام دہی کے ساتھ قومی اور دستوری سطح پر شریعت بل پاس کرانے، قاضی ایکٹ کے نفاذ اور اسلامی اوقاف کی تنظیم واصلاح کے لئے جو مردانہ وار جنگ لڑی گئی

اس کا سہرا جمعیۃ علمائے ہند کے سر ہے اور جمعیۃ کی رہنمائی کا فخر سب سے زیادہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کی ذات گرامی کو حاصل ہے، اگرچہ حضرت نے اس پر فخر کا کبھی اظہار نہیں فرمایا۔

(۳) ——— قومی سطح پر اور ملک کی اجتماعی زندگی کے دائرے میں اسلامی عقائد وشعائر کے تحفظ کے لئے کوششیں کی گئیں، جمعیۃ علمائے ہند نے ہمیشہ ان تجویزوں اور قراردادوں کی مخالفت بھی کی جو کسی قومی یا غیر قومی جماعت یا کسی فرد یا حکومت کی طرف سے پیش کی گئیں، سول میرج کے بل اور شاردا ایکٹ کی اس بنیاد پر مخالفت کی گئی کہ اس سے اسلامی زندگی کی روایت، اس کا تشخص اور استحقاق مجروح ہوتا تھا، اور یہ شریعت اسلامی میں ایسی مداخلت تھی کہ اگر ایک مرتبہ اس کی اجازت دیدی جاتی تو پھر اس دروازے کا بند کرنا ناممکن ہو جاتا۔

اسی طرح جمعیۃ علماء کے اکابر نے جس کے سرخیل حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رح تھے، ہر اس تجویز و تحریک کی مخالفت کی جو مسلمانوں کے ملی و اجتماعی مفاد اور اسلامی عقائد کے خلاف پائی گئی اور اس میں کبھی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے تعلق اور اس کا احترام مانع نہ ہوا، تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ نہرو رپورٹ کو مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے ناکافی یا خلاف پایا تو اس کی مدلل مخالفت کی اور پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کی خامیوں کو گنوایا، واردھا تعلیمی اسکیم اور ودیا مندر کی اسکیم کو مسلمانوں کے دینی و تہذیبی افکار و روایات کے خلاف پایا تو اس پر تنقید کرنے میں زبان و قلم نے کوتاہی نہ کی، بندے ماترم کا قومی نغمہ اسلامی عقائد سے ٹکرایا تو اس کی قومی حیثیت تسلیم کرنے اور مسلمان بچوں سے اسکے بول کہلوانے سے صاف انکار کر دیا، حالاں کہ اس کا سخت سے سخت جملہ بھی شاعر اسلام کے اس مصرعے "خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے" اور اس جیسے بہت سے مصرعوں

اور شعروں سے زیادہ سخت اور شرمناک نہ تھا۔ اور جب گاندھی جی کی پرارتھنا کے گیت یا ان کے پسندیدہ بھجن کے بعض جملوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو ایک لمحے کے لئے بھی گاندھی سے تعلق اور ان کا احترام یہ کہنے میں مانع نہ ہوا کہ اس کی تعلیم مسلمانوں کے عقائد کے خلاف ہے۔ اور کوئی مسلمان بہ قائمی ہوش و بہ سلامتی ایمان اسے اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکتا۔

(۴) ـــــ ملی استحقاق کو منوانے کے لئے جمعیۃ علمائے ہند جس کے صدر نشین حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ تھے، ہمیشہ سینہ سپر رہی، خواہ وہ محرم کے جلوس کی بندش ہو یا ذبیحہ گاؤ کی ممانعت یا کسی بزرگ کے عرس کا اہتمام کوئی بات خواہ اسلام کے کسی حکم کے مطابق نہ ہو رہی ہو لیکن اگر مسلمانوں کا کوئی فرقہ اسے اپنے عقائد کا جز سمجھتا ہے اور کسی جانور کا ذبیحہ اسلام کی بخشی ہوئی آزادی اور اجازت کے مطابق ہو رہا ہے تو یہ فیصلہ کرنا کہ کیا صحیح اور کیا غلط ہے مسلمانوں کا داخلی اور تہذیبی ملی اصلاح کا مسئلہ ہے، حکومت کو اس میں مداخلت اور حکم نافذ کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، محرم کے جلوس کی اباحت اور کسی بزرگ کے عرس کا اہتمام بھی اسلام کی تعلیم یا اسکے کسی جزیئے سے ثابت نہیں کیا جاسکتا، ذبیحہ گاؤ کی بھی اجازت تھی بنی اسرائیل کے گائے کی طرح ذبح کا حکم قطعی نہ تھا، لیکن حکومت اس معاملے میں حکم نافذ کر کے جس دروازے کو کھول رہی تھی اس کے کھل جانے کے بعد اس کی دست درازیوں سے اسلام کا کوئی حکم قطعی بھی محفوظ نہ رہ سکتا تھا، یہ معرکہ جمعیۃ علما نے حضرت شیخ الاسلامؒ کی صدارت میں سر کیا تھا۔

(۵) ـــــ قومی اور ملکی سطح پر جمعیت علمائے ہند اور اس کے اکابر نے ہر اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا جو ہندوستان سے برٹش استعمار کی جڑوں کو اکھاڑنے والی اور آزادی کی منزل کو قریب لانے والی ہو اور اس کے لئے کبھی کسی جانی و مالی ایثار

سے دریغ نہ کیا، خواہ ترک موالات کا پروگرام ہو، بدیشی اشیاء کے ترک یا کھدر کے استعمال کی دعوت ہو، سول نافرمانی یا ستیہ گرہ ہو یا ہندوستان چھوڑدو کا اعلان جنگ ہو، یا کسی ریاست میں عوام کے مسائل میں رہنمائی کا مسئلہ ہو، جب بھی اس نے کسی تحریک میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو یہ اسکے اپنے غور وفکر کا نتیجہ تھا اور اسکی اپنی صواب دید پر منحصر تھا، کسی جماعت کی تقلید سے اس کا کبھی کوئی تعلق نہ ہوا، جمعیۃ علماء کا فیصلہ ہمیشہ اسی اصول پر مبنی رہا کہ اس کا تعلق نہ صرف ہندوستان کی آزادی اور ملک کے عوام کے اجتماعی مفاد سے تھا بلکہ مسلمانوں کا ملی اور اسلامی مفاد بھی اسی کا مقتضی تھا۔

(۶) ــــــ مالٹا کی قید سے رہائی کے بعد ۱۹۲۰ء کے وسط میں حضرت شیخ الاسلام ہندوستان تشریف لائے تھے، اسی وقت سے ملک میں چلنے والی تمام قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا تھا، لیکن جب بھی کسی تحریک یا پروگرام میں کسی جماعت سے اشتراک عمل کیا تو اپنے تئیں اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بالکل اس کے حوالے نہ کر دیا بلکہ اپنے جماعتی فیصلے کے مطابق، اپنے جماعتی تشخص کے ساتھ مسلمانوں کے ملکی اور بیرون ملک مسلمانوں کے عمومی مفاد کے پیش نظر کیا، ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اہمیت ہمیشہ پیش نظر رہی لیکن ہمیشہ شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ، حضرت شیخ الہند رح کی نصیحت کے مطابق۔

(۷) جمعیۃ علمائے ہند کے تمام ارکان اور حضرت شیخ الاسلام فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لئے اپنی تمام ذاتی اور جماعتی صلاحیتوں اور وسائل کو بروئے کار لائے، مسلمانوں کو نظم وضبط اور تحمل کی تلقین کی، اپنی طرف سے کبھی آغاز نہ کرنے کی تنبیہ کی، لیکن مقابلے میں قدم پیچھے نہ ہٹانیکا بھی مشورہ دیا، اور ہجرت کے مقدس نام پر بزدلانہ فرار کے مقابلے میں بہادرانہ موت کو ترجیح دینے کی تلقین کی، جو لوگ فساد میں مظلومانہ

مارے گئے تھے ان کی موت کو شہادت کی موت قرار دے کر حالات کے مقابلہ و مقاومت کے لئے جذبہ پیدا کیا۔

(۸) ـــــــ ملکی زندگی کے دائرے میں مسلمانوں کو اپنے فرض کا احساس دلانے کے لئے حضرت شیخ الاسلام کو نظریۂ قومیت کے حوالے سے بدنام کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن حضرت کی پوری زندگی اور اس کے معمولات اس کے گواہ ہیں کہ اس متحدہ قومیت کے قیام کے لئے نہ تو حضرت نے مسلمانوں کی علاحدہ تنظیم، اسلام کی تبلیغ، مسلمانوں کی اصلاح اور اسلامی تعلیمات کی اشاعت کی ضرورت کو نظر انداز کیا، نہ ان فرائض کی ادائیگی میں کبھی ایک شمہ کی کوتاہی واقع ہوئی، نہ حضرت کی وضع و قطع معمولات روز و شب، اوراد و اذکار، سحر خیزی و عبادت گذاری، درس حدیث و تعلیم و ارشاد، مراسلت اور اسفار و تقاریر کے ذریعہ مسلمانوں کی خدمت اسلامی میں کوئی فرق آیا بلکہ آپ نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا واحد راستہ یہ بتایا کہ صرف نام کے مسلمان نہ ہوں، عادات و اطوار، سیرت و خصائل اور وضع و قطع سے بھی مسلمان نظر آئیں، ہمارے نزدیک تو حضرت کے نظریہ متحدہ قومیت کا وہی مفہوم تھا جو حضرت کی وضع و قطع، شکل و صورت، آپ کے معمولات روز و شب اور ملی وظائف و خدمات میں آپ کے ذوق و انہماک سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تمام کارنامے حضرت شیخ الاسلام کے نظام فکر کے مطابق الگ الگ اور مختلف دائروں میں انجام پاتے رہے، یہی حضرت کی سیرت کے خصائص ہیں اور یہی جمعیۃ علمائے ہند کے زرّیں کارنامے ہیں، حضرت کے خطوط، خطبات اور بیانات سے یہ نظام فکر اور کارنامے ثابت ہیں۔

(۹) ـــــــ حضرت شیخ الاسلام کا نظام فکر صرف مسلمانوں کی ملی اور قوم کی اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں ہی کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ جس طرح ہماری زندگی فرد سے خاندان، خاندان سے برادری اور سوسائٹی اور اس سے آگے ملکی اور قومی

دائرے میں نمایاں ہوتی ہے، اور قومی و ملکی دائرے سے بلند ہو کر زمین کے زیادہ وسیع علاقوں اور خطوں کو محیط ہوتی ہے، مثلاً ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ اور ان وسیع علاقوں کے حالات و مسائل اور مشترک انسانی فلاح و بہبود کے تقاضے انسانی فرائض اور ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہیں، اسی طرح ایشیا، یورپ اور افریقہ کی ارضی سطح سے اوپر کل انسانیت کی سطح نمودار ہوتی ہے اور متحدہ انسانیت کے تقاضے سامنے آتے ہیں، انسانی نقطۂ نظر رکھنے والے شخص کے لئے خصوصاً اس شخص کے لئے جو الخلق عیال اللہ کے عقیدے پر ایمان رکھتا ہو، ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ شخصی مفادات، خاندانی، جماعتی بہبود یا ملک یا اس سے اوپر کسی خاص بر اعظم یا خطۂ ارض کی فلاح و ترقی کے نظریے پر اس کی سعی اور عمل کا قدم اور ذہنی و فکری ترقی کا سفر رک نہ جائے بلکہ وہ اس مقام سے بلند ہو کر تمام خلق اور کل نوع انسانی کی دنیاوی فلاح اور اخروی نجات کے بارے میں سوچے۔

حضرت شیخ الاسلام کے نظام فکر کا یہ آخری نقطہ ہے، یہی انسانی اور یہی اسلامی اندازِ فکر ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر حضرت کے فکر کی بلندی اور سیرت کی عظمت کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہئے

حضرت شیخ الاسلام نے مسلمانوں کی انفرادی زندگی میں تعلیم و تزکیہ کی ضرورت سے لے کر عائلی نظام کی اصلاح، ملک کی عام معاشرتی اور سماجی زندگی میں رہنمائی اور پھر ایک عالمی انسانی معاشرے (یونیورسل سوسائٹی) کی تعمیر تک انسانی زندگی اور اجتماع کی تمام ضرورتوں کو نظر میں رکھا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبید اللہ سندھی کے علاوہ برصغیر کے سارے طبقہ علماء میں حضرت شیخ الاسلام واحد شخصیت ہیں، جن کی تحریرات خصوصاً مکاتیب میں ایک عالمی انسانی معاشرے یا متحدہ انسانیت کا نہ تصور ملتا ہے بلکہ حضرت نے ایسے واضح اشارے

کئے ہیں جن کی رہنمائی میں عالمی انسانی معاشرے کا پورا نظام فکر و عمل مرتب کرلیا جاسکتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کے مکاتیب تاریخی و سیاسی مباحث اور مذہب میں اس کے تمام علوم و فنون اور ان کے متعلقات کے مضامین سے بھرے ہوئے ہیں، تصوف و طریقت، اصلاح و تہذیب، تعلیم و ارشاد، ذکر و اذکار، اوراد و وظائف، مراقبہ و مجاہدہ کے مضامین الگ ہیں، کئی خطوط اسلامی زندگی کے خصائص اور اس کے اختیار کرنے کے فوائد میں ہیں، اور گویا کہ بصائر و عبر کا گنجینہ ہیں، فلسفے کا ذوق آپ میں نہ تھا لیکن مذہب و فلسفہ کی تفریق کے مطابق حضرت شیخ الاسلام کے وہ خطوط جو مذہب کے دفاع اور خدا کے وجود کے اثبات میں ہیں اور جن میں مذہبی عقائد سے استدلال کے بجائے عقلی دلائل سے کام لیا گیا ہے وہ بنیادی طور پر فلسفہ کا مضمون بن جاتا ہے حضرت نے مذہب کے دفاع میں جو طرز استدلال اور اسلوب بیان اختیار فرمایا ہے اس سے ایک جدید علم کلام کے اصول وضع کئے جاسکتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام عام معنوں میں مدبر نہ تھے یعنی ایسی شخصیت نہ تھے۔ جو اپنے افکار کی تالیف و تدوین میں مصروف رہتی ہے اور جس کا فکر آفریں دماغ نت نئے نکتے پیدا کرکے دنیا سے تحسین و آفرین کا خراج وصول کرتی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام ایک خالص عملی انسان اور صاحب فکر سیاست داں تھے اور جن خطوط میں آپ نے سیاسی افکار و مسائل یا کسی قوم یا جماعت کی سیاسی تاریخ اور کردار کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے، وہ وقت کے سیاسی مسائل اور حالات کے تقاضے کے حوالے سے ہے نہ کہ محض فکر آفرینی کے شوق میں! اگر آپ کے دور میں وہ سیاسی حالات اور مسائل پیدا نہ ہوتے تو آپ کو چونکہ مدبر بننے اور اپنی اس حیثیت کو ثابت کرنے اور منوانے کا شوق نہ تھا اس لئے کوئی سیاسی مسئلہ

چھیڑنے کی یقیناً ضرورت پیش نہ آتی، البتہ ان خطوط اور حضرت کی بعض دوسری تحریروں کے مطالعہ سے یہ بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ وہ سیاست میں انسانی معاشیات کی کارفرمائی کے قائل تھے اور اس بارے میں وہ اپنا ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے، نیز حضرت کی یہ خوبی تھی کہ وقت کے سیاسی مسائل کو تاریخ کے تعامل اور تناظر کی روشنی میں دیکھتے تھے اور اسی کے مطابق حال و مستقبل میں عام لوگوں، مسلمانوں اور وقت کی تحریکوں کی رہنمائی فرماتے تھے۔

حضرت شیخ الاسلام کے خطوط کی ایک اہم خوبی آپ کا شریفانہ رویہ ہے، خطوط میں آپ نے سخت سے سخت تنقید فرمائی ہے، لیکن اس میں ذاتی عناد کا کوئی شائبہ نہیں، آپ نے شخصاً کسی کی ذات کو مورد الزام اور متہم قرار نہیں دیا، بعض مقامات پر لہجے میں جھنجھلاہٹ کا احساس ہوتا ہے، لیکن یہ اظہار خشمگی اپنے مخاطب سے ہے جو عام طور پر حضرت ہی کا کوئی مرید، معتقد یا شاگرد ہے، ورنہ معلوم ہے کہ ایک جماعت کے اصاغر و اکابر نے حضرت کی شان میں کیا کیا گستاخیاں نہ کی تھیں، لیکن حضرت کی زبان سے ان کے لئے بھی کبھی کوئی درشت کلمہ نہ نکلا، بلکہ ہمیشہ کلمۂ خیر ہی فرمایا۔

حضرت شیخ الاسلام نے اپنی زندگی میں ہزاروں خطوط لکھے، بلکہ اتنے تو چھپ چکے ہیں، تشنۂ ترتیب و اشاعت خطوط کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا، پچاسوں مضامین و خطبات حضرت کی قلمی یادگار ہیں اور متعدد تصانیف آپ کے ذوق تالیف و تصنیف اور علم و فضل پر شاہد عدل ہیں، اور بلند پایہ مصنف تسلیم کئے جانے کے باوجود آپ کو ادیب اور صاحب طرز تسلیم کئے جانے کی طرف ابھی کسی نقاد نے توجہ نہیں کی، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آپ کی تحریرات اور تصنیفات کے موضوعات چونکہ سیاسی، مذہبی اور اسلامی دینی مباحث

ہیں، اس لئے ادیبوں اور نقادوں نے توجہ نہیں کی، اور وہ علمار اور فضلار جو حضرت سے عقیدت و ارادت رکھتے ہیں ان کی نظر میں اسلوب تحریر ونگارش کی حیثیت نہ صرف دوسرے بلکہ تیسرے درجے کی ہے اس لئے ابھی یہ فیصلہ کرنے کا وقت نہیں آسکا کہ حضرت شیخ الاسلام صاحب طرز ادیب اور انشار پرداز بھی ہیں۔

میں خود بھی اگرچہ اس انداز سے حضرت کی تمام تحریرات کا مطالعہ نہیں کرسکا ہوں لیکن جس حد تک غور کیا ہے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حضرت کا طرز نگارش جن عناصر سے مرکب ہے ان میں صحتِ زبان کے ساتھ عام فہم اور سادہ بول چال کی زبان خاص عنصر ہے۔

عبارت تعقید لفظی سے پاک اور صاف درواں ہے، اگرچہ فقہ تصوف وغیرہ کے مطالب پر مشتمل خطوط میں علمی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں اور کسی بھی علم وفن کی اصطلاحات عام لوگوں کے لئے کبھی عام فہم نہیں ہوتیں، اس کے سوا آپ کی تحریر میں مشکل پسندی کے رجحان کا پتہ نہیں چلتا، آپ کو عربی زبان پر مادری زبان کی طرح قدرت تھی اور عربی ادب کی تمام شاخوں اور صنفوں پر آپ کو عبور حاصل تھا، فارسی دانی کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہ تھی، لیکن آپ کی اردو تحریر عربی وفارسی کی مشکل تراکیب، بعید از فہم تشبیہات و استعارات سے بوجھل اور فہم کے لئے دشوار نہیں، آپ نے جا بجا عربی فارسی اور بھاشا کے اشعار، جملوں اور مثلوں سے اپنے افکار و مطالب کی تفہیم کا کام لیا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کے پیش نظر ہمیشہ مکتوب الیہ اور مخاطب کی علمی اور ذہنی سطح رہی، آپ نے جس مستفسر یا مکتوب الیہ کو جس معیار کلام کا مستحق سمجھا، اسی کے مطابق اپنی تحریر کو لفظوں اور جملوں سے تالیف فرمایا، عربی کا حکمت آمیز مقولہ کلموا الناس علی قدر عقولہم، آپ کی تحریر کی علمی اور ذہنی سطح کو متعین کرتا

کرتا ہے اس لئے آپ کی تحریر کی ایک اہم خوبی وہ ہے جو ادب کے اکابر کے کلام میں تسلیم کی گئی ہے یعنی از دل ریزد بر دل خیزد۔ آپ کی تحریر کا تعلق چونکہ دل کے سچے جذبات، نیت کے اخلاص، طبیعت کے سوز، علم کی گہرائی عقیدے کی پختگی تاریخ کے حقائق اور دلائل کی محکمی سے ہوتا ہے اسلئے پڑھنے والے کے دل میں گھر کرلیتی ہے، اگرچہ ہر قاری کا تأثر جدا ہوتا ہے کوئی آپ کے دل کے سچے جذبات اور اخلاص سے متأثر ہوتا ہے، کسی کو طبیعت کا سوز اثر کرتا ہے، اور کوئی آپ کے علم کی گہرائی، مطالعے کی وسعت اور دلائل کی محکمی سے مسحور ہوتا ہے۔ اثر کم وبیش ہوسکتا ہے، لیکن ایسا کوئی قاری نہیں ہوسکتا جو کسی پہلو سے کسی درجے میں بھی متاثر نہ ہو
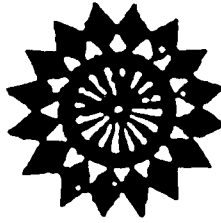
پر

سید صبغۃ اللہ بختیاری معہد الاحسان کراچی

یہ کوئی علمی مقالہ نہیں ہے جو مربوط، مضبوط، مسلسل اور مرتب ہو، جس میں حوالے دیئے جائیں، بلکہ یہ چند نقوش چند تاثرات ہیں جن سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ احسانیات کے حاملین کس طرح اپنے متوسلین کی اصلاح فرماتے ہیں اور کن نفسیاتی اداؤں سے اپنی روحانی تحریک میں کام لیتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی ملی تاریخ میں جن بزرگوں نے اپنا انقلابی کارنامہ چھوڑا ہے، اور وہ کیا کیا خوبیاں تھیں اور وہ کون سی ذہنی قدریں تھیں جن سے خارجی مظاہر زندگی میں تبدیلیاں واقع ہو جاتی تھیں اور ظاہر و باطن کی وہ کیسی کیفیتیں ہوا کرتی تھیں جن سے انسانی سوسائٹی میں جب کہ ہر طرف مادیت کا غلبہ ہو ایک نئی سوسائٹی وجود پذیر ہوتی تھی،

اس ظاہر پرستی، ظاہر بینی اور ظاہر آرائی کے مادی دور میں کسطرح ظاہر و باطن میں ایک روحانی ربانی اور احسانی ماحول پیدا کر دیا جاتا تھا آج دور حاضر میں انسانوں کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے لئے بالخصوص ان کی ذہنی

قومی، ملی، انفرادی، اجتماعی مساعیِ جمیلہ میں ایسی کامیابی حاصل ہو جائے جو نہ صرف حیاتِ طبعی میں بلکہ ابعد طبعی میں فلاح و نجاح کا باعث بن جائے اور جس قدر بگاڑ انسانیت عامہ میں نظر آرہا ہے وہ اصلاح پذیر ہو جائے اور تنزل سے ترقی پر آجائے۔

ہمارے ممدوح کی زندگی اور ان کی سوانح پر ہم ایک دھندلی سی روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

حضرت اقدس نسبی اعتبار سے حسینی نجیب الطرفین سید ہیں اور ان کے خاندان میں علم و مشیخت کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے، پھر عرصۂ دراز کے بعد حضرتِ ممدوح کے والد ماجد علیہ الرحمہ نے اس کی تجدید فرمائی جو اردو، فارسی، ہندی، سنسکرت کے فاضل تھے اور کسی سرکاری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور قطب العارفین، اسوۃ الصالحین حضرت مولانا شاہ فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادی سے وابستہ ہوئے، سلوک باطنی طے کر کے منامی طور پر منصب خلافت سے سرفراز ہوئے، پھر ان ہی کے ایماء سے اپنے صاحبزادوں کو دارالعلوم دیوبند بھیجا اور حضرت شیخ الہند مولانا ابو میمون محمود حسن عثمانی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ اور قطب الارشاد والتمکین، مقتدائے اہل یقین حضرت مولانا شاہ رشید احمد انصاری ایوبی گنگوہی کے فیضانِ خصوصی سے یہ خاندان عالی شان ممتاز ہو گیا۔ جب ہمارے ممدوح کے والد مدینہ منورہ ہجرت فرما گئے تو سارا خاندان مدینۂ منورہ منتقل ہو گیا۔ اور مسجد نبوی میں گنبد خضرا کے قریب بیٹھ کر علوم دینیہ اور علوم عربیہ کا درس دیا

حضرت اقدس سیدنا سید مدنی، جب مدینہ منورہ سے پہلی بار ہندوستان تشریف لائے تو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے آپ کو استاذ حدیث

مقرر کیا، صحیح مسلم شریف کا درس آپ کے ذمہ کیا گیا، اور یہ طے کر دیا گیا. جب بھی وہ ہندوستان آئیں مدرسی کے لئے نئے تقرر کی ضرورت نہیں. یہ تقرر دائمی ہے، پھر جب دوبارہ حضرت شیخ الہند کے ساتھ مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان آئے تو آزادی ہند کی تحریک زوروں پر شروع ہو چکی تھی اس میں شامل ہو گئے، پھر قید فرنگ میں رہ کر جب رہا ہوئے تو دارالعلوم دیوبند کے دفتر اہتمام نے آپ کو مدرسی کے لئے طلب نہیں کیا. اس خطرہ کی بنا پر کہ برطانوی حکومت آپ کے اثر سے مدرسہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے، پھر حضرت مدنی" کلکتہ گئے اور بنگال و آسام میں دورے فرماتے رہے اور مواعظ حسنہ کا سلسلہ شب و روز جاری رہا، یہاں تک کہ سلہٹ کو اپنا مرکز بنا کر تین کام کئے، تعلیم تزکیہ اور تبلیغ، انھیں خطوط پر کام ہوتا رہا، کئی مدرسے کئی خانقاہیں وجود پذیر ہو گئیں۔

چند برس وہاں رہنے کے بعد پھر ایک لطیفۂ غیبی نے دارالعلوم دیوبند پہنچا دیا واقعہ یہ ہوا کہ دارالعلوم دیوبند میں ایک اختلاف رونما ہوا. ایک طرف علامہ سید انور شاہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی. مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا سید بدر عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولوی ادریس سیکروڈوی. قاری محمد یامین، مولوی سعید احمد اکبر آبادی، مولوی حامد الانصاری غازی، مولوی عبدالوحید صدیقی اور کئی سو طلبہ ایک طرف ہو گئے، اور دوسری طرف مولانا مفتی حافظ محمد احمد صدیقی قاسمی مہتمم اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم، مولانا اعزاز علی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا عبدالسمیع، مولانا نبیہ حسن مولانا سید اصغر حسین اور ان کے صاحبزادے مولانا سید اختر حسین وغیرہ اور طلبہ کی ایک کافی تعداد دوسری طرف ہو گئی۔ اس اسٹرائیک کے بعد سال بھر ایک ایسا فتنہ رہا کہ دارالعلوم دیوبند کی تعلیم بند رہی، ایسے میں دونوں مہتمم صاحبان

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں پہنچے، عرض کیا کہ اس فتنہ میں دارالعلوم دیوبند کو کیسے سنبھالیں، فرمایا سید حسین احمد مدنی کو بلالو، تو دفتر اہتمام نے سلہٹ کو تار دے کر بلایا، جب تشریف لے آئے تو انھیں خلوت میں لے گئے، اپنی پگڑیاں قدموں پر ڈال دیں، اور رونے لگے، تو حضرت نے دیوبند آنا قبول کرلیا، پھر چلے گئے اور بالکلیہ شوال میں آگئے، اور اس نواح کے مخلصین سے وعدہ کیا کہ میں ہر سال تمھارے یہاں رمضان گذاروں گا، پھر حضرت نے اپنی شرطیں پیش کیں جن کی تفصیل اب نہیں بتائی جاسکتی، البتہ اتنا ہوا کہ اس لطیفۂ غیبی کے تحت حضرت کا دارالعلوم دیوبند آنا ہوگیا جو وصال تک مسلسل رہا۔

مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ حضرت شیخ الہند کے دیوبند سے چلے جانے کے بعد سے شیخ الاسلام کے دیوبند آنے تک دارالعلوم بالواسطہ برطانوی سرپرستی میں تھا، کوئی بالارادہ، کوئی بے ارادہ اس میں ملوث رہا اور ان سارے بزرگوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا، العبرۃ بالخواتیم۔

حضرتِ اقدس کے دارالعلوم کے قدوم میمنت لزوم کے بعد، جو برکات وہاں ظاہر ہوئیں وہ سب اپنی ایک تفصیل رکھتی ہیں جن میں دورۂ حدیث سے پہلے جلالین شریف و بیضاوی شریف کا لازم ہونا اور ترجمۂ قرآن کا جلالین سے پہلے پڑھ لینا، اور پھر دورۂ حدیث کے بعد دورۂ تفسیر کا قائم ہونا، دورۂ تفسیر میں فوزِ کبیر امام دہلوی کی، برہان، امام زرکشی کی، اتقان امام سیوطی کی اور تفسیر بیضاوی مکمل، تفسیر ابن کثیر کی تمام جلدیں، یہ نصاب حضرتِ مدنی کا تجویز کردہ ہے، تفسیر ابن کثیر عجیب کتاب ہے دنیا میں سب سے پہلی بار مَلِکِ بھوپال علامہ نواب سید صدیق حسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر فتح البیان کے ساتھ اس کے حاشیہ پر ابن کثیر کو مصر میں شائع کروایا، اور دوسری بار سلطان عبدالعزیز

ابن سعود اعلی اللہ مقامہ کی توجہ سے وہ دوبارہ شائع ہوئی، اور پہلی بار دارالعلوم دیوبند کے تفسیر کے کورس میں حضرت مدنی رہ کے فیضان توجہ سے داخل درس کی گئی جو اردو میں آچکی ہے۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں جامعہ نظامیہ حیدرآباد سے مولوی عالم تک تعلیم پاکر دارالعلوم دیوبند آگیا، یہ حضرت کے شیخ الحدیث اور صدرالمدرسین بنائے جانے کا پہلا سال ہے، مجھے متوسط کتابیں پڑھنے کا موقع ملا اور حضرت کا ذکر خیر ایک حیدرآبادی طالب علم مولوی عبیداللہ حیدرآبادی نے کچھ اس انداز سے کیا کہ دید سے پہلے شنید کے ذریعہ دل و دماغ میں محبت رچ گئی، میں عیدالفطر کے متصل دیوبند آگیا تھا، ابھی مدرسہ کھلا نہیں تھا، اساتذہ تشریف نہیں لائے تھے میں روزانہ حضرت اقدس کے دیدار کا منتظر رہا بے قراری اور انتظار کی شدت بڑھتی چلی گئی، ایک دن دیکھا کہ عصر کے وقت ایک بزرگ حوض پر وضو فرما رہے ہیں، خود بخود دل نے کہا یہی وہ بزرگ ہیں جن کے انتظار میں گھڑیاں گزر رہی تھیں جب وضو سے فارغ ہوئے تو صحن مسجد میں وہ بزرگ کھڑے ہوگئے اور مشتاقان دید چہار طرف جمع ہوگئے، مصافحہ کا شرف حاصل کرنے لگے، میں نے اخیر میں مجمع چھٹنے کے بعد مصافحہ کیا، تو حضرت نے غور سے دیکھا، میں ململ کا کرتا پہنا ہوا تھا اور حضرت کھدر پوش تھے، فوراً میں نے کھدر کے کپڑے سلوا لئے اور دربارِ دُربار میں حاضری دی، فرمایا کون ہو کہاں کے ہو، میں نے عرض کیا حیدرآباد دکن کے علاقہ کا ایک چھوٹا گاؤں ہے راتے چوٹی وہاں کا رہنے والا ہوں، فرمایا آپ نے کھدر کیسے پہن لیا، عرض کیا آپ کی پہلی نگاہ نے اس پر آمادہ فرمایا، مسکرا کر فرمایا کہ ولایتی کپڑوں سے انگریزوں کی محبت معلوم ہوتی ہے، کھدر سے اپنے وطن اور اہل وطن کی محبت ہوتی ہے، اس کے بعد آمد و رفت شروع ہوئی، ہم چند طلبہ نے یہ طے

کرلیا کہ حضرت کی خدمت میں حاضری دیا کریں گے، پھر ایک بار عرض کیا کہ آپ سے ہماری درخواست ہے کہ مسجد دار العلوم میں ہفتہ میں ایک بار آپ کی تقریر ہوا کرے جس میں ہماری معلومات عامہ میں اضافہ ہو، چنانچہ دوشنبہ کے دن یہ تقریری سلسلہ شروع ہوا جس میں تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات کے ساتھ ہندوستان کی آزادی اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی جاتی تھی، بحمد اللہ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ۱۹۳۰ء میں آزادی کی جنگ شروع ہوئی اور اس میں اپنے جذبات کو ہم چند طالب علم قابو میں نہ رکھ سکے اور جمعیۃ علماء کے اس دور کے صدر علامہ مفتی کفایت اللہ دہلوی اور سکریٹری مولانا احمد سعید دہلوی سے خط و کتابت کی اور دیوبند چھوڑ کر ہم چند طلبہ دہلی آگئے، آنے سے پہلے ہم نے حضرت مدنی رح سے تحقیق کی کہ کیا آزادی ہند کی جنگ میں حصہ لینا، تھوڑے دنوں کیلئے تعلیم کا ملتوی کرنا صحیح ہے۔ فرمایا: میں مدرسہ کا مدرس ہوں تمھیں کیسے اجازت دے سکتا ہوں، پھر ہم اتفاق سے علامہ سید انور شاہ کشمیری کی خدمت میں پہنچے جو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے اپنے گھر دیوبند آئے ہوئے تھے، ان سے مراجعت کی، فرمایا ضرور شرکت کرو اور یہ نیت رکھو کہ اللہ مدد فرمائے گا، اور پھر کسی وقت تعلیم بھی پوری ہو جائے گی، ایسا موقعہ تو کبھی کبھی آیا کرتا ہے، اور دعائیں کرتے رہو، میرے سب ساتھی مطمئن ہو گئے، میں تنہا حضرت مدنی رح کی خدمت میں پہنچا، میں کس عنوان سے رخصت لے کر جاؤں، فرمایا مہتمم صاحب کے نام درخواست لکھو وطن کا بلاوا ہے، رخصت دی جائے، اس سے میں سمجھا کہ حضرت ہمارے اس اقدام کو صحیح سمجھتے ہیں، چنانچہ میں اور میرے ساتھی دیوبند سے دہلی آئے اور جمعیۃ علماء کے دائرہ حربیہ میں قیام کیا جس کے خصوصی نگراں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی تھے اور دفتر مرکزی جمعیۃ علمائے ہند کے خصوصی نگراں حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد

بہاری تھے، اسی سلسلہ میں مجھے جیل جانا پڑا۔

پہلے دہلی جیل میں مفتی کفایت اللہ مولانا احمد سعید وغیرہ کے ساتھ چند دن دہلی جیل میں رہ کر پھر دوسری جیل میں تبادلہ ہوگیا۔ مجھے زندانِ اٹک کے اس قلعہ میں بھیجدیا گیا، جہاں عارضی کیمپ جیل تھا، اس میں ہزاروں سیاسی قیدی تھے مولانا نورالدین بہاری بھی جیل میں میرے ساتھ تھے، تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد رہائی ہوئی اور میں دارالعلوم دیوبند حاضر ہوا، حسن اتفاق سے حضرت مدنیؒ ہندوستان آنے کے بعد سولہ سال بعد حرمین شریفین تشریف لے گئے۔

مجھے دارالعلوم دیوبند میں حضرت مہتمم صاحب نے داخل نہیں کیا، میں نے مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب کو اطلاع دی اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کو بھی خطوط لکھے، یہ سب حضرات جمعیۃ علمائے ہند کے ایک اجلاس منعقدہ کراچی میں تشریف لے گئے، اس میں حضرت مہتمم صاحب نے بھی شرکت فرمائی، ان چاروں بزرگوں نے سفارش کی، دو بزرگوں نے نرم اور دو بزرگوں نے گرم طریقہ پر میری مدد فرمائی۔ بالآخر حضرت مہتمم صاحب نے مجھے مشروط طریقہ پر داخل کرلیا، اور پھر بقیہ تعلیم پوری کرکے میں واپس ہوا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کے مختصر حالات

✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻

پیش کردہ، محمد فخرالدین رکن مرکزی جمعیۃ علماء ہند وخادم مدرسہ قاسمیہ اسلامیہ گیا (بہار)

اللہ اللہ حسین احمدؒ ماہر علم ومعرفت جامع شریعت وطریقت تحصیل علم کے لئے دیوبند پہنچے۔ شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو ان کی نظر مردم شناس نے تاڑ لیا کہ یہ بچہ علم کا آفتاب عالم تاب بننے والا ہے۔ لہٰذا اولاد سے بڑھ کر ان کو مانا۔ اپنے گھر میں رکھا۔ اور وہ شیخ الہند جو بخاری شریف سے نیچے کی کتابیں کسی کو نہیں بڑھاتے تھے۔ انھوں نے ان کو کسی دوسرے استاذ کے پاس جانے نہ دیا اور نیچے سے لے کر اوپر تک اور چھوٹی سے لے کر بڑی تک ساری کتابیں خود پڑھائیں۔ اور ایک وقت آیا کہ وہ اپنے استاذ شیخ الہند کے سچے جانشین ہو کر جانشینِ شیخ الہند کہلائے۔

تحصیل علم کے بعد کمالات معرفت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت کر لینے کی درخواست کی۔ شیخ الہندؒ نے قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کا حکم فرمایا۔ شیخ الہند سے انتہائی عقیدت کی بنا پر انھیں کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونا چاہتے تھے لیکن شیخ الہندؒ بڑے اصرار کے ساتھ ان کو لے کر گنگوہ تشریف لے گئے اور حضرت گنگوہیؒ سے بیعت کرایا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے خود اپنی سوانح میں تحریر فرمایا ہے کہ بیعت سے پہلے حضرت شیخ الہندؒ کی محبت غالب تھی۔ مگر بیعت کے بعد حضرت گنگوہیؒ کی محبت بڑھنی شروع ہوئی۔ اور اتنی بڑھی کہ شیخ الہند کی محبت پر غالب آگئی لیکن شیخ الہند کی محبت میں بھی کمی واقع نہ ہوئی۔ بیعت کے بعد حضرت شیخ الاسلام کے والد نے اپنے اہل وعیال کے ساتھ حرمین شریفین کے حج وزیارت اور وہیں قیام کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس لئے ہندوستان میں آنے کے بعد قیام زیادہ نہ رہ سکا۔

حضرت گنگوہیؒ نے ان کو سلوک کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے پیر ومرشد حضرت

حاجی امداد اللہ کے حوالہ کیا۔ مکہ معظمہ پہنچ کر حضرت حاجی امداد اللہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے سلوک کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد مدینہ منورہ روانگی ہوئی۔ اور یہ پورا مقدس خاندان وہیں مقیم ہو گیا۔ حضرت حاجی صاحب سے مکہ معظمہ میں سلوک کی جو تعلیم حاصل کی تھی اس کی مشق مدینہ منورہ میں انتہائی محنت کے ساتھ جاری رکھی۔ اور حیرت ناک طریقہ پر ترقی فرماتے رہے۔ پہلے شروع میں حرم نبوی میں بیٹھ کر اشغال سلوک کا سلسلہ تھا۔ مگر اس کے اثرات اتنے زیادہ تھے کہ بدن میں حرکت ہوتی تھی اس لئے مسجد اجابۃ کے قریب جھاڑیوں میں بیٹھ کر ذکر کی مشق فرماتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ سے خط وکتابت جاری تھی۔ رابطہ قائم تھا۔ ترقی پر ترقی ہوتی رہی۔ اور کمالات سلوک اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ تک حاصل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت آیا کہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ہندوستان کا سفر کر کے گنگوہ شریف حاضری ہوئی اور وہاں کچھ دن فیض صحبت اپنے شیخ طریقت حضرت گنگوہیؒ سے حاصل فرماتے رہے۔ ایک شب خواب میں دیکھا کہ حضرت حاجی امداد اللہؒ تشریف لائے ہیں اور مدینے کی کھجوریں ساتھ لائے ہیں۔ وہ کھجوریں ان کو دے کر فرمایا کہ انھیں تقسیم کر دو۔ حضرت نے وہ کھجوریں حاضرین میں تقسیم کر دیں۔ یہ خواب حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں بیان فرمایا۔ تو انھوں نے یہ ارشاد فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب کی طرف سے آپ کو اجازت مل گئی۔ مگر میں ابھی اور محنت کراؤں گا ایک دن حضرت گنگوہیؒ کی پیٹھ دبا رہے تھے کہ بین النوم وَالیَقظَہ کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس میں ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ فرما رہے ہیں کہ حضرت گنگوہیؒ کے یہاں سے چالیس روز کے بعد اپ کو اجازت مل جائے گی۔ اس خواب کو حضرت گنگوہیؒ سے بیان نہیں فرمایا تاکہ طلب کا شبہ نہ پیدا ہو۔ اس خواب کے چالیس روز کے بعد حضرت گنگوہی نے ان کو اور ان کے بڑے بھائی کو فرمایا کہ آپ دونوں اپنے اپنے عمامے لایئے۔ یہ دونوں حضرات عمامے لائے حضرت گنگوہیؒ نے دونوں کے سروں پر وہ عمامے اپنے دست اقدس سے باندھ دیئے اور فرمایا کہ یہ عمامے کیسے ہیں۔ دونوں نے فرمایا۔ دستار فضیلت ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ نہیں۔ یہ

دستار خلافت ہیں۔ کہو کہ قبول کیا میں نے۔ خلافت و اجازت کا یہ طریقہ حضرت گنگوہیؒ کے یہاں نہیں تھا۔ یہ انوکھا طریقہ صرف انہیں کے ساتھ اختیار کیا گیا۔ چونکہ ان کے کمالات بھی انوکھے و نرالے تھے۔ اس کے بعد یہ فرمایا۔ آخری تعلیم جو مراقبے کی ہے جو آپ لوگوں کو دی گئی ہے۔ اس کی مثال سمندر کی ہے۔ اس سمندر میں غوطے کھاتے رہو۔ اسی سمندر میں پیر بھی غوطے کھار ہا ہے اور مرید بھی غوطے کھاتا رہے۔ اب پیر مرید سے بڑھ جائے یا مرید اپنے پیر سے آگے بڑھ جائے اس انوکھے کمالات والے مرید کے سامنے یہ انوکھی بات قابل غور ہے۔ شیخ الہندؒ کے فیوض اور شفقتوں نے ان کو جانشینِ شیخ الہند بنایا اور قطب الارشاد حضرت گنگوہیؒ کے فیوض و توجہات عالیہ نے قطب العالم بنادیا۔ اس کے بعد مدینہ منورہ واپسی ہوئی۔ اور درس و تدریس کا سلسلہ اتنا بڑھا کہ روزانہ بیس ۲۰ بیس بائیس ۲۲ بائیس سبق پڑھایا کرتے تھے۔ حلقۂ درس اتنا وسیع ہوا اتنا عام اور اتنا مقبول ہوا کہ حضرت امام مالکؒ کے بعد اس کے سوا کوئی نظیر نہیں ملتی۔ امام مالکؒ کی طرح ان کا حلقۂ درس بھی حرم شریف مسجد نبوی میں ہوتا تھا۔ اس کی برکت سے ہزار ہا اشخاص فیض یاب ہوئے۔ اس مقبولیت عامہ اور فضل خداوندی نے ان کو شیخ الحرم و استاذ العرب مشہور کیا۔ استاذ محترم ہندوستان سے مدینہ منورہ اپنے شاگرد کے پاس پہنچے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے انگریزوں کا تختہ الٹنے کے لئے ہند و بیرون ہند ایک عظیم تحریک جاری کر رکھی تھی۔ جس کی بنا پر انگریزی حکومت کا وارنٹ ان کی گرفتاری کے لئے جاری ہو چکا تھا۔ مگر حکومت ان کو گرفتار نہ کر سکی۔ اور گرفتاری سے پہلے ہی وہ ہندوستان سے نکل گئے۔ حاکم حرمین شریفین اس وقت شریف مکہ تھا۔ اس کے پاس انگریزوں کا آرڈر آیا کہ شیخ الہند ہمارا باغی و مجرم ہے جو تمہاری سلطنت میں جا کر مقیم ہے۔ فوراً گرفتار کر کے ہمارے حوالہ کر دو۔ چنانچہ شریف مکہ کا وارنٹ شیخ الہند کی گرفتاری کے لئے گورنر مدینہ کے پاس پہنچا۔ گورنر مدینہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا خاص شاگرد تھا۔ وہ حضرت کے پاس آیا اور کہا کہ آپ اپنے استاذ کو فوراً مدینے سے باہر کہیں پہنچا دیجئے۔ اس کے بعد میں شریف مکہ کو اطلاع دیدوں گا کہ وہ مدینہ میں نہیں ہیں

چنانچہ فوراً حضرت شیخ الہندؒ مکہ چلے آئے۔ متعدد رفقاء بھی ساتھ آئے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے اپنے ایک معزز شاگرد کے گھر میں روپوش کر دیا۔ شریف مکہ کو پتہ چل گیا۔ اس نے شیخ الہندؒ کے رفقاء پر ظلم شروع کیا۔ اور دباؤ ڈالا کہ وہ بتلادیں کہ شیخ الہند کو کہاں روپوش کیا ہے۔ شیخ الہندؒ کو جب معلوم ہوا کہ ان کی وجہ سے ان کے رفقاء پر ظلم ہو رہا ہے۔ تو اس محفوظ مقام سے باہر آگئے اور اپنے کو حکومت کے حوالہ کر دیا۔ شریف مکہ نے ان کو گرفتار کر کے جدہ بھیج دیا جہاں حکومت برطانیہ کا جہاز ان کو لینے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ حضرت مدنیؒ کو اپنے استاذ کی تنہا گرفتاری سے بہت غم ہوا۔ مکہ میں شریف مکہ کا ایک معتمد ماتحت حاکم تھا جو حضرت مدنیؒ کا شاگرد تھا۔ آپ نے اس سے کہا کہ حضرت شیخ الہند ہمارے استاذ ہیں۔ استاذ محترم میرے مہمان تھے۔ میرے استاذ تھے۔ انتہائی شفقت کی وجہ سے میرے پاس آئے تھے اور یہاں گرفتار ہو گئے۔ اور تنہا ان کو روانہ کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ میرا ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ میں ان کی خدمت کرسکوں۔ اور ان کی تنہائی کو دور کرسکوں۔ آپ کوشش کیجئے کہ میری بھی گرفتاری ہو جائے۔ اس حاکم نے کہا کہ وارنٹ آپ کے نام نہیں ہے۔ تو کیسے گرفتاری ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی مخالفت کی وجہ سے انگریزی حکومت نے ان کے نام وارنٹ جاری کیا تھا۔ جو دلی سے چل کر سہارنپور کے ضلع مجسٹریٹ کے پاس آیا۔ وہ مسلمان تھا اور حضرت شیخ الہندؒ کا مرید تھا۔ وہ وارنٹ لے کر دیوبند آیا اور اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ الہندؒ کو وہ وارنٹ دکھلایا اور مشورہ دیا کہ حضرت پہلی ٹرین سے بمبئی کے لئے روانہ ہو جائیں اور بمبئی سے جدہ کے لئے سفر فرمائیں۔ مجھ کو چوبیس ۲۴ گھنٹہ وارنٹ کے روک لینے کا اختیار ہے۔ چوبیس ۲۴ گھنٹہ کے بعد میں حکومت کو اطلاع دے دوں گا کہ حضرت شیخ الہند دیوبند میں نہیں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں فوراً دیوبند سے نکلے۔ بمبئی پہنچتے ہی اللہ کے فضل و کرم سے جدہ کے لئے جہاز مل گیا۔ جدہ پہنچ کر حضرت استاذ مدظلہ مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ اب حکومت برطانیہ نے اپنے یار وفادار شریف مکہ کے پاس آرڈر بھیجا کہ حضرت اس کے باغی ہیں اور مدینے میں مقیم ہیں ان کو فوراً گرفتار کر کے میرے

حوالہ کردو۔ چنانچہ شریف مکہ کا وارنٹ حضرت شیخ الہندؒ کے نام جاری ہو کر مدینہ منورہ کے گورنر کے پاس پہنچا۔ وہ بفضلہ تعالیٰ میرے شاگرد ہیں۔ انھوں نے آکر مجھ سے کہا کہ آپ کے استاذ کے نام گرفتاری کا وارنٹ آیا ہے۔ آپ ان کو فوراً مدینہ منورہ سے کہیں باہر بھیج دیں۔ میں چوبیس[۲۴] گھنٹے کے بعد شریف مکہ کو اطلاع دے دوں گا کہ شیخ الہند مدینہ منورہ میں نہیں ہیں۔ چنانچہ حضرت استاذ مدظلہ فوراً مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہم لوگ بھی ساتھ آئے اور یہاں ایک مخلص کے مکان میں روپوش کر دیا۔ مگر شریف مکہ کا ظلم وستم حضرت استاذ کے رفقاء پر جاری ہو گیا۔ اور اصرار ہوا کہ وہ بتلادیں کہ شیخ الہند کہاں ہیں۔ شیخ الہند کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کی وجہ سے ان کے رفقاء پر ظلم ہو رہا ہے تو وہ فوراً اس محفوظ مقام سے باہر آگئے اور اپنے کو حکومت کے حوالہ کر دیا۔ شریف مکہ نے ان کو آج ہی جدہ روانہ کر دیا ہے۔ حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ میں ایک ترکیب بتلاتا ہوں آپ شریف مکہ سے کہیں کہ سانپ کو مار ڈالنا اور اس کے بچہ کو چھوڑنا، اسی طرح آگ کو بجھا دینا اور چنگاری کو چھوڑ دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ سانپ کا وہ بچہ بڑا ہو کر ڈس لے گا۔ چنگاری بڑھ کر آگ بن سکتی ہے۔ حسین احمد کے ہزارہا شاگرد مکہ و مدینہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ شیخ الہند کا شاگرد ہے۔ استاذ کی گرفتاری کے بعد آپ کے خلاف بغاوت پھیلا سکتا ہے۔ اس لئے اس کو بھی گرفتار کر کے اس کے استاذ کے پاس جدہ بھیج دیں۔ چنانچہ اس حاکم نے شریف مکہ سے اسی طرح کہا وہ بغاوت کے نام سے ڈر گیا اور فوراً حضرت مدنی کے نام وارنٹ جاری کر کے جدہ کے لئے روانہ کر دیا۔ حضرت اپنے استاذ کے پاس جدہ پہنچے اور بہت خوش پہنچے کہ حضرت کی رفاقت اللہ نے نصیب کر دی۔ شیخ الہند آب دیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ تم نے کیوں اپنے کو مصیبت میں مبتلا کیا۔ حضرت مدنی نے فرمایا کہ آپ کو تنہا چھوڑنا میری غیرت کو گوارہ نہ ہوا۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ اور حتی الوسع خدمت کروں گا۔ برطانیہ کا جہاز ان لوگوں کو لے کر جزیرہ مالٹا کے لئے روانہ ہو گیا۔ مالٹا پہنچ کر حکومت کی زیر نگرانی ایک جگہ رسید کر دیئے گئے۔ حضرت مدنیؒ اپنے استاذ محترم کی شبانہ

بوم خدمت میں لگے رہتے تھے۔ ان کے لئے کھانا پکاتے تھے۔ کپڑے دھوتے اور بدن دبا کر سلاتے تھے۔ اور جب تک وہ سو نہ جاتے تھے خود نہیں سوتے۔ چھ مہینہ وہاں گذرنے کے بعد رمضان قریب آگیا تو حضرت شیخ الہند نے آہ سرد بھر کر فرمایا کہ اس رمضان میں تراویح اور تہجد میں قرآن سننے سے محرومی رہے گی۔ حضرت مدنی نے فرمایا کہ نہیں۔ محرومی نہیں رہے گی۔ تراویح میں بھی قرآن ہوگا اور تہجد میں بھی۔ شیخ الہند نے فرمایا کہ ہم میں سے کوئی حافظ تو ہے نہیں۔ کون پڑھے گا؟ کس سے سنا جائے گا؟ حضرت مدنی نے فرمایا کہ میں پڑھوں گا۔ حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ تم تو حافظ نہیں ہو۔ کیسے پڑھو گے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں حافظ ہو گیا ہوں یہاں آنے کے بعد ہی سے مجھ کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ رمضان میں قرآن پاک نہ سننے کا حادثہ رونما ہو اس لئے میں نے قرآن پاک روزانہ یاد کرنا شروع کر دیا تھا۔ آپ کو دوپہر کا کھانا کھلانے اور بدن دبا کر سلانے کے بعد میں جنگل کی طرف چلا جاتا تھا۔ اور قرآن پاک روزانہ یاد کرتا تھا۔ پھر ظہر کے وقت آجاتا تھا۔ اور آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہوتا تھا۔

اپنے استاذ کی خدمت اور صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو حفظ قرآن کی دولت عنایت فرمادی۔ الحمدللہ رمضان بہت پر کیف گذرا۔ جزیرہ مالٹا میں حکومت برطانیہ کے ماتحت مختلف ملکوں کے باغی وہاں موجود تھے۔ ایک جگہ بیٹھ کر آپس میں سیاسی گفتگو کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے حضرت شیخ الہندؒ سے کہا کہ جو طریقہ آپ نے اختیار فرمایا ہے اس زمانے میں یہ طریقہ کامیاب نہیں ہوگا۔ صرف مسلمان ہندوستان کے بغاوت کریں اور قریبی اسلامی ممالک کی طرف سے حملہ ہو۔ یہ کامیاب ہونے والی بات نہیں ہے بلکہ بہت کامیاب نسخہ یہ ہے کہ آپ ہندوستان میں ملی جلی ہوئی ایک جماعت بنائیں۔ جس میں ہر مذہب کے ماننے والے لوگ شریک ہوں۔ اور تشدد کے طریقہ کو نہ اپنائیں ورنہ کامیابی نہیں ہوگی۔ بلکہ عدم تشدد کا آئینی راستہ اختیار کیا جائے۔ ملے جلے ایجیٹیشن کئے جائیں۔ اسٹرائک کرائی جائے۔ حکومت کے سامنے مطالبہ پیش کئے جائیں۔ اور اس سلسلے کو مداومت کے ساتھ جاری رکھا جائے

توانشاء اللہ تحریک ضرور کامیاب ہوجائے گی۔ یہ بات حضرت شیخ الہند کی سمجھ میں آگئی۔ اور جب ان کی رہائی ہوئی۔ تو ہندوستان پہنچے۔ ان کے ساتھ حضرت مدنیؒ بھی تشریف لائے۔ اب لوگوں سے مل کر ملی جلی سیاسی جماعت بناکر تحریک شروع کردی۔ آپس میں مشورہ ہوا کہ کسی ایسے شخص کو اس جماعت کا لیڈر بنایا جائے جس پر سب متفق ہوسکیں۔ اور سیاسی بصیرت بھی رکھتا ہو۔ ہندوستان میں متعدد بڑے بڑے ہندو لیڈر تھے۔ سب کے نام سامنے آئے۔ مگر شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ ان کو لیڈر بنانے سے کام نہیں چلے گا۔ ان میں ہر ایک اونچی ذات اور برادری سے وابستہ ہیں۔ ان کو اگر لیڈر بنایا گیا تو یہ احسان مند نہ ہوں گے۔ بلکہ اپنا حق سمجھیں گے۔ گاندھی نام کے ایک لیڈر افریقہ سے ہندوستان پہنچے ہوئے تھے۔ افریقہ میں سیاسی تحریکات میں حصہ لیتے رہے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ گاندھی کو لیڈر بنایا جائے یہ بنیا ہے احسان مند ہوگا۔ اور یہاں کی پوری آبادی کے لئے مفید ہوگا۔ چنانچہ اس کو لیڈر تسلیم کیا گیا۔ اب یہ تجویز ہوئی کہ گاندھی کو پورے ملک میں دورہ کرایا جائے۔ تاکہ ہر جگہ روشناس ہوجائیں۔ اور مقبول عام لیڈر بن جائیں۔ حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ اس کے نام کے ساتھ مہاتما بھی لکھا اور بولا جائے۔ اب سوال یہ ہوا کہ پورے ملک میں دورہ کرانے کے لئے فنڈ کہاں سے آئے تو حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ خلافت تحریک کے سلسلہ کی بہت سی رقومات بچی ہوئی ہیں۔ ان کو اس کام صرف میں کیا جائے۔ چنانچہ پورے ملک میں مہاتما گاندھی کے دورے ہوئے۔ خالص اسلامی اور مذہبی دینی جماعت جمعیۃ علماء ہند تھی جو آزادی کی تحریک میں بھی سرگرم حصہ لیتی تھی۔ اور آزادی کی تحریک کو فریضہ جہاد حریت مانتی تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے بڑے لیڈر مہاتما گاندھی ہوئے اور جمعیۃ علماء ہند کے سرپرست حضرت شیخ الہند ہوئے۔ ملک میں جابجا جلسے ہونے شروع ہوئے۔ اس طرح کہ کانگریس کا جلسہ بھی ایک پنڈال میں ہوتا تھا اور وہیں دوسرے پنڈال میں جمعیۃ علماء ہند کا جلسہ ہوتا تھا۔ جمعیۃ علماء ہند جو تجاویز پاس کرتی تھی وہی تجاویز کانگریس بھی پیش کرکے منظور کرتی تھی۔ اسی طرح سیاسی

تحریک آگے بڑھتی رہی۔

حضرت شیخ الہندؒ اب بہت بیمار رہنے لگے اور کچھ عرصہ کے بعد وصال فرمایا۔ حضرت مدنیؒ تو مدنی تھے۔ مدینہ میں ان کا پورا خاندان آباد تھا۔ تقریباً آدھا مدینہ انہیں حضرات کے زیر اثر تھا۔ اور آج تک ہے۔ ہندوستان تشریف آوری استاذ کی رفاقت کی وجہ سے ہوئی۔ اور یہاں ان کے ساتھ مل کر جہاد حریت کی تحریک میں شریک ہو گئے۔ انگریزوں نے ان حقانی علماء کو بدنام کرنے کی طرح طرح سے تدبیریں کیں۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کو اپنا منظور نظر بنا کر مقابل میں کھڑا کر دیا۔ وہ انگریز زدہ مسلمان رات دن علماء کے خلاف پروپیگنڈوں میں لگ گئے۔ کانگریس جو ملی ہوئی جماعت تھی اور ہے۔ اس کو ہندو جماعت مشہور کیا اور جو علماء کرام کانگریس میں شریک تھے ان کو ہندوؤں کا غلام اور کانگریس سے روپیہ پانے والا اور اس کے ٹکڑوں پر پلنے والا جھوٹا اور گھناؤنا پروپیگنڈہ شروع کیا۔ جیسے جیسے انگریز کمزور ہوتا گیا انگریزی پروپیگنڈہ مشنری مخالفت کی ناپاک صورتیں اختیار کرتی چلی گئی۔ ہمارے علماء فرماتے کہ کانگریس تو اب قائم ہوئی ہے اور ہماری تحریک آزادی تو پہلے سے جاری ہے۔

ے ہم اکیلے ہی چلے تھے جانب منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

حضرت مدنیؒ اس تحریک حریت میں ابتداءً تو اپنے استاذ محترم کی معیت و رفاقت کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ لیکن استاذ محترم کے وصال کے بعد بڑے شد و مد اور جوش و خروش کے ساتھ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں لگ گئے۔ انگریز مشنری کی طرف سے ان کی مخالفت کا طوفان اٹھایا گیا اور انگریز زدہ ذہن و دماغ والے مسلمان ان کے پیچھے لگ گئے۔ "ہندوؤں کا غلام ہے، کانگریس کا ایجنٹ اور تنخواہ دار ہے اور مسلمانوں کا دشمن" وغیرہ وغیرہ من الخرافات۔ حضرت مدنیؒ فرماتے تھے کہ میں اس تحریک کو اپنا مذہبی اور دینی فریضہ سمجھتا ہوں۔ یہ تحریک آزادی ہمارے لئے فریضہ جہاد حریت ہے۔ ہم انگریزوں سے

جہاد کر رہے ہیں۔ جو ہمارا مذہبی فرض ہے۔ اگر ہندو ہمارا ساتھ دیتے ہیں تو بڑی خوشی کی بات ہے۔
انسان تو پھر بھی انسان ہے۔ اگر کتے اور سور بھی ہمارے اس مقصد میں ہمارا ساتھ دیں گے
اور انگریزوں کو کاٹ کاٹ کر بھگانے کا وعدہ کریں گے تو ہم ان کو بھی اپنے ساتھ لینے میں کوئی
دریغ نہ کریں گے۔ حضرت مدنیؒ اپنی تقریروں میں ایک حدیث پڑھا کرتے تھے ”افضل
الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر“ ظالم حکومت کے مقابلہ میں کلمہ حق کو بلند کرنا افضل
جہاد ہے۔ جیسے جیسے یہ تحریک زور پکڑتی گئی انگریزوں کی بوکھلاہٹ بڑھتی چلی گئی۔
ہندو مسلم منافرت کی آگ ملک کے اندر انگریزوں نے خوب خوب بڑھائی۔ اور آپس
میں خوب جھگڑے پیدا کئے۔ حضرت مدنیؒ کی ہر تقریر انگریزوں کی مخالفت سے بھری ہوتی
تھی۔ انگریزی حکومت کا نام اپنی تقریروں میں اس طرح لیتے تھے کہ ”ہماری مہربان گورنمنٹ
ہم پر بہت مہربان ہے۔ ہم کو آپس میں لڑاتی ہے اور خود فیصلہ کرنے بیٹھ جاتی ہے۔ اس
کی پالیسی ہے یہ کہ لڑاؤ اور حکومت کرو“۔ جامع مسجد دیوبند میں ایک جمعہ کے بعد حضرت
نہایت پرجوش تقریر فرما رہے تھے۔ فرمایا کہ اس تحریک میں ابتداءً تو مجھ کو حضرت شیخ الہندؒ
نے لگایا۔ مگر اب علی وجہ البصیرت میں اس میں شریک ہوں۔ اور اس کو میں اپنا مذہبی اور
ملی فریضہ سمجھتا ہوں۔ حکومت کی لڑاؤ اور حکومت کرو والی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے ہنس کر
فرمایا کہ ”ہماری مہربان گورنمنٹ تو شیرہ لگاتی ہے۔ لڑائی میں لڑنے والے خود لڑتے ہیں۔
فرمایا کہ ایک بزرگ عالم کی ملاقات شیطان سے ہو گئی۔ اس سے انھوں نے فرمایا کہ تیرے
متعلق قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ تو انسانوں کے درمیان لڑائی جھگڑے کراتا ہے۔ اس
نے کہا۔ نہیں حضور میں نہیں کراتا ہوں۔ لوگ خود لڑتے ہیں۔ آئیے آپ کو تماشہ دکھلاؤں
شیطان ان کو لے کر آگے بڑھا۔ ایک حلوائی کی دکان پر ایک بڑے کڑاہ میں شیرہ بھرا پڑا تھا۔
شیطان نے ایک انگلی میں شیرہ ڈال کر تھوڑا سا اٹھا لیا۔ اور آگے بڑھا۔ ایک بنیئے کی دکان
پر پہنچ کر اس کی دیوار پر وہ شیرہ لگا دیا۔ شیرہ لگنے کے بعد اس پر چند مکھیاں آکر بیٹھیں مکھیوں

کو بیٹھا ہوا دیکھ کر ایک مرغ اچھلا اور مکھیوں کو اپنی چونچ میں دبالیا۔ محلے میں ایک شخص کی بلی وہاں موجود تھی۔ اس نے مرغ کو اچھلتے ہوئے دیکھا تو اس کا دل بھی اچھلا اور اس بلی نے مرغ کو دبوچ لیا۔ بلی کے منہ میں مرغ کو دیکھ کر پڑوس کا ایک کتا اچھلا اور بلی کو آکر دبا لیا۔ اب جس کا مرغ مارا گیا تھا وہ بلی والے سے لڑنے لگا۔ اور جس کی بلی ماری گئی تھی وہ کتے والے سے لڑنے لگا۔ یہاں تک کہ خوب خون خرابہ ہوا۔ شیطان وہاں سے ہٹ کر بولا کہ مولانا! دیکھئے میں نے تو صرف شیرہ ہی لگایا تھا۔ میں نے کیا لڑائی کرائی؟ لڑائی تو لڑنے والوں نے خود کی"۔ حضرت نے فرمایا کہ اسی طرح ہماری مہربان گورنمنٹ بھی شیرہ لگاتی ہے۔ لڑاتی نہیں ہے۔ لڑائی تو خود لڑنے والے کرتے ہیں۔

بحرحال تحریک زور پکڑتی چلی گئی اور انگریز کمزور ہوتا چلا گیا۔ جب حکومت کو یقین ہو گیا کہ اس کو ہندوستان چھوڑنا ہی پڑے گا تو اس نے جاتے جاتے اس ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کمزور کر دینے کا منصوبہ بنایا اور ہندوؤں کا ظلم و ستم بیان کر کے مسلمانوں کو پاکستان کے نام پر ابھارا۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ ہماری مہربان گورنمنٹ کا قاعدہ ہے کہ جب کسی ملک سے جاتی ہے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کو کمزور بنا کر جاتی ہے۔ یہی تدبیر ہندوستان کے متعلق بھی کی جا رہی ہے۔ انگریزوں نے اپنے ہم نوا مسلمانوں کو سمجھایا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ان صوبوں میں مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیئے۔ اگر متحدہ ہندوستان میں یہ صوبے شریک ہو گئے تو ان کے حقوق بھی پامال ہو جائیں گے لہذا تقسیم ہند کا ایک نقشہ بنایا گیا اور ان صوبوں کی حکومت کا نام حکومت پاکستان رکھا گیا۔ اور ان صوبوں کے مجموعہ کو ملک قرار دے کر اس کا نام پاکستان رکھا گیا۔ انگریز نے یہ سمجھ لیا کہ اس کے قدم یہاں نہیں جم سکتے اور اس ملک کو چھوڑنا ہی پڑے گا تو جتنا بھی ممکن ہو اس کو کمزور کر کے ہٹو۔ پھر اس نے ملک کی آزادی کا وعدہ کر لیا۔ اور اپنا ایک مشن ہندوستان بھیجا۔ جس کو کرپس مشن کہتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ظاہر کیا کہ ہندوستان کے لوگ کس قسم کی

حکومت چاہتے ہیں۔ اس کو معلوم کیا جائے۔ چنانچہ تقسیم کا مطالبہ کرنے والے اپنا فارمولا لے کر پہنچے اور مشن کے سامنے پیش کیا۔ متحدہ حکومت کے چاہنے والوں نے بھی اپنا فارمولا پیش کیا۔ انھیں میں ایک مدنی فارمولا بھی تھا۔ جس کو لے کر حضرت مدنیؒ تشریف لے گئے تھے۔ وہ فارمولا اگر منظور ہو گیا ہوتا تو پورا ہندوستان ایک مضبوط ملک ہوتا اور ہر صوبہ محفوظ ہوتا۔ مدنی فارمولے میں پہلی بڑی بات تو یہ تھی کہ ہر صوبہ اپنے داخلی معاملات میں آزاد و خود مختار ہوگا مرکز کو اس میں دخل اندازی کا حق نہ ہوگا۔ مرکز کے ہاتھ میں بعض مرکزی امور ہوں گے مثلاً ریلوے، ڈاکخانہ وغیرہ۔ اور مرکزی حکومت کے لیے بھی یہ فارمولا بہت عجیب وغریب تھا۔ وہ یہ کہ مرکز میں جو ملی جلی ہوئی حکومت ہوگی اس میں نمائندے اس طرح لئے جائیں گے کہ پینتالیس ۴۵ ہندو، پینتالیس ۴۵ مسلمان اور دس دیگر اقلیتیں۔ مدنی فارمولے نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر نمائندگی کیوں ملے گی۔ حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ مسلمان اقلیت میں نہیں ہیں۔ دس بارہ ۱۲ کروڑ کی تعداد اقلیت نہیں ہو سکتی ہندوستان میں دو اکثریتیں ہیں اور دیگر اقلیتیں بہت زیادہ اقلیت میں ہیں۔ اس لئے ان سب کے مجموعہ کی نمائندگی کے لئے دس کی تعداد کافی ہے۔ کرپس مشن نے سارے فارمولے لے لئے۔ اور آزادی کا وعدہ کر لیا مگر شرط یہ ہے کہ پہلے الکشن ہوگا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ متحدہ ہندوستان کی طلب والے مسلمان زیادہ ہیں یا تقسیم کے طلبگار زیادہ ہیں۔

چنانچہ الکشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اور پورے ملک کے عملے۔ بڑے بڑے کالجوں کے پروفیسر اور اسٹوڈنٹس سب اس میں لگا دیئے گئے تاکہ حکومت کی منشا کے مطابق پروپیگنڈے کو تیز کریں۔ چنانچہ الکشن ہوا اور اس میں وہ سب کچھ ہوا جس کا ہونا شرمناک تھا۔ حضرت مدنیؒ پر ہر جگہ حملے ہوئے۔ انگریز زدہ مسلمانوں نے ان کی تذلیل و توہین و ایذا رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مگر یہ اللہ والا مجاہد جلیل سب کچھ ہنس ہنس کر سہتا رہا۔ اور اپنی تقریروں میں یہی کہتا رہا کہ ہمارے بھائی جو ہم پر حملے کرتے ہیں ہم کو ان سے کوئی شکایت نہیں۔ لڑائی

ہماری تو انگریز سے ہے۔ جو لوگ نازیبا حرکتیں کر رہے ہیں وہ انگریز کے اشارے پر کر رہے ہیں۔ وہ تو کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں۔ ان کی حرکت اپنی نہیں ہے۔ کٹھ پتلی کے پیچھے جن کے ہاتھ میں تار ہے اصل اشارہ انھیں کا ہے۔ کٹھ پتلیاں تو ناواقف ہوتی ہیں۔

ٹونیشن تھیوری (Two Nation) یعنی دو قومی نظریہ انگریزوں نے گھول کر دونوں قوموں کو خوب خوب پلایا۔ اور اس کے وفاداروں نے اس کا خوب پروپیگنڈہ کیا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ ہندوستان کی دونوں قومیں یعنی ہندو اور مسلمان دونوں الگ الگ قومیں ہیں۔ ان دونوں میں کسی مسئلہ کے اندر اتحاد و اتفاق ناممکن ہے۔ اس کے خطاب یافتہ سر، خان بہادر، راجہ، مہاراجہ، بڑے بڑے زمیندار، عہدہ دار، دنیاوی حیثیت سے باوقار اور اس کے نمک خوار وکلاء اور بیرسٹر سب کے سب اس تھیوری کے پھیلانے میں لگ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں میں تعصب، افتراق، منافرت اور جنگ وجدال کا جذبہ خوب خوب بڑھا۔ حضرت مدنیؒ نے بھی اس تھیوری کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ایک ملک کے رہنے والے سب ایک قوم ہیں۔ آپس میں مل جل کر اپنے ملک میں رہنے کا ہر ایک کے اندر جذبہ ہونا ضروری ہے۔ قومیت کے مختلف رابطے ہیں۔ ایک مذہب کے ماننے والے آپس میں ایک قوم ہیں۔ اور ایک وطن کے رہنے والے بھی وطنیت کی حیثیت سے ایک قوم ہیں۔ حضرت مدنیؒ نے کسی بڑے جلسہ کے اندر اس مسئلہ پر تقریر فرماتے ہوئے یہ فرمایا کہ آج کل قومیں اوطان سے ہیں۔ اس تقریر کو ٹونیشن تھیوری والوں نے بہت غلط انداز سے پھیلایا اور بہت مخالفانہ پروپیگنڈے کئے۔ چنانچہ ڈاکٹر سر اقبال مرحوم نے بھی جو انگریز کے خطاب یافتہ تھے حضرت مدنی کے خلاف بہت غلیظ اور گھناؤنی نظم شائع کی۔ جس کا ایک مصرعہ یہ ہے۔ ؎ سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است۔ اسی کا ایک مصرعہ بہت گندہ اور پر از فتنہ یہ بھی ہے۔ ؎ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست۔ اور بھی دوسرے گندے گندے اشعار تھے جو حافظہ میں محفوظ نہیں ہیں۔ اس نظم میں پورے ملک میں آگ لگ گئی۔ دشمنوں نے اس کو آلہ کار بنایا اور دوستوں میں انتہائی بے چینی پھیلی۔ سب سے پہلے اس کا جواب

اقبال سہیل مرحوم نے نظم ہی میں دیا۔ وہ بڑی شاندار نظم تھی اور ڈاکٹر اقبال کا ترکی بہ ترکی جواب بھی۔ اس کے بعد پورے ملک میں اس جواب کا سلسلہ ہر جگہ جاری ہوا۔ ہر جگہ سے ڈاکٹر اقبال کے جواب میں نظمیں لکھ کر ڈاک سے ان کے پاس بھیجی گئیں۔ میں اس وقت دار العلوم دیوبند میں پڑھتا تھا۔ دار العلوم کے اساتذہ وطلبہ میں بھی انتہائی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں کے ایک بڑے استاذ حضرت مولانا شمس الحق صاحب پشاوری نے بھی ایک بڑی عمدہ نظم لکھی اور ڈاکٹر اقبال کو بھیجی اور وہ اخباروں میں بھی چھپی۔ میں نے بھی ایک نظم لکھی تھی اس کا صرف ایک مصرعہ یاد ہے یعنی ؎ کہ گفت برسر منبر کہ ملت از وطن است۔ (کس نے کہا منبر سے کہ ملت وطن سے ہے) ملت وطن سے بنتی ہے یہ حضرت مدنی نے نہیں فرمایا تھا ملت تو مذہب کو کہتے ہیں۔ بلکہ یہ فرمایا تھا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اقبال نے اس کو غلط طور پر پیش کیا۔ پورے ملک سے جوابی نظمیں جو ڈاکٹر اقبال کے پاس پہنچیں اور ان کا ڈھیر وانبار لگ گیا تو وہ گھبرا اٹھے اور اخبار میں معذرت نامہ شائع کیا کہ جن لوگوں نے مولانا مدنی کی حمایت میں نظمیں لکھی ہیں ان کے دلوں میں مولانا کا جتنا احترام ہے اس سے کم میرے دل میں نہیں۔ بہرحال انگریزوں کا پھیلایا ہوا یہ زہر پورے ملک کو مار کر رہا۔ اور الکشن جو ہوا اس میں اسی دو قومی نظریہ کا نتیجہ ظاہر ہوا۔ الکشن اگر آزادانہ ہوتا تو بھی ہرگز ہرگز یہ خراب نتیجہ نہ نکلتا مگر صورت حال یہ تھی کہ انگریز کے سارے وفادار، نمک خوار، خطاب یافتہ اور کوٹ کچہریوں کے سارے عملے اس الکشن میں انگریزی نظریہ کو کامیاب بنانے میں لگ گئے۔ انتہائی تشدد اور غنڈہ گردی کے ساتھ الکشن ورک ہوا جس کا نتیجہ وہی ہوا جو نہ ہونا چاہیئے تھا۔ افسوس پروپیگنڈے کے جادو سے متاثر ہو کر لوگوں نے عقل وخرد کو گم کر دیا۔ صحیح اور غلط کی تمیز اٹھ گئی۔ اور سچا ہمدرد رہنما کون ہے اور غلط رہنمائی کرنے والے کون ہیں اس کا فرق اٹھ گیا۔ تقسیم ہند کا حادثہ پیش آیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء آزادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اور اس تاریخ سے ایک دن پہلے ان کے وہ رہنما جو ان کو اپنے زیر اثر دیوانہ بنائے

ہوئے تھے۔ سب کے سب راتوں رات کراچی روانہ ہو گئے۔ اور یہاں فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پاکستان کا دارالسلطنت کراچی بنا اور اس کی پوزیشن یہ تھی کہ وہاں اس سے پہلے جب بھی الکشن ہوا تو کانگریس ہی کامیاب ہوئی۔ اس لئے اس پوزیشن کو ختم کرنے کیلئے نواکھالی میں سخت فساد کرایا گیا۔ اس کے نتیجہ میں جوابی فساد بہار میں بہت سخت ہوا۔ اور فرقہ پرست ہندو لیڈروں کے بہار میں نعرے یہی تھے کہ نواکھالی کا بدلہ۔ بہار میں اس شدید ترین فساد کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں فسادات کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ مظلوموں کی آنکھیں اپنے ہمدرد رہنماؤں کو جن پر انھوں نے بھروسہ کیا تھا تلاش کرتی تھیں۔ مگر نہ پاتی تھیں۔ وہ سب کے سب تو پاکستان پہنچ چکے تھے۔ اس وقت یہ شعر پوری طرح صادق آرہا تھا۔

مری نماز جنازہ پڑھائی غیروں نے
مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے

مگر یہاں تو حال یہ تھا کہ وہ وضو بھی نہ کرتے رہے بلکہ لاشوں کو تڑپتا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کی ہمدردی میں رونے والا، خبر گیری کرنے والا، امداد و اعانت میں دوڑنے والا وہی سچا پکا ہمدرد رہنما اللہ والا حسین احمد مدنی تھا اور ان کے رفقار کار تھے۔ جنھوں نے جان کی بازی لگادی اور ہر طرح کی ریلیف بہم پہنچائی۔ امدادی کیمپ لگائے۔ اور ملک کے حالات کو بدلنے کے لئے سروں کو ہتھیلیوں پر لے کر بھڑکتی ہوئی آگ میں کود پڑے اور ہر ممکن کوشش کی کہ حالات بدل جائیں اور امن وامان قائم ہو۔ ان فسادات کے نتیجہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ اور وہ پاکستان بھاگنا شروع ہو گئے۔ حضرت مدنی نے اپنی قوت ایمانی اور جذبۂ روحانی سے کام لے کر بھاگنے والوں کے قدم جمائے۔ ہر جگہ پہنچے اور صبر کی تلقین کی اور ہمت دلائی۔ مایوسیاں دور کیں۔ جہاں جہاں پہنچتے بڑے بڑے جلسے ہوتے تھے، ان میں ہمت افزا تقریریں فرماتے تھے۔ تقریباً ہر جگہ یہ فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، صبر کرو، ہمت سے کام لو۔ اپنا وطن چھوڑ کر مت بھاگو۔ کروڑوں کی تعداد میں تم ہو۔ کم نہیں ہو۔ گھبرانے کی کوئی

بات نہیں. حالات بدل جائیں گے۔ اللہ کی مدد ظاہر ہوگی۔ تم ابتداءً کسی پر حملہ نہ کرو اور اگر کوئی حملہ آور تم پر چڑھ آئے تو تم بھاگنے کے بجائے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرو۔ اتنا مارو اتنا مارو کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ اس جملہ سے غیر مسلم حضرات ہر جگہ تلملا اٹھتے تھے۔ مگر حضرت مدنیؒ کا جوش ایمانی تھا، ہمت تھی جوان سے یہ کہلا رہی تھی۔ اور یہ کوئی غیر قانونی بات بھی نہ تھی حکومت کا قانون بھی یہی ہے کہ کسی پر اگر کوئی حملہ آور چڑھ کر آجائے تو مظلومین کو مقابلہ کا پورا پورا حق ہے۔ الحمد للہ حضرت مدنیؒ کی یہ انتھک کوشش بارآور ہوئی اور بھاگنے والوں کے قدم جم گئے۔ بزدلی دور ہوئی اور صبر وسکون پیدا ہوا۔

حضرت مدنیؒ مالٹا سے آنے کے بعد جن سیاسی تحریکوں میں مصروف ہوئے ان کا مختصر ذکر یہاں تک کیا گیا۔ اس کے علاوہ درس و تدریس، تعلیم علوم دینیہ، دعوت و تبلیغ، بیعت و ارشاد و تلقین کی خدمات کا بہت بڑا سلسلہ تھا جو حضرت مدنیؒ کے دامن سے وابستہ تھا کلکتہ میں حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور اس کے لئے حضرت شیخ الہندؒ سے حضرت مدنی کو طلب کیا۔ حضرت شیخ الہند نے ان کو اس مدرسہ کی خدمت کے لئے کلکتہ بھیج دیا جہاں صدر المدرسین اور شیخ الحدیث کی حیثیت سے حضرت مدنیؒ کام کرتے تھے۔ اسی مدرسہ میں عبدالرزاق ملیح آبادی ایڈیٹر آزاد ہند اخبار کلکتہ بھی کام کرتے تھے۔ پھر سلہٹ میں ایک مدرسہ قائم ہوا۔ وہاں کی خدمت کے لئے شیخ الہندؒ نے حضرت مدنیؒ کو روانہ فرمایا۔ وہاں خدمت دین دعوت و تبلیغ، بیعت و ارشاد و تلقین کا کام خوب خوب انجام پایا۔ یہاں تک کہ ایک وقت آیا کہ دارالعلوم دیوبند میں بہت بڑی اسٹرائک ہوئی اور اس کا زور اتنا زیادہ ہوا اور اخباری پروپیگنڈے اتنے زیادہ ہوئے کہ پورے ملک میں یہ اندیشہ عام ہو گیا تھا کہ اب دارالعلوم ٹوٹنے والا ہے۔ اس وقت دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حافظ احمد صاحب اور نائب مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور سرپرست حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے حالات سے مایوس ہو کر حضرت تھانوی سے عرض کیا کہ

دارالعلوم کو سنبھالنے کے لئے اب اس وقت مولانا حسین احمد مدنی کی ضرورت ہے۔ وہ شیر اسلام، مجاہد ملت، صاحب فراست، صاحب تقویٰ و ذکاوت، متبحر عالم، امام حدیث، ماہر درس و تدریس، صاحب شریعت و طریقت اور دین کی بے لوث خدمت کرنے والے اور نہایت بہادر و جری ہیں۔ ان کو اگر بلایا جائے تو وہ اس فتنۂ عظیم کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور دارالعلوم دیوبند ٹوٹنے سے بچ سکتا ہے۔ حضرت تھانویؒ نے پرزور تائید کی۔ مولانا حبیب الرحمان صاحب نے عرض کیا کہ ان کی کچھ شرطیں ہیں ان کو منظور کیا جائے گا تبھی وہ آسکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ تعلیم کے علاوہ دعوت و تبلیغ، ارشاد و تلقین اور جہاد حریت کے لئے وہ سفر کرنے میں آزاد ہوں گے۔ ایام غیر حاضری کی تنخواہ کٹوادیں گے اور غیر حاضری کے زمانہ میں جو تعلیمی نقصان ہوگا اس کی تلافی حاضری کے زمانہ میں اپنی محنتوں سے کردیں گے وغیرہ وغیرہ۔ مولانا تھانویؒ نے فرمایا کہ ایک سادہ کاغذ دستخط کر کے ان کے پاس بھیج دو اور لکھ دو کہ جتنی شرطیں بھی وہ چاہیں اس پر لکھ دیں وہ سب منظور ہیں۔ فوراً تشریف لائیں چنانچہ حضرت مدنیؒ دارالعلوم میں تشریف لے آئے۔ اور فتنے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اسٹرائیکیوں کی ہمت پست ہوگئی ان لوگوں نے اہتمام کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے اخباروں میں اہل ملک سے اپیل کی تھی کہ وہ حساب فہمی کا مطالبہ دارالعلوم سے کریں۔ مشہور ہوا کہ فلاں تاریخ کو فلاں ٹرین سے ملک کے بڑے لیڈر مولانا محمد علی جوہر مرحوم دارالعلوم میں حساب فہمی کے لئے تشریف لا رہے ہیں حضرت مدنیؒ اسٹیشن پر پہنچے۔ ٹرین سے مولانا موصوف کو اتارتے ہوئے فرمایا کہ مولانا آپ اور دارالعلوم کی حساب فہمی؟ مولانا محمد علی مرحوم حضرت مدنی کے شاگرد تھے۔ کراچی جیل میں حضرت کے ساتھ تھے اور حضرت سے ترجمہ کلام پاک پڑھا تھا۔ حضرت کا یہ سوال سن کر قدموں پر گر پڑے اور کہا کہ حضرت میں آپ کی زیارت کے لئے آیا ہوں۔ حساب فہمی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ آپ میرے مہمان ہیں۔ میرے ساتھ میرے گھر چلیئے۔ حضرت ان کو اپنے گھر مدنی منزل میں لائے۔ اور خاطر مدارات کر کے اسٹیشن

پہنچا دیا۔ دار العلوم میں اسٹرائیکیوں کے جگہ جگہ جلسے ہوتے تھے۔ حضرت ہر جگہ جلسہ کے وقت سے چند منٹ پہلے پہنچ کر ڈائس پر قابض ہو جاتے تھے۔ اسٹرائیکی جب پہنچتے تھے تو دور سے حضرت مدنی کو بیٹھا ہوا دیکھ کر مرعوبیت کے ساتھ واپس پلٹ جاتے تھے۔ ڈائس پر آنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ اور حضرت مدنی وقت شروع ہونے کے بعد دار العلوم کی حمایت میں بہت پر جوش اور پر زور تقریر فرماتے تھے۔ واضح ہو کہ یہ اسٹرائیکی حضرات معمولی آدمی نہیں تھے بلکہ بڑے بڑے علماء، مدرسین، محدثین اور رجاد داثر مقررین تھے۔ مگر یہ شیر خدا سب سے بلند و بالا تھے۔ اس لئے ان کے سامنے آتے ہوئے سب ڈرتے تھے۔ چنانچہ اسٹرائیکی دیوبند چھوڑ کر بھاگے اور اخباری پروپیگنڈے بھی ختم ہو گئے۔ اور اسٹرائیک کی تحریک بند ہو گئی۔ دار العلوم نئے سرے سے زندہ ہوا۔ اور یوماً فیوماً ترقی کرتا رہا۔ حضرت مدنی کے فیض سے تھوڑے دنوں میں دار العلوم دیوبند عالم اسلام کا واحد دینی، علمی و روحانی مرکز بن گیا۔
دار العلوم کے ذریعہ حضرت مدنی کے لاکھوں شاگرد پیدا ہوئے۔ ہزارہا مجاہدین حریت نکلے۔ جو سب کے سب پورے ملک میں دین اور علم دین کی اعلیٰ سے اعلی خدمات کی انجام دہی میں لگ گئے اور جہاد حریت کا کام بھی بڑے اعلی پیمانے پر انجام دیا۔ پورے ملک میں ہر جگہ مدارس اسلامیہ اور مراکز روحانیہ کے جلسوں کے لئے حضرت بلائے جاتے تھے۔ ہر جگہ حضرت پہنچ کر اپنے علمی و روحانی فیوض سے وہاں کی زمین کو پر نور بنا دیتے تھے۔ بیعت اور ارشاد و تلقین کا کام بھی سفر و حضر میں ہر جگہ زیادہ سے زیادہ انجام دیا جا رہا تھا۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اپنی کتاب آپ بیتی میں تحریر فرماتے ہیں کہ میں کبھی بے پیرا نہیں رہا۔ اپنے پیر و مرشد کے وصال کے بعد حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری سے بیعت حاصل کر کے ان کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے حضرت مدنی کی طرف رجوع کیا۔ اور جب حضرت مدنیؒ تشریف لاتے تھے تو میں نے اپنے تمام معمولات کو ترک کر کے ان کی خدمت میں بیٹھنے ہی کو اپنا معمول بنا لیا تھا۔ اسی کتاب میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت مدنی جب تشریف

لائے تو میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور ان کا دامن پکڑ لیا اور عرض کیا کہ آج آپ سے لڑنا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ ہاں ہاں مجھ بڈھے سے تم لڑوگے۔ کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت گنگوہیؒ نے جو دولت آپ کو عنایت فرمائی ہے اس کی تقسیم کا کام کرنے کے بجائے آپ سیاسی کاموں میں لگے رہیں گے؟ حضرت نے فرمایا کہ میں وہ کام بھی کرتا ہوں۔ چنانچہ پھر حضرت کا معمول یہ ہو گیا کہ سہارن پور سے جب بھی گذر ہوتا یہاں اتر کر میرے غریب خانہ پر تشریف لاکر مسترشدین و متوسلین کے اونچے اونچے احوال کے چند سطور میرے حوالہ کر دیتے۔ جن کو دیکھ کر میں حیران رہ جاتا کہ یا اللہ ان ظاہری مصروفیات کے باوجود روحانی خدمات کتنے اعلیٰ درجہ کے ساتھ انجام پا رہے ہیں۔ چنانچہ کوئی صوبہ اور کوئی خطہ ملک کا ایسا نہ تھا جو ان کے روحانی فیوض سے مالامال نہ ہوا ہو۔

حضرت مدنیؒ کے مجازین و خلفاء ہر صوبے میں پھیلے ہوئے ہیں جو روحانی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

سیاسی خدمات کے سلسلے میں آزادی کے بعد مسلمانوں کی ترقی کا ایک فارمولا مرتب فرمایا تھا۔ جن پر مسلمان اگر عمل کرتے تو ان کی بہت سی مشکلات کا حل نکل آتا۔ اقتصادی ترقی کے سلسلے میں اصول مقرر فرمایا تھا کہ اب مسلمان یہ طے کر لیں کہ جو چیزیں بازار میں مسلمان دکانداروں سے مل سکتی ہوں وہ دوسری جگہ سے نہ خریدیں اور جو متمول حضرات ہیں وہ بطور امانت کے اور بطورِ قرض کے چھوٹی پونجی والے تاجروں کو پونجی عنایت کریں کہ وہ اپنے کاروبار کو ترقی دیں اور جو بیکار ہیں ان کو سرمایہ دے کر کاروبار میں لگائیں۔ بڑے کارخانے قائم کریں جن میں مسلمان ورکروں کو جگہ عنایت کریں۔ اس طرح مسلمانوں کی اقتصادی ترقی ہو سکتی ہے اور جو دولت مند حضرات ہیں وہ چار چار شادیاں کریں۔ اسی طرح دس سال کے اندر یہ اقلیت اکثریت سے بدل سکتی ہے۔ اور اقلیت و اکثریت کا مسئلہ بڑے پیمانے پر حل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کے دس اصول مرتب فرمائے تھے۔ کاش کہ مسلمان ان پر عمل کرتے اور ہر طرح کی اقتصادی

اور عددی اقلیت کی مصیبت دور کر سکتے۔

یورپ کے کسی نجومی نے یہ پیشین گوئی شائع کی تھی کہ ۱۹۵۷ء میں سارے عالم کا ایک سب سے بڑا شخص دنیا سے اٹھ جائے گا۔ لوگوں کے اذہان عالم کے بڑے بڑے دنیاوی مقتدر ارباب حکومت اور اصحاب شوکت کی طرف منتقل ہو رہے تھے کہ ان میں سے کوئی شاید اٹھ جائے گا مگر آہ ۱۹۵۷ء آیا اور عجیب غم و اندوہ کا پیغام لایا۔ یعنی حضرت مدنی قدس اللہ سرہ العزیز دنیا سے اٹھ گئے۔ دنیا اندھیری ہو گئی۔ مسلم، غیر مسلم، اہل ہند اور اہل عالم میں کہرام مچ گیا اور ہر جگہ سب نے یہ محسوس کیا کہ زمین ہلکی ہو گئی ہے۔ اس کا وزن ختم ہو گیا ہے۔ اور اب اتنی اونچی اور بلند شخصیت کا نعم البدل تو کیا بدل بھی حاصل ہونا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اب وہ تو چلے گئے اور ان کا کام باقی رہ گیا ہے۔ جو ان کے متوسلین اور منتسبین و جانشین حضرات کے ذمہ ہے جو کسی نہ کسی درجہ میں انجام دے رہے ہیں۔ اللہ ان کی مدد کرے۔ اللہ کا شکر ہے ان منتسبین، متوسلین اور جانشین حضرات میں سب سے نمایاں ہستی جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم کی ہے۔ الحمد للہ انھوں نے ان کے کام کو بڑے اعلیٰ پیمانے پر سنبھالا ہے۔ حضرت مدنی کا فیض ان کے ذریعہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بنگلہ دیش، پاکستان، افریقہ اور عرب میں بھی زیادہ سے زیادہ پھیل رہا ہے۔ موصوف تن من دھن سے ان کے کام کی انجام دہی میں مردانہ وار اور دیوانہ وار والہانہ طور پر مصروف ہیں۔ ہر مشکل میں مسلمانوں کی مدد کرنا، بھڑکتی ہوئی آگ میں کود پڑنا، جہاں خون کی ندیاں بہہ رہی ہوں سر کو ہتھیلی پر لیکے وہاں پہنچ کر مظلومین کی ہر طرح خدمت انجام دینا ان کا شیوہ ہے۔ جس سے عالم بالا میں حضرت مدنی کی روح مقدس کو انتہائی خوشی اور مسرت حاصل ہو رہی ہوگی۔

حضرت مدنیؒ کے حالات اتنے زیادہ اور اتنے شاندار ہیں کہ ان سب کو بیان کرنا آسان نہیں۔ اس کے لئے ایک بڑی ضخیم کتاب اور طویل دفتر بھی ناکافی ہے۔ یہ جو کچھ بیان کیا گیا مشتے نمونہ از خروارے ہے۔

تمام شد

۳ر نومبر ۱۹۸۷ء

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے امتیازات وخصائص میں کثرتِ اسفار ورحلات ایسی ممتاز خصوصیت ہے جس میں وہ اپنے تمام اقران ومعاصرین میں منفرد نظر آتے ہیں، وہ بھی ایسے پُرخطر، دشوار گذار، دور افتادہ اور کوردہ مقامات کے اسفار جو متقدمین علمائے اسلام کے رحلات واسفار کی یاد تازہ کرتے ہیں، جن میں انھوں نے تعلیم وتعلم کے لئے دنیا کی خاک چھانی ہے۔ اگر مولانا مدنیؒ کے علمی، دینی، روحانی اور سیاسی اسفار، اور ان کے دور رس نتائج وثمرات کو کتابی شکل میں یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہوسکتی ہیں جو ایک اہم علمی ودینی خدمت ہوگی، ذیل میں ہم حضرت مدنیؒ کے ایک ایسے سفر کی مختصر روداد پیش کرتے ہیں جو اب سے بتیس ۳۲ سال پہلے ۱۹۵۵ء میں علاقۂ کوکن میں ہوا تھا، اور اس کے نتیجہ میں وہاں عظیم دینی وعلمی انقلاب برپا ہوگیا، اس داستان سفر کی بھولی بسری کچھ باتیں ہدیۂ ناظرین ہیں۔

علاقۂ کوکن کا مختصر تعارف

بہت سے قارئین کے لئے علاقۂ کوکن نامعلوم مقام ہے اس لئے ہم پہلے اس علاقہ کی مختصر طور پر جغرافیائی اور تاریخی حیثیت پیش کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوگا کہ حضرت مدنیؒ کی وہاں تشریف

ارزانی کے نتیجہ میں کس طرح تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہے۔

بمبئی کے آس پاس بحرِ ہند کے ساحل سے ملی ہوئی پہاڑی پٹی جنوب و شمال میں پھیلی ہوئی ہے جس کے مشرق میں ایک طرف مہاراشٹر کا میدانی علاقہ اور دوسری طرف کرناٹک کا میدانی علاقہ واقع ہے، اسی پہاڑی علاقہ کا نام خطۂ کوکن ہے، اور اس میں خاص طور سے اضلاع تھانہ، قُلابہ (رائے گڑھ) اور رتناگیری شمار ہوتے ہیں، عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں میں ابن خُردادبہ، اصطخری، یعقوبی، اور مسعودی نے اس کا نام کم کم بتایا ہے، البیرونی نے اس کو کنگن کے نام سے یاد کیا ہے، عرب تاجر و سیاح خطۂ کوکن کو بلاد الساج (ساگوان کا دیس) اور بلاد الارز (چاول کا دیس) کے لقب سے یاد کرتے تھے، تیسری اور چوتھی صدی میں اس علاقہ میں مسلمانوں کی آبادیاں تھیں جو عرب باپ اور ہندی ماں کی نسل سے تھے، اسی علاقہ میں واقع سندان (سنجان) میں ایک عرب ریاست تھی جس میں تین حکمراں گذرے ہیں اور سوراشٹر کا علاقہ ان کے زیرنگیں رہا ہے، یہاں کے راجوں مہاراجوں کی طرف سے مسلمان قاضی مقرر کئے جاتے تھے، جو مسلمانوں کے معاملات و مسائل میں راجہ کے نائب کی حیثیت رکھتے تھے، ان ہی عرب تاجروں کی نسلیں اس خطہ میں آباد ہیں جو کوکنی کے نام سے مشہور ہیں، ساحلی تجارت ان کے ہاتھ میں تھی مگر پرتگیزیوں کے قبضہ و غلبہ کے بعد عام طور سے لوگ کھیتی باڑی، بحری ملازمت میں لگ گئے، چونکہ یہ پورا علاقہ دشوار پہاڑیوں اور سمندری کھاڑیوں میں گھرا ہوا ہے، اسلئے ایک دیہات سے دوسرے دیہات میں آنا جانا بہت کم ہوتا تھا، اور گھنٹوں کے راستے دنوں میں طے ہوتے تھے۔

وسطِ کوکن میں ساحل سمندر پر سیدیوں کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی سیدی ان حبشی فوجوں کو کہتے ہیں جو شاہان گجرات و احمد نگر وغیرہ میں ملازم ہوکر

یہیں رہ بس گئے تھے، مرہٹوں نے اورنگ زیب عالمگیرؒ کے زمانہ میں جزیرہ حبشان کے قلعہ ڈنڈا لاج پوری پر ایک رات دھاوا بول دیا، رات بھر جنگ ہوتی رہی اور صبح ہوتے ہوتے قلعہ کی سیدی فوج نے ان کو مار بھگایا، اور قلعہ پر قبضہ کرلیا، اس ریاست میں تین تعلقے یا تحصیلیں تھیں، مُرُوڈ، سِری وردھن اور مُہسلہ، مروڈ میں قلعہ ڈنڈا لاج پوری اس کا مرکز تھا، تقسیم ملک کے بعد نواب سیدی محمد قان صاحب اپنے دوست راجہ اندور کے یہاں چلے گئے اور چند سال ہوئے انتقال کرگئے ہیں جزیرہ مقامی زبان کوکنی میں جنجیرہ ہوگیا ہے، خطۂ کوکن کے دیگر علاقوں کے مقابلہ میں ریاستِ جنجیرہ میں عصری علم کا رواج تھا، نواب جنجیرہ اور ان کے ارکان نے ۱۹۰۷ء میں انجمن اسلام کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا، جس کے صدر ریاست کے دیوان سیدی ظفر خان زادہ اور سکریٹری سید یاقوت تھے، اس کے ماتحت ایک زراعتی ہائی سکول مُرُوڈ میں جاری ہوا، پوری ریاست میں یہی ایک تعلیمی ادارہ تھا، جس کا مقصد مسلمانوں میں عصری تعلیم عام کرنا تھا، پورے علاقہ میں کوئی دینی ادارہ یا مدرسہ نہیں تھا، اسی حال میں نسیم علم کا ایک ایسا جھونکا آیا جو پورے خطۂ کوکن کے مشامِ جاں کو معطر کرگیا، یعنی حضرت مدنی کے ایک دورہ نے یہاں کی دنیا ہی بدل دی، اور ہر طرف قرآنی اور دینی تعلیم کی فضا پیدا ہوگئی۔

شر میں خیر حضرت مدنیؒ کے سفر کوکن کے ابتدائی محرکات میں ایک شخصی شر تھا جو اجتماعی خیر کا سبب بنا، صورت یہ ہوئی کہ ہمارے مخلص و محترم دوست عالی جناب سید محمد صدیق ابراہیم قادری صاحب (مہر بُنبسلائی) انڈر سکریٹری حکومت مہاراشٹر کے اعزہ میں شہر بوُر دھن کے ایک بزرگ جناب عبدالرشید کردمُے صاحب مرحوم تھے، بڑے خوش قامت اور رعب داب کے آدمی تھے، وہ شیطانی چکر میں پڑکر شراب نوشی کی علت میں پھنس

گئے تھے۔ بلا کے بلانوش تھے، کوشش کے باوجود، چھٹتی نہیں تھی منہ سے یہ کافر لگی ہوئی بالکل اخیر میں ایک دن گھر سے نکلے اور سیدھے دیوبند مولانا مدنی کی خدمت میں حاضر ہو کر بلاکم وکاست اپنی داستانِ رندی و سرمستی بیان کر دی، اور حضرت کے دست اقدس پر توبہ و استغفار کی خواہش ظاہر کی، نہ پہلے سے دید و شنید، نہ خط و کتابت نہ ہی درمیان میں کوئی واسطہ، البتہ آشناسن رکھا تھا کہ مجھ جیسے گم کردہ راہ اور بھولے بھٹکے لوگوں کو آستانۂ مدنی میں پناہ ملتی ہے، حضرت مدنیؒ نے ان کی تمام باتیں سنکر فرمایا کہ میں خود گنہ گار آدمی ہوں اپنی اصلاح نہیں کرسکا ہوں، آپ کی اصلاح کیسے کرسکتا ہوں؟ حضرت مدنیؒ کے ان جملوں سے عبدالرشید کردئے صاحب کی ندامت و اضطراب کے زخم اور ہرے ہو گئے اور انھوں نے محسوس کرلیا کہ دل کی بے قراری اسی مدنی دارالشفا میں سکون پاسکتی ہے اور حضرت سے بیعت ہو کر کچھ دنوں مقیم رہے، بعد میں وقفہ وقفہ سے حاضری دیتے رہے

اسی درمیان میں شیریوَرْدَھن کے ایک اور شخص جناب عبدالرحیم بروٹ صاحب حضرت مدنی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہوئے، یہیں سے خطۂ کوکن میں حضرت کے فیوض و برکات کا سلسلہ جاری ہوا، ان دنوں حضرت مدنیؒ گجرات اور بمبئی کے علاقہ میں نسبتہً زیادہ تشریف لے جاتے تھے اور کوکن کے یہ دونوں مسترشد حاضر خدمت ہو کر حضرت سے کوکن تشریف لانے کی خواہش کیا کرتے تھے نیز انجمن اسلام جنجیرہ کے اراکین نے اس کیلئے کوشش کی اور محترم سید محمد صدیق ابراہیم قادری صاحب کو وسیلہ بنایا جن سے حضرت مدنی بہت مانوس تھے، اور ان کے ساتھ کریمانہ برتاؤ فرمایا کرتے تھے، قادری صاحب نے جناب حکیم اعظمی صاحب صدر جمعیۃ علمائے مہاراشٹر سے مل کر پروگرام مرتب کرایا، قادری صاحب پانچ دن کا دورۂ کوکن چاہتے تھے اور حکیم صاحب مرحوم صرف دو دن رکھنا چاہتے تھے، جب حضرت

مدنی، کو اس کشمکش کا علم ہوا تو خود ہی فرمادیا کہ میں پانچ دن کیلئے کوکن جاؤں گا۔

بسم اللہ مجرِیہا و مُرسٰہا

پروگرام کی اطلاع ملتے ہی بہت سے معتقدین و متوسلین اور خُدّام حضرت کی ہمرکابی کے لئے تیار ہو گئے، یہ سفر براہ سمندر جہاز سے ہونے والا تھا، روانگی صبح آٹھ بجے تھی، سویرے ہی سے علاقائی بندرگاہ بھاؤ کے دھکے پر بہت بڑا مجمع ہو گیا، آج کوکن جانے والا جہاز ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حُجّاج کو لے کر ارض پاک کی طرف جارہا ہے عجیب دینی و روحانی منظر تھا، تقریبًا پانچسو مسافروں میں ہر طرف علماء و فضلاء مسترشدین و متوسلین اور معتقدین چلتے پھرتے نظر آتے تھے، جہاز میں بڑی چہل پہل تھی جہاز کے کیپٹن جن کا نام غالبًا عباس تھا دَمن دیو کے رہنے والے تھے، آج انھوں نے اپنا جہاز رانی کا بحری یونیفارم اتار کر پائجامہ، شیروانی اور سیاہ ٹوپی پہن رکھی تھی، اور ایک سچے خادم و معتقد کی طرح اس کاروانِ علم و روحانیت کی راحت رسانی کے لئے جہاز میں چکر کاٹتے تھے، کہتے تھے کہ آج جہاز کمپنی کا نہیں نواب جنجیرہ کا چل رہا ہے، کیپٹن صاحب نے حضرت مدنی کے اعزاز میں نہایت پُرتکلف دعوتِ طعام کا انتظام کیا، جس میں سیکڑوں خدام و متوسلین شریک تھے، جہاز کے عرشہ پر نہایت قرینہ سے میز کرسیاں لگوائیں، حضرت مدنی جب اوپر تشریف لے گئے اور یہ تکلفات دیکھے تو فرمایا کہ میں میز کرسی پر نہیں کھاتا ہوں، یہ جملہ سنتے ہی کیپٹن صاحب نے جہاز کے خلاصیوں اور ملازموں کو آواز دی اور میز کرسیاں اٹھوا کر سترنجیاں (دریاں) بچھوا دیں۔

چار گھنٹے کے اس دریائی سفر میں حضرت کے مزاج میں بڑا انشراح رہا اور سینے کے علوم و معارف سفینے میں آتے رہے اس مدرسہ بحریہ میں فیوض و برکات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا، جہاز ہی میں حضرت کی امامت میں نماز ظہر ادا کی گئی۔

جہاز مُرُوڈ کے ساحل سے دور سمندر میں کھڑا ہوا ساحل سے کئی کشتیاں آکر جہاز سے لگ گئیں اور مسافران میں بیٹھ گئے۔ واپسی پر سمندری موجوں کی وجہ سے بھری ہوئی کشتیاں بُری طرح ہچکولے کھا رہی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ڈوبیں، تب ڈوبیں، ہم لوگ سہمے ہوئے بیٹھے تھے اور حضرت اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہے تھے، جیسے ان کو بڑا مزا آرہا ہے، غالباً اس کا مقصد ہمراہیوں کی ہمت افزائی تھا۔

شراب نوشی چھوڑدو

ساحل پر مسلم غیر مسلم عقیدت مندوں کا بہت بڑا مجمع استقبال کے لئے موجود تھا، اور حضرت کی ناراضگی اور ناپسندیدگی کے باوجود استقبالی نعروں کی گونج میں جلوس روانہ ہوا، راستہ میں نواب صاحب کے بھائی سِیدی محمد خان زادہ اور چچا سِیدی عبدالقادر خان زادہ (بابا صاحب) کا مکان پڑتا تھا، سِیدی عبدالقادر خان زادہ صاحب نے سید محمد صدیق صاحب قادری کے ذریعہ گذارش کی کہ حضرت میرے مکان پر چل کر ایک پیالی چائے پی لیں، حضرت نے اس گذارش کو فوراً قبول کرکے فرمایا کہ ایک نہیں دو پیالی آپ کی چائے پیوں گا، خان زادہ صاحب خوش خوش حضرت کو مکان کے اندر لے گئے، ساتھ میں دو چار عقیدت مند بھی تھے، حضرت نے ان کی دل جوئی اور دلداری کرتے ہوئے بڑے ذوق وشوق سے چائے پی، اور جب رخصت ہونے لگے تو خان زادہ صاحب کو تنہائی میں لے جاکر آہستہ سے فرمایا کہ شراب پینا چھوڑدو خان زادہ صاحب نے فوراً اس کا عہد کرلیا اور حضرت کے سامنے توبہ کرلی، اس کے بعد پھر یہ کافران کے منھ سے نہ لگ سکی، باہر نکل کر خان زادہ صاحب نے سید محمد صدیق قادری صاحب سے شکوہ کیا کہ تم نے حضرت کو میری شراب نوشی کی خبر کردی تھی، قادری صاحب نے ان کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا کہ حاشا وکلا

میں نے آپ کے بارے میں ایسا کوئی جملہ نہیں کہا ہے، یہ فراستِ مومن کا اعجاز ہے کہ فقیر نے ایک امیر کی چائے کی پیالی پی کر امیر کو جام نوشی سے نجات دلادی، آپ اس توفیق پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔

مالٹا کا اسیر اور مقدمۂ کراچی کا قیدی کوکن میں؟

خطۂ کوکن کی ان دشوار گذار پہاڑیوں اور کھاڑیوں میں اس سے پہلے اتنا بڑا کوئی عالم اور بزرگ نہیں آیا تھا، کچھ اہل علم یہاں کے انجمن اسلام زراعتی ہائی اسکول میں آئے مگر وہ دوسرے ذہن و مزاج کے تھے، ۱۹۰۷ء میں ریاست جنجیرہ کے صدر مقام مرڈ میں انجمن اسلام کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ کھولا گیا جس کا مقصد مسلمانوں میں عصری اور جدید تعلیم عام کرنا تھا، اس سلسلہ میں مختلف اوقات میں علامہ شبلی، مولانا راشد الخیری، مولانا عبدالمنان خلافت بمبئی، سروجنی نائیڈو اور ڈاکٹر امبیڈکر وغیرہ آئے، عطیہ فیضی بیگم کے تعلق سے علامہ شبلی ہفتوں ہفتوں یہاں پھول محل میں قیام کرتے تھے مگر علم و عمل کا جامع کوئی عالم و مرشد اس دیار میں نہیں آسکا تھا، حضرت مدنی پہلے بزرگ ہیں جو اس خطہ میں آئے، اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس کو علم دین کا گلشن بنادیا، اور ہزاروں گم کردۂ راہ کو راہ پر لگادیا۔

اس دیار کے ایک معمر بزرگ جناب لالہ میاں سرکھوت مرحوم جنھوں نے نقوش ماضی کے نام سے شہر نورذھن کی تاریخ لکھی ہے، بار بار کہتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں علاقہ کوکن میں نہ اتنا بڑا عالم دین دیکھا تھا اور نہ کسی آدمی کی مقبولیت و محبوبیت کا اتنا عظیم مظاہرہ ہی دیکھا، مالٹا کا اسیر اور مقدمۂ کراچی کا قیدی اس خطہ میں آجائے، یہ خدا سازبات ہے، ورنہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی اس کے لئے ظاہری اسباب تھے۔

دو باتوں پر زور

حضرت مولانا اس پورے سفر میں وعظ وارشاد کی مجالس میں دو باتوں پر بڑی شدت سے زور دیتے تھے اور سخت تاکید کرتے تھے، ایک یہ کہ مسلمان ڈاڑھی رکھیں تاکہ شکل وصورت سے مسلمان معلوم ہوں، ڈاڑھی مسلمانوں کے عالمی شعائر میں سب سے ضروری اور نمایاں شعار ہے، دوسرے قرآن کی تعلیم عام کریں، قرآن پڑھیں، پڑھائیں، حافظ و قاری اور عالم ہوں اور قرآنی تعلیمات پر عمل کریں، ڈاڑھی کے بارے میں شدت کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی ڈاڑھی منڈا مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتا تو مولانا یہ کہہ کر اپنا ہاتھ کھینچ لیتے کہ سلام ضروری ہے، مصافحہ ضروری نہیں ہے، یا پھر داڑھی رکھنے کا عہد لے کر مصافحہ فرماتے تھے۔

عام جلسوں اور نجی مجلسوں میں دینی تعلیم پر زور دینے کے ساتھ عصری اور جدید تعلیم کی افادیت واہمیت بیان کرتے تھے، چنانچہ زراعتی ہائی اسکول انجمن اسلام مروڈ کی دعوت پر بڑے انشراح کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے، تمام شعبہ جات کا معائنہ دیر تک فرماتے رہے، شعبۂ امور خانہ داری پر خاص طور سے خوشی کا اظہار فرمایا، کھیتی باڑی کی عملی تعلیم دیکھنے کے لئے کچھ دور کھیت پر پیدل تشریف لیگئے، اور شاندار معائنہ تحریر فرمایا، جس میں اسکول میں دینی تعلیم کا شعبہ قائم کرنے پر خاص طور سے زور دیا، اسکے نتیجہ میں وہاں دینی تعلیم کا شعبہ قائم ہوگیا، اور راقم نے اس کے لئے "مسلمان" نام کا ایک رسالہ لکھا، جو انجمن اسلام جنجیرہ کی طرف سے شائع اور اسکول کے نصاب میں داخل کیا گیا

مدرسہ حسینیہ شری وردھن

کوکن کے اس پہلے دورہ میں حضرت مدنی نے متعدد جلسوں کو خطاب فرمایا، ارشاد وتلقین کی مجلسوں میں عوام وخواص کو دینی زندگی اختیار کرنے کی تاکید کی، اسلامی علوم اور دینی شعائر پر زور

دیا، جس سے پورے علاقہ، کوکن کے مسلمانوں میں ذہنی اور فکری انقلاب پیدا ہو گیا اور جس کا فوری ثمرہ شری وردھن میں مدرسہ حسینیہ کا قیام تھا

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ بمبئی میں معاصر علماء و مشائخ کی امتیازی خدمات کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مولانا مدنیؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے تلامذہ و متوسلین نے ملک میں مدارس اسلامیہ کا جال بچھا رکھا ہے، ان میں سے تقریباً ہر ایک نے اپنے اپنے علاقہ میں مدرسہ قائم کیا ہے، یہ مولانا مدنی کی دینی علوم کی طرف خصوصی توجہ کا نتیجہ ہے، چنانچہ کوکن میں پہلے مرکزی مدرسہ کا اجراء اسی توجہ کا نتیجہ تھا۔

یہ مدرسہ شری وردھن کی جامع مسجد میں جاری کیا گیا، دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شاندار عمارت تیار ہو گئی اور پورے کوکن سے طلبہ آنے لگے، اسی مدرسہ کا فیض ہے کہ جہاں کوئی حافظ قرآن نہیں تھا وہاں دیہات دیہات حُفّاظ و قراء پیدا ہو گئے ہیں دینی علم کی روشنی ہر طرف پھیل گئی ہے، متعدد علماء دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، اور اس مرکز علم سے خطۂ کوکن گلشن صدا بہار بنا ہوا ہے، یہ سب حضرت کے حسنات و برکات ہیں ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

مولانا محمد طاہر خلیفۂ مجاز حضرت شیخ الاسلامؒ

میں ۱۹۴۰ء میں مدرسہ عالیہ سلہٹ میں زیر تعلیم تھا کہ رمضان المبارک کی تعطیلات سے پہلے یہ معلوم ہوا کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اپنے معمول کے مطابق قیام رمضان کے لئے سلہٹ تشریف لا رہے ہیں، حضرت کی شہرت سن کر میں نے سوچا کہ چھٹیوں میں اپنے گھر جانے کے بجائے سلہٹ میں ہی ٹھہر کر ان سے اکتساب فیض کروں، میں اس وقت ۱۷ سال کا تھا۔ بہرحال میں گھر جانے کے بجائے سلہٹ میں ہی ٹھہر گیا، اور رمضان شریف کے بعد ہی گھر گیا، اس کے بعد تو میری طبیعت بن گئی کہ کوئی حدیث پڑھتا تو حضرتؒ کی صورت سامنے آجاتی۔ دوسرے سال حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ پھر تشریف لائے اور میں گذشتہ سال کی طرح ان سے اکتساب فیض کے لئے ٹھہر گیا۔

۱۹۴۲ء میں حضرت شیخ الاسلامؒ گرفتار ہو گئے اور میں مدرسہ عالیہ سے فارغ ہو کر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند پہنچا، جہاں میں دورہ حدیث میں داخل ہوا، اس دوران حضرت شیخ نینی جیل سے رہا ہو کر دیوبند تشریف لائے، دو ایک دنوں کے بعد حضرتؒ سلہٹ تشریف لے گئے اور میں دیوبند ہی میں رہا، دوسرے سال حضرتؒ نے پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ کی وجہ سے چھٹی لے رکھی تھی، میں سلہٹ چلا گیا، ۱۹۴۶ء میں حضرت شیخؒ پھر سلہٹ تشریف لے آئے، میں پورے رمضان ان کی خدمت میں رہا، اسی سال ڈائرکٹ ایکشن کا

واقعہ پیش آیا، مسلم لیگیوں نے نئی سڑک کی مسجد پر خشت باری کی، مگر حضرتؒ جو نماز سے فارغ ہو چکے تھے خاموش بیٹھے رہے، استقلال اور صبر و سکون کا ایسا منظر اس سے پہلے میں نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے میں نے حضرتؒ سے بیعت ہونے کی درخواست کی تھی مگر طالب علم ہونے کی وجہ سے انھوں نے انکار کر دیا تھا، اسی اثنار میں میرا رجحان کچھ اور ہو گیا تھا اور طبیعت دوسری طرف مائل ہو رہی تھی کہ میں نے نئی سڑک کی مسجد میں حضرت سے پھر بیعت کرنے کی درخواست کی جسے اس مرتبہ انھوں نے قبول فرمالیا۔ اگر حضرت اُس وقت میری سرپرستی و دستگیری نہ فرماتے تو شاید میں دوسری راہ اختیار کر لیتا اور کچھ سے کچھ ہو گیا ہوتا۔

حضرت نے شرفِ بیعت عطا کیا تو میں نے اسی رات کو خواب میں دیکھا کہ حضرت کا دستِ مبارک میری گردن پر ہے، مجھ کو ایسی طمانیت قلب حاصل ہوئی کہ اس کا الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے، بہرحال میری زندگی کا رخ یکسر مڑ گیا، اگر میری زندگی کا رخ نہ مڑتا تو میں آج کوئی پروفیسر ہوتا۔

حضرت کے ترغیب دلانے پر میں نے دورۂ تفسیر میں داخلہ لیا اور جی چاہتا تھا کہ دورۂ حدیث میں دوبارہ داخلہ لے لوں، چنانچہ میں بالاستیعاب دورۂ حدیث میں بھی حصہ لینے لگا کہ ایک دن ترمذی کے سبق کے دوران میں نے آگے پڑھنا شروع کیا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ "کچھ ہوش بھی ہے" اور میں ہوشیار ہو گیا، حضرتؒ نے دوسرے سال کی فہرست دیکھ کر فرمایا کہ تم تو گذشتہ سال پڑھ چکے ہو، کہیں دوسرے اعتراض نہ کریں، پھر ذرا توقف کے بعد فرمایا کہ اچھا پڑھو، اور اتنا کہہ کر ایک رقعہ پڑھ کر سنایا کہ مولوی محمد طاہر گذشتہ سال پڑھ چکے ہیں اور امسال بھی پڑھنا چاہتے ہیں، کسی کو اعتراض ہو تو بتائے لیکن کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

اس دوران جبکہ میں دورۂ تفسیر میں داخلہ لے چکا تھا تو گھر سے فسادات ہو جانے

کا ٹیلیگرام موصول ہوا، میں نے رقعہ پڑھ کر حضرت کو مطلع کیا تو انھوں نے فرمایا کہ جاؤ میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ میرے پاس گھر جانے کا کرایہ نہیں تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کیسے گھر جاؤں کہ ایک دور کے رشتہ دار نے میری مدد کردی جو یقیناً حضرت کی کرامت تھی۔

میں حضرت کی خدمت بابرکت میں رہ کر سرکاری ملازمتوں سے متنفر ہوگیا تھا کہ مدرسہ عالیہ کی نشاۃ ثانیہ کا مسئلہ درپیش ہوا، مفتی رشید احمد صدیقی صاحبؒ نے مولانا سید اسعد مدنی سے کہا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کیلئے جو ایک سرکاری مدرسہ ہے ایک ایسا مدرس چاہئے جو بنگلہ بھی جانتا ہو، مولانا سید اسعد مدنی نے میرا نام درج کرادیا اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ حضرت شیخؒ نے اپنے مزاج کے خلاف میرے نام کی پرزور سفارش کی، مدرسہ عالیہ کلکتہ سے انٹرویو کے لئے میرے نام خط گیا، مگر دیوبند میں رہنے کی وجہ سے وہ خط مجھے نہیں ملا، اور انٹرویو کی مدت گذر چکی تھی مگر مفتی عبدالرشید صاحب نے مدت گذر جانے کے باوجود ٹیلیگرام بھجوایا، میں انٹرویو میں کامیاب رہا اور میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ملازم ہوگیا، حضرتؒ نے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں اپنے کشف سے یقیناً میری تقرری کو ضروری سمجھا ہوگا اور یہ انھی کی کرامت تھی کہ انٹرویو کی مدت گذر جانے کے بعد بھی مجھے مدرسہ عالیہ میں رکھ لیا گیا۔

میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی کن کن باتوں کا ذکر کروں، سوچتا ہوں تو آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں وہ بات بات میں عبرت و موعظت کا ایسا درس دیتے تھے جو دل پہ نقش ہوجاتا تھا، میری شادی کے موقع پر حضرت میری سسرال تشریف لائے تو وضو کے دوران سنگریزوں میں آم کے تر و تازہ پودے پر ان کی نظر پڑگئی، حضرت نے فرمایا کہ دیکھو تو سہی، آخر ان سنگریزوں میں آموں کے اس پودے کو کون رزق دے رہا ہے!۔

حضرت کا یہ معمول تھا کہ وہ جب کسی چیز کی فرمائش کرتے تھے تو اصرار کے ساتھ اس کے پیسے دیدیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرتؒ نے مجھ سے آموں کے پودوں کی فرمائش کی، میں نے ۱۵ / ۲۰ روپیہ خرچ کر کے حضرت کے حکم کی تعمیل میں پودے بھیجدیئے، تو ان کا خط آیا کہ تم نے پودے تو بھیجدیئے مگر حساب کیوں نہیں بھیجا، اور برافروختگی ظاہر فرمائی کہ میں کسی چیز کی فرمائش کروں تو اس کا حساب ضرور بھیجا جائے چنانچہ میں نے حساب بھیجدیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرتؒ کے اس معمول میں بہت بڑا سبق پوشیدہ تھا۔

میں حضرتؒ کے آخری سفر کے دوران ان کے ساتھ تھا حضرتؒ ۹ بولائی دت اسٹریٹ کلکتہ میں مقیم تھے۔ ان کو پھولوں میں "رات کی رانی" نامی پھول بہت پسند تھا، اس پھول کے حضرتؒ نے مختلف نام بتائے، عربی میں جو نام حضرتؒ نے بنایا تھا وہ میں بھول گیا تھا، اس لئے بات ہی بات میں ان سے میں نے پوچھا کہ حضرت! عربی میں اس پھول کا آپ نے کیا نام بتایا تھا، تو انھوں نے عربی کا ایک شعر پڑھا جس میں رات کی رانی کا ذکر تھا اور اس شعر میں اس بات کا اشارہ بھی تھا کہ یہ حضرت رحمہ اللہ سے آخری ملاقات ہے۔

حضرت کلکتہ میں سیرت کانفرنس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تھے اور تین دنوں کا قیام تھا۔ رات کا قیام خان بہادر شیخ محمد جان مرحوم کی کوٹھی واقع پارک سرکس میں رہا کرتا تھا۔ میں نے پہلے ہی دن حضرتؒ سے کہا کہ حضرت! کل صبح کی چائے میرے یہاں نوش فرمالیں، فرمایا کہ ابھی تو وقت ہے دیکھا جائیگا۔ میں بھی رات کو وہیں مقیم تھا کہ فجر کی نماز کے بعد خان بہادر مرحوم نے پوچھا کہ حضرت چائے پیش کروں تو انھوں نے اچانک میری طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ چائے تو ان کے یہاں پینی ہے۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے، اور بہت خوش بھی ہوا۔ ہاتھ پاؤں اسلئے

مر

بھول گئے کہ حضرتؒ نے اچانک میرے یہاں چائے نوشی پر آمادگی ظاہر فرمائی تھی، اور خوش اس لئے ہوا کہ بہر حال حضرت نے میری درخواست قبول فرما لی، میں پریشان تھا کہ کب گھر جاؤں اور کب کیا کروں کیونکہ صرف ایک گھنٹہ کا وقت تھا، میں نے عبدالباری کو فوراً گھر بھیجا۔ وہ گھر گیا اور کچھ گھر میں سامان تیار کیا اور کچھ ہوٹل سے لایا، اس طرح وقت پر دس بارہ آدمیوں کا سامان خورد و نوش مہیا ہو گیا، حضرتؒ میرے گھر تشریف لے گئے، ان کے ساتھ مولانا محمد یعقوب بھی تھے، میں حضرتؒ کے اس انداز پر قربان ہو گیا اور میں ان کی مصلحت کو سمجھ گیا کہ وہ پہلے سے ناشتہ کی بات کہہ کر مجھ کو زیر بار کرنا نہیں چاہتے تھے، اگر وہ پہلے سے میرے گھر پر رونق افروز ہونے کی خوش خبری سناتے تو ظاہر ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی اہتمام کرتا۔

ٹانڈہ میں رمضان شریف کے دوران جس سال حضرت شیخؒ نے مجھے اجازت مرحمت فرمائی تو میرے جی میں آیا کہ کاش حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح حضرت شیخؒ کے سر پر دستارِ خلافت باندھی تھی اسی طرح حضرت شیخ بھی میرے سر پر دستارِ خلافت باندھ دیتے تو میں خود کو بڑا خوش نصیب سمجھتا، میں نے حضرتؒ کو پرچہ لکھا اور اپنی خواہش کا اظہار کر کے لکھا کہ حضرت! آپ اپنا رومال میرے سر پر باندھ دیں یا حکم دیں تو میں بازار سے کوئی اور چیز خرید لاؤں، حضرتؒ نے عمامہ لانے کا حکم دیا، میں نے عمامہ لا کر ان کی خدمت میں پیش کر دیا جسے انھوں نے میرے سر پر باندھ دیا، لیکن انھوں نے عمامہ باندھنے سے پہلے نماز عصر کے بعد فرمایا کہ لوگو! دیکھو یہ کہتے ہیں کہ حضرت گنگوہیؒ کی طرح میں ان کے سر پر دستار باندھوں، اگر میں ان کو دستار باندھتا ہوں تو کیا دوسرے لوگوں کو اعتراض نہ ہوگا، حضرتؒ نے کچھ ایسے

پیار سے اور مشفقانہ انداز میں یہ جملے ارشاد فرمائے کہ کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی
واضح رہے کہ میں نے اپنے پرچے میں صرف اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ حضرت
میرے سر پر کچھ باندھ دیں، میں نے حضرت گنگوہی کا ذکر نہیں کیا تھا، لیکن حضرت
شیخ رہ کشف سے یہ سمجھ گئے تھے کہ میرے دل میں خواہش نے کس طرح جنم لیا تھا۔

میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی کن کن باتوں کا ذکر کروں، شدت جذبات
میں بس اسی قدر لکھوا سکا جو حضرت شیخ رہ کے عقیدت مندوں کے لئے بطور تبرک
حاضر خدمت ہے۔

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رح کے دو مکتوب گرامی اور ان کا پس منظر

نسیم احمد فریدی امروہوی

چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں ہندوستان کے اندر ایک نئے فتنے کا ظہور ہوا۔ یہ فتنہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ملت اسلامیہ کے حق میں نہایت ہی مضر اور خطرناک فتنہ تھا۔ اس کا اثر جاہل عوام پر زیادہ ہوا۔ اس فتنے کے بانی مولوی احمد رضا خاں بریلوی تھے، جو سنی حنفی قادری برکاتی لکھے اور لکھوائے جاتے تھے، اور جنھوں نے اکابر دیوبند کی مخالفت کو اپنا نصب العین بنالیا تھا۔ دراں حالیکہ یہ اکابر بھی سنی حنفی چشتی صابری تھے۔ کہا جاتا ہے اور تحقیق کرنے پر یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے کہ اس فتنے کے اندر فرنگی کا ہاتھ تھا اور اس کے چشم وابرو کے اشارہ پر یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے پہلے حضرت مولانا اسمعیل شہید دہلوی پر ہاتھ صاف کیا۔ ان کو ستر وجوہ سے کافر کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور بڑے طمطراق سے یہ کہا کہ جو ان کو کافر نہ کہے وہ کافر ہے۔ پھر خیال آیا کہ مولانا شہید دہلوی کو کافر کہنے یا کہلوانے کا اصلی مقصد پورا نہیں ہوتا اس لئے کہ اب ان کی تحریک بظاہر ختم ہو چکی اور ۱۸۵۷ء کی فرنگی ستم کیشیوں نے مجاہدین اسلام پر کاری ضرب لگادی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کو نشانہ بنایا جائے جو ان اکابر نے ۱۸۵۷ء کے دس سال بعد قائم کیا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ ضعیف نہ ہونے پائے اور جہاں تک ہو سکے فروغ ملت بیضا میں جد وجہد کی جائے فرنگی بھی سمجھتا تھا کہ دارالعلوم کا یہ نظام تعلیم میری

سازش کو کھلم کھلا کر دے گا اور میرے پروگرام میں خلل ڈالے گا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ درسگاہ
مجاہدین کی ایک نئی پارٹی تیار کر دے۔ انگریز کھلم کھلا اس کے خلاف کوئی حکومتی مظاہرہ
بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی حکمت عملی کا تقاضہ تھا کہ اس اسلامی ادارہ کو چھیڑا نہ جائے۔
مگر اس کو ابھرنے کا موقعہ بھی نہ دیا جائے۔ اس لئے اس نے اس کا وقار گھٹانے اور اس
کی بات کو بے اثر کرنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ بڑا ہتھکنڈا یہ تھا
کہ خود مسلمانوں میں سے اور مسلمانوں میں بھی سنی حنفیوں میں سے ایسے لوگوں کو ہمنوا بنا کر
اپنا کام نکالا جائے جو پروپیگنڈے میں کمال رکھتے ہوں، اور اپنی بات کو منوانے کے لئے
ایک خاص ذہن رکھتے ہوں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں مناسب اور ضروری سمجھا گیا کہ حرمین شریفین
کے علماء اور مفتیان کرام سے اس جماعت حقہ کے خلاف فتویٰ لے کر تمام دنیا میں عموماً اور
ہندوستان میں خصوصاً اسے بدنام کیا جائے۔ اس تیر سے دو شکار کرنے تھے۔ ایک دارالعلوم
دیوبند کے وقار کو اور اس کی حیثیت کو برباد کرنا۔ دوسرے فیض آبادی خاندان کو ـــــ
جو سید حبیب اللہؒ کے ساتھ مدینہ منورہ پہونچا تھا اور جس کے ایک فرد حضرت شیخ الاسلام
مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی تھے جو دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن
قدس سرہ کے حلقۂ درس کے نمایاں فیض یافتہ تھے اور جو مسجد نبوی میں گنبد خضرا کے زیر سایہ
مدت سے درس حدیث دے رہے تھے اور جو قطب الوقت حضرت گنگوہی قدس سرہ کے
خلیفہ مجاز تھے ـــــ علماء حرمین کے فتاوی کی زد میں لاکر حکومت حجاز سے شہر بدر کرایا
جائے اس کے لئے حسام الحرمین نام کا ایک رسالہ مولوی احمد رضا خاں نے مرتب کیا اور
بڑی چالاکی اور ہشیاری سے اکابر دیوبند کی عبارتوں کو کتربیونت کر کے حجاز کے کچھ
علماء سے فتاوی حاصل کر لئے ـــــ مگر حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ نے اسی وقت جبکہ
مولوی احمد رضا خاں حجاز میں موجود تھے اور اپنی ریشہ دوانیاں کر رہے تھے، ان کا تعاقب
کیا اور ان کے منصوبے کو باطل کر کے شکست فاش دی۔ حضرتؒ اگر مولوی احمد رضا خاں

کا تعاقب نہ کرنے اور علمار حرمین کو اصل حقیقت سے آگاہ نہ فرماتے تو دار العلوم اور اس کے اکابر کے وقار کو بڑی ٹھیس لگتی ۔ مولوی احمد رضا خاں اس سے پہلے ندوۃ العلمار کے خلاف ۱۳۱۶ھ میں حجاز سے کچھ فتاویٰ منگوا چکے تھے اور ان کو ایک کتابی شکل میں شائع کر دیا تھا. اس کا نام فتاوی الحرمین لرجف المین ہے ۔ ندوہ کے خلاف فتاویٰ حاصل کرنے کا محرک بھی غالبًا چشم فرنگی کا اشارہ ہوگا۔ میں نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے پاس ایک مرقع دیکھا ہے جس میں اکابر علمار کے خطوط، ان کی تحریریں، معلومات سے لبریز یادداشتیں موجود ہیں ۔ اس میں حضرت مولانا مونگیریؒ بانی ندوۃ العلمار کا ایک مکتوب گرامی بھی ہے. جو انھوں نے احمد رضا خاں کے تخریبی عمل سے متاثر ہو کر کسی ذمہ دار ندوہ کو لکھا ہے جہاں تک یاد پڑتا ہے انھوں نے اپنے مکتوب میں اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ ندوہ کے خلاف فتاوی شائع ہونے پر ایسا بروقت تعاقب نہ ہو سکا جیسا دار العلوم دیوبند کی طرف سے حضرات اکابر دیوبند کے خلاف فتویٰ لینے پر مولوی احمد رضا کا تعاقب ہوا

مولوی احمد رضا خاں کے اس تکفیری کاروبار کا جو رد عمل ہوا اس نے ان کو بڑا پریشان اور مبہوت کر دیا تھا۔ اس تخریبی کارروائی کی روئیداد اور اس کے بروقت جواب کی سرگذشت الشہاب الثاقب مؤلفہ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں حضرت مولانا قاسم العلوم والمعارف مولانا محمد قاسم نانوتوی حضرت رشید ملت والدین مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ پر کئے جانے والے رضائی حملوں کا بھرپور دفاع کیا گیا ہے ۔ اس کا خلاصہ مولانا حسین احمد نجیب، رفیق دار التصنیف والتالیف دار العلوم کراچی نے کیا ہے ۔ المہند علی المفند مولفہ حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ میں حسام الحرمین کا پورا پورا رد کیا گیا ہے۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے بھی فیصلہ کن مناظرہ میں ہر چہار مذکورہ بالا اکابر دیوبند کا دفاع کیا ہے. یہ کتاب بھی

حسام الحرمین کا ایک جواب ہے ـــ یہ تمام مذکورہ بالا کتابیں عقائد علمار دیوبند اور حسام الحرمین کے نام سے دارالاشاعت کراچی سے یکجا شائع ہوئی ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ مولانا محمد تقی عثمانی نے اور مقدمہ مولانا حسین احمد نجیب نے لکھا ہے ـــ اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کے چند اقتباسات پیش کر کے حضرت مدنی رح کے دو اہم مکتوب ناظرین کے سامنے لاؤں جو ۱۹۱۱ء کے ہیں اور فتنہ رضا خانیت سے متعلق ہیں۔

"جب کبھی انگریزی استعمار سے ہندوستان کی آزادی کی بات آئے گی تو علمار دیوبند کا تذکرہ سرفہرست ہوگا۔ اکابر دیوبند میں تحریک سید احمد شہید، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں تھانہ بھون کی اسلامی حکومت، شاملی کا جہاد، تحریک شیخ الہند رح ریشمی رومال کی تحریک ـــ ایسی حقیقتوں کے چند عنوان ہیں جن سے متعصب مورخ بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ (عقائد علمار دیوبند صـ۱۸)

اس روح جہاد کو ختم کرنے کا واحد ذریعہ انگریز مفکروں نے یہ تجویز کیا کہ علمائے دیوبند سے ہندوستانی مسلمانوں کا رابطہ ختم کر دیا جائے ـــ جب رابطہ نہ ہوگا تو روح جہاد خود بخود دم توڑ دے گی۔ اسی "مقدس مقصد" کے تحت پنجاب سے ایک نبی کھڑا کیا گیا۔ بدایوں اور بریلی سے علمار دیوبند کو کافر ثابت کرنے والا ایک گروہ تیار ہوگیا۔ شکم پرور پیروں کا وہ طبقہ جو مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ رح کی اذیت ناکیوں کا سبب بنا تھا اس گروہ کی پشت پناہی کے لئے لا کھڑا کیا گیا۔ (عقائد علمار دیوبند صـ۲۱)

حضرت نانوتویؒ پر یہ کھلی تہمت لگائی کہ آپ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت زمانی یعنی نبی آخر الزماں ہونے کے منکر ہیں۔ اس مقصد کے لئے موصوف کی شہرۂ آفاق کتاب "تحذیر الناس" کی تین الگ الگ صفحات کی عبارتوں کو سیاق وسباق سے نکال کر ان میں تقدیم و تاخیر کر کے پہلے اپنی ایک مسلسل عبارت ترتیب دی پھر ان کے عربی ترجمہ میں انتہائی علمی بددیانتی کا مظاہرہ کر کے اس کو ایسے معنی پہنائے جن کے کفریہ کلمات ہونے میں کسی ادنی مسلمان

کو بھی ذرہ برابر شک نہیں ہو سکتا اور یہ سب خاں صاحبؒ کی طبع زاد جدت طرازی کا کرشمہ تھا۔ (عقائد علماء دیوبند ص۳۰-۳۱)

حضرت گنگوہیؒ کی طرف ایک ایسا جعلی فتویٰ منسوب کیا گیا کہ جس میں آپ کی طرف اس تحریر کی نسبت کی گئی۔

(معاذ اللہ) اگر کوئی اللہ کی نسبت یہ کہتا ہے اور اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ جھوٹ بولتا ہے تو اس کو کافر مت کہو۔ (عقائد علماء دیوبند ص۳۱)

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کی کتاب البراہین القاطعہ کی ایک عبارت کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے اپنے الفاظ میں ایسا مختصر مطلب نکالا جو سراسر کفر کے معنی پر دلالت کر رہا ہے وہ یوں کہ۔

موصوف اپنی کتاب براہین قاطعہ میں (معاذ اللہ) شیطان کے علم کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے زیادہ کہتے ہیں اور اس کو آپؐ سے اَعْلَم قرار دیتے ہیں۔ (عقائد علماء دیوبند ص۳۱)

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تالیف حفظ الایمان ص۸ کی عبارت کو قطع و برید کے بعد اپنے یہ معنی پہنائے۔

(معاذ اللہ) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم زید و عمرو بلکہ چوپایوں کے برابر ہے"

اکابر علماء دیوبند کی تحریروں کو یوں من مانے معنیٰ و الفاظ پہنا کر اور عبارتوں میں قطع و برید اور تقدیم و تاخیر کر کے ان کو حتی الامکان بھیانک بنا کر علماء مکہ مکرمہ کے سامنے "المعتمد المستند" کے خوبصورت نام کے ساتھ پیش کر دیا۔ (عقائد علماء دیوبند ص۳۱)

حسام الحرمین اور علماء مکہ مکرمہ

مکہ مکرمہ شرفہا اللہ کے باشندوں خصوصاً علماء کرام سے عقیدت تقریباً ہر مسلمان

کے دل کی آواز ہے۔ اس لئے ان کا ہر قول عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے مگر حقیقت اور عقیدت کی بنیادیں ہمیشہ یکساں نہیں ہوتیں۔ سرزمین حرم کی طرف منسوب ہر فرد بشر کے لئے یہ ضروری تو نہیں کہ علم و تفقہ اور تقوی و دیانت کے ایک ہی معیار پر پورا اترتا ہو۔ مذکورہ بالا معاملہ میں بھی اسی حقیقت کا مظاہرہ سامنے آیا۔ احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے جب اپنا رسالہ حسام الحرمین اہل مکہ کے اصحاب علم کے سامنے پیش کیا تو اس پر مختلف طبقات علماء کرام میں علیحدہ علیحدہ رد عمل ہوا۔ متوسطین علماء میں سے جن حضرات نے اپنی آرا ظاہر کیں انھوں نے کسی حد تک احتیاط سے کام لیا اور اپنی تقریظات میں ایسے الفاظ استعمال کئے جن سے کسی خاص فرد پر حکم، صرف اسی صورت میں لگایا جاسکتا ہے جبکہ حسام الحرمین میں مذکورہ عبارت اسی کی ہو اور اس کا یہ عقیدہ بھی ہو۔

(عقائد علماء دیوبند ص۳۲)

مکہ مکرمہ کے جن بڑے علماء نے حسام الحرمین کی تصدیق سے انکار کیا وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) مولانا الشیخ حب اللہ مکی شافعیؒ (۲) مولانا شیخ شعیب مالکیؒ (۳) مولانا شیخ احمدؒ (۴) مولانا شیخ عبد الجلیل آفندی حنفیؒ (۵) الشیخ احمد رشید مکی حنفیؒ (۶) شیخ محب الدین حنفی مہاجر مکیؒ (۷) الشیخ محمد صدیق افغانی مہاجر مکیؒ (عقائد علماء دیوبند ص۳۲-۳۳-۳۴)

علماء مدینہ منورہ میں جن علماء نے حسام الحرمین کی تصدیق سے انکار کیا وہ حسب ذیل ہیں ۔

(۱) حضرت مولانا شیخ یسین مصری شافعیؒ (۲) مولانا شیخ عبد اللہ نابلسیؒ (۳) مولانا شیخ عبد الحکیم بخاری حنفیؒ (۴) الشیخ السید ملا سنقر بخاریؒ (۵) مولانا شیخ سید محمد امین رضوان شافعیؒ (۶) مولانا شیخ آفندی مامون بریؒ (۷) مولانا شیخ فالح ظاہری مالکیؒ (۸) صدر محکمہ عدل شیخ اسماعیل آفندی ترکیؒ

(عقاید علماء دیوبند ص۳۶-۳۷)

اصل حقیقت کی وضاحت کیلئے حضرت مدنیؒ کی کوششیں اور ان کے نتائج

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ احمد رضا خاں صاحب اور ان کے رسالے حسام الحرمین کی حقیقت کو آشکارا کر دیا بلکہ آپ نے سید اسحاق صاحب بردوانیؒ کے ذریعہ اس رسالے حسام الحرمین میں لکھے گئے علماء دیوبند کی طرف منسوب عقائد سے متعلق تحریروں کی صحت پر مناظرہ کا پیغام بھیجا تو جواب یہ دیا گیا کہ تم ہمارے قرین نہیں ہو۔ اپنے اساتذہ کو لاؤ ——— جو کہ مناظرہ سے فرار کا بہترین راستہ تھا کیونکہ ہندوستان سے اکابر علماء دیوبند کا حجاز پہونچنا آسان نہ تھا .... علماء کبار مدینہ منورہ کی طرف سے حسام الحرمین پر تصدیق کرنے سے انکار شروع کر دیا گیا اور جن لوگوں نے غلطی سے تصدیق کر دی تھی انھوں نے بھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ تو اب خاں صاحب نے یہی غنیمت جانا کہ جو کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں تصدیقات حاصل ہو گئیں ہیں اسی پر اکتفا کیا جائے اور جلد واپس جانا چاہیئے۔ اگر مدینہ منورہ میں مزید قیام کیا تو (چونکہ) حقیقت حال واضح ہو چکی ہے لہذا یہ لوگ کہیں اپنی اپنی تقریظات واپس ہی نہ لینا شروع کر دیں۔ چنانچہ فوراً واپسی کا رخت سفر باندھا اور ہندوستان واپس پہونچ گئے۔

حسام الحرمین کی تالیف اور اس پر تصدیقات کا یہ کام ایسی صورت حال میں مکمل ہوا کہ علماء حرمین، علماء دیوبند اور ان کے عقائد کے بارے میں صحیح معلومات نہ رکھتے تھے۔ نہایت رازداری کے ساتھ اس لئے (یہ کام) تکمیل پا گیا کہ راز ابھی کھلا نہ تھا اور خاں صاحب کے علمی اور سیاسی مددد اربعہ سے حرمین شریفین کے علماء اب تک آشنا نہ تھے۔

(عقائد علماء دیوبند ص ۴۹ - ۵۰)

علمائے حرمین نے اس سلسلہ میں چھبیس ۲۶ سوالات مرتب کر کے علماء دیوبند کے پاس

جواب کے لئے ارسال کئے۔ ان کی ابتدار میں مکر وفریب کے گذشتہ واقعات کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔ یہ تحریر عربی زبان میں ہے ترجمہ یہ ہے۔

اے علمائے کرام اور سرداران عظام! تمہاری جانب چند لوگوں نے وہابی عقائد کی نسبت کی ہے اور چند اوراق اور رسالے ایسے لائے ہیں جن کا مطلب غیر زبان ہونے کے سبب ہم نہیں سمجھ سکے۔ اس لئے امید کرتے ہیں کہ ہمیں حقیقت حال اور قول کی مراد سے مطلع کروگے اور ہم تم سے چند امور ایسے دریافت کرتے جن میں وہابیہ کا اور اہل سنت والجماعت سے خلاف مشہور ہے۔ (عقائد علمار دیوبند ص ۶۷-۶۸)

اس استفسار کے جواب میں حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری ؒ نے ایک معرکۃ الآرار رسالہ تیار کیا جس کا نام "المہند علی المفند" ہے اور جس پر دیوبند، امروہہ، مراد آباد، میرٹھ، سہارنپور، بجنور، دہلی کے نامور علمار کرام کے دستخط موجود ہیں۔ ان میں نمایاں اسمار حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ؒ، حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہی ؒ حضرت مولانا محمد احمد ابن قاسم العلوم والمعارف اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کے ہیں۔

مولوی احمد رضا خاں آخر صفر ۱۳۲۹ھ مطابق فروری ۱۹۱۱ء کو عرس حضرت شاہ بلاقی ؒ میں مراد آباد آنے والے تھے اس عرس ہی میں مولوی نعیم الدین مراد آبادی کی طرف سے جلسہ دستار بندی کا بھی اہتمام تھا۔ مولوی احمد رضا خاں حضرات علمار دیوبند سے مناظرہ بھی کرنا چاہتے تھے حضرات اکابر دیوبند نے اپنی آمادگی کا اظہار کیا اور لکھا کہ آپ مراد آباد میں مناظرہ کے لئے تیار ہو کر آجائیں۔ جیسا کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندی ؒ اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد ؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ایک مشترکہ تحریر سے ظاہر ہے جو مولوی احمد رضا خاں کے نام ہے اور اس کی نقل مجھے حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صدیقی مفسر، محشی بیضاوی ؒ کے کاغذات سے ملی ہے۔

نقل خط حضرت مولانا شیخ الہند دیوبندیؒ و حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ

بنام مولوی احمد رضا خاں صاحب

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم ـــــ جامع الاشتات جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب .
اصلح اللہ بالنا و بالکم ـــــ اظہار ما بیق بشانکم کے بعد واضح ہو۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مولانا اشرف علی صاحب سے حفظ الایمان کے متعلق مناظرہ کا عزم کر لیا ہے۔ گو ابھی اس مناظرہ کی تاریخ مقرر نہیں ہوئی مگر یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ مراد آباد کسی عرس کی شرکت کیلئے آنے والے ہیں۔ مولانا اشرف علی صاحب حسب قرارداد معاہدہ آپ سے وقت معین پر مناظرہ کریں گے اور آپ کے مواخذات پر حفظ الایمان کا جواب دیں گے مگر چونکہ آپ نے حضرت مولانا قاسم الخیر والبرکات اور حضرت مولانا رشید الملۃ والدین کی نسبت بھی داد ایمانداری دی ہے اور آپ اس میں مدعی ہیں اس لئے ہم کو حق ہے کہ آپ سے آپ کے دعاوی کا ثبوت طلب کریں بلکہ حسب قاعدہ "الاقدم فالاقدم" آپ کو اول ہر دو حضرات مرحومین کے متعلق تصفیہ کرنا ضروری ہے اور ان نزاعات کو اس موقع پر مراد آباد میں طے کر لیا جاوے۔ اور مسلمانوں میں جو اختلاف واقع ہو رہا ہے اس کو رفع کر دیا جاوے۔ اس لئے ہم آپ کی خدمت میں اطلاع دیتے ہیں کہ آپ اس خاص کام کے لئے تیار ہو کر مراد آباد کا قصد فرمادیں۔ ہم بالاصالۃ مشافہۃً زبانی گفتگو کریں گے۔ آپ بفور پہونچنے اس تحریر کے اپنے پہونچنے کے وقت سے اطلاع دیں تاکہ ہم لوگ پہلے سے مراد آباد پہونچ جاویں۔ اگر آپ نے ہماری اس تحریر کا کچھ جواب نہ دیا تب بھی بغرض اظہار حق واقع اختلاف ہم لوگ مراد آباد کا قصد ضرور کریں گے۔ مکرر یہ کہ آپ سے اصالۃً گفتگو ہوگی۔ وکالت معتبر نہ ہوگی۔ اور اگر اصالۃً گفتگو سے انکار کر کے کسی وکیل مسلم کو پیش کریں گے تو اس وقت ہم کو بھی اختیار ہوگا کہ اپنی طرف سے وکیل مسلم پیش کر دیں۔

آگے کو اس مناظرہ کی صحیح روئیداد نہ معلوم ہو سکی مراد آباد کے اخبارات میں نیر اعظم

ایک بڑے درجہ کا اخبار تھا اس میں یقیناً یہ روئیداد شائع ہوئی ہوگی مگر مجھے نیر اعظم کا فائل نہ مل سکا جس سے اس موقع کی روئیداد کا علم ہوتا ــــ رسالہ ضیاء الاسلام میں بھی اس کی روئیداد ضرور چھپی ہوگی مگر صفر یا ربیع الاول ۱۳۲۹ھ کا کوئی پرچہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ مدرسہ شاہی مرادآباد کی ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء کی روئیداد بھی مدرسہ میں موجود نہیں ہے۔ ایسی صورت میں پوری معلومات بہم نہیں پہونچ سکیں۔ البتہ پندرہ روزہ اخبار دبدبہ سکندری رامپور کے ۲۷ صفر ۱۳۲۹ھ کے پرچہ سے اتنا معلوم ہوا کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب عرس حضرت شاہ بلاقیؒ میں آئے تھے۔ ۱۴ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ کے پرچہ میں "عرس و مناظرہ" کے عنوان سے ایک مختصر روئیداد شائع ہوئی ہے جو انھیں کے کسی بے نام و نشان ہمنوا کی ہے اس روئیداد کے آخر میں بجائے نام کے یکے از حاضرینِ جلسہ تحریر ہے۔

اس روئیداد کا ایک جملہ یہاں نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

"الحمدللہ ..... کہ ۲۶ صفر یوم یک شنبہ کو دن کے ۸ بجے اعلیٰ حضرت عظیم البرکت .... شاہ محمد احمد رضا خاں صاحب حنفی قادری، برکاتی بریلوی مدظلہم الاقدس جلسۂ دستار بندی اور ایک دینی خدمت کے لئے جو مناظرہ کی صورت میں فرقۂ غیر مقلدین سے تھی۔ بریلی سے روانہ ہوکر مرادآباد آئے"۔

تعجب ہے کہ اس بے نام و نشان نامہ نگار نے اپنی روئیداد میں ہر جگہ یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مناظرہ غیر مقلدین کے مقابلہ میں ہونا تھا نیز اکابر دیوبند میں سے کسی ایک کا بھی نام تحریر نہیں کیا ہے حالانکہ خود مولوی احمد رضا خاں نے اپنے ایک خط[ف] میں جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام ہے، لکھا ہے۔

" .... معاہدہ میں ۲۷ صفر وصول تعین تاریخ مناظرہ کے لئے مقرر ہوئی

ف اس خط کی نقل بھی احقر کے پاس موجود ہے جو حضرت حافظ صاحب کے کاغذات سے مجھے ملی۔

ہے۔۔۔۔۔ لہٰذا فقیر اس عظیم ذوالعرش کی قدرت و رحمت پر توکل کر کے یہی (۲۷) صفر روز جان افروز دوشنبہ اس کے لئے مقرر کرتا ہے۔۔۔۔"

اب میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے دونوں مکتوب ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں ان دونوں مکتوبات سے واضح ہوتا ہے کہ اکابر دیوبند مناظرہ کا عزم بالجزم لے کر مراد آباد آئے تھے۔

مکتوب نمبر ۱

مخدومی و مکرمی جناب فیض مآب مولانا صاحب زید مجدہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل ایک عریضہ ارسال خدمت ہو چکا ہے ملاحظہ نظر فیض اثر سے گذرا ہوگا۔

یہ اشتہار مرسل خدمت ہے۔ نہایت ضروری ہے کہ بفور ملاحظہ اس کو کاپی پر چڑھوا کر جلد طبع کرا دیجئے۔ بعدہٗ تمام مراد آباد میں تقسیم کرادیں اور بریلی بھی بہت جلد روانہ کر دیں۔ اور وہاں بھی مشتہر ہو جاوے۔ اشتہار بڑے ورق پر ہونا چاہئے۔ ہم سب ہر طرح تیار ہیں ذرا آپ حضرات بھی بخوبی تیار ہو جاویں۔ اگر اس کے واسطے کوئی خاص چندہ نہ کیا گیا تو ہم بطور خصوص ان مصارف کے متکفل ہوں گے۔ مگر تاخیر نہ ہونا چاہئے۔ علاوہ ازیں قابلِ مزید غور و توجہ یہ امر ہے کہ بروز جمعہ حضرت مولانا دامت برکاتہم و جناب حافظ صاحب مدظلہم ہاپوڑ و امروہہ ہوتے ہوئے شام کے دس بجے کی گاڑی میں حضرت مولانا امروہی مدظلہم کو ہمراہ لیتے ہوئے مراد آباد پہونچیں گے۔ بعونہ تعالیٰ۔ یہ امر نہایت قابل اہتمام ہے کہ بروز جمعہ صبح کو چند آدمی آپ کی طرف سے مولانا مدظلہم کی خدمت میں امروہہ پہنچ جاویں اور ان سے درخواست

ؔ یہ دونوں مکتوب حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صدیقیؒ مفسر، محشی بیضاوی کے نام ہیں جو اس وقت مدرسہ شاہی مراد آباد کے صدر المدرسین تھے۔ حضرت حافظ صاحب کے کاغذات میں سے یہ دونوں مکتوبات مجھے حاصل ہوئے جو براہِ راست حضرت شیخ الاسلامؒ کے قلم سے ہیں۔

مراد آباد کر کے ان کی پیش قدمی کریں۔ یہاں سے دو تین قطعہ رجسٹری ان کے پاس روانہ کی جا چکی ہیں۔ مولانا دامت برکاتہم کو یہ حضرات لے کر شام کے وقت اسٹیشن امروہہ پر آجاویں تاکہ جملہ حضرات کی رفاقت ہو جاوے اور یکبارگی مراد آباد میں پہونچیں۔ مولانا کے واسطے وہاں بھی جائے قیام وغیرہ کا اہتمام خاص ہونا ضروری ہے ــ غرضکہ یہ امور نہایت قابل توجہ والتفات ہیں۔ سرگرم رہیں۔ مولوی بدر الحسن صاحب سہسوانی اگر ان حضرات سے پہلے پہونچ جاویں تو جس بات کی ان کو ضرورت واقع ہو اس کی انجام دہی میں مدد ضرور فرمادیں۔ جناب مولانا مولوی قدرۃ اللہ صاحب کی خدمت میں مضمون واحد ہے۔ غالباً احقر ان اکابر کی ہمراہی میں نہ آسکے بلکہ اگر منظور ایزدی ہے تو شب شنبہ کی ڈاک گاڑی میں ۳½ بجے وہاں پہونچے گا۔ اور ان شاء اللہ تعالیٰ جناب مولوی انور شاہ صاحب کے ہی ہمراہ ہوگا۔ سہارنپور میں بروز جمعہ بعض ضروریات ہیں مسودۂ درخواست ارسال خدمت ہے۔ اس کو مشورہ فرما کر ونیز مولوی حامد حسن صاحب کو دکھلا کر کسی باوجاہت شخص سے درخواست دلادیں اور اگر اس کے علاوہ اور کوئی رائے مناسب معلوم ہو تو وہ کی جاوے مگر کانوں تک پہونچادیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مکتوب ۲

مخدومی ومکرمی جناب فیض مآب مولانا مولوی عبد الرحمن صاحب وحاجی محمد اکبر صاحب وحاجی فضل الٰہی صاحب ومنشی عبد الرزاق صاحب ومنشی محمد اسماعیل صاحب ومنشی محمد ابراہیم صاحب زید مجدہم

بعد از سلام مسنون الاسلام عرض آنکہ آج معزز نامہ آپ جملہ حضرات کا وارد ہو کر باعث سرفراز ہوا۔ چونکہ قبل ازیں کل اور پرسوں لگاتار دو خط رجسٹری کردہ آپ کی خدمت میں روانہ کر چکے ہیں اس لئے بظاہر کوئی ضرورت اس وقت عریضہ ارسال خدمت

کرنے کی نہیں تھی مگر مزید اطمینان کے واسطے ارسال کرتا ہوں۔ آپ حضرات بخوبی اطمینان رکھیں۔ اگر منظور الٰہی ہے تو کل ان شاء اللہ العزیز ہر دو حضرات بعد جمعہ یہاں سے روانہ ہو کر بماہ امروہہ ۱۰ بجے وہاں پہونچ جاویں گے۔ ان اکابر کو اس قدر اہتمام ہے کہ باوجودیکہ کل تار بمبئی سے حجاج کے پہونچ جانے کا آچکا ہے۔ مگر ہرگز اس کا خیال نہ کیا گیا اور ہر طرح عازم بالجزم ہیں۔ مولوی ابراہیم صاحب کا بھی خط آگیا وہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ اوسی گاڑی میں ہاپوڑ سے مل جاویں گے۔ حضرت مولانا امروہی مدظلہم کے پاس غالباً آپ نے دو ایک حضرات کو روانہ کر دیا ہوگا۔ احقر ہر چند ہمراہ نہ ہوگا۔ مگر آخر شب کی گاڑی میں حاضر ہو جاوے گا۔ جناب عالی نہایت مناسب اور ضرور ہے کہ جملہ حضرات کا قیام ایک ہی جگہ ہو۔ جس کے لئے مسجد شاہی کے حجرے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا امروہی مدظلہ کے واسطے کوئی خاص کوٹھری انسب ہوگی۔ مولوی کفایت اللہ صاحب شاہجہاں پوری وغیرہ حضرات بھی مولوی ابراہیم صاحب کے ساتھ ضرور پہونچیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔ دیگر ایں کہ ہمارے کھانے کا انتظام شام کے وقت نہ فرمائیں۔ کھا کر آویں گے۔ نیز ایں کہ اکابر کی رائے ہے کہ کل بعد از جمعہ مولانا مولوی عبدالرحمٰن صاحب ایک وعظ خاص اس بارے میں ضرور فرما دیں۔ و نیز آپ اس اجتماع میں جلسۂ جمعیۃ کا بھی استحکام کرلیں۔ جملہ حضرات سلام مسنون فرماتے ہیں۔ مولوی قدرۃ اللہ صاحب سے سلام مسنون کہہ دیں۔

فقط

والسلام

احقر الطلبہ حسین احمد غفرلہ

۲۳ صفر ۱۳۴۱ھ بروز جمعرات

آخر وہی ہوا جس کی توقع تھی خاں صاحب خود تاب مناظرہ نہ لاسکے۔ محمد سعید کوتوال شہر کے ذریعہ اپنا کام نکال لیا اور نقض امن کا اندیشہ اس انداز سے ظاہر کیا کہ عوام الناس یہ سمجھیں کہ فریق ثانی نقض امن کا بہانہ بنا کر فرار چاہتا ہے۔

میرا مقصود درحقیقت حضرت شیخ الاسلامؒ کے اِن دو مکتوب گرامی کا پیش کرنا اور ان کا پس منظر دکھانا تھا اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ ۱۳۲۴ھ میں حجاز مقدس میں اسلاف واکابر کے خلاف برپا ہونے والے فتنہ کا سدباب اور تعاقب جس عظیم شخصیت نے کیا تھا ہندوستان کے اندر ۱۳۲۹ھ میں اسی فتنہ کا مقابلہ اور دفاع سرزمین مرادآباد پر اسی شخصیت نے پوری جانفشانی اور بیدار مغزی کے ساتھ کیا اور پھر ربیع الاول ۱۳۲۹ھ مطابق مارچ ۱۹۱۱ء میں مرادآباد میں ہونے والی جمعیۃ الانصار کی عظیم الشان مؤتمر کا منعقد کرنا حضرت مولانا عبیداللہ سندھی ناظم جمعیۃ الانصار کے ساتھ اسی شخصیت کا کارنامہ تھا جس کے چھ اجلاس حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہیؒ کی زیر صدارت ہوئے، اور جس نے نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ پورے ہندوستان میں ایک نئی روح پھونک دی اور جس کے نتیجہ میں ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلماء نہایت شان وشوکت کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی، حضرتؒ کی زندگی کا یہ بھی قابل ذکر پہلو ہے جس کا بیان کرنا ضروری تھا، ورنہ تو ان کی شخصیت ایک جامع شخصیت تھی ان کا نصب العین اعلاء کلمۃ اللہ تھا انھوں نے درس حدیث وقرآن کا مشغلہ تمام عمر جاری رکھا اور متقدمین صوفیہ کے طرز پر سلوک کی منزلیں طے کر کے تادم آخر مجالس ذکر وشغل کو جاری رکھا۔

تقسیم ہند کے بعد دس سال تک وہ حیات رہے، اور اس دس سال کے عرصہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اور جس طرح انھوں نے مسلمانوں کے قدم یہاں جمائے اور ہمت وجرأت کی تلقین کی، ان کا ذکر تو ایک ضخیم کتاب میں بھی نہیں سما سکتا، انھوں نے تقسیم کے بعد شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک مسلسل دورے کئے، اور رات دن اسی

فکر میں لگے رہے کہ مسلمانانِ ہند دینداری اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گذاریں، اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا انعام تھا کہ تقسیم کے بعد حضرتؒ کو دس سال تک اصلاح ورشد وہدایت کا موقع ملا، ورنہ نامعلوم تقسیم کے بعد مسلمانانِ ہند کا کیا حال ہوتا حضرتؒ نے بلاتخصیص مسلک ہر ایک مسلمان کی ہمدردی فرمائی، اور جو لوگ حضرت کے سیاسی ملک کے سخت مخالف تھے، اور جنھوں نے ایذار رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا، ان کو بھی تسلی دی، اور ان کے بھی کام بنائے، جن لوگوں نے اکابر دیوبند کے خلاف مسلسل جد وجہد کی تھی ان کو بھی راحت وآرام پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کی، تمام فروعی اختلافات پس پشت ڈال کر عامۃ المسلین کی نفع رسانی مدنظر رکھی اور اپنی تقریروں وتحریروں میں بالکل یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ ہندوستان میں جن مسلمانوں کی حمایت کی جارہی ہے ان میں ایک اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جنھوں نے ان کے بزرگوں کے خلاف سخت نامناسب ہنگامے برپا کئے تھے اور خود ان کے خلاف بھی ایذار رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔
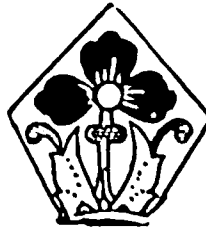
شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ بظاہر ایک شخصیت کا نام ہے، لیکن بباطن وہ اپنی جامعیت کے اعتبار سے " ان ابراھیم کان امۃً " کی تفسیر تھے، کیونکہ وہ بیک وقت علوم و معارف کے امام، مجلس ارشاد کے صدر نشین، عزیمت و استقامت کے جبل عظیم، فقر و تواضع کے بحر عمیق، بصائر و حکم کے سرچشمہ، زہد و قناعت کے مجسمہ، اخلاص و ایثار کے پیکر، سخاوت و شجاعت کے مخزن، میدان صبر و رضا کے شہسوار، قافلۂ جہد و عمل کے تاجدار، اور سلفِ صالحین کی مکمل و متحرک یادگار تھے۔ "کثر اللہ امثالہ"

آپ نے سیاست کے بحرِ مواج میں اپنے سفینہ کی تختہ بندی کی، مگر اس بصیرت کے ساتھ کہ اس کی چھینٹیں آپ کے دامنِ حیات کو نمناک نہ کر سکیں، آپ نے مذہب و سیاست کے جام و سندان کو باہم آمیز کر دیا، مگر اس کمالِ فراست

کے ساتھ کر دونوں کی نزاکتوں سے ایک لمحہ کیلئے بھی صرف نظر نہیں کیا۔

"خدمات اور کارناموں پر ایک اجمالی نظر"

۱۹ر شوال ۱۲۹۶ھ کو آپ کی ولادت ہوئی۔ اور ۱۲ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء) کو ساڑھے اکیاسی سال کی عمر میں اس جہان فانی کو چھوڑ کر رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ اس اکیاسی سالہ حیات کے ۲۰ سال تعلیم و تحصیل میں بسر ہوئے اور تقریباً ۷ سال ۹ ماہ سے کچھ کم و بیش قید فرنگ کی نذر ہوگئے، زندگی کے باقی ۵۳ سال میں سے اگر کم از کم ۱۰ برس خواب و خور اور دیگر حوائج بشریہ کی تکمیل کے لئے نکال دیئے جائیں، تو کارکردگی کی مدت صرف ۴۳ سال رہ جاتی ہے، ان ۴۳ر سال کے محدود ایام کو پیش نظر رکھ کر حضرت شیخ الاسلام کی تعلیمی، تربیتی، تصنیفی اور سیاسی خدمات اور کارناموں کا جائزہ لیجئے کہ مدینۃ الرسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام، مدرسہ عالیہ کلکتہ اور آسام کے علاوہ صرف دارالعلوم دیوبند میں چار ہزار سے زائد وہ تلامذہ ہیں جنھوں نے آپ کے شمع علم سے اکتساب نور کیا، لاکھوں سے زیادہ وہ طالبین حق ہیں جنھوں نے تربیت گاہ مدنی سے تصحیح عقائد، تحسین اخلاق و تزکیۂ باطن کا درس لیا، جن میں ڈیڑھ سو سے اوپر وہ خوش بخت اور جواں ہمت بھی ہیں جو احسان و سلوک کی منزلیں طے کر کے سند اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے۔ اصلاح معاشرہ اور تبلیغ دین کے لئے اس وسیع و عریض ملک کے چپے چپے کا دورہ اور اسلامی عنوانات پر ہزاروں سے زائد خطبات و تقریریں، استخلاص وطن، حریت قومی اور ملت کی سربلندی کی خاطر وقت کی سب سے بڑی استعماری طاقت سے محاذ آرائی، علوم اسلامی کی اشاعت کی غرض سے ہزاروں مکاتیب دینیہ و مدارس اسلامیہ کی سرپرستی و نگرانی، پھر ان ہمہ جہت و مختلف النوع مشاغل کے ساتھ مختلف دینی

علمی اور سیاسی و تاریخی موضوعات پر کتب و رسائل کی تالیف و تصنیف، نیز ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ان مکاتیب کی تحریر جن میں تفسیر آیات، تشریح احادیث، تفصیل عقائد، توضیح مسائل فقہیہ، رموز احسان اور تاریخ و سیاست سے متعلق بیش بہا نادر معلومات کا ایک عظیم ذخیرہ جمع کر دیا ہے، جس کے متعلق بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے، مکتوبات و ملفوظات کی طویل فہرست میں مخدوم شرف الدین احمد منیری متوفی ۷۸۲ھ اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ کے بعد مجموعۂ مکاتیب میں شیخ الاسلام کے مکتوبات اپنی افادیت، اثر آفرینی، کثیر معلومات اور جامعیت میں سب پر فوقیت رکھتے ہیں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ مکتوبات قلم برداشتہ اور بالعموم اسفار یا قید و بند کی حالت میں لکھے گئے ہیں جس سے حضرت شیخ الاسلام کے علمی استحضار و عبقریت کا کسی قدر اندازہ لگایا جا سکتا ہے، پھر تکمیل ذات کیلئے آہ نیم شبی کا مشغلہ اور رب کریم و آقائے بے نیاز سے عرض و نیاز، جو زندگی کا ایک جزبن گیا تھا، بسا اوقات پورا دن ٹرین، تانگہ اور بیل گاڑیوں کے تکلیف دہ سفر میں گذر جاتا اور رات کا بیشتر حصہ جلسہ اور وعظ میں، لیکن کیا مجال کہ رات کے اس محبوب معمول میں ذرا بھی فرق آجائے۔ الحاصل آپ کی زندگی ...... فی اللیل رہبان و فی النہار فرسان کا مکمل نمونہ تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ایسی جامع کمالات و متضاد صفات کی حامل شخصیت پر قلم اٹھانے والا محامد و محاسن کے ہجوم میں متحیر ہو کر رہ جاتا ہے، وہ اگر مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور دار العلوم دیوبند میں آپ کے درس و تدریس اصحاب عمل اور مردان کار کی تعلیم و تربیت کو موضوع سخن بنانا چاہتا ہے، تو اسی لمحہ میدانِ جہاد میں آپ کے محیر العقول کارنامے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں، وہ اگر آپ کے صدارت جمعیۃ کے عہد پر لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسی آن عرفان و احسان

کی وہ روح افزا وکیف آگیں بزم جس کے آپ صدر نشین تھے، اسکے رہوار تخیل کی زمام اپنی سمت موڑ لیتی ہے، وہ اگر آپ کے تبلیغی مواعظ اور اصلاحی مکاتیب کے سلسلے میں اپنے تاثر بیان کرنا چاہتا ہے تو آپ کے خطبات صدارت اور کراچی کی عدالت میں سنگینوں کے زیر سایہ اعلان حق، تاریخ عزیمت کا ایک نیا باب اس کی نگاہوں کے سامنے کردیتے ہیں۔ وہ اگر آپ کے محاسن اخلاق اور بلندی کردار کو اپنی بحث وتحقیق کا عنوان بنانا چاہتا ہے، تو آپ کے بحر علم سے اسرار وحکم وعلوم ومعارف کی اٹھتی ہوئی موجیں، اس کے اشہب فکر کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں، اور بالآخر فضائل وکمالات کی ان مسلسل اور بے پناہ جلوہ طرازیوں سے مبہوت ہوکر وہ پکار اٹھتا ہے۔ ؎

دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار
گلچیں زتو تنگئ داماں گلہ دارد

یقین جانئے یہ شاعری یا عقیدت کی کرشمہ کاری نہیں ہے بلکہ ان مشکلات وکیفیات کا صحیح اظہار ہے جن سے ان سطور کو سپرد قلم کرتے ہوئے گذرنا پڑا ہے، ظاہر ہے اس پریشان خیالی میں کسی مرتب ومفصل تحریر کی ہوس بے سود تھی، اس لئے یوسف کے خریداروں میں نام لکھوانے کی غرض سے یہ بضاعۃ مزجاۃ بعنوان تین امتیازات لے کر حاضر ہوگیا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز وشرف

شیخ الہندؒ کے ساتھ طویل ملازمت:

حضرت شیخ الاسلام ماہ صفر ۱۳۰۹ھ میں بغرض تحصیل علم دیوبند پہنچے اور اخیر شعبان ۱۳۱۶ھ تک آپ کا قیام رہا۔ ساڑھے چھ سال کی اس مدت میں سترہ

فنون پر مشتمل سرسٹھ درسی کتابیں اساتذہ دارالعلوم سے پڑھیں، جن میں ۲۴ کتابیں خود حضرت شیخ الہند نے پڑھائیں، اس اجمال کی تفصیل خود حضرت شیخ الاسلام کے کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

خلاصہ یہ کہ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام رہا، اس مدت میں مندرجہ ذیل کتابیں مندرجہ ذیل اساتذہ کے پاس ہوئیں

(۱) حضرۃ شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز:- دستور المبتدی، زرادی، زنجانی، مراح الارواح، قال اقول، مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی تصورات، قطبی تصدیقات، میر قطبی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، مطول، ہدایہ اخیرین، ترمذی شریف، بخاری شریف، ابوداؤد شریف، تفسیر بیضاوی شریف، نخبۃ الفکر، شرح عقائد نسفی، حاشیہ خیالی، موطا امام مالک، موطا امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ۔

(۲) مولانا ذوالفقار علی (والد ماجد حضرت شیخ الہند رحمہما اللہ) فصول اکبری

(۳) مولانا عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس دوم دارالعلوم۔ مسلم شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ، سبعہ معلقہ، حمد اللہ، صدرہ، شمس بازغہ، توضیح تلویح۔

(۴) مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند۔ تلخیص المفتاح

(۵) مولانا حکیم محمد حسن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند۔ پنج گنج، صرف میر، مختصر المعانی، سلم العلوم، ملا حسن، جلالین شریف، ہدایہ اولین۔

(۶) مولانا المفتی عزیز الرحمان صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند۔ شرح جامی بحث فعل کافیہ، ہدایۃ النحو، منیۃ المصلی، کنز الدقائق، شرح وقایہ، مأتہ عامل، اصول الشاشی۔

(۷) مولانا غلام رسول صاحب بغوی مدرس دارالعلوم دیوبند: نور الانوار، حسامی قاضی مبارک، شمائل ترمذی۔

(۸) مولانا منفعت علی صاحب مرحوم، میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال، میبذی

خلاصۃ الحساب، رشیدیہ، سراجی۔

(۹) مولانا الحافظ احمد صاحب مرحوم ۔ شرح جامی بحث اسم

(۱۰) مولانا حبیب الرحمان صاحب ۔ مقامات حریری، دیوان متنبی

(۱۱) بڑے بھائی صاحب مرحوم (مولانا سید محمد صدیق صاحب) میزان الصرف، منشعب، ایساغوجی[1]

(۱) تعلیم و تعلم کا یہ ساڑھے چھ سالہ دور حضرت شیخ الہند کے زیر سایہ اور ملازمت میں بسر ہوا کیونکہ اس پوری مدت میں آپ کا قیام حضرت کے مکان سے متصل ایک کوٹھی میں رہا، اس قربت مکانی کے علاوہ آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب حضرت شیخ الہند کے خدام میں سے تھے، اس تقریب سے ابتدا ہی سے آپ کو حضرت شیخ الہند کا تقرب حاصل ہو گیا۔

(۲) فراغت تعلیم اور مدینہ منورہ میں اقامت پذیر ہو جانے کے بعد ۱۳۲۷ھ میں جب عارضی طور پر ہندوستان تشریف لائے تو تقریباً ایک سال مزید حضرت شیخ الہند کی خدمت میں رہ کر ترمذی و بخاری کو دوبارہ بحث و تحقیق سے پڑھا۔ لکھتے ہیں

> ۱۳۲۶ھ کے آخر میں (مدینہ منورہ) سے روانہ ہو کر ۱۳۲۷ھ میں دیوبند پہنچا۔۔۔۔۔ اور ترمذی و بخاری میں شریک ہو گیا، اور بالالتزام ان دونوں کتابوں کو پڑھا۔ مسائل پر پوری بحث کرتا تھا، حضرت رحمہ اللہ بھی اس مرتبہ غیر معمولی توجہ فرماتے تھے اور خلاف عادت تحقیقی جواب نہایت وضاحت سے دیتے تھے[2]

(۳) علاوہ ازیں اسارت مالٹا کا پورا زمانہ حضرت شیخ الہند کی معیت میں گذرا اور کنج تنہائی میں حضرت شیخ کے آفتاب فیض سے باطمینان خاطر علم و فکر کی روشنی

---

[1] نقش حیات ج ۱ ص ۴۵ و ۴۶۔ [2] ایضاً ج ۱ ص ۴۴

اخذ کرتے رہے، اس طرح مجموعی طور پر دس گیارہ سال تک آپ کو حضرت شیخ الہند کی صحبت وملازمت کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایسا امتیاز ہے جس میں ان کے رفقاء ومعاصرین میں کوئی بھی ان کا سہیم وشریک نہیں، علم وفکر کی پختگی میں شیخ سے طول ملازمت کا جو مقام ہے اہل نظر سے مخفی نہیں، سچ پوچھیئے تو اسی اتصال ویک نفسی نے حضرت شیخ الاسلام کی ذات کو ایک ایسا آئینہ بنا دیا تھا جس میں شیخ الہند کے سراپا کو بخوبی دیکھا جا سکتا تھا ؎

یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

مسجد نبوی میں حلقۂ درس:

شعبان ۱۳۱۶ھ میں آپ کو تعلیم وتحصیل سے فراغت حاصل ہوئی اور اسی سال ماہ شعبان ہی میں آپ کے والد ماجد نے مدینہ منورہ زادہا شرفاً وتعظیماً کی جانب ہجرت کے ارادہ سے رخت سفر باندھا، والد محترم کے حکم سے حضرت شیخ الاسلام نے بھی انھیں کی معیت میں ہندوستان کے بجائے ارض رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مسکن وماویٰ بنا لیا۔ جیسا کہ خود رقم طراز ہیں۔

محرم ۱۳۱۷ھ کی ابتدائی تاریخوں میں مدینہ منورہ میں شرف حضور حاصل ہوا۔ حرم نبوی کے باب النساء کے قریب زقاق البدور کے کنارے پر ایک مکان کرایہ پر لے کر قیام کیا گیا [1]

مدینہ منورہ میں پہنچ کر رہائش وغیرہ کے معاملات سے مطمئن ہو جانے کے بعد آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا، اس اجمال کی تفصیل خود حضرت

---

[1] نقش حیات ج ۱ ص ۱۰۔

شیخ الاسلام کی زبانی سماعت کیجئے۔ فرماتے ہیں

"درس و تدریس کی تفصیل یہ ہے کہ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جب کہ ہم تینوں بھائی (حضرت شیخ الاسلام، مولانا محمد صدیق صاحب۔ و مولانا سید احمد صاحب) دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے تو منجملہ رخصت کرنیوالوں کے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز ساتھ ساتھ اسٹیشن دیوبند تک تشریف لائے تھے، راستہ میں پرزور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ "پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا چاہے دو ایک طالب علم ہی ہوں" اس لئے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہوگیا تھا، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بعض طلبہ ہندوستان اور عرب بعض کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے ..... اور حسب ہدایت حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز اس کام کو شروع کردیا"[1]

چونکہ حضرت شیخ الاسلام کی عمر ابھی کم تھی اور یہاں کے نو وارد بھی تھے، اور بقول سعدی علیہ الرحمہ ؎

"تا مرد سخن نگفتہ باشد ٭ عیب و ہنرش نہفتہ باشد

آپ کے علمی مقام و مرتبہ اور صلاحیتوں پر اجنبیت اور عدم واقفیت کا پردہ پڑا ہوا تھا، اس لئے ابتدا میں تقریبًا ایک سال تک طلبہ کا رجوع آپ کی طرف کم رہا۔ لیکن دو سال گذرتے گذرتے آپ کا نہال علم ایک تناور درخت ہوگیا، جس کے سایے میں حجاز، ترکستان، بخاریٰ، ہندوستان، کابل، الجزائر، قازان، مصر وغیرہ دور و نزدیک سے مسافران علم کے قافلے در قافلے آآکر اترنے لگے اور آپ کے تبحر علمی کے غلغلے سے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گلی کوچے پرشور ہوگئے، آپ کے

---

[1] نقش حیات ج ۱ ص ۷ د۔

درس کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ قدیم اساتذہ مسجد نبوی کے حلقہ ہائے درس سونے پڑ گئے، اور ان کی ساری رونق سمٹ کر حضرت شیخ الاسلام کے قدموں میں نچھاور ہونے لگی ؎

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ایک نووارد اور وہ بھی نوعمر کا اس قدر جلد شہرت و مقبولیت کے بام عروج پر پہنچ جانا عام حالات میں بڑے بڑے وسیع ظرف اور سیر چشموں کے لئے بھی رشک و رقابت اور حسد کا سبب ہو جاتا ہے، کچھ اسی طرح کا معاملہ حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ بھی پیش آیا کہ آپ کا علمی عروج دیکھ کر مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے قدیم اساتذہ کی رگ حسد پھڑک اٹھیں جس کی بنا پر آپ کو چندے مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن جس آقائے کریم نے سر پر مقبولیت کا تاج رکھ کر آپ کو سرفراز فرمایا تھا، اسی نے ان مشکلات کا مداوا بھی کر دیا۔ اور آپ کی نیک نامی دن دونی رات چوگنی بڑھتی ہی رہی۔

خود حضرت شیخ الاسلام؛ نے مدینہ منورہ میں اپنے مشاغل علمیہ پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے

"۱۳۱۸ھ شوال تک .... میں ابتدائی کتابیں مختلف فنون کی دو دو چار چار طالب علم کو پڑھاتا رہا ۱۳۱۸ھ ذی قعدہ میں قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز کے ارشاد کے مطابق گنگوہ کا سفر کیا اور ۱۳۲۰ھ محرم میں مدینہ منورہ واپس ہوا، یہاں پہنچنے کے بعد مدرسہ شمسیہ باغ معروف بہ توطیہ کے مدرسہ میں بعہدہ مدرسی ۳۵ روپے پر ماہوار ملازم ہو گیا، چونکہ طلبہ کا ہجوم ہوا اسلئے

خارج از مدرسہ اوقات میں حرم محترم میں کتابیں شروع کرادیں، سمجھدار اور جد وجہد کرنے والے طلبہ کا اجتماع میرے پاس بہت زیادہ ہوگیا جس سے مدرسین حرم محترم کو حسد اور رقابت پیدا ہوگئی، طلبہ صرف اہل مدینہ نہ تھے بلکہ ترک بخاری، قازانی، قزق، ترکستانی، کابلی، مصری، وغیرہ بھی تھے (اس حسد کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا) ...... ناظر مدرسہ شمسیہ باغ کو اصرار (ہوا) کہ خارج از اوقات مدرسہ کہیں نہ پڑھایا جائے، اس قسم کی چند باتیں اور بھی پیش آئیں جن کی وجہ سے بمجبوری مدرسہ کی ملازمت سے استعفاء دینا پڑا۔ اور یہ ارادہ کرلیا گیا کہ لوجہ اللہ بلا معاوضہ حرم محترم میں اسباق پڑھائے جائیں اور رزق کو اس کے کفیل جناب باری عز اسمہ کی کفالت پر رکھا جائے چنانچہ کتب درسیہ کا میدان وسیع کردیا گیا، حضرت گنگوہی قدس سرہ کی بارگاہ میں ان اسباق کی فہرست اور مشاغل کی تفصیل لکھی ...... (کہ) طلبہ علوم کا اصرار بہت زیادہ ہے، مجبور ہو کر میں نے دن رات کا اکثر حصہ اسی میں صرف کر رکھا ہے، جواب میں حضرت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ "پڑھاؤ خوب پڑھاؤ" اس سے ہمت زیادہ بڑھ گئی، روزانہ ۱۴ اسباق پڑھاتا تھا پانچ صبح کو تین یا چار ظہر کے بعد دو عصر کے بعد دو مغرب کے بعد ایک عشاء کے بعد"[1]

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۶ھ تک مسلسل طور پر میرا مشغلہ علمی مدینہ منورہ میں جاری رہا ...... چونکہ مدینہ منورہ میں منگل اور جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے۔ تو ان تعطیل کے ایام میں بھی

---

[1] نقش حیات ج ۱ ص ۹۲ تا ۹۹ باختصار الخ

خصوصی دروس چار پانچ ہوتے تھے، .... علوم میں جد وجہد کرنے والے طلبہ کا ہجوم اس قدر ہوا کہ علماء ومدرسین کے حلقہ ہائے درس میں اس کی مثال نہیں تھی[1]

۱۳۲۷ھ میں آپ پھر ہندوستان وارد ہوئے اور ۱۳۲۹ھ تک ہندوستان ہی میں قیام پذیر رہے، اسی سفر میں آپ نے حضرت شیخ الہند سے ترمذی وبخاری دوبارہ پڑھی جس کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے، نیز اس عارضی قیام کے زمانہ میں آپ کو اکابر دار العلوم نے باقاعدہ طور پر دار العلوم کا استاذ بھی منتخب کرلیا تھا اور اس تصریح کے ساتھ کہ یہ انتخاب دوامی ہے۔ درمیان میں وقفہ کے بعد جدید تقرر کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ یہی تجویز تقرر کافی سمجھی جائے گی، یہ حضرات اکابر رحمہم اللہ کی جانب سے آپ کے علمی لیاقت پر اعتماد اور وثوق کی ایسی گرانقدر سند ہے، جو فضلائے دار العلوم میں سے سب سے پہلے آپ ہی کو مرحمت ہوئی ہے اور غالباً آپ ہی پر اس کا آخر بھی ہوگیا ذلک فضل اللہ یعطیہ من یشاء۔

حضرت شیخ الاسلام نے بھی اس یادگار تجویز کا تذکرہ فرمایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں

۱۳۲۷ھ شوال میں اکابر نے مجھکو تدریس کا حکم دیا جلسۂ اہل شوریٰ نے حضرات مہتممین رحمہما اللہ تعالیٰ کی خواہش پر تجویز پاس کردیا کہ حسین احمد کو بالفعل بمشاہرہ ۲۴ روپے ماہوار مدرس کردیا جائے اور اسکے بعد جب بھی مدینہ منورہ سے ہندوستان آئے اس کو بغیر تجدید اجازت از مجلس شوریٰ مدرس کیا جائے[2]

۱۳۲۹ھ میں آپ مدینہ منورہ واپس حاضر ہوگئے۔ ۱۳۳۱ھ میں چند مہینوں کے لئے پھر ہندوستان آنا ہوا اس کے بعد مسلسل محرم ۱۳۳۵ھ تک آپ کا قیام مدینہ

---

[1] نقش حیات ج ۱ ص ۹۶ تا ۹۹ باختصار [2] ایضا ج ۱ ص ۱۲۲

ہی میں رہا اور مشاغل درس وتدریس برابر جاری رہے تاآنکہ صفر ۱۳۳۵ھ میں حکومت برطانیہ کی سازش اور ایما پر حضرت شیخ الہند (جو اس وقت حجاز مقدس ہی میں تھے) اور دیگر رفقاء کے ساتھ آپ کو گرفتار کرکے مالٹا جیل میں پہنچا دیا گیا۔ اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی سترہ سالہ اقامت مدینہ کے دوران باستثنائ وقفۂ قیام ہند کم وبیش ۱۲۔۱۳ سال مسجد نبوی میں خود صاحب وحی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے زیر نظر کتاب وسنت اور دیگر فنون اسلامیہ کا کامیاب درس دیا۔ مجد وشرف کا یہ تاج جو حضرت شیخ الاسلام کے سر پر رکھا گیا بارگاہ صمدیت کا ایسا بیش بہا اور عظیم عطیہ ہے جو بندگان خاص ہی کو عطا کیا جاتا ہے بغیر کسی خوف تردید کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایسا طرۂ امتیاز ہے جس میں وہ اپنے تمام ہم عصر علماء میں بالکل منفرد وممتاز ہیں۔

"یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"

اس خصوصی تربیت گاہ مدنی کے افق سے علم وفکر اور جہد وعمل کے کیسے کیسے ماہ واختر طلوع ہوئے، افسوس کہ آپ کے سوانح نگاروں نے اپنی سہل انگاری اور سہولت پسندی کی بنا پر اس کی جانب کوئی توجہ ہی نہ کی اس طرح حیات مدنی کا یہ زریں وروشن باب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور اب اس پر ماہ وسال کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہیں کہ انھیں ہٹا کر حقیقت حال کو واضح کرنا غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے، لیکن اس مشکل کی وجہ سے اس اہم ترین موضوع سے آنکھ بند کرکے گذر جانا کسی طرح مناسب نہیں، اس لئے اس کی طرف مختصر طور پر کچھ اشارات ضروری ہیں، ممکن ہے آگے آنے والے مورخ کو انھیں اشاروں کی روشنی میں بحث ونظر کے لئے کوئی واضح شاہراہ مل جائے اور وہ اپنی تحقیق کے دائرے کو وسیع کرسکے، وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

• طلبہ کا اس قدر ہجوم ہوا کہ علماء و مدرسین کے حلقہ ہائے درس میں اس کی مثال نہیں تھی"

حضرت شیخ الاسلام کا یہ اشارہ بتا رہا ہے کہ شمع مدنی کے گرد اکٹھا ہونے والے پروانوں کی تعداد سیکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں رہی ہوگی، پھر خود حضرت ہی یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ " یہ طلبۂ علوم صرف مدینہ منورہ ہی کے نہیں تھے بلکہ اس ہجوم میں ہندوستان، ترک، بخاری، قازان، قزق، ترکستان، کابل، مصر وغیرہ کے طالبان علم بھی تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلقہ درس و دائرۂ تربیت نہایت وسیع تھا، مجلہ المنہل کے بیان سے بعض تلامذہ کے ناموں کی تعیین بھی ہو جاتی ہے اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ضروری اقتباس اس موقع پر پیش کر دیا جائے ـــ المنہل نے حضرت شیخ الاسلام کی وفات کے موقع پر جو تعزیتی مضمون شائع کیا تھا یہ اقتباس اسی مضمون سے ماخوذ ہے۔

تتلقی علیہ العلم الناس الکثیرون وانتفع الطلاب من تعلیمہ وکان من تلامیذہ مدرسون وقضاۃ وحکام ومدیرون ورؤساء یذکر من منھم المرحومین المشائخ عبد الحفیظ الکردی الکورانی عضو المحکمۃ الکبری بالمدینۃ واحمد البساطی نائب القاضی بھا سابقا ومفتی الاحناف بھا محمود عبد الجواد رئیس بلدیۃ المدینۃ وکذلک الشیخ محمد البشیر الابراھیمی العالم الجزائری المجاھد فی سبیل التطویح ببغاۃ الاستعمار من الجزائر العربیۃ العریقۃ[1]

بہت سے لوگوں نے آپ سے علم حاصل کیا اور کثیر طلبہ آپ کی تعلیم و تدریس سے منتفع ہوئے، آپ کے تلامذہ میں مدرسین، قاضی، حکام،

---

[1] المنہل اشاعت جمادی الثانی ۱۳۷۷ھ ص ۲۸۰

سرکاری محکموں کے سکریٹری اور رؤسا تھے ان میں حسب ذیل مرحومین مشائخ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) الشیخ عبدالحفیظ الکردی الکورانی رکن محکمۂ کبریٰ مدینہ منورہ (۲) الشیخ احمد البساطی نائب قاضی ومفتی احناف مدینہ منورہ (۳) الشیخ محمود عبدالجواد صدر میونسپلٹی مدینہ منورہ (۴) محمد البشیر الابراہیمی الجزائری، جنھوں نے الجزائر سے استعماری باغیوں کو دور کرنے میں زبردست جہاد کیا۔

الوعی الاسلامی سے مزید ایک اور الجزائری مجاہد کے نام کی تعیین ہوتی ہے، الامام عبدالحمید بن بادیس المصلح الجزائری المعاصر کے عنوان سے الوعی الاسلامی نے ڈاکٹر محمود محمد قاسم کا ایک مقالہ شائع کیا ہے، اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف لکھتے ہیں

ثم سافر الی مکۃ لاداء فریضۃ الحج فی سنۃ ۱۹۱۳ وفی الحجاز لقی عددا من علماء مصر والشام وتتلمذ علی الشیخ حسین احمد الہندی الذی نصحہ بالعودۃ الی الجزائر اذ لاخیر فی علم لیس بعدہ عمل [1]

پھر شیخ عبدالحمید بن بادیس نے فریضۂ حج کی ادائیگی کی غرض سے مکہ معظمہ کا سفر کیا اور حجاز میں متعدد علماء مصر وشام سے ملاقات کی اور شیخ حسین احمد ہندی سے (شرف) تلمذ حاصل کیا جنھوں نے عبدالحمید کو الجزائر واپس جانے کی نصیحت کی کیونکہ اس علم میں کوئی خوبی نہیں جس کے بعد عمل نہ ہو۔

ان مراجع سے درج ذیل تلامذہ کی نشاندہی ہوتی ہے، جنھوں نے آپ سے قیام مدینہ منورہ کے زمانہ میں اخذ فیض کیا، شیخ عبدالحفیظ کردی کورانی (رکن محکمہ کبریٰ مدینہ منورہ) شیخ احمد بساطی، نائب قاضی ومفتی احناف مدینہ منورہ، شیخ محمود عبدالجواد (صدر میونسپلٹی مدینہ منورہ) شیخ محمد البشیر الابراہیمی، جزائری، شیخ عبدالحمید بن بادیس

---

[1] الوعی الاسلامی الکویت اشاعت رجب ۱۳۹۳ھ ص ۷۷

جزائری. آخرالذکر دونوں جزائری تلامذہ کے سلسلے میں ہم قدرے تفصیلی گفتگو کر رہے ہیں کیونکہ ہمارے موضوع کے اس آخری جز سے انھیں ہر دو حضرات کی خدمات دکارنامے متعلق ہیں، علاوہ ازیں آج تک اس پر کچھ لکھا بھی نہیں گیا ہے

الجزائر کے جہاد حریت میں حضرت شیخ الاسلام کا حصہ:-

گذشتہ سطور سے معلوم ہو چکا ہے کہ الشیخ عبدالحمید بن بادیس اور الشیخ محمد البشیر الابراہیمی حضرت کے ان تلامذہ میں ہیں جنھوں نے مدینہ منورہ میں آپ سے تحصیل علم کیا ہے، تفصیلات میں جانے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ الجزائر میں ان دونوں حضرات کو کیا مقام حاصل ہے تو مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ ہندوستان میں حکومت اور عوام کے نزدیک جو حیثیت گاندھی جی اور جواہر لال کی ہے علی الترتیب یہی درجہ و مرتبہ شیخ عبدالحمید بن بادیس اور شیخ محمد بشیر الابراہیمی کا ہے۔

ایک الجزائری مصنف لکھتے ہیں، ۱۹۴۰ء میں جس تاریخ کو شیخ ابن بادیس کی وفات ہوئی اس وقت میری عمر صرف دس سال کی تھی اور میں ایک مکتب (مدرسہ حیات الشباب) میں زیر تعلیم تھا، ہم درجے میں جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ہمارے درجہ کے استاذ نے آکر کہا۔ اب سبق نہیں ہوگا شیخ عبدالحمید بن بادیس کا انتقال ہو گیا ہے،، ہم بچوں کو شیخ کے مقام و مرتبہ کا کیا خبر، ہمیں تو اس غیر متوقع چھٹی مل جانے پر بڑی مسرت ہوئی، راستے میں کھیلتے کودتے گھر آئے، میرے والد شیخ کی علالت کی اطلاع پر قسنطینہ ان کی عیادت کو گئے ہوئے تھے، اور میری عادت یہ تھی کہ جب معلوم ہوتا کہ والد صاحب گھر میں نہیں ہیں تو دروازے کی کنڈی خوب زور زور سے بجاتا، چنانچہ حسب عادت آج بھی میں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد گھر میں پہنچا، میری والدہ شام کا کھانا پکا رہی تھی، میں نے بھی بے وقت آنے

کی وجہ بتاتے ہوئے ان سے کہا کہ مدرسہ میں تعطیل ہوگئی ہے کیونکہ شیخ عبدالحمید بن بادیس کا انتقال ہوگیا ہے، میرے منہ سے یہ جملہ نکلنا تھا کہ میری والدہ بے قابو ہوکر چیخ اٹھیں ۔ "اصحیح ماتقول" کیا تم سچ کہہ رہے ہو، میں نے جب موکد طور پر یہی بات دہرائی اور انھیں اس کا یقین ہوگیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، اس وقت مجھے کچھ احساس ہوا کہ یہ غیر معمولی حادثہ ہے، دوسرے دن شیخ کی تجہیز و تکفین کے بعد میرے والد قسنطینہ سے واپس لوٹے، ان کی عادت تھی کہ جب بھی کبھی وہ شہر جاتے تو میرے لئے کھلونے وغیرہ ضرور لاتے میں اس بار بھی منتظر تھا کہ عادت کے مطابق میرے لئے کھلونے وغیرہ ضرور لائیں گے، لیکن اس مرتبہ جب وہ گھر واپس آئے تو ان کی عجیب و غریب کیفیت تھی، بالکل گم سم گویائی کی طاقت بالکل ناپید تھی، بولنے کی کوشش کرتے بھی تو صرف ہونٹوں میں حرکت ہوجاتی آواز بالکل نہیں نکلتی تھی، شدت غم سے تحیر کی یہ حالت ان پر کئی دن تک طاری رہی[1]

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ الجزائر میں شیخ ابن بادیس کو کیا مقام حاصل تھا اور الجزائری انھیں کس نگاہ سے دیکھتے تھے،

ابن بادیس کا مختصر تذکرہ

الشیخ عبدالحمید بن بادیس ۴ر دسمبر ۱۸۸۹ء / ۱۳۰۶ھ کو الجزائر کے مشہور شہر قسنطینہ میں پیدا ہوئے، ۱۳ رسال کی عمر میں حفظ قرآن سے فراغت کے بعد قسنطینہ میں ہی شیخ حمدان لونیسی سے علوم عربیہ کی تحصیل شروع کردی اور پانچ سال تک انھیں کی خدمت میں رہ کر ابتدائی مرحلے کی تعلیم مکمل کی اور آگے کی تعلیم کے لئے ۱۹۰۸ء میں جامعہ زیتونیہ تیونس میں داخل ہوگئے، چار سال وہاں رہ کر بقیہ تعلیم پوری کی اور ۱۹۱۲ء میں عالمیت کی سند لے کر گھر واپس آگئے، پھر ۱۹۱۳ء / ۱۳۳۲ھ میں حج و زیارت

---

[1] محمد المیلی، ابن بادیس وعروبۃ الجزائر، ص ۷، ۸

کے ارادہ سے مکہ معظمہ کا سفر کیا فریضۂ حج ادا کرکے مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور تقریباً تین ماہ یہاں قیام کیا، اسی قیام کے دوران حضرت شیخ الاسلام سے استفادہ کیا بعد ازاں حضرت شیخ الاسلام ہی کے مشورہ پر وطن واپس آئے، اور درس و تدریس اور وعظ و تذکیر میں مشغول ہوگئے، ۱۹۲۵ء میں المنتقد کے نام سے اصلاحی ہفت روزہ جاری کیا...... حکومت کی پابندی عائد کر دینے کی وجہ سے اس کے صرف ۱۸ شمارے نکل سکے، اس کے بند ہونے کے بعد دوسرا جریدہ الشہاب کے نام سے جاری کیا جو ابتدا میں ہفت روزہ تھا بعد میں ماہنامہ ہوگیا تھا جس میں علمی اصلاحی اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے اور پورے الجزائر میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔

۱۹۳۱ء میں جمعیۃ علماء الجزائر قائم کی اور تا حیات اس کی صدارت کے منصب پر فائز رہے، اسی کے پلیٹ فارم سے الجزائر کی آزادی کی جنگ کا آغاز کیا، ۵۱ سال کی مختصر عمر میں بمرض کینسر ۸ ربیع الاول ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۶ اپریل ۱۹۴۰ء کو وفات پائی[1]

حضرت شیخ الاسلام کا مشورہ اور تحریک کی ابتداء:

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد شیخ ابن بادیس حجاز پہنچے، اس سے پانچ سال قبل ان کے استاذ شیخ حمدان استعماری جبر و تشدد سے تنگ ہوکر الجزائر سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ میں آباد ہوگئے تھے، چنانچہ ابن بادیس جب مدینہ منورہ پہنچے تو انھیں بھی یہی مشورہ دیا کہ الجزائر اب رہنے کی جگہ نہیں ہے وہاں سے قطع تعلق کرکے جوار رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مقیم ہوجائیں، لیکن ان کے برعکس حضرت شیخ الاسلام نے انھیں الجزائر واپس جانے اور وہاں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت

---

[1] ماخوذ تر کی را بع، الشیخ عبد الحمید بن بادیس باعث النہضۃ الاسلامیہ

کرنے کی رائے دی، اس سلسلے میں تحریک الجزائر کے دوسرے لیڈر شیخ ابن بادیس کے رفیق کار تلمیذ شیخ الاسلام الشیخ محمد البشیر الابراہیمی کا درج ذیل بیان قابلِ ملاحظہ ہے،

"مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ، نے احقر سے بیان فرمایا کہ میں ۱۹۵۰ء میں عم محترم الشیخ السید احمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مدرسۃ الشرعیہ المدینۃ المنورہ میں بیٹھا تھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے اور چچا سے مصافحہ ومعانقہ کے بعد دریافت کیا، "این شیخی وکیف" میرے شیخ کہاں اور کس حال میں ہیں، چچا نے بتایا کہ ہندوستان میں ہیں اور بحمد اللہ خیر وعافیت سے ہیں پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ان کے خلف اکبر ہیں، یہ سنتے ہی مجھ سے چمٹ گئے اور دیر تک مجھے گلے سے لگائے رکھا اس کے بعد اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں محمد البشیر الابراہیمی الجزائری ہوں، اور آپ کے والد ماجد کا ایک ادنی تلمیذ ہیں حضرت نے جہاد حریت کی ترغیب دیکر الجزائر واپس بھیجا تھا"[۱]

قریب قریب یہی بات شیخ ابراہیمی نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب سے ایک ملاقات کے موقع پر بتائی تھی، مولانا ندوی صاحب اپنے مکتوب بنام مولانا سید ارشد مدنی میں لکھتے ہیں۔

میں ۱۹۵۶ء میں جب دمشق محاضرات کے سلسلے میں گیا ہوا تھا تو الشیخ محمد البشیر الابراہیمی دمشق آئے تھے، انھوں نے ذکر کیا تھا کہ الجزائر کی جنگ وآزادی جہاد کے قائد شیخ عبدالحمید کا خیال ہجرت اور مستقل قیام کا ہو رہا تھا حضرت نے ان کو واپس جانے کا مشورہ دیا وہ واپس گئے اور انھوں نے تحریک کی قیادت کی"[۲]

---

[۱] بروایت حضرت مولانا سید اسعد مدنی۔ [۲] مکتوب حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مورخہ ۸۶/۹/۲۷

ان معتبر بیانات کے علاوہ خود ابن بادیس کی یہ تحریر ملاحظہ کیجئے۔

اذکرانی لمازرت المدینۃ المنورۃ واتصلت فیہا بشیخی الاستاذ حمدان لونیسی المہاجر الجزائری، وشیخی حسین احمد الہندی اشار علی الاول بالہجرۃ الی المدینۃ المنورۃ وقطع کل علاقۃ لی بالوطن واشار الثانی وکان عالما حکیما، بالعودۃ الی الوطن وخدمۃ الاسلام فیہ والعربیۃ بقدر جہدہ فحقق اللہ رأی الشیخ الثانی ورجعنا الی الوطن بقصد خدمتہ[1]

مجھے خوب یاد ہے میں جب مدینہ منورہ حاضر ہوا اور وہاں میری ملاقات اپنے قدیمی استاذ شیخ حمدان مہاجر جزائری اور دوسرے استاذ شیخ حسین احمد ہندی سے ہوئی تو پہلے استاذ (شیخ حمدان) نے مجھے مشورہ دیا کہ الجزائر کو خیر آباد کہہ کر مدینہ منورہ ہی کو اپنا مسکن و مستقر بناؤں اور دوسرے استاذ (شیخ الاسلام) جو عالم محقق تھے کی رائے یہ ہوئی کہ میں الجزائر جاؤں اور وہاں اسلام و عربیت کی خدمت کروں، اللہ تعالیٰ نے شیخ ثانی کی رائے کو محقق فرمایا اور میں الجزائر کی خدمت کیلئے واپس آگیا۔

لیکن ان مصادر سے یہ بات بالکل نہیں واضح ہوتی کہ حضرت شیخ الاسلام نے اس عظیم خدمت کو انجام دینے کیلئے ابن بادیس کو کیا ہدایات دیں اور کن افکار اور طریقہ عمل کے تحت انھیں کام کرنے کی ترغیب دی، ظاہر ہے کہ ایک ۲۴ سالہ نوجوان کو جس کی اب تک کی پوری زندگی گھر یا تعلیم گاہ کے ماحول میں گذری ہو جو تنظیم و تحریک کے تجربات سے بالکل ناآشنا ہو اسے یکایک بغیر کسی تعلیم و تربیت کے ایسے اہم ترین صبر آزما اور دور رس نتائج کی حامل خدمت پر مامور کردیا جائے عقل اسے باور کرنے کے لئے تیار

---

[1] ابن بادیس: الشہاب ج ۸ ص د د عدد اکتوبر ۱۹۳۷ بحوالہ ترکی رابح الشیخ عبد الحمید بن بادیس ص ۲۷

نہیں ہے، اس لئے لازمی طور پر یہ ماننا ہوگا کہ حضرت شیخ الاسلام نے ضروری اصول وضوابط سمجھانے کے بعد ہی انھیں اس جوکھم کام پر لگایا ہوگا، لیکن وہ اصول وضوابط کیا تھے کن افکار و نظریات کے تحت اس تحریک کا آغاز کرایا گیا تھا، نہ تو شیخ ابن بادیس کی تحریروں سے اس کا سُراغ ملتا ہے، اور نہ شیخ ابراہیمی کے بیانات ہی سے، اس وقت کے احوال وظروف کا تقاضہ یہی تھا کہ اس جہاد سے حضرت شیخ الاسلام کے براہ راست تعلق کو واضح نہ کیا جائے ورنہ شیخ کے لئے مشکلات ومصائب پیش آسکتی تھیں اور جب حالات سازگار ہوئے تو بیان کرنے والے ہی دنیا سے جا چکے تھے اس لئے یہ راز پردۂ راز ہی میں رہ گیا، لیکن علمی ومنطقی اعتبار سے اگر یہ درست ہے کہ تلمیذ و شیخ کے فکر و عمل میں یکسانیت اور توافق اس بات کی دلیل ہے کہ تلمیذ نے ان افکار واعمال کو اپنے شیخ سے اخذ وجذب کیا ہے تو بغیر کسی پس وپیش کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت شیخ الاسلام نے قائد جہاد شیخ ابن بادیس کو مکمل طور پر اصول وضوابط کے کیل کانٹے سے لیس کر کے میدان عمل میں آتارا تھا کیونکہ دونوں کے نظریات اور طریقۂ عمل میں اس قدر توافق اور یکسانیت ہے کہ الجزائر کے جہاد حریت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ایک لمحہ کیلئے یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ الجزائر کی تاریخ آزادی کو پڑھ رہا ہے یا حضرت شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال اور جمعیۃ علمائے ہند کی تاریخ اس کے پیش نظر ہے، اس موقع پر طوالت سے بچتے ہوئے چند نظائر پیش کئے جا رہے ہیں۔

فکر وعمل میں یکسانیت

حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی تنہا ہندوستان کی آزادی نہیں ہے بلکہ یہ ایشیا کی آزادی کا پیش خیمہ ہے، اور ایشیا کی آزادی مشرق کے کتنی ہی پسماندہ اور کمزور قوموں کی آزادی کا ذریعہ ہے، اپنے احوال وظروف کے مطابق

اسی نظریہ کا اعلان ابن بادیس ان الفاظ میں کر رہے ہیں۔

نحو ان لنا وراء هذا الوطن الخاص اوطانا اخری عزیزة علینا هی دائما علی بال و نحن فیما نعمل لوطننا الخاص نعتقد انه لابد ان نکون قد خدمناها و اوصلنا الیها النفع و الخیر من طریق خدمتنا لوطننا الخاص و اقرب هذه الاوطان الینا هو المغرب الاقصی و المغرب الادنی و المغرب الاوسط ثم الوطن العربی الاسلامی ثم الانسانیة العامة

اس وطن خاص (الجزائر) کے علاوہ ہمارے اور بھی اوطان ہیں، جو ہمیں بہت محبوب ہیں جن کا خیال ہمہ وقت رہتا ہے اور ہم جو خدمات اپنے وطن خاص کی انجام دے رہے ہیں ہمیں یقین ہے کہ اس راہ سے ہم ان اوطان کی بھی خدمت کر رہے ہیں اور انھیں بھی نفع وخیر پہنچا رہے ہیں اور ان میں ہم سے سب سے قریب مغرب اقصیٰ، مغرب ادنیٰ، اور مغرب اوسط ہیں ان کے بعد یہ نفع وطن عربی اسلامی اور پھر وطن انسانیت کو پہنچے گا۔

حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ مشرق کی ساری تباہی اور فساد کی جڑ مغربی اقتدار کا غلبہ ہے اگر مغرب کا یہ استعماری غلبہ ختم ہو جائے تو مشرق کے مزاج کی اصلاح ہو سکتی ہے اس نظریہ کی بازگشت شیخ ابن بادیس کے کلام سے سنی جا سکتی ہے

اننا نفرق جیدا بین الروح الانسانیة والروح الاستعماریة فی کل امة فنحن بقدر ما نکره هذه و نقاومها نوالی تلك و نؤیدها لاننا نتیقن کل الیقین ان حل بلاء العالم هو من

لہ ابن بادیس الشباب بحوالہ محمد المسلی : ابن بادیس دعوة الجزائر ص ۵۶

هذه وكل خير يجی للبشرية انما يكون يوم تسود تلك فتسقط الروح الاستعمارية ولتندحر ولترتفع الروح الانسانية ولتنتشر[1]

ہم تمام امت وجماعت میں روح انسانیت اور روح استعماریت کے درمیان فرق کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم اسی فرق کے مطابق استعماریت کو ناپسند کرتے اور اس کی مخالفت کرتے ہیں اور روح انسانیت کو دوست رکھتے اور اس کی تائید کرتے ہیں اس لئے کہ ہمیں یقین کامل ہے کہ عالم کی تمامتر مصیبت کا سبب یہی استعماریت ہے اور انسانیت کے لئے کسی خیر کی امید اسی وقت کی جا سکتی ہے جس وقت کہ انسانیت کو سیادت اور بالاتری حاصل ہو جائے لہٰذا اس وقت روح استعماریت ختم اور ساقط ہو جائے گی اور روح انسانیت بلند اور چھا جائے گی۔

(۳) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک عنصر ہیں کیونکہ آج کل قومیت کا تشخص وطنیت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور لفظ قوم اپنے معنی کے اعتبار سے اسی جماعت پر منطبق ہوتا ہے جس میں جامعیت کا کوئی سبب موجود ہو۔

شیخ ابن بادیس نے اس نظریہ کی تعبیر حسب ذیل الفاظ میں کی ہے۔

المسلم هو المتدين بالاسلام والاسلام عقائد واعمال واخلاق بها السعادة فی الدارين والجزائری انما ينسب للوطن افراده الذين ربطتهم ذكريات الماضی ومصالح الحاضر وآمال المستقبل فالذين يعمرون هذا القطر وتربطهم هذه الروابط هم الجزائريون[2]

---

[1] ابن بادیس: الشہاب ۱۹۳۸ء بحوالہ محمد المیلی ابن بادیس وعروبۃ الجزائر ۵۲

[2] ابن بادیس: الشہاب ۱۰۶ عدد نومبر ۱۹۲۹ء بحوالہ سابق

مسلم وہ شخص ہے جو دین اسلام کا پابند ہے اور اسلام ایسے عقائد، اعمال
اور اخلاق کو شامل ہے جس سے دارین کی سعادت متعلق ہے اور جزائری
تو صرف وطن کی جانب منسوب ہیں جس کے افراد کو ماضی کی تاریخ حال کے
مصالح اور مستقبل کی امیدوں نے باہم مربوط کر رکھا، لہذا جو لوگ اس
ملک میں آئے اور ان مذکورہ روابط میں مربوط ہیں وہ جزائری ہیں۔

(۴) حضرت شیخ الاسلام کا نظریہ تھا حق وانصاف میں ذات و مذہب کی بنیاد
پر امتیاز غلط ہے ملک کے تمام باشندے خواہ وہ کسی بھی ذات و مذہب سے تعلق
رکھتے ہوں حق وانصاف میں سب کے حقوق یکساں ہیں
شیخ ابن بادیس اس نظریہ کا اعلان یوں کرتے ہیں۔

فنهضتنا نهضة بنيت على الدين اركانها فكانت سلاما على
البشرية .... لا يخشاها والله النصراني لنصرانيته
ولا اليهودي ليهوديته بل ولا المجوسي لمجوسيته ولكن يجب
والله ان يخشاها الظالم لظلمه والدجال لدجله والخائن
لخيانته۔[1]

ہمارے اس انقلاب کی اساس دینی ہے جو انسانیت کی سلامتی کا ذریعہ
ہے اس میں نصرانی اپنی نصرانیت اور یہودی اپنی یہودیت کی وجہ سے
خائف نہیں ہوگا بلکہ مجوسی کو بھی اپنی مجوسیت کی بنا پر کوئی اندیشہ نہ ہوگا
البتہ ظالم اپنے ظلم دجال اپنے دجل اور خائن اپنی خیانت کی بنیاد پر خوف
زدہ ہوگا۔

نظریات میں اس وحدت کے بعد ایک سرسری جائزہ طریقہ کار اور دستور العمل

---

[1] ابن بادیس، الشہاب ۱۹۳۶ء بحوالہ سابق

پر بھی ڈالتے چلیئے، حضرت شیخ الہند نے اپنی تحریک کی ابتدا درس و تدریس سے کی تھی دوران درس جن تلامذہ میں صلاحیت پاتے تعلیم علوم کے ساتھ اس کی سیاسی تربیت بھی کرتے جاتے تھے، ایک عرصہ تک اس طرح کام کرنے کے بعد جب ملک کے اطراف و جوانب میں تلامذہ کی ایک جماعت منظم طور پر کام کو آگے بڑھانے کے لئے تیار ہوگئی تو جمعیۃ الانصار کی داغ بیل ڈالی اور پھر دہلی میں مولانا عبیداللہ سندھی کے ذریعہ نظارۃ المعارف کے عنوان سے درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا، اس طرح سے ملک کے ذہین، بیدار مغز، متحرک اور فعال افراد پر مشتمل ایک جماعت اپنے گرد اکٹھا کرلی اور پھر انھیں کے واسطے سے تحریک کا جال پورے ملک میں بچھادیا تحریک کی اسی ہمہ گیری کا نتیجہ تھا کہ حضرت شیخ الہند کی گرفتاری اور قید و بند کی وجہ سے کام کرنے والوں میں اضمحلال نہیں پیدا ہوا بلکہ انھوں نے خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کے نام سے ایک محاذ کے بجائے دو دو محاذ کھول دیئے اور بالآخر اسی جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے آزادی کی بھرپور جنگ لڑی گئی۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے شیخ ابن بادیس کی تاریخ جہد و عمل کا مطالعہ کیجئے۔

وہ ۱۹۱۳ء میں حضرت شیخ الاسلام کی ہدایت پر الجزائر واپس آئے، اور ہر مشغلہ سے بالکل یکسو ہوکر درس و تدریس وعظ و تذکیر میں لگ گئے، اور ایک دو سال نہیں بلکہ پورے دس سال اس خالص علمی مشغلہ کو جاری رکھا وہ خود لکھتے ہیں۔

قضینا عشر سنوات فی الدرس لتکوین نشأ العلمی لم نخلط به غیرہ من عمل اخر فلما کملت العشرو ظهرت بحمد الله نتیجتها: ہم نے پورے دس سال (الجزائر) کی نشأۃ علمی میں گزار دیئے جن میں نوخیز علوم کے علاوہ ہم نے کوئی کام نہیں کیا،

اور الحمد للہ ... اس کے اچھے نتائج ظاہر بھی ہوئے۔

طریقہ یہ ہوتا تھا کہ رات کو قرآن حکیم کا عمومی درس ہوتا تھا، جس کے ضمن میں اپنے سیاسی، اجتماعی اور اصلاحی نظریات کو بھی مدلل طور پر بیان کرتے رہتے تھے، اس درس کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ شہر قسنطینہ کے علاوہ مضافات سے بھی بڑی جماعت اس میں شرکت کے لئے آتی تھی، اور دن کو خصوصی درس ہوتا تھا جس میں صرف طلبہ شریک ہوتے تھے، اس درس میں تفسیر قرآن، موطا امام مالک، مقدمہ ابن خلدون اور بعض فقہ اور تاریخ کی کتابیں ہوتی تھیں، اس طرح سے دس سال کی مدت میں انھوں نے آگے کے کام کی زمین تیار کر لی اور اپنے تلامذہ و مستفیدین کے ذریعہ پورے ملک میں اپنے نظریات کو عام کر دیا، اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں یکے بعد دیگرے علی الترتیب دو رسالے المنتقد اور الشہاب جاری کئے (ممکن ہے الشہاب نام حضرت شیخ الاسلام کی فاضلانہ کتاب "الشہاب الثاقب" کے نام سے اخذ کیا ہو، یہ کتاب اس وقت شائع ہو چکی تھی) جس میں اپنے سیاسی اجتماعی اور اصلاحی نظریات پر کھل کر بحث کرتے تھے اس کا اثر بھی ملک پر نہایت اچھا پڑا اور لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی بعد ازاں ۱۹۳۱ء میں جمعیۃ علمائے الجزائر کی بنیاد رکھی جس کے خود ہی تاحیات صدر رہے، شیخ ابن بادیس کے جانشین جمعیۃ علماء کے دوسرے شیخ محمد بشیر الابراہیمی جمعیۃ علماء کی اہمیت و ضرورت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

لو تأخر ظهور جمعية العلماء عشرين سنة لما وجدنا في الجزائر من يسمع صوتنا۔ اگر جمعیۃ علماء کی تاسیس میں بیس سال کی اور تاخیر ہو جاتی تو ہماری باتیں سننے کیلئے الجزائر میں ایک آدمی بھی نہ ملتا پھر جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے کھل کر آزادی کی جنگ لڑی گئی [1]

---

[1] ابن بادیس کے تجدد عمل کی ترتیب کے لئے ترکی رابح الشیخ عبد الحمید بن بادیس رائد النہضۃ الاسلامیہ فی الجزائر کے صفحات ۴، ۵، ۰، ۷، اور

فکر و عمل کا یہ اتحاد بلا شبہ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ الجزائر کی جنگ آزادی حضرت شیخ الاسلام کے متعین کردہ خطوط پر برپا کی گئی ورنہ اس طرح کا کلیۃً اتحاد ممکن نہیں تھا، اس لئے تاریخ کا طالب علم اگر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جس طرح ہندوستان کی تاریخ آزادی میں اگر حضرت شیخ الہند کا تذکرہ نہ کیا جائے تو وہ تاریخ ناقص اور ادھوری ہو گی، ٹھیک اسی طرح اگر الجزائر کے جہاد حریت کی تاریخ میں شیخ الہند کے جانشین شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کا ذکر نہ ہو تو وہ تاریخ بھی غیر مکمل و ناتمام ہو گی — تو اس کا دعویٰ یقیناً مبنی برحق ہوگا، حضرت شیخ الاسلام کا یہ ایک ایسا عظیم اور بے مثال امتیاز ہے جس کی نظیر ہندوستان کے کسی بھی قومی لیڈر اور سیاسی رہنما میں تلاش کرنا بے سود ہے۔

"یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

والصلوٰۃ والسلام علےٰ خاتم المرسلین

وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

شیخ الاسلام کے درس بخاری کی جھلکیاں

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے طرز تدریس کے کچھ نمونے

از : مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

آج کی مبارک مجلس اس ذات گرامی کے تذکرہ اور اس کی خوبیوں کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے منعقد کی گئی ہے جس کا شمار یقیناً ان گرامی قدر اور قدسی صفات نفوس میں ہے کہ جن کے تذکرہ پر رحمت خداوندی کا نزول ہوتا اور اس سے دنیا ہی نہیں آخرت بنانے کا سامان ــــ فراہم کیا جا سکتا ہے، اس لئے ایسی بابرکت مجلس میں شرکت کرنے والا اپنے آپ کو خوش نصیب اور سعادت مند سمجھے تو اس پر تعجب نہیں، بلکہ ایسا نہ سمجھنے والے پر تعجب و حیرت ہونی چاہئے ــــ بنا بریں میں شکر گذار ہوں ان حضرات کا جنھوں نے اس اجتماع کے انعقاد کا اہتمام کیا اور مزید یہ کہ مجھ جیسے حقیر کو اس میں باریابی اور حصول سعادت کا موقعہ دیا، (فجزاہم اللہ احسن الجزاء)

بزرگان محترم ! میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ اس ستودہ صفات کی ــ جو کہ علوم نافعہ کا بحر ذخار ہو اور عزم و ثبات کا کوہ باوقار بھی، تقویٰ

وطہارت کا پیکر ہو اور بحر تصوف واحسان کا شناور بھی، مجاہد فی سبیل اللہ ہو اور داعی الی اللہ بھی، صاحب خلقِ عظیم کا نمونہ ہو اور جس کا سینہ اسلاف کی روایات کا خزینہ بھی، حلم وتواضع کا مجسمہ ہو اور مروت وشرافت کا پتلا بھی، جو مہمان نوازی میں بھی ضرب المثل ہو اور خوردوں کی ناز برداری میں بھی ـــ ایسے فرد فرید کی زندگی کے کس گوشہ کو موضوع بناکر مشام جان معطر اور اپنے نامۂ سیاہ کو منور کرنے کیساتھ حاضرین مجلس کی دلنوازی کا سامان کرے، کہ اس کی حیات کا ہر ہر پہلو، "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است" کا مصداق ہے، بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ خلق خدا، کی زبانی جو کچھ سنا اسے سنانے کے بجائے خود اپنے مشاہدات وتاثرات کے پھولوں سے سجایا ہوا گلدستہ لیکر اس مبارک اجتماع میں حاضر ہوا جائے ؎

نہ شبنم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم (دوسرے مصرع میں
"رخ دیدہ" آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم تصرف کے ساتھ)

حضرت سے راقم کی واقفیت کی ابتدا

یہ بتانا مشکل ہے کہ حضرت اقدس کا اسم گرامی پہلی بار کب سنا، لیکن اس میں شک نہیں کہ احقر کے والد ماجد (مولانا قاری حمید الدین صاحبؒ جو علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگردوں اور دارالعلوم کے قدیم ترین فضلاء میں تھے) کو حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے غایت درجہ عقیدت کا تعلق ہونے کی بنا پر۔ راقم نے بالکل بدو شعور میں ہی غالباً والد ماجدؒ سے ہی اس مبارک ہستی کا نام نامی سنا ہوگا، اور اس میں مبالغہ نہیں کہ "أتانی هواها قبل أعرف الهوی" کے مصداق سب سے پہلے جس کی عظمت کے نقوش (جو اگرچہ پہلے ہلکے اور نامعلوم سے تھے) راقم کے صحیفۂ قلب پر مرتسم ہوگئے وہ حضرت، ہی کی ہی ذات گرامی تھی، ویسے بھی احقر کے وطن اصلی سنبھل میں حضرت کے خدام وعشاق کا ایک وسیع حلقہ تھا جن میں اکثر والد ماجدؒ کے دوست اور اہل تعلق یا شناسا تھے، اسلئے

وہاں حضرت کی تشریف آوری بھی ہوتی رہتی تھی، اس موقعہ پر والد ماجد مرحوم، حضرتؒ کی خدمت میں بار بار حاضری کو سعادت سمجھتے تھے اور حضرت مدنی بھی والد مرحوم سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان کے قدردان تھے اور ربط و تعلق بھی رکھتے تھے، چنانچہ ہمارے گھر کو اپنی تشریف آوری سے بھی نوازا ہے (کم سے کم ایک مرتبہ کا آنا خوب یاد ہے[1]) بدیں وجوہ راقم کی آنکھیں بالکل اوائل عمری ہی میں حضرت کی زیارت و دید سے مشرف ہوئیں پھر وقت کے ساتھ حضرت کی عظمت و تقدس کے نقوش بھی برابر بڑھتے اور گہرے ہوتے گئے، تاآنکہ وہ زمانہ آیا کہ جب حضرت سے براہ راست استفادہ کی تمنا اور شوق بے چین کرنے لگا. لیکن کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل کا تصور کبھی افسردہ کرتا، تو کبھی "نسیم صبح کی مہربانی" کا خیال امید بندھاتا، یہاں تک کہ آخر وہ دن بھی آہی گیا "دن گنے جاتے تھے جس دن کیلئے". یعنی یہ حقیر ابتدائی اور متوسط درسی کتابیں اپنے وطن کے علماء اور مدارس کے اساتذہ سے پڑھنے کے بعد آخری تعلیمی مرحلہ طے کرنے کے لئے ۱۳۷۵ھ کے ابتدائی تعلیمی سال میں علوم و فنون کے سب سے بڑے مرکز اور (محدث جلیل و عظیم حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے الفاظ میں) "دنیائے اسلام میں اپنی نوع کی واحد اور سب سے بڑی دینی درسگاہ" مادر علمی. دارالعلوم دیوبند کے آغوش میں پہنچا دیا گیا جہاں۔ خاص طور پر اس زمانہ میں۔ پتہ پتہ بلکہ ذرہ ذرہ سے علم نافع کی خوشبو مہکتی اور سوتے ابلتے محسوس ہوتے تھے، کہ مٹی چاہے جیسی حقیر و بے قیمت ہو لیکن ہم نشینوں کے جمال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

راقم کا پہلا سال تو موقوف علیہ دورہ کی کتابوں کے درس و تعلم میں گزرا اس لئے حضرت شیخ الاسلام کی بس زیارت ہی ہو پاتی، البتہ کبھی خالی گھنٹہ یا خارج وقت میں ہونے والے، حضرت کے درس کے اندر شرکت کی سعادت بھی حاصل کر لیتا، اکثر

---

[1] ہمارے گھر حضرت کی آمد کا تذکرہ الجمعیۃ کے شیخ الاسلام نمبر ص ۱۵۷ میں میرے بھائی سلطان الدین کے حوالہ سے موجود ہے

دولت کدہ پر حاضر ہو کر آنکھوں کے نور اور دل کے سرور کا سامان فراہم کرتا، اس طرح وہاں پہلا تعلیمی سال بیتا (بحمد اللہ، سالانہ امتحان میں، ہر کتاب کے اندر اعلیٰ ترین نمبروں سے کامیابی کا شرف حاصل ہوا) اگلے سال قدرتی طور پر، دورۂ حدیث کے اندر شریک ہونے کی باری تھی جس سے خواہش دیرینہ پوری ہونے کی امید بندھی کیونکہ اس سعادت کا حصول علم حدیث میں شب و روز غیر معمولی انہماک و اشتغال اور حضرتؒ جیسے نابغۂ روزگار سے براہ راست استفادہ کے شرف کی بنا پر، بخت کی معراج بلکہ طالب علم کے لئے بجا طور پر اوج کمال سمجھا جاتا تھا، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ صحیح وہی کر سکتا ہے جو اس چشمۂ شیریں سے سیراب، بلکہ جسے قدح طلب کی تنگی کا احساس ہوا ہو ع بخدا تا نہ چشی دانی۔

اس سال حضرت کی ضعف و کمزوری کی وجہ سے دار الحدیث فوقانی کے بجائے تحتانی ہال کی تزئین و تبریق (برقی روشنی اور پنکھوں کی وسیع پیمانہ پر فٹنگ کی گئی، اور دار العلوم کی تاریخ میں غالباً پہلی بار اسے دار الحدیث کی حیثیت دے کر، اس میں مستقل لاؤڈ اسپیکر فٹ کیا گیا تاکہ طلبہ کی کثیر تعداد تک آواز پہنچانے کے لئے حضرتؒ کو بلند آوازی کا تعب نہ اٹھانا پڑے اور ہر ایک تک بآسانی آواز پہنچ سکے، نیز درس کو ریکارڈ کرنے کیلئے ٹیپ ریکارڈ کا بندوبست کیا گیا

شوال ۱۳۷۶ھ کا تقریباً پورا مہینہ حضرت کی تشریف آوری کے انتظار میں سراپا شوق بن کر گذارا تا آنکہ وہ روز سعید آ ہی گیا جو ہم جیسے مہجوروں کیلئے 'عید' سے کم نہ تھا کہ اس ماہتاب علم و تقویٰ کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرنے کا شرف حاصل ہوا جس کی دید ہلال عید سے کم نہ تھی، اور پھر پانچ ذی قعدہ کو وہ مبارک گھڑی بھی آ ہی گئی جس کے لئے گھڑیاں گنی جا رہی تھیں یعنی شیخ الاسلام استاذ العرب والعجم محدث جلیل اور جنید وقت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

نے مسند درس پر جلوہ افروز ہو کر ہم جیسے تہی دامنوں کو مالا مال کرنے کے لئے علم کے موتی اور تحقیق کے لعل و جواہر لٹانے شروع کئے اور اس علم شریف کے آداب تعلیم و تعلم پر ایک مختصر مگر پر مغز و جامع تقریر کرنے کے بعد دلوں کو موہ لینے بلکہ دلوں میں اتر جانے والے، مؤثر عربی لہجہ اور مترنم آواز میں یوں لب کشا ہوئے "وبالسند المتصل منا الی الامام الحافظ الحجۃ امیر المؤمنین فی الحدیث ابی عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراھیم بن المغیرۃ بن بردزبۃ الجعفی البخاری رحمہ اللہ تعالیٰ و نفعنا بعلومہ۔ آمین۔ ہر سبق کی ابتدا میں ہر قاری کے لئے خواہ حضرت خود ہوں یا کوئی طالب علم۔ اس پوری عبارت کا پڑھنا ضروری تھا، اس میں تخلف نہ ہوتا، اسی طرح ہر قاری کے لئے یہ ادب بھی ضروری قرار دیا کہ سند کے اختتام پر راوی حدیث صحابی کا نام آئے تو، رضی اللہ عنہ و عنہم، پڑھے تاکہ اس دعا میں صحابی کے ساتھ دوسرے رواۃ بھی شامل ہوں۔ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس طرح قاری بھی رحمت و برکت کا مستحق بن جائیگا۔ سبق شروع ہونے سے پہلے۔ دورۂ حدیث کے طلبہ میں سے۔ ایک طالب علم حضرت کے دولت کدہ سے کتابوں کی ایک عظیم تعداد لا کر حضرت کی مسند درس پر لگا دیتا، کیونکہ بوقت ضرورت۔ دوران درس، کبھی کبھی موصوف ان کتابوں سے عبارتیں بطور حوالہ و استناد۔ پڑھ کر سناتے۔

اکثر طلبہ حضرت کی درسی تقریر قلم بند کرتے، جن میں یہ راقم آثم بھی تھا (چنانچہ آگے اس درس سے جو اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں، وہ اپنے قلم بند کردہ ذخیرہ ہی سے ماخوذ ہیں)۔

اسلاف کرام کے طریقۂ تدریس کے مطابق، شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہ، کتاب شروع کرانے سے پہلے علم حدیث کے مبادی و متعلقات نیز اس کی فضیلت بیان فرماتے تھے، اسی ذیل میں، فضیلت حدیث بیان کرتے ہوئے، قرآن مجید کی آیت

"ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ" کی تلاوت وتفسیر کی اور فرمایا کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ پیارے پیغمبر ہیں، آپ کی ہر چال ڈھال اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اسی لئے تو فرمایا ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی الخ اس لئے کہ محبوب کی نقل بھی محبوب ہوتی ہے، مزید فرمایا کہ امت محمدیہ کو یہ شرف بخشا گیا کہ اللہ تعالیٰ خود ان کا عاشق ہے، عاشق کو معشوق کی خطائیں قابل مواخذہ نہیں معلوم ہوتیں اسی لئے آخر آیت میں "ویغفر لکم ذنوبکم" فرمایا۔ پھر موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ارشاد ہوا کہ: اس تمام شرف و بزرگی کا ذریعہ صرف علم حدیث ہے، اس لئے اس کی اہمیت کس قدر بڑھ جاتی ہے، حدیث شریف میں ہے[1] "ان اولی الناس بی یوم القیٰمۃ اکثرھم علی صلوٰۃ" (او کما قال علیہ الصلاۃ والسلام) اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ اشرف علوم ہے کیونکہ اس میں ذکر خیر نبی کریم علیہ التحیہ والتسلیم ہوتا ہے اور ہر مرتبہ نام آنے پر درود شریف پڑھا جاتا ہے تو اس طرح "اکثرہم علی صلوٰۃ" بھی محدثین ہی ہوئے، اسلئے کہ کسی اور علم میں اتنا درود نہیں پڑھا جاتا" اسکے بعد کیا خوب اور پتہ کی بات فرمائی۔ کہ "اسی سے اندازہ لگائیے کہ دارالعلوم دیوبند میں جب ہر وقت حدیث کی کتابیں پڑھی جاتی رہتی ہیں، تو کس قدر یہاں بارش رحمت خداوندی ہوتی رہتی ہے، پھر اسی طرح کثرت درود کی بنا پر سب سے زیادہ قرب دارالعلوم ہی کو آنحضورؐ سے ہے" (واضح رہے کہ راقم نے پوری کوشش کی تھی کہ یہ درسی تقریر حضرت ہی کے الفاظ میں قلم بند ہو)

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ یوں تو سب ہی کے لئے ہمہ وقت سراپا شفقت و رحمت تھے، لیکن دوران درس یہ صفت اپنے منتہیٰ کو پہنچی نظر آتی تھی، بالخصوص طلبہ کے لئے، کہ ان کے ہر جا وبیجا سوالات، نیز تک اور بے تک کے اعتراضات کے جوابات نہایت ہی انبساط اور خندہ پیشانی کے ساتھ دینے، اور

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح ج ۱ ص ۸۶ بحوالہ ترمذی

بیچ بیچ میں کبھی کبھی کسی کسی خوش نصیب سے مزاح بھی فرما لیتے، خاص طور پر رات کے وقت سبق پڑھاتے ہوئے یہ وصف اتنا بڑھ جاتا کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مجلس درس قہقہہ زار بن جاتی خاص طور پر جب کسی طالب علم کے بارہ میں حضرت کو مطلع کیا جاتا، یا وہ خود دیکھ لیتے ـــ کہ فلاں اونگھ یا سو رہا ہے تو حضرت نہایت ظریفانہ انداز میں بآواز بلند اس طالب علم کا نام لے کر مخاطب فرماتے اور حکم دیتے کہ اٹھئے، جائیے وضو کیجئے، اگر کوئی زیادہ گہری نیند میں ہوتا تو اسے "صدر النائمین" جیسے القاب سے بھی یاد کیا جاتا، اس طرح دوسرے اونگھنے یا سونے والے بھی پوری طرح چوکنا اور بیدار ہو جاتے اور گویا "السعید من وعظ بغیرہ" کا مصداق بن جاتے۔

حضرت کا یہ انداز بے تکلفی بسا اوقات اتنا زیادہ ہو جاتا کہ تھوڑی دیر کے لئے اس بات کے ذہول کا خطرہ ہو جاتا کہ یہی عظیم الشان اور جلیل القدر ہستی ہے جس کی عظمت کے سامنے بڑے بڑے فضلائے روزگار سر جھکاتے ہیں، یہ سب کچھ سنت نبوی کے پیروی کے جذبہ کے ساتھ! اس لئے بھی تھا تاکہ طلبہ میں انبساط رہے اور تکلف و رعب کا حجاب استفادہ و سوالات سے مانع نہ بن جائے، آنحضرتؐ کے خادم خاص یعنی صحابی رسول حضرت انسؓ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ عادات و خصائل بیان فرمائے ہیں۔ کان یمازح اصحابہ ویخالطہم ویحادثہم ویداعب صبیانہم (السیرۃ النبویہ للشیخ ابی الحسن علی الحسنی الندوی ص۲۹۶ بحوالہ الحلیہ لابی نعیم) ایک دوسرے صحابی حضرت عبداللہ بن الحارث فرماتے ہیں ما رأیت اکثر تبسما من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ...... فکان اصحابہ یتناشدون الشعر ویتذاکرون اشیاء من امر الجاھلیۃ وھو ساکت وربما تبسم معہم (شمائل ترمذی مع الخصائل ص۱۳۷) اور خود آنحضرت نے بطور استشہاد

شعر پڑھنا بھی ثابت ہے، جیسا کہ خلوت وجلوت کی رازداں ام المؤمنین حضرت عائشہ نقل فرماتی ہیں کان یتمثل من شعر عبد اللہ بن رواحۃ ؎ و یاتیك بالاخبار من لم تزود (الادب المفرد ص ۱۲۲ للبخاری) حضرت، بھی بسا اوقات دورانِ سبق بطور استشہاد شعر پڑھا کرتے (حضرت کو عمدہ اشعار بہت یاد تھے اور نہایت برمحل سناتے تھے)

باب خوف المومن ان یحبط عملہ وھو لا یشعر کے تحت، امام بخاری نے مشہور تابعی حضرت ابن ابی ملیکہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ ادرکت ثلاثین من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلھم یخافون النفاق علی نفسہ (بخاری ۱۲/۱) حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح فرماتے ہوئے صحابۂ کرام کے مذکورہ خوف کی توجیہ کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا ؎

ما می پروریم دشمن و ما می کشتیم دوست
کسے را نرسد چون و چرا در قضائے ما

حضرت کو مشکل احادیث کی ایسی توجیہ کرنے کا ملکۂ تامہ حاصل تھا جس سے اشکال رفع ہوجائے اور طالب علم کو بھی پورا انشراح ہوجائے، یہاں صرف ایک مثال۔ ازراہ اختصار۔ پیش کی جارہی ہے۔

بخاری کی روایت میں آتا ہے کہ بعض صحابۂ کرام نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات کی تفصیل جاننے کے بعد۔ ایک خاص پس منظر میں۔ یہ کہا انا لسنا کھیأتك یارسول اللہ ان اللہ قد غفر لك ما تقدم من ذنبك وما تأخر (بخاری ص ۱۷) یہ مضمون دراصل قرآن مجید کی (سورہ الفتح کی ابتدائی) آیت سے ماخوذ ہے، اس پر مشہور اشکال وارد ہوتا ہے کہ جب اللہ کے رسول معصوم ہیں تو پھر "غفر لک" اور "ذنبک" کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ —— اسکے جوابات

یوں تو بہت سے دیئے گئے ہیں (اور خود حضرت رہ نے بھی کئی جوابات دیئے) لیکن ایک جواب ایسا عمدہ اور انوکھا دیا کہ یہ اشکال بالکل رفع ہو جاتا ہے وہ یہ کہ "غفران" کے معنی "ستر" (چھپانے) کے ہیں اور "غفار" کے معنی "ستار" (چھپانے والا) تو "لیغفر لک اللہ" کے معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ساتر ہوتا ہے (مانع ہو جاتا ہے) بین الذنب و بین النبی صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی ذنب کو نبی تک نہیں پہنچنے دیتا، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے بارے میں (قرآن مجید میں ذکر کیا گیا) ہے، انبیاء علیہم السلام کیلئے تو اللہ تعالیٰ بین الذنب والنبی ساتر ہوتا ہے، اور غیر نبی کے لئے بین الذنب و الجزاء تو یہاں یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو گناہ تک پہنچنے نہیں دیگا: اس جواب کی لذت اور اطمینانی کیفیت آج بھی تازہ معلوم ہوتی ہے

سب واقف جانتے ہیں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بحر تصوف و احسان کے کیسے شناور تھے، تو جب کسی حدیث میں ایسا کوئی پہلو نکلتا جس سے تصوف و احسان کا اثبات ممکن ہوتا تو حضرت کی تقریر کی روانی اور طبیعت کی جولانی "دیدنی" ہوتی، ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے عنبر (مچھلی) کو تیرنے کے لئے دریا مل گیا ہو یا شاہین کو کھلی فضا ــــ چنانچہ ایک مشہور حدیث ـ جسے اہل علم "حدیث جبرئیل" کے نام سے جانتے ہیں. کی تشریح کے وقت طلبہ کو ایسا لگا کہ "بلبل چہک رہا ہو جیسے گلشن میں" ـ

نامناسب نہ ہوگا اگر اجتماع کے سامعین تھوڑی دیر اس کوچہ کی بھی سیر کرلیں، مذکورہ بالا حدیث کے جزو "فان لم تکن تراہ" کی توجیہات بیان کرتے ہوئے فرمایا: تیسری توجیہ یہ ہے کہ "لم تکن" میں "کان" تامہ مراد لیا جائے، یعنی فنا کا مرتبہ[1] حاصل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کو دیکھ لے گا، یعنی قوت متخیلہ سے جب تمام

---

[1] لیکن شراح حدیث مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی نے (فتح الباری ۱/۱۲۰ میں) اس توجیہ کو من حیث العربیہ صحیح نہیں بتایا ہے مگر حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہ اسے صحیح سمجھتے تھے اور شراح کے اعتراضات کے جوابات بھی دیتے تھے ـ

چیزوں کا شعور جاتا رہے بلکہ خود اپنی ذات کا بھی شعور جاتا رہے، یعنی کثرت ذکر سے وہ مرتبہ حاصل ہو جائے کہ شعور نہ ذکر کا رہے اور نہ ذاکر کا بلکہ صرف مذکور (اللہ تعالیٰ) کا شعور رہے اسے "فناء الفناء" کہتے ہیں، یہی مرتبہ منصور کو حاصل ہو گیا تھا، جو "انا الحق" کا نعرہ لگاتے تھے، یہ حقیقۃً نہ تھا بلکہ غلبہ کی کیفیت تھی (اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال بھی بیان فرمائی) نیز ایک اور صحیح حدیث اس کی تائید میں ذکر کرتے ہوئے فرمایا، اس لئے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ بندہ نوافل سے ایسی ترقی کرلیتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اتنا قرب حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے[1] اس لئے منصور "انا الحق" کہنے کے باوجود عبادت کرتا تھا اس میں کمی نہیں آتی تھی..... ایسی حالت آجانے پر اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی اسطرح نازبرداری کرتا ہے جس طرح باپ بچہ کی۔"

حضرتؒ دوران درس دلچسپ حکایات اور تاریخی واقعات سے بھی محظوظ فرماتے، چنانچہ ایک روز ہارون رشید اور اس کی بیوی زبیدہ سے متعلق ایک دلچسپ تاریخی واقعہ سنایا جو مامون کی پیدائش کا ظاہری سبب بنا کر پھر زبیدہ کو ساری عمر افسوس رہا

درس حدیث کی ایک اہم خصوصیت، بلکہ ضرورت، مختلف، اور بظاہر متعارض احادیث کے درمیان تطبیق و توفیق بھی ہے، کیونکہ اختلاف کو من عند غیر اللہ ہونے کی علامت قرآن مجید ہی میں بتایا گیا ہے (ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا) اس لئے نبوت کی عصمت کا تقاضا اور وحی کے من اللہ ہونے کا امت کے خواص پر یہ حق ہے کہ تعارض و اختلاف اگر نظر آتا ہو تو وہ دور کیا جائے، چنانچہ علمائے امت بالخصوص فقہائے کرام اور شراح حدیث، نیز اساتذۂ فن نے ہمیشہ

---

[1] مشہور حدیث ہے: ولایزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببتہ فکنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ التی یبطش بہا الخ (بخاری ۲/۹۶۳ کتاب الرقاق)

اپنی ذمہ داری سے بطریق احسن عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے، اور یہ کہنا غالباً مبالغہ نہیں ہوگا، بلکہ حقیقت کی سچی ترجمانی ہوگی، کہ دارالعلوم کی تدریسی خصوصیات و امتیازات میں سے ایک یہ ہے کہ یہاں اس امر کا اہتمام سب سے زیادہ ہوتا ہے، چنانچہ حضرت قدس سرہٗ کے درس میں بھی یہ پہلو بہت نمایاں ہوتا تھا، اس کی بابت بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر اختصار کی غرض سے یہاں صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

بخاری جلد ثانی کی ایک روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن غزوات میں شرکت فرمائی ان کی جو تعداد بتائی گئی ہے وہ دوسری معتبر کتب حدیث و سیرت میں بیان کردہ تعداد سے بہت مختلف ہے ۔۔۔ حضرت علیہ الرحمہ نے روایات سے رونما ہونے والے اس اختلاف کو یوں رفع فرمایا۔ اس حدیث (بخاری ثانی کی روایت) سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۹ غزوات میں شرکت فرمائی اور اس سے پہلے مذکور ہوا کہ ۲۷ غزوات میں آپ نے شرکت فرمائی، تو اس میں بظاہر تخالف ہے لیکن حقیقۃً تخالف نہیں، کیونکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ کے لئے نکلے لیکن اس سفر میں کئی کئی غزوات میں شرکت کی تو بعض لوگوں نے ان سب کو ایک ہی شمار کیا، جیسے کہ فتح مکہ کے سال ۴ غزوات بنی ثقیف، حنین، خیبر، مکہ، یہ چار لڑائیاں ہوئیں لیکن بعض نے ان کو ایک ہی شمار کیا تو اس طرح کل غزوات کی تعداد ۱۹ ہوتی ہے اور جو ان کو چار شمار کرتا ہے (اس کے علاوہ دوسرے مواقع پر بھی اسی طرح کی صورت حال میں ۔۔ یہی طرز اختیار کرتا ہے) تو تعداد ۲۷ ہو جاتی ہے"۔

یہ تو اس اختلاف کے رفع کرنے کی مثال ہوئی جو راویوں کی بناء پر پیدا ہوا، ان کے علاوہ ایسے اختلافات بھی۔ روایات، حدیث میں۔ بہت کافی ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل یا قول کے بارے میں نقل ہوئے ہیں، ان میں باہم

تطبیق و ترجیح ہی دراصل ائمہ و فقہاء کے مسالک میں اختلاف کا سبب بنی ہے، اور جو محدث و فقیہ، یا مدرس و استاذ۔ جس امام کا مسلک اختیار کرتا ہے وہ اسی کو راجح دیانۃً بھی سمجھتا ہے اور دلائل سے ترجیح۔ جبکہ مختلف روایات کے درمیان تطبیق ممکن نظر نہ آتی ہو۔ دیتا ہے۔ اس کی مثالیں دینے کی یہاں چنداں افادیت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ وہ عام طور پر معلوم و مشہور ہیں، البتہ ایک مثال ذکر کئے بغیر آگے بڑھنا مناسب نہیں لگ رہا ہے، جس کا تعلق اگرچہ قولی درس سے نہیں بلکہ عملی درس سے ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے تعلیمی سال۔ گذشتہ برسوں کے معمول سے کچھ پہلے ہی۔ عصر بعد بھی بخاری ثانی پڑھانا شروع فرمادی تھی مغرب کی نماز باجماعت عموماً درسگاہ زیریں ہال میں ہوتی، ایک روز راقم حروف کے بخت نے یاوری کی کہ بالکل حضرت کے پہلو میں کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کا موقعہ مل گیا، امام نے جب سورۂ فاتحہ مکمل کی، تو حضرت نے "آمین" اس طرح کہا کہ اس میں مختلف حدیثوں کے اندر وارد الفاظ "خفض" و "مد"[1] دونوں کی ایسی حسین آمیزش تھی جس سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ حضرت اقدس دونوں پر عمل فرما رہے ہیں (یا دونوں میں تطبیق دے رہے ہیں) اور اسی سے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ روایتوں کا یہ اختلاف، جس نے معرکہ جیسی صورت مدتوں سے اختیار کر رکھی ہے (کہ دونوں طرف سے مستقل رسالے اور کتابیں ہی نہیں لکھی گئیں بلکہ جنگ و جدال تک کی بھی نوبت آگئی) فی الواقع اختلاف ہے ہی نہیں بلکہ صرف تعبیر و بیان کا فرق ہے جو راویوں نے اپنی اپنی صوابدید اور فہم کے اعتبار سے اختیار کیا اور پھر وہ آگے بڑھ کر کچھ سے کچھ بن گیا۔

غرضیکہ ایسی نورانی و علمی فضا میں اس طرح لیل و نہار گذر رہے تھے کہ ہر روز

---

[1] یہ اشارہ حدیث کے الفاظ "خفض بہا صوتہ" اور "مد بہا صوتہ" کی طرف ہے جو سنن کی روایات میں آمین کہنے کے بارے میں آئے ہیں، انہی سے "آمین بالجہر" اور "آمین بالسر" کی وہ معرکہ آرائیاں ہوئیں جن کا اجمالاً ذکر اوپر آیا (ترمذی ج ۱ ص ۳۴)

روزِ عید معلوم ہوتا تھا، اور ہر شب شب براۃ، اور ہم سب طلبۂ دورۂ حدیث اپنے آپ کو بجا طور پر سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھ رہے تھے اور گمان تھا کہ پورا سال اسی طرح بیتے گا، یہاں تک کہ ختم بخاری پڑھا کی اس پر کیف و پُر اثر مجلس میں شرکت ہوگی کہ جس کی ایک جھلک دیکھنے اور اس میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے۔ نہ جانے کتنی کتنی دور سے لوگ آتے اور پھر سال بھر اس دن کے انتظار میں گذارتے ہیں، لیکن اللہ حکیم و علیم کی مشیت کچھ اور تھی جس کا پتہ پہلے سے کسی کو بھی نہ تھا، اور نہ ہو سکتا تھا بس ایسے پُر بہار شب و روز تقریباً تین مہینے ہی رہے تھے کہ حضرتؒ ایسے بیمار ہوئے کہ وہی مرض الوفات ثابت ہوا اور ہم (طلبۂ دورۂ حدیث) جو اپنے آپ کو سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھ رہے تھے بعد میں ہمیں ایک ایسے غم کا داغ سہنا اور محرومی پر رونا پڑا جس کی مدت العمر تلافی نہیں ہو سکتی، گویا ہم سب حسرت بھرے انداز میں کہتے رہ گئے۔

ع روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ (اسبغ علیہ شابیب رحمۃ و رضوانہ) آج بھی۔ جبکہ تیئس سال سے زائد بیت چکے ہیں۔ اس سانحہ کا خیال آتا ہے تو دل خون ہونے لگتا، اور کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے ؎

صبت علی مصائب لو انہا ؛ صبت علی الایام صرن لیالیا

اگرچہ اس موضوع پر ابھی کہنے کو بہت کچھ ہے[1] لیکن ایک شاعر کے الفاظ میں معذرت خواہ ہو کر رخصت چاہتا ہوں ؎

اندکے پیش تو گفتم غمِ دل ترسیدم ؛ آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

آخر میں حسنِ استماع کیلئے تہہ دل سے شکریہ پیش کرتا ہوں۔ والسلام

---

[1] اور راقم، کچھ، کہہ بھی چکا ہے، حضرت مولانا سید فخر الدین صاحبؒ کے انتقال پر راقم نے مضمون لکھا تھا جو "الفرقان" لکھنو (ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ) میں شائع ہوا تھا اس میں مولانا مرحوم کے حالات کے ساتھ حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہ کی بیماری اور وفات کا ذکر بھی مختصراً آگیا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ

حیات وکارنامے

مولانا ابوالعرفان ندوی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی !

اَمَّا بَعْدُ ! محترم حضرات ! آج ہم اور آپ جس ذات گرامی کو خراج عقیدت پیش کرنے اور ان کے کام ونام کو یاد کرنے کیلئے جمع ہوئے ہیں اس کا نام نامی واسم گرامی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ہے (رحمۃ اللہ علیہ) عام طور پر گفتگو میں انکو شیخ الاسلام حضرت مدنی کہا جاتا ہے، درحقیقت ان کی ذات ہندوستان اور اس بیسویں صدی میں تعریف وتعارف کی محتاج نہیں ہے، ہندوستان کی علمی وسیاسی دنیا میں ان کا نام اور کام اظہر من الشمس ہے، وہ ایک طرف دارالعلوم دیوبند کے صدرالمدرسین اور شیخ الحدیث تھے اور دارالعلوم کو ہمہ جہتی ترقی دینے میں انکی کوششوں اور مساعی، حسن تدبر وتدبیر کو غیر معمولی دخل ہے تو دوسری طرف ہندوستان کی آزادی اور آزادی کیلئے انکی

سیاسی جد وجہد میں (اور اس عہد میں سیاسی جد وجہد کا مطلب قید وبند اور مجاہدہ کی زندگی تھی) ان کا مقام صف اوّل کے مجاہدین آزادی میں تھا، علم وسیاست کے ایک ذات میں اجتماع کی مثال صرف حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہیں ؎

درکفِ جام شریعت درکفِ سندان عشق :: ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

محترم حضرات! حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ جامع کمالات وفضائل تھے، اور ان کا وجود امت مسلمہ میں خیر وبرکت کا سبب اور ذریعہ تھا، ایک عرصہ تک مدینہ منورہ میں علمی اور دینی ذمہ داریوں کو ایماناً واحتساباً انجام دینے کے بعد جب انکی مادر علمی اور ان کے اسلاف کا لگایا ہوا پودا یعنی دارالعلوم دیوبند میں نامساعد حالات پیدا ہوئے اور ۱۳۴۶ھ کے مشہور ہنگاموں نے دارالعلوم دیوبند کی علمی اور انتظامی سطح میں زلزلہ پیدا کر دیا اس وقت جس مرد مجاہد نے ڈانواں ڈول کشتی کو سنبھالا دیا ہے وہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، اور نہ صرف یہ کہ اس کشتی اور اس کے مسافروں کو محفوظ طور پر ساحل تک لائے بلکہ دارالعلوم دیوبند کو پوری دنیا میں ایک دینی اور علمی ادارہ کی حیثیت سے اور کتاب وسنت کی ایک عظیم دینی درسگاہ کی حیثیت سے مشہور کر دیا، کتاب وسنت اور سلف صالحین کی ہدایت اور ان کی روش کے مطابق دارالعلوم دیوبند کی جو شہرت ہے اسمیں بہت بڑا دخل حضرت مدنی علیہ الرحمہ کو ہے۔

اگر ان کے ابواب فضائل میں صرف یہی ایک باب ہوتا کہ انھوں نے اس عظیم ادارہ کو اپنی شیخ الحدیثی اور صدر المدرسینی کے زمانہ میں کہاں سے کہاں پہونچا دیا اور اس کی افادیت ونافعیت کے میدان کو کتنا وسیع کر دیا تو صرف یہی بات ان کے فضل وکمال کیلئے بہت تھی لیکن ان کے

ابواب فضائل بیشمار ہیں۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ❊ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ان کی زیر سرپرستی دار العلوم دیوبند کا تیس سالہ عہد ہمیں امام غزالی کے استاذ امام الحرمین کی یاد دلاتا ہے، نظامیہ نیشا پور میں امام الحرمین نے تیس[۳۰] سال تک درس دیا اور ان کے اس درس کے ثمرات اور اس کی برکات آج تک محسوس کی جا رہی ہیں، ٹھیک اسی طرح حضرت مدنی رح کا یہ تیس سالہ عہد جو دار العلوم دیوبند کی صدر المدرسینی اور شیخ الحدیثی کا رہا ہے، وہ بہت ہی خیر و برکت اور دین اور علم دین اور باکمال فضلاء کے پیدا ہونے کا زمانہ ہے۔

دار العلوم دیوبند کی صدارت پر ان کا رونق افروز ہونا ہمیں یاد دلاتا ہے نظامیہ بغداد میں امام ابو اسحاق شیرازی کے منصب صدارت پر رونق افروز ہونے کی، انھوں نے بھی بیس[۲۰] سال تک نظامیہ بغداد کی صدر نشینی کو رونق اور عزت بخشی تھی اور اسکے نتیجہ میں نظامیہ بغداد آج تک علمی حلقوں سے متجاوز ہو کر عوامی حلقوں میں بھی مشہور ہے، یہی حال دار العلوم دیوبند کی شہرت کا ہے، گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ مسلمانوں کی بستیاں چاہے چھوٹی ہوں یا بڑی ہیں دار العلوم دیوبند مشہور و مقبول رہا ہے۔

حضرات! اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ وہ دار العلوم دیوبند کی صدالمدرسینی اور شیخ الحدیثی کے خاتم و خاتَم تھے۔

ان کے فضائل و مناقب کے باب میں سب سے اہم اور نمایاں فضیلت ان کا مجاہدہ تھا اور وہ بھی ایماناً و احتساباً تھا، زندگی کے تمام ذاتی اور اجتماعی معاملات میں صحیح نیت جس کیلئے بنیادی شرط صبر و تقویٰ ہوتی ہے کیساتھ

جد وجہد اور رہراہی اور صحیح بات کیلئے پیہم سعی وعمل ان کی حیات کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، وہ چاہے علم کی مجلس ہو، چاہے سیاست کا میدان ہو اور چاہے ارشاد وہدایت کی مسند ہو سب جگہ وہ مرد مجاہد تھے، بڑے بڑے لمبے اسفار سے واپسی پر سیدھے مسند درس پر جلوہ افروز ہونا ان کی ایسی فضیلت ومنقبت ہے کہ مدارس دینیہ کے بڑے بڑے اساتذہ اس سے محروم ہیں، اس میں نہ رات کی تخصیص تھی نہ دن کی، پھر میدان سیاست میں جو آزادی سے پہلے خالص مجاہدہ اور صبر واستقامت کا میدان تھا ان کی بھرپور شمولیت وشرکت مجاہدہ نہیں تو اور کیا تھا، پھر ان کی سیاسی جد وجہد میں اس بات کا بھی اضافہ کر لیجئے کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کا مقصد جواب حاصل ہو گیا اور اس جنگ میں فتح کے بعد فاتحوں اور غازیوں میں مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آیا تو وہ بالکلیہ اس مجلس سے کنارہ کش تھے، اور مسندِ درس اور مسندِ ارشاد میں آزادی کے بعد اپنی زندگی کو محدود فرمادیا۔ ان کا یہ مجاہدہ قیام مدینہ کے زمانہ میں بھی تھا. حضرت شیخ الہند کی اسارت مالٹہ کے وقت رضا کارانہ طور پر اپنے کو اسیری کیلئے پیش کر دینا بھی اسی فہرست میں آتا ہے، رات میں بارہ ایک بجے تک جلسوں میں شرکت اور اس کی صدارت فرما کر جب مستقر پر واپسی ہوتی تھی تو بجائے آرام کے نماز تہجد کیلئے کھڑا ہو جانا جو ان کا معمولِ تھا مجاہدہ فی العبادۃ ہی کی فہرست میں آتا ہے۔ ان کے تمام فضائل میں مجاہدہ سے ایک رونق پیدا ہو گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مقبول خلائق بنا دیا تھا۔ ان کے فضائل میں ایک اہم چیز ارشاد وہدایت ہے جس کا سلسلہ تقسیم ہند سے پہلے پورے ہندوستان میں کثرت سے

جاری تھا، ہزاروں ہزار لوگ ان سے یہ روحانی تعلق قائم کرتے تھے اور پھر ان کی ہدایت وارشاد کے مطابق اور ان کی رہنمائی میں اپنا تزکیہ نفس کرتے اور اپنی عاقبت بناتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تک ان کے خلفاء اور مسترشدین ہندوستان و پاکستان اور بنگلہ دیش کے طول و عرض میں اپنے اپنے دائرے میں دین کے خدمت گذار اور دین کے داعی ہیں۔

ے این سعادت بزور بازو نیست ؛ تانہ بخشد خدائے بخشندہ

جود وکرم اور اکرام ضیف بھی ان کی زندگی کا ایک روشن باب ہے، ان کا دسترخوان اور ان کا گھر اہلِ حاجت اور مسافروں کا ملجأ و ماوی تھا، ہر شخص بلا تکلف کھانے کے وقت ان کے خوان کرم سے مستفید ہوتا تھا، اس میں ہر شخص بلا تفریق شریک ہوتا تھا اور اسلامی اخوت و مساوات کا منظر اسی طرح سے ان کے دسترخوان پر دیکھا جاتا تھا جس طرح مجالس میں اور دیگر موقعوں پر اخوت و مساوات کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ میری عربی کی ابتدائی تین سال کی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی ہے، اور میں وہاں تعلیم کے اس مرحلہ میں تھا جب دارالعلوم کے ضابطہ کے مطابق مجھ کو امداد نہیں مل سکتی تھی، اس وقت حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ کرم نے میری دست گیری فرمائی اور ان کی طرف سے دارالعلوم کے قریب ایک ہوٹل میں ہدایت پہونچ گئی کہ مجھے دو وقت کا کھانا وہاں سے ملتا رہے مجھ جیسے اور بھی بہت لوگ تھے، ہوٹل والے کو ان کھانوں کے مصارف حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ادا کر دیئے جاتے تھے۔ اس طرح میری تعلیم میں بھی حضرت مدنیؒ کے کرم اور ان کی دستگیری کو دخل ہے، میں نے عرض کیا کہ میری ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی اسلئے میں

حضرت کا براہ راست شاگرد تو نہیں ہوں لیکن ان کے بہت سے شاگردوں کا شاگرد ضرور ہوں۔ یہیں دارالعلوم دیوبند میں اپنے داخلہ کے کچھ دنوں کے بعد دارالحدیث میں ان کو درس دیتے ہوئے دیکھا اور سُنا، انکی شخصیت و وجاہت اور علم و تقوی کے نورسے میں متأثر ضرور رہا اور ان کی عظمت کا احساس ذہن کو ہوا، لیکن ظاہر ہے کہ میری وہ عمر ایسی نہیں تھی کہ اپنے اس تأثر اور احساس کے واضح اسباب کی نشاندہی کر سکتا جو بعد میں مجھ پر ظاہر ہوئے پھر تو زمانۂ قیام دارالعلوم میں مختلف موقعوں پر دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی، بعد نماز عصر مسجد میں کبھی ضرورت و حالات کے تقاضے سے طلبہ کو نصیحت بھی فرماتے تھے اس میں بھی بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، ان کی پوری زندگی مسلسل عمل اور مجاہدہ کی تفسیر و تعبیر ہے۔

حضرت مدنیؒ کو بہت قریب سے اور مسلسل تین چار روز سے مجھے دیکھنے کی سعادت ۱۹۳۹ء میں اس وقت ہوئی جب کہ میں مدرسہ امدادیہ لہریا سرائے دربھنگہ میں زیر تعلیم تھا اور غالباً اپریل یا مئی کے مہینے میں جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس وہاں ہوا تھا، سارے معزز و محترم علماء کرام اور مہمانان خصوصی کا قیام مدرسہ امدادیہ کے اس دارالاقامہ میں ہوا تھا جو پختہ تھا، اور جس کے کمرے وسیع اور کشادہ تھے چنانچہ ہم لوگوں کو اس مدت کیلئے کمرے خالی کرنے پڑے اور اِدھر اُدھر دوسری جگہوں پر جہاں گنجائش نکلی وہیں مقیم ہوگئے۔ اسی دارالاقامہ کے ایک کمرہ میں حضرت مدنیؒ بھی فروکش تھے اس موقعہ پر حضرت مدنی کے علاوہ مولانا احمد سعید رحمۃ اللہ علیہ مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اور مولانا حفظ الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بہت قریب سے دیکھنے اور انکی خدمت کا موقعہ ملا اور پھر

تو اس کے بعد وقتاً فوقتاً جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں زیر تعلیم رہا اور اس کے بعد مدرس ہوا حضرت مدنی سے سلام و مصافحہ اور ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کی مجلس میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا، سب سے آخری بار ۱۹۵۶ء میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس سورت میں سلام و مصافحہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس اجلاس کے زمانہ میں پورے گجرات کے علاقے سے آئے ہوئے عقیدت مندوں اور مسترشدین کا ہجوم تھا اور چونکہ حضرت اب عمر کی اس منزل میں پہنچ گئے تھے کہ اتنا طویل سفر آئندہ کم متوقع تھا۔ اسلئے ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ حضرت ہمارے گھر اور ہمارے شہر میں تشریف لاکر ہم سب کی تمنائیں پوری فرمائیں اور ہم کو حضرت سے فیض و برکت حاصل ہو۔ چنانچہ اجلاس کے بعد گجرات کے مختلف علاقوں میں حضرت کا علمی اور دینی سفر ہوا ہے اور حضرت سے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے اصلاحِ نفس اور تزکیہ باطن کا تعلق پیدا کیا ہے اور یہی حال ان کے تمام اسفار کا تھا جو بظاہر سیاسی مقصد سے ہوتے تھے لیکن ان کے تشریف لے جانے پر لوگ پروانہ وار ٹوٹ پڑتے تھے اور بیعت و ارادت کا تعلق قائم کرتے تھے، ان کا فیض برابر ان کی زندگی کے آخر دن تک جاری رہا، اور یہ حضرت مدنیؒ کی ایسی فضیلت و خصوصیت ہے جس میں کوئی دوسرا ان کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ وہ سیاسی دنیا کے بھی صدر نشین تھے اور ارشاد و ہدایت کی مجالس میں بھی صدر نشین تھے اور علوم دینیہ کی مسند کے بھی زینت بخش تھے، مدینہ منورہ میں ان کے والد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تمام صاحبزادگان کو ایک نصیحت فرمائی تھی، اور وہ خود حضرت مدنیؒ کے الفاظ میں یہ ہے :-

"انھوں نے جب کہ ہم سب بڑے ہو گئے تھے ہم لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ میں نے تم سبھوں کو اسلئے پرورش کیا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں جہاد کرو اور کچھ کر کے شہادت حاصل کرو" انکی پوری زندگی اپنے والد مرحوم کی نصیحت پر عمل تھی، اسی جذبۂ جہاد اور شوق شہادت نے ان ایک نہ تھکنے والا مجاہد بنا دیا اور زندگی کے ہر میدان میں چاہے وہ سیاسی ہو، چاہے دینی ہو، چاہے عملی ہو، انکی جدوجہد کا محور و مرکز وہی نصیحت تھی جو ان کے والد مرحوم نے کی تھی۔

زندگی کے عملی میدان میں جدوجہد اور صبر و استقامت ان کا ایسا جوہر تھا جو ان کی زندگی کے آخر دن تک قائم رہا۔ جس چیز کو صحیح سمجھا اس پر پوری استقامت کے ساتھ قائم رہے، اور جس میدان میں ایماناً و احتساباً داخل ہوئے اس سے کبھی فرار اختیار نہیں فرمایا۔

هيهات لا يأتي الزمان بمثله ٭ إن الزمان بمثله لبخيل

اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنا اور اس کی دعوت دینا ان کی زندگی کا معمول تھا، وہ ہر قدم اور ہر منزل پر سلف صالحین کے نشان قدم کو اپنا رہنما بناتے تھے، اور اسلاف کرام کا اسوہ ان کیلئے منارۂ نور اور مشعلِ ہدایت تھا، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ ان کے استاد، مربی اور سرپرست تھے، قطب عالم حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ان کے مرشد تھے، اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ان کے اسلاف میں تھے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنی عملی زندگی کی رہنمائی میں زیادہ تر ان تین بزرگوں کی ذات کو اپنے پیشِ نظر رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس راہ پر چلنے کی دعوت دیتے تھے۔ ان کا اخلاص، ان کا ورع و تقوی ان کا تعفف،

ان کا صبر و استقامت، علومِ دینیہ میں ان کا تفوق، ان کی تواضع، ان کا جود و کرم اور حلم یہ سب ان کی وہ صفات ہیں جن کا ان کے مخالفین کو بھی انکار نہیں ہو سکتا ہے، ہندوستان کی آزادی سے دس سال پہلے کا زمانہ سیاسی حیثیت سے بہت ہی پر شور زمانہ تھا، اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عہد میں اپنی ملت اور اپنی جماعت سے جو جو آزار اور اذیتیں اٹھائی ہیں وہ آج بھی لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہیں، لیکن صبر و استقامت کے اس پیکر نے اپنے مخالفین کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا اور ساتھ ہی نصح و خیر خواہی کا معمول بھی نہیں چھوڑا، جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ کتنے ایسے لوگ جو ان کیلئے غیبت، بدگوئی، افتراء اور ایذاء کا معاملہ رکھتے تھے، جب وہ کسی معاملہ میں حضرت مدنی رح سے امداد کے طالب ہوتے تو وہ پوری وسعت قلب کیساتھ اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے مدد کر کے ان کی پریشانیوں کو دور فرماتے تھے، فرمان نبوی "لاتثریب علیکم الیوم" کا ایسے وقت میں وہ نمونہ بن جاتے تھے۔

عام طور پر یہ کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ علماء سیاست نہیں جانتے ہیں لیکن ہم آپ حضرات کے سامنے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی خود نوشت سوانح سے ایک عبارت پیش کرتے ہیں جس سے نہ صرف یہ کہ علماء کی طرف سے بدگمانی بے بنیاد ثابت ہوتی ہے بلکہ مزید براں ان کی وسعتِ قلبی اور معاملات پر زیادہ وسعتِ نظر سے دیکھنے کی قوت و صلاحیت کا علم ہوگا نقشِ حیات جلد دوم صفحہ ۱۵۵ میں حضرت مدنی رح فرماتے ہیں:-

"پرانے اور نئے خیال کے مسلمانوں میں محل نزاع کیا ہے میں اچھی طرح جانتا تھا، علماء برداشت نہیں کر سکتے کہ عام مسلمانوں کی رہنمائی کا

منصب ان کے ہاتھ سے نکلے، ادھر تعلیم یافتہ طبقہ لیڈر شپ کا مدعی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ علماء کی امامت میں ہم کوئی کام نہیں کر سکیں گے، میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ سب سے پہلے کام یہ ہونا چاہیئے کہ اہلِ علم (علماء) لیڈر شپ کے ادعاء سے دست بردار ہو جائیں، اور تعلیم یافتہ لوگوں میں عام طور پر یہ احساس پیدا کر دیا جائے کہ وہ اہلِ علم (علماء) کی شمولیت کی صحیح قیمت کو نہ بھولیں۔ میرے استاذ حضرت مولانا شیخ الہند۔ تغمدہ اللہ بغفرانہ۔ نے میرے خیال کی اس طرح داد دی تھی کہ وہ پہلے سے اس کیلئے تیار بیٹھے تھے" انتہی الکلام۔

حضرات! اب اس کے بعد نہ تو علماء پر تنگ نظری کا الزام لگ سکتا ہے اور نہ سیاست سے عدم واقفیت کا، علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان اگر کوئی چیز حائل اور سنگ گراں بن سکتی تھی تو وہ سیاسی میدان تھا لیکن حضرت مدنی رحؒ نے کس مدبّرانہ انداز سے اس مسئلہ کا حل تجویز فرمایا اور دونوں گروہوں کے درمیان توازن قائم فرمایا۔

اسلام کی پوری تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ علمائے ربانیین نے کسی مرحلہ میں بھی اپنے لئے حکومت اور سیاسی اقتدار کو پسند نہیں فرمایا لیکن اس کیساتھ ہی ان علمائے حقانیین نے ہر زمانہ میں اصحاب اقتدار کو ان کی غلطیوں پر ٹوکا ہے، اور ان کو صحیح راہ دکھلائی ہے، اور اس راہ میں انھوں نے کبھی کبھی اپنی جان بھی قربان کی ہے اور شہادت کا درجہ بھی حاصل کیا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ سلاطین وامراء نے علمائے حقانیین کی ہدایات کو سُنا ہے اور اس پر عمل کیا ہے "کلمۃ حق عند سلطان جائر" پر ہمیشہ اصحاب ورع وتقوی علماء کا عمل رہا ہے۔

رہے علماء سوء، تو اسلامی تاریخ کے ہر عہد میں ان کی نشاندہی ہوتی رہی ہے اور ان کے مقصد و نیت سے امّت مسلمہ کا سوادِ اعظم اچھی طرح واقف رہا ہے۔ طول کلام کی وجہ سے مذکورہ بالا اقتباس کو مختصر کردیا ہے ورنہ بعد کی عبارت بھی اس مقصد کو بہت زیادہ واضح کررہی ہے۔

محترم حضرات! سیمنار میں حضرات منتظمین کا تقاضا ہوتا ہے کہ بات مختصر کہی جائے اسلئے میں ان مختصر کلمات کے بعد اپنی بات ختم کرتا ہوں اس احساس اور تأثر کے ساتھ کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اور ان کی حیات مبارکہ کے تمام گوشوں اور ان کے ابواب فضائل کے تمام بابوں کو تطویل کے خیال سے نہ لکھ سکا۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔
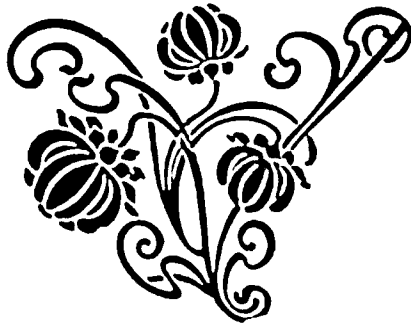
مولانا حسین احمد مدنی کے ملی افکار

از:۔ ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی
(شعبہ تاریخ۔ کراچی یونی ورسٹی کراچی)

دنیا میں ایسے نفوس قدسیہ آتے رہے ہیں جو آفتاب ہدایت بن کر افقِ انسانیت پر طلوع ہوئے اور جنھوں نے انسانوں کی رہنمائی اور بھلائی کے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ایسی جلیل القدر ہستیوں میں مولانا حسین احمد مدنی کا نام سرفہرست ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی امت مسلمہ کی ان برگزیدہ شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنوں اور سازشوں کا انتہائی پامردی، ہمت اور استقامت سے مقابلہ کیا۔ ان کی جرأت ایمانی کے سامنے برطانوی شہنشائیت کے ظلم وستم، تخت وتاج اور شاہی جلال دطنطنہ ان میں سے کوئی بھی چیز، ان کو کلمۂ حق کہنے سے نہیں روک سکی۔ وہ حدیثِ رسولؐ کے اس مفہوم کے عملی مصداق تھے کہ بہترین جہاد ظالم سامراج کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔

برصغیر پاک وہند کی جنگ آزادی دراصل مولانا حسین احمد مدنی جیسے فرزندانِ توحید کی ولولہ انگیز اور دلیرانہ جنگ آزادی تھی جس کا دامن خون شہداء سے تر ہے۔ آزادی کا سفر پلاسی سے سرنگاپٹم اور اگست ۱۹۴۷ء تک تاریخ کا وہ زریں باب ہے جس کی راہ میں مسلمانوں نے سرفروشانہ جدوجہد کی۔ آزادی کا یہ سفر مسلم قومیت کے تحفظ کا سفر تھا تجدید دین اور احیائے ملت کا سفر تھا جس کے لیے مولانا حسین احمد جیسے مجاہدوں نے سربکف اور کفن بدوش ہوکر، انگریزی سامراج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ یہ وقت کا بہت بڑا چیلنج تھا جس کی جنگ مسلم قومیت کے تحفظ کے لئے اس زمین پر لڑی گئی۔ انگریزوں نے اپنی سیاسی چال کے طور پر اس کو غدر یا فوجی شورش کا نام دیا۔ مگر شہیدانِ

حریت کا خونِ ناحق رنگ لائے بغیر نہ رہ سکا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں جس طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مسلم سوسائٹی اور سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب کا پتہ لگایا اور یہ کہا کہ مسلم سوسائٹی کا انحطاط، شعائر اسلام سے بیگانگی ہے اور سلطنت مغلیہ کا انحطاط اقتصادی کمزوری اور عشرت پسندی ہے انھوں نے کہا کہ

"جس سوسائٹی میں اقتصادی توازن نہ ہو، اس میں طرح طرح کے روگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ نہ وہاں عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے۔ اور نہ مذہب اپنا اچھا اثر ڈال سکتا ہے" ۔[1]

تفہیمات میں شاہ صاحب نے مسلم سوسائٹی کی اصلاح کے بارے میں معاشرے کے ہر طبقے کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی اور ان کو ان کی برائیوں کی طرف متوجہ کیا۔ اگر مولانا حسین احمد مدنی کے افکار ملی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی سب سے بڑی فکر قومی اخوت تھی۔ انھوں نے اپنے افکار سے مسلمانوں میں اسلامی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ مسلمانوں میں للّٰہیت، خلوص، اتحاد، نظم، سیاست اور تنظیم کے جوہر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی حیثیت ایک تاریخ ساز قوم کی ہے جس نے نہ صرف اقوام عالم پر اثر ڈالا بلکہ دنیا کی تاریخ کے دھارے کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ مولانا کا کہنا یہ ہے کہ اسلام ایک بامقصد، متحرک اور اقدام پذیر نظام حیات ہے جو ایک اعلیٰ تر زندگی اور بلند تر خیر کے لئے کوشاں ہے۔ اسلام دنیا کو اجتماعی نصب العین کی طرف بلاتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دنیا سے ظلم و فساد، شر اور استحصال کا خاتمہ ہو ہر فرد کو آزادی ہو اور وہ عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکے۔ ایک فرد دوسرے فرد کا ایک قوم دوسری قوم کا احترام کرنا سیکھے۔ مولانا مدنی کے نزدیک اسلامی قومی اخوت،

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ: باب سیاسۃ المدینۃ، بحوالہ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۲۴۔ ۳۲۳

روایت پرستی اور تقلید جامد کا نام نہیں بلکہ وہ عقل وفکر کی تابناکی ہے اس میں ایک ابدی اور آفاقی شان ہے وہ ایک ایجابی مقصد ہے جو دوسرے ملکوں کی قوم پرستانہ تہذیب کے مقابلے میں زیادہ دیرپا ہے اور وسیع وعریض ہے کیونکہ اس کے پیچھے ایک اجتماعی نصب العین کی طاقت کام کر رہی ہے جو جغرافیائی حدود اور نسلی ملکی قدغن سے بالاتر ہے۔ یہ اجتماعی نصب العین، اعلائے کلمۃ الحق کے ذریعہ دنیا میں ایک اخلاقی انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ مولانا کے نزدیک اسلامی قومی اخوت ایک مذہب منفعت ہے جو اپنے نور ضمیر یا وجدان کی روشنی سے حق و باطل اور خیر و شر میں تمیز پیدا کرتا ہے۔ ایک خدا، ایک قرآن، ایک دین اس کے بنیادی عناصر ہیں۔ جو تمام انسانوں خاص طور سے مسلمانوں کو حرم کی پاسبانی کے لئے ایک رشتۂ اتحاد میں مربوط کرتے ہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے احیائے دین اور تجدید ملت کی جو تحریک چلائی تھی مولانا حسین احمد مدنی نے اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جہاد کیا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۸۲۸ میں دارالحرب کا فتویٰ دیا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ میں متعدد علمار کرام نے جہاد کا فتویٰ دیا۔ جس کی بنیاد پر جنرل بخت خاں نے انگریزوں سے جنگ کی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے بھی دار الحرب کا فتوی دیا۔ متعدد علمائے کرام اور مجاہدین آزادی کو جلا وطن کر کے کالا پانی بھیجا گیا۔ جہاں آزادی کی راہ میں انھوں نے دردناک تکالیف برداشت کیں۔ مولانا حسین احمد مدنی کو بھی جہاد حریت کی پاداش میں اسیر مالٹا بنایا گیا۔ اس طرح انھوں نے قلمی جہاد کے ساتھ ساتھ عملی جہاد میں حصہ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمان حریت و آزادی کے صحیح جذبے سے اس جنگ میں شریک نہ ہوتے تو یہ ہنگامہ محض بغاوت یا غدر بن کے رہ جاتا۔

مولانا حسین احمد مدنی کے افکار ملی کا ماحصل یہ ہے کہ اسلام ایک فکر مکمل ہے وہ کسی ایک ملک، قوم یا زمانہ کے لئے مخصوص نہیں۔ وہ تمام انسانیت کا دین ہے۔ وہ چند

رسموں اور روایتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل نظام حیات ہے جو تمدنی زندگی میں، معاشی اور سیاسی راہوں پر گامزن ہونے والے انسانی معاشرے کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ زندگی کے باہمی تضاد۔ نفرت اور دشمنی کے سیلاب کو روکتا ہے۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ سارے انسان ایک ہیں۔ فرقوں اور طبقوں کی تقسیم حقیقی نہیں۔ سب کی اصل ایک ہے۔ ساری انسانیت ایک ہے۔ کل کائنات ایک ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ بَنُوْا آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ یعنی سب انسان آدم کی اولاد ہے اور حضرت آدم، مٹی سے بنائے گئے ہیں

مولانا حسین احمد مدنی کی شخصیت اور ان کی ملی فکر کا نمایاں پہلو ان کا وہ جذبۂ اسلامی ہے جس کی تبلیغ واشاعت کے لئے انھوں نے اپنی پوری زندگی وقف کردی تھی اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کی ساری زندگی اسی نقطے کے گرد گھومتی نظر آتی ہے چنانچہ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ قید فرنگ کے لئے ان پر جو الزام لگائے گئے وہ آزادئ ہند بھی تھا اور یہ بھی تھا کہ وہ قرآنی احکام اور احادیث رسولؐ، مسلمانوں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل وہ آزادئ ہند کے پردے میں آزادئ اسلام کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔ اس لحاظ سے وہ سب سے پہلے مسلمان تھے اور بعد میں ہندوستانی۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے مسلمانوں میں قومی بیداری اور اسلامی تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ نہ دربار سے متأثر ہوئے اور نہ شاہانہ کروفر سے۔ مسلمانوں کو متحد کرکے اسلامی کی آزادی اور برطانوی اقتدار کا خاتمہ ان کا مقصد تھا۔ اس حقیقت کو حاصل کرنے کے لئے انھیں جہاں بھی رزق حیات نظر آئی اس میں انھوں نے اپنے لہو کو شامل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ جمعیۃ علمائے ہند سے ان کی وابستگی کا واحد سبب یہی تھا کہ وہ اس کے ذریعہ اسلام کا پرچم سربلند کرکے علماء کے خواب کی تعبیر دیکھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے ساری عمر جہاد کیا۔ یہ جہاد تھا خود اپنی زندگی سے، حالات سے اور ان سب سے بڑھ کر برطانوی استعمار اور وقت کے دھارے سے۔

غرض مولانا مدنی کی سیاست، اسلامی سیاست تھی۔ وہ کانگریس کے ساتھ رہے۔ انھوں نے گاندھی کے ساتھ مل کر کام کیا۔ مگر ان کا دل مسلمان تھا۔ وہ گاندھی کو ساتھ لے کر اسلامی سیاست کی خدمت انجام دینا چاہتے تھے۔ مولانا کے بارے میں یہ بات پورے وثوق کے کہی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمانان ہند کے صف اول کے مسلم رہنما تھے۔ وہ اپنے آپ کو رسول کی محبت میں فنا کیے ہوئے تھے جس پر دین کا عشق غالب تھا۔ مولانا کو ہندوستان کی آزادی بھی اس لئے عزیز تھی کہ اس سے حرمین شریفین بھی آزاد ہوسکیں۔ ان کی اس اسلامی اسپرٹ کو حسب ذیل فارسی اشعار میں ادا کیا جاسکتا ہے ؎

به دین مصطفےٰ دیوانه بودی
فدائے ملت جانانه بودی

سیاست را نقاب چهره کردی
وگرنه عاشق مستانه بودی

مولانا حسین احمد مدنی کی پوری زندگی ملی افکار کی پاسداری میں گذاری۔ ریشمی رومال کی تحریک ہو یا فید فرنگ، تحریک خلافت ہو یا ترک موالات، سائمن کمیشن ہو یا کمیونل ایوارڈ، واردھا تعلیمی اسکیم پر تنقید کرنا ہو یا شاردا ایکٹ کے خلاف تحریک، ان سب واقعات میں ان کی ملی فکر کا جو واضح عنصر سامنے آتا ہے وہ ان کی اسلامیت پسندی یا جذبۂ اسلامی ہے جس پر ان کے ملی افکار کی بلند و شاندار عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی کی فکر، فکر صالح تھی۔ وہ سعی و جہد کے ذریعہ ملت کو دنیا کی اقوام و ملل میں باعزت مقام دلانا چاہتے تھے۔ مولانا کے نزدیک فکر صالح وہ ہے جو ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرے جس میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پیروی کی جائے دکھی انسانیت کی خدمت کرنا ایثار و محبت مولانا کی ملی فکر کے اہم عناصر ہیں۔ اللہ کی راہ میں صعوبتیں برداشت کرنا حق کو بلند کرنا اور باطل سے ٹکرانا ان کی فکر اسلامی کا طرۂ امتیاز ہے۔

مادی ترقی اصل ترقی نہیں حقیقی ترقی، اخلاق حسنہ اور مدار اعلیٰ کو مدارج انسانیت کی تکمیل کا ذریعہ سمجھنے میں ہے۔ مولانا کا سب سے زیادہ زور جس بات پر تھا وہ یہ تھی کہ مسلمان اسلامی معاشرے کی حیثیت سے اپنی سالمیت قائم رکھیں اور اپنے قومی استحکام کو استوار کریں۔ اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم ذاتی اور گروہی مفادات پر ملی مفادات کو ترجیح دیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سعی و جہد تھی اس کا ماحصل یہ تھا کہ امت ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو تمام مسلمان ایک ملی وحدت بن جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امت جب بنتی ہے جب رنگ، نسل اور دوسری عصبیتوں کے بھید بھاؤ ختم ہو جاتے ہیں۔ اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کو ایک خاص حکمت کے تحت تخلیق کیا ہے اور وہ یہ کہ ہدایت خداوندی ایک کائناتی شریعت ہے۔ اس بنا پر ہدایت خداوندی کا اتباع، انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ یہی ہدایت خداوندی سراسر خیر و فلاح کا موجب ہے اور اس کے ذریعہ انسانی زندگی فساد اور شر سے محفوظ ہو سکتی ہے۔ یہی وہ بنیادی فکر ہے جو مولانا کے افکار ملی کی اساس ہے۔ کیونکہ مولانا کے نزدیک اسلامی قیادت، انسانیت کے تحفظ اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی بہترین ضامن ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن کو خدا پر بھروسہ ہوتا ہے وہ نامساعد حالات میں زمانہ کی رفتار کا مقابلہ کرتے ہیں طوفان سے خائف نہیں ہوتے بلکہ لہروں سے کھیلتے ہوئے سفینے کو ساحل پر لاتے ہیں وہ آندھیوں میں چراغ جلاتے ہیں مگر اللہ کی راہ میں سعی و جہد سے دست بردار نہیں ہوتے۔ مولانا حسین احمد مدنی عدل و انصاف کو انسانیت کا عین اقتضا تصور کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظلم دیر پا نہیں ہوتا۔ جبکہ عدل باقی رہتا ہے۔ عدل کا حق وہ حق ہے جس میں دشمنی بھی مانع نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ کا فرمان اسی مفہوم میں ہے اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو مولانا کے ملی افکار کا جوہر خلوص اور للہیت تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ ہم اپنے مسلمان ہونے پر فخر محسوس کریں۔ اپنے دین پر عمل پیرا ہوں۔ آپس میں باہمی اتحاد کی فضا پیدا کریں اور ایمانی وحدت میں اسلام کی سربلندی تصور کریں۔ اس طرح مولانا

نے اپنے ملی افکار کے ذریعہ اندھیروں سے روکا اور اجالوں میں زندگی بسر کرنے کی دعوت دی۔ وہ حق سے انحراف، فسق و فجور اور ظلم و زیادتی کو پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ معاشرے میں اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی لانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ملی افکار سے اللہ کے دین کو غالب کرنے کی سعی کی اور قوم و ملت کے استحکام کے لئے بڑا کام کیا۔

مولانا حسین احمد مدنی کی ملی فکر یہ ہے کہ انھوں نے باہمی اخوت کا درس دیا۔ معاشی اور معاشرتی فروغ میں اعلیٰ اخلاقی کردار کی تبلیغ کی۔ فضائل اخلاق کی حفظ و بقا کے لئے معروف کا حکم دیا اور برائیوں سے بچنے کی تاکید کی۔ ایمان کی پختگی اور عبادات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ وہ اپنے اخلاق و عادات کو درست کرے۔ شرافت، رواداری اور انکساری کو اپنا شعار بنائے۔ مولانا نے بتایا کہ تقویٰ انسانی زندگی کا شرف ہے جو شخص اپنے دل میں خدا کا خوف رکھتا ہے۔ برائی سے نفرت کرتا ہے۔ احتیاط سے زندگی بسر کرتا ہے۔ ہر دم اپنی ذمہ داریوں کا خیال کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے ہر عمل کی جواب دہی کے احساس سے غافل نہیں ہوتا تو یہی تقویٰ ہے۔ اسی طرح مال و دولت، جاہ و منصب اور عیش کے دنوں میں اللہ کو یاد رکھنا اور تنگی اور مفلسی میں صبر اور ضبط نفس کا مظاہرہ کرنا یہ ایک سچے مسلمان کی شان ہے۔ مولانا نے قوم کو صبر، تحمل، بردباری اور قوت برداشت کی تعلیم دی کیونکہ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے حوصلوں کو بلندی اور عزم کو استقامت ملتی ہے۔ سورۂ آل عمران میں خوشخبری دیتے ہوئے ارشاد رب جلیل ہے۔ لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ اور نہ ہمت ہارو اور نہ غم کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن رہے۔ اس آیت کریمہ میں باہمی اتحاد، اور ایمانی وحدت کو اسلام کی سربلندی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

مولانا نے اپنے ملی افکار کے ذریعہ اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری میں استقامت ثابت قدمی کی تلقین کی۔ اور فرمایا کہ اعمال صالحہ کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ نیکی کے بعد نیکی کرنا تو مقصود مومن ہے لیکن نیکی کے بعد برائی کرنا مقصود مومن نہیں۔

کیونکہ نیکی، مقصود مومن ہے نہ کہ برائی یا بدی۔ سجدہ ہائے نیم شب، عبادتوں میں کوتاہیوں پر استغفار، رضائے خداوندی کا حصول اور سنت نبوی کا اتباع یہ وہ رہنما اصول ہیں جو مولانا کے ملی افکار کے بنیادی عوامل ہیں۔ دراصل مولانا چاہتے تھے کہ آدمی کو آدمی کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ رب العالمین کی حاکمیت و اطاعت کا پابند کیا جائے۔ کہ یہی راستہ فلاح و کامرانی کا راستہ ہے۔ اور اسی میں دین و دنیا کی بھلائی ہے۔ اور اسی کے ذریعہ انسان ہر ظلم و جہل، مطلق العنانیت اور نخوت و غرور سے بچ سکتا ہے۔ عروج آدمیت اور فلاحِ انسانیت کی اگر کوئی راہ ہے تو وہ یہی ہے کہ یتیموں کی مدد کی جائے، ضعیفوں کی خبر گیری کی جائے، بیواؤں کی بہبود اور بے کسوں کی خیر خواہی کی جائے، صداقت، سخاوت اور قناعت کے اصولوں کو اپنایا جائے۔ یہ ہیں وہ اجزا جن کو مولانا نے اپنے ملی افکار کی اساس بنایا۔ اسی طرح مولانا نے مسلمانوں کو عفو و درگذر کی تعلیم دی اس کی وجہ یہ ہے کہ عفو و درگذر سے شخصیت کے مدارج کمال کی تکمیل میں مدد ملتی ہے۔ اس کے ذریعہ اشخاص کی روحانی بالیدگی ہوتی ہے اور اخلاقی بلندی اور ترقی کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا نے اپنے افکار سے مسلمانوں میں یوم آخرت کے محاسبہ پر یقین پیدا کیا۔ اور اس بات کو سمجھایا کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ اس لئے ہمیں خلق خدا کے لئے باعث آزار نہیں بننا چاہئے۔ مولانا نے فرمایا کہ فرزندان توحید کو شجاعت ورثہ میں ملی ہے۔ اسلام میں بزدل وہ ہے جو برے کام کرتا ہے اور بدی کو پھیلاتا ہے۔ اس لئے اسلامی شریعت کے مطابق بزدلی سخت اخلاقی عیب کا نام ہے۔

مولانا کے ملی افکار میں سے ایک ملی فکر یہ ہے کہ جھوٹ زبان کی بدترین بیماری ہے جو منافق کی علامت ہے۔ مولانا کے نزدیک جھوٹ مقصود مومن نہیں کیونکہ جو مومن ہے وہ نہ جھوٹ بولتا ہے نہ الزام تراشی کرتا ہے۔ نہ عیب جوئی کرتا ہے اور نہ فخر و ریا کاری سے کام لیتا ہے۔ یہ سب برائیاں زبان ہی کے بہکنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں اور باعث ضرر

بنتی ہیں۔ مولانا کے نزدیک ان سب چیزوں کی انتہا ندامت اور شرمساری ہے۔ مسند امام احمد کی حدیث ہے کہ اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں جنھیں دیکھ کر اللہ یاد آئے۔ اور بدترین لوگ وہ ہیں جو ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ اور دلوں کی محبت میں دراڑ پیدا کرتے ہیں۔ اگر مولانا حسین احمد مدنی کے ملی افکار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا امن اور ترقی کے داعی تھے۔ وہ ہر اس عادت یا خصلت کو جو عدل، مساوات اور قومی اخوت کے خلاف ہو۔ اسے مقصود مومن تصور نہیں کرتے تھے۔ وہ زندگی کے ہر دائرے سے کجی اور گمراہی کو خارج کرنا چاہتے تھے۔ اور اعتقادی اصلاح کے علاوہ معاشرتی، تمدنی، تہذیبی سمتوں میں صاف اور روشن راستوں کی رہبری کرتے تھے۔ وہ احترام آدمیت اور تکریم انسانیت کے نقیب تھے۔ وہ کینہ، بغض، حسد اور ایک دوسرے کی تحقیر کو ناپسند کرتے تھے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو مولانا نے اپنے ملی افکار کے ذریعہ امن کے چراغ روشن کئے باہمی صلح کی نوید دی اور نور ہدایت پھیلایا۔

مولانا نے اپنے ملی افکار سے جو اتباع رسول پر زور دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ آپ کی شریعت نے تمام سابقہ شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔ اور آپ کی بعثت کے بعد اب تمام انسانوں پر آپ کی اطاعت فرض ہے۔ آپ سے پہلے جس قدر انبیاء آئے وہ خاص خاص قبیلوں اور قوموں کی طرف بھیجے گئے ان کی دعوت عام نہ تھی۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت روئے زمین کی ہر قوم کی طرف ہوئی ہے۔ کالے، گورے، رومی، حبشی، عرب وعجم، ترک وتاتار، چینی ہندی سب آپ میں برابر کے حقدار ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ اے محمدؐ! ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لئے بھیجا ہے۔ صحیحین کی حدیث ہے آپ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے نبی، خاص، اپنی قوم میں بھیجا جاتا تھا اور میں تمام دنیا کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ ان آیات اور حدیث سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے قرآن مجید کی طرح رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی حیثیت آفاقی ہے۔ تو جو شخص کامل و اکمل ہو اس کا اتباع بدرجۂ اولیٰ واجب ہے۔ دنیا میں کئی آسمانی صحیفے آئے مگر ان میں کوئی بھی جامعیت کی صفت نہیں رکھتا ہے تورات، اقوام کی تاریخ ہے۔ زبور، دعاؤں اور مناجاتوں کا ذخیرہ ہے۔ سفر ایوب میں عقیدۂ تقدیر و رضا کی تعلیم ہے۔ امثالِ سلیمان میں مواعظ و حِکَم ہیں۔ انجیل حضرت مسیح کی سرگذشت اور تعلیمات اخلاقی کا مجموعہ ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو صحیفہ ملا یعنی قرآن وہ جوامع الکلم ہے یعنی وہ تمام باتوں کا جامع ہے۔ وہ توراۃ بھی ہے زبور بھی، انجیل بھی ہے اور کچھ اس سے زیادہ بھی۔ یہ ہے اسلام کا وہ بنیادی تصور جس کی بنا پر مولانا نے اپنے افکار ملی میں اتباع رسول کو موضوع بنایا۔

غرض مولانا کی ملی فکر یہ ہے کہ خدا کی بندگی کے سوا کسی کی بندگی نہ کی جائے۔ نہ نفس کی بندگی، نہ بادشاہوں کی نہ طاقت کی بندگی نہ دولت کی بندگی۔ نہ عادات کی بندگی، نہ خواہشات کی بندگی کی جائے۔ دراصل مولانا ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے جس کی بنیاد عالمگیر برادری پر ہو، جس میں حکمرانی، اللہ کی ہو۔ خواہشات کی نہ ہو۔ جس میں انسانیت کی خیر خواہی، آخرت پر یقین ایثار و قربانی اور زہد و اخلاص ہو۔ یہ ہیں وہ افکار جن کی مولانا نے زندگی بھر تبلیغ کی اور یہ فیض ہے بعثت محمدیؐ کا کہ اس نے لوگوں کو دنیا میں باعزت انسانوں کی طرح اور آزاد انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا سکھایا۔ اس لحاظ سے اگر مولانا کے افکار کا خلاصہ نکالا جائے تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ ایک صالح معاشرہ، ایک خدا ترس انسان دوست معاشرہ، ایک صاحبِ ضمیر معاشرہ وجود میں لایا جائے۔ ایسا معاشرہ جس میں دولت ہی سب کچھ نہ ہو جس میں اصل چیز اللہ کی رضا۔ اس کی خوشی اور آخرت کا نفع ہو۔ کیونکہ اصل چیز اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرنا ہے۔

مولانا کے ملی افکار کا ایک اور اہم عنصر خدمت خلق ہے۔ جس سے انسانی سوسائٹی کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور معاشرتی، ثقافتی اور معاشی حقوق کی سرافرازی کے دروازے

کھلتے ہیں۔ مولانا کی تعلیمات کی رو سے ہر فرد کو معاشرے کی ثقافتی زندگی اور معاشرتی ماحول میں زندگی گذارنے کا حق ہے اسی لئے مولانا نے استحصالی نظام کی سختی سے مذمت کی۔ کیونکہ مولانا کے نزدیک تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں ان کی سماجی حیثیت برابر ہے۔

غرض مولانا کی ملی فکر یہ ہے کہ اتحاد ایک خزانہ ہے ہنرمندی اور عقل کا طور طریقہ اور اخلاق کا۔ جس سے قوم اپنی نشوونما کے دوران ذہنی زندگی کے لئے غذا حاصل کرتی ہے معاشرتی تنظیم میں جسمانی توانائی کے لئے جس چیز کی زیادہ ضرورت ہے وہ ہے قوم میں اتحاد واتفاق۔ یہ توانائی نہ ہو تو دل ودماغ کو نشوونما کا موقع نہیں ملتا۔ اعلیٰ نسلیں، جغرافیائی اور ارضیاتی حدود سے ماورار ہوتی ہیں۔ وہ ایک ایسی ثقافت کو جنم دیتی ہیں جو بلند اخلاقی ضابطہ کی رو سے قوم کو ایک رشتہ اتحاد میں منسلک کر سکے۔ ایسے عقائد مرتب ہوتے ہیں جو زندگی کو کوئی نصب العین فراہم کرسکیں تاکہ زندگی بامقصد بن جائے۔ وہ قوم جو نقل یا عقل کے ذریعہ۔ زبان، علم، اخلاق، روایات، ٹکنالوجی، ہنر اور مذہب کا صحیح ورثہ اپنے نوجوانوں کو منتقل کر سکے وہ حقیقی معنوں میں تہذیب یافتہ اور ایک عظیم قوم (Creat Nation) کہلانے کی مستحق ہے۔

اس وقت عالم اسلام جس کشمکش اور شکست وریخت کی کیفیت سے گذر رہا ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہم سب متحد ہو کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور رنگ ونسل یا گروہی اختلافات سے ماورار ہو کر ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ اسی سے ہماری قومی اخوت اجاگر ہوگی۔ دوسری قوموں پر ہماری قومی عظمت کا رعب وجلال اثرانداز ہوگا۔

اے برادران اسلام! اب آخر میں، میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ

ایک زمانہ تھا جب مراکش پر فرانس، عراق اور اردن پر برطانیہ، مصر، الجیریا، اور ٹیونس پر یورپی طاقتوں کا قبضہ تھا۔ لیکن آج معاملہ برعکس ہے آج نائجیریا، برطانیہ

سینی گال، مالی، گنی، گھانا، مصر، مراکش، اردن مسلمانوں کے بیشتر ممالک آزاد ہیں۔ کیا ایسی صورت میں تمام دنیا کے مسلمان اپنی قومی اور ملی وحدت اور ملی خود اعتمادی کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا ہو جائے تو عالمی سیاست کا رخ بدل سکتا ہے۔

اے اسلامیان ہند! ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں کی افواج ویانا (Vienna) کے دروازے پر دستک دیتی تھیں۔ یورپ میں ہنگری، رومانیہ، جنوبی روس، بلغاریہ، یونان، البانیہ، آسٹریا کا بڑا حصہ مسلمانوں کے زیر نگیں تھا۔ امیرالبحر خیرالدین باربروسہ کی قیادت میں مسلمان ایک عظیم ترین بحری طاقت تھے۔ یہاں تک کہ بحیرۂ روم خلافت عثمانی کی ایک جھیل بن کے رہ گیا تھا۔ جس میں کسی ملک کی بحریہ کو اس کے جہازوں کو چیلنج کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ آج جبکہ بیشتر مسلم ممالک آزاد ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنا الگ ایک متحدہ قومی پلیٹ فارم بنائیں۔ یہی میرا پیغام ہے ؎

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

مرشدنا حضرت شیخ الاسلام سید مولانا حسین احمد صاحب کے سلسلہ میں ہونے والے حالیہ سیمنار جو دہلی میں آئندہ مورخہ ۱۸ر ۱۹ر مارچ ۱۹۸۸ء کو منعقد ہو رہا ہے جس میں ہر طبقہ کے اہل فن صاحب ذوق اور دانشوران علم وفکر اپنے اپنے مکتب فکر کے گلہائے عقیدت پیش کریں گے، میں بھی اس بزم سیمنار کے ایک ادنی عقیدت مند اور خادم کی حیثیت سے اس مبارک اور سعید موقعہ پر یکے افسردہ حال شاعر کے مصداق

در مجلس خود راہ مدہ ہم چوں منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

چند احوال و واقعات جو میری زندگی کا سرمایہ ناز اور مجھ جیسے اکثر کے لئے باعث فخر وانبساط ہیں چند عنوانات کے تحت اس امید پر نقل کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ شاید کسی نوردراہ اور تلاش منزل والے کے لئے نشان راہ ثابت ہو جائیں۔

حضرت شیخ الاسلام رح کی بعد حیات اپنے متعلقین پر ہنوز توجہ اور مہمان نوازی

ہندوستان کے مشہور و معروف مشرقی سرحدی صوبہ آئیزول (میزورم) میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے مسلمان تجارتی سلسلہ میں رہتے ہیں، اس کوہستانی علاقہ اور ان دور و دراز علاقوں میں اسلام سے بے فکر اور غافل رہنے والے مسلمانوں کے اندر بے دینی اور موجودہ بدعات جڑ پکڑ رہی ہیں اور ارتداد و بے دینی کی خبریں برابر ملتی رہتی تھیں، جس کی بنا پر وہاں کے لئے میرا ایک حالیہ سفر در پیش ہوا، اس سلسلہ میں ۶ ر تا ۱۹ ر فروری وہاں رہنا ہوا، اس چہار روزہ سفر سے واپسی کے بعد ۲۱ ر فروری کو دوپہر ایک گہری نیند آئی جس میں ایک مبارک خواب سے مشرف ہوا۔

دیکھا کہ حضرت شیخ الاسلام رح نور اللہ مرقدہ دیوبند کے دو منزلہ برآمدہ پر تشریف فرما ہیں اور زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حاضرین سے ایک سوال کیا، جس کا جواب کسی نے نہیں دیا اور اس سوال کے جواب دینے کا شرف مجھے حاصل ہوا، جس پر خوش ہو کر حضرت رح نے مجھے ایک خاص لقب سے نوازا (لقب کے ظاہر کرنے سے معذرت خواہ ہوں)

دوسرے لمحہ دیکھتا ہوں کہ میرے والد بزرگوار مرحوم منشی محمد نصیر علی صاحب کے ہاتھوں میں بڑے صفحات کے چند اوراق ہیں جن میں سرخ خفی حرفوں میں ناموں کی فہرست ہے اور مجھ سے فرما رہے ہیں کہ میں حضرت مدنی علیہ الرحمہ کا مہمان ہوں بقیہ اور دوسرے مہمانوں کے نام اس فہرست میں ہیں

غور فرمایئے کہ اس ـــ جمال شاہ کو رب کریم نے جس طرح دنیا میں وسیع صاحب خوان اور مہمان نواز بنایا تھا، ہنوز عالم برزخ میں بھی وہی شرف بخشا ہے

اور اپنے متعلقین کی طرف برابر توجہ مبذول ہے

احوال و واقعات کی بات جب خواب سے شروع ہوئی تو اپنے تعلیمی زمانہ کا ایک خواب بیان کرتا ہوں جو اس قسم کے دوسرے اور خوابوں کی ایک کڑی ہے جو گداز و دلفریب ہونے کے ساتھ ساتھ دل خراش بھی ہے۔

شیخ الاسلامؒ کے ساتھ سید الکونین صلعم کی تائید اور معیت مبشرات کی شکل میں

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب کہ میں حسب ایماء حضرت شیخ الاسلام دورۂ تفسیر کے لئے دیوبند میں احاطۂ باغ کمرہ ۱۹ میں مقیم تھا، دوپہر کے وقت قیلولہ کے لئے لیٹا ہوا تھا کہ خواب میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی تیزی سے حضرت شیخ الاسلام کی قیام گاہ کی طرف تشریف لے جا رہے ہیں

یہ اس وقت کا خواب ہے کہ جس روز حضرت مدنیؒ پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور اس زیارت کے فوراً بعد مجھکو معلوم ہوا کہ حضرت والا پر فالج کا حملہ ہو گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کے صدقے عنیمت فرمایا اور شدت سے بچا لیا۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی ذات کے ساتھ تائید اور مبشرات کی فہرست بڑی لمبی ہے اسی سلسلہ کا ایک واقعہ ایک صاحب کشف اور عاشق رسول کی عینی شہادت ملاحظہ فرمائیے

ایک عاشق رسول کی معیت رسول کی عینی شہادت

یہ واقعہ جناب قاری نجیب علی صاحب مرحوم رسنگاری کریم گنجی سے وابستہ ہے جو ایک سچے عاشق رسول تھے، اور اکثر و بیشتر آپ کے اوپر جذب و کیف کی حالت طاری رہتی تھی اور اسی جذب و کیف کی حالت میں یا رسول اللہ یا رسول اللہ کہتے ہوئے جنگلوں اور بیابانوں میں نکل جایا کرتے تھے، ان کے اس جذبی کیفیت کے اکثر لوگ گرویدہ تھے، خود حضرت شیخ الاسلامؒ آپ سے بہت

فرماتے تھے۔ اور وہ حضرتؒ پر جان نثار تھے، سلہٹ کے قیام رمضان میں ساتھ ساتھ رہتے تھے، سلہٹ ہی کے ایک قیام رمضان کا یہ واقعہ ہے۔

جیسا کہ قدیم متعلقین کو معلوم ہے کہ حضرت مدنی رہ نئی سڑک کی مسجد میں تراویح خود پڑھایا کرتے تھے جس کی ترتیب یہ ہوتی تھی کہ پہلی چار رکعتوں میں جناب مولانا عبدالجلیل صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند پڑھاتے تھے باقی رکعتوں میں اسی کو دوبارہ حضرتؒ پڑھایا کرتے تھے اور بعد تراویح ایک گھنٹہ یا دو گھنٹے کے قریب وعظ فرمایا کرتے تھے۔

انہی کسی ایک مجلس وعظ کا واقعہ ہے کہ وعظ کے بعد خصوصی نشست میں حضرت مدنی رہ نے قاری صاحب مرحوم سے دریافت فرمایا کہ قاری صاحب آج کیا دیکھا؟

اس نشست کے بعد قاری صاحب مرحوم نے خود ہی اس پر کیف منظر کی تفصیل بیان کی کہ آج کے پورے وعظ میں حضرت علیہ الرحمہ کے پیچھے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دست مبارک میں ایک پھلوں اور پھولوں سے بھری خوبصورت طبق لئے ہوئے کھڑے دیکھا اور روئے مبارک پر مسرت اور خوشی کے آثار نمایاں دیکھے اور اسی پر مسرت منظر میں میری نگاہیں مسحور تھیں۔

غور فرمایئے! کہ ان واقعات سے حضرت مدنی رہ کی ظاہری و باطنی تائید اور ہر لمحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی معیت کس قدر گہری تھی اور اتباع سنت کی نسبت نے آپ کی ذاتِ گرامی کو کس قدر عروج کو پہنچا دیا تھا۔

روئے مدنیؒ پر تجلیات الٰہی کا سیمابی عکس

اسی مشابہت کے دو یکساں واقعات میری زندگی سے وابستہ ہیں جس میں خاکسار نے حضرت مدنیؒ کے چہرۂ مبارک پر تجلیات الٰہی کو مسحور کن اور پر لطف طور پر محسوس کیا، ایک دفعہ دہلی الجمعیۃ کے دفتر میں جبکہ حضرت والا کسی علمی کام میں منہمک تھے اور میں پاس ہی حاضر تھا، دوسری دفعہ

حضرت کے آخری حج کے موقعہ پر جبکہ مدینہ منورہ میں حضرتؒ کا اپنے بھائی سید محمود صاحب کے مکان میں قیام تھا اور میں بھی ساتھ تھا۔

دفعۃً چہرہ پر ایک سیمابی کیفیت طاری ہوئی اور تجلیات وانورات کے نمایاں نقوش ظاہر ہوئے ان سیمابی نقوش نے پورے ماحول کو لذت وحلاوت میں تبدیل کر دیا اور صاف وشفاف شہد کی سلسبیل نے کام ودہن کو بے خود بناکر بھوک وپیاس سے بے نیاز بنا دیا اور دیر تک اس کی لذت محسوس کرتا رہا۔

تلاوت قرآن کی لدنی کیفیت کا ایک انوکھا واقعہ

کام ودہن کی لطف اندوزی کی بات آئی تو ایک روحانی ترنگ کا واقعہ یاد آیا، آخر میں اس کو بھی سناتے چلوں۔

حضرت مدنی علیہ الرحمہ کا تلاوت قرآن سے شغف اور انہماک ہر خاص وعام کو معلوم ہے کہ کس قدر اہتمام تھا اور رسول پاکؐ کے ان دعائیہ کلمات اللھم ارحم بالقرآن العظیم وتخلطہ بلحمی ودمی کے کتنے مصداق تھے۔

یہ اس زمانہ طالب علمی کا واقعہ ہے جبکہ میں سلہٹ میں عالیہ مدرسہ کا طالب علم تھا اور حضرت مدنی علیہ الرحمہ سلہٹ میں قیام رمضان اور اعتکاف کے سلسلہ میں جیل روڈ پر واقع مرحوم داروغہ عبدالستار صاحب کے مکان میں مقیم تھے جس کے متصل مشرقی جانب ایڈوکیٹ مرحوم نثار علی صاحب کا مکان تھا جس میں میں رہتا تھا، اس قربت کی وجہ سے پورے رمضان معیت اور خدمت گذاری کا پورا موقعہ نصیب ہوتا تھا۔ حضرت نئی سڑک کی مسجد میں آخری عشرہ اعتکاف فرماتے تھے اور عموماً تہجد کی باجماعت نمازوں میں چار پانچ پارے تلاوت فرماتے،

اسی شب گذاری عشرۂ آخیرہ سے پہلے کسی رات کا واقعہ ہے کہ ایک رات تکان کی وجہ سے میں دو رکعت کے بعد اپنے کمرے میں آرام کے خیال سے چلا آیا

تکیہ سے سر لگایا ہی تھا کہ اس سے تلاوت قرآن کی آواز آنی شروع ہو گئی اور بستر کے ہر حصہ سے تلاوت کی آواز آنے لگی حتی کہ کمرے سے باہر ہر شجر و حجر سے وہی ایک ہی تلاوت کی آواز مدنی لب و لہجہ میں گونج رہی تھی، میں حیران و پریشان حضرت والا کی قیام گاہ کی طرف لوٹ آیا اور پھر دوبارہ آپ کی نماز کے ساتھ شریک ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد میرے حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی اللہ سے ہم کلامی میں کوہِ طور کے لرزنے اور حضرت داؤد علیہ السلام کی تلاوت زبور میں ذی روح اور غیر ذی روح کے شامل ہونے کی تفسیر سامنے آگئی

حضرت شیخ الاسلام رح کے انتقال کے بارے میں ایک خواب

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ جس وقت شدید علیل تھے اور یہی علالت آپ کی مرض الموت بن گئی، علالت کی خبر سنکر میں دیوبند عیادت کی غرض سے مولانا عبدالحق صاحب کی معیت میں دیوبند پہنچا، چند دن اقامت کے بعد حضرت والا نے جمعیۃ العلماء کے بارے میں ایک ہدایت نامہ دے کر ہم دونوں کو آسام بھیجدیا، دورۂ آسام کے درمیان مجھ کو سخت بخار آگیا، چنانچہ میں مکان چلا آیا، اسی اپنی علالت کے درمیان حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر پہنچی۔

انتقال کے ایک رات بعد خواب میں حضرت شیخ الاسلام کی زیارت نصیب ہوئی، جس میں میں نے پوچھا کہ آپ کا انتقال کیسے ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ

میں قیلولہ کے لئے لیٹا ہوا تھا کہ معلوم ہوا کہ ملک الموت آگئے، چنانچہ میں دائیں کروٹ لیٹ گیا تو اتنا ہی محسوس ہوا کہ جیسے کسی چیونٹی نے کاٹا

ہو، پھر میں بیدار ہو گیا، دوسری دفعہ مجھے نیند آئی تو پھر دوسری بار حضرت والا کی زیارت نصیب ہوئی۔ فرمایا کہ مجھے جب معلوم ہوا کہ ملک الموت آ گئے تو میں دائیں کروٹ پر لیٹ گیا اور کلمۂ شہادت پڑھا اور صرف اتنا ہی محسوس ہوا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیونٹی نے کاٹا ہو۔

ان واقعات کی روشنی میں سمینار ہونے والے کی
شخصیت اور ان کے پایۂ کمال کو دیکھا
جا سکتا ہے اور بھی اس قسم کے کتنے احوال
و واقعات کتنوں کے سینوں میں امانت
ہیں، میں وقت کی نزاکت کو
مدنظر رکھ کر یہیں ختم کرتا
ہوں۔ و آخر دعوانا
ان الحمد للہ
رب
العالمین

پروفیسر تنویر احمد علوی، دلی یونیورسٹی
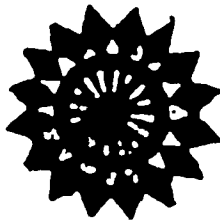
نقش حیات

ایک تاریخی و تہذیبی دستاویز

حضرت شیخ الاسلام مولینا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ عالیہ سے متعلق ایک ایسی خود نوشت تحریر اور تاریخی دستاویز ہے، جسے ہم اگر ایک روشن نقطہ مان لیں تو اس کے گرد نقوش و آثار اور فکری خیال کا، ایک ایسا دلکش دائرہ نما بنتا ہے قوس و قزح کی طرح جس کے الگ الگ رنگ اپنے خارجی رشتوں اور داخلی کیفیتوں کے ساتھ ساتھ خوش رنگی و ہم آہنگی کا ایک عجیب مرقع اور دل آویز امتزاج پیش کرتے ہیں اور رہم رنگ میں مولینا کی اپنی منفرد شخصیت ابھرتی ہے اور اپنے زمانے اور زندگی کو متاثر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس کے وسیلہ سے ہمارے لئے حضرت کے اپنے شعور و شخصیت کی شناخت تو ممکن ہو ہی جاتی ہے اور اس کی ایک متحرک تصویر شروع سے آخر تک نگاہوں کے سامنے رہتی ہے اس سے آگے اور الگ اس کا وسیع تر ذہنی پس منظر اور تاریخی تناظر، بعض نہایت اہم قومی مسائل اور ملی رجحانات کی تفہیم اور ان کی تاریخی توجیہ میں، غیر معمولی سطح پر، ہماری فکر کو ہمیز کرتا اور اس کی قدر شناسی میں معاون ہوتا ہے۔

اس سے جہاں مولینا کے اپنے خاندان اور وقت کے ایک خاص دائرے میں، اس کے ماضی و موجود کو سمجھنے میں سہولت ہوتی ہی ہے وہاں مولنٰنا کی بھی حیثیت اور اس کی مختلف جہتوں کو روشن کرتی ہوئی تاریخی بصیرت، ہمیں مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی زندگی اس کی افتادِ مزاج، اس کی روایت پسندی، نیز اس کے مذہبی و نیم مذہبی رویوں، اور وطنی رشتوں کو سمجھنے میں بھی ہمارے لیے روشنی اور رہنمائی کا باعث ہوتی ہے اور ہم اس کو

بنیاد جان کر اس محول صورت اور تغیر حالی کا بھی کچھ اندازہ کر سکتے ہیں جس سے خصوصیت کے ساتھ پچھلی صدی عیسوی کے نصف آخر اور موجودہ صدی کے ربع اول میں مسلم معاشرہ گذرا ہے۔ اور کیسے کیسے یہ سفر ختم ہو گیا۔

حضرت والا کے خاندانی حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم جاگیرداریوں اور زمینداریوں سے وابستہ معاشرہ کس طرح اپنے دور انحطاط سے گذرتا ہے اور اس مرحلہ کے اخیر تک آجاتا ہے جسے ہم نقطۂ ہجرت Point of deparliv بھی کہہ سکتے ہیں اور جہاں پہنچ کر کوئی نیا قدم اٹھانا چاہے وہ کتنا ہی کمزور ہونا گزیر ہو جاتا ہے۔

زمینداریاں کیوں اور کیسے تباہ ہوئیں ان سے وابستہ افراد کا طبقاتی کردار کیا تھا اس کی تفصیلات اور اسباب ہر جگہ الف سے لیکر یا یہ تک یکساں تو نہیں ہو سکتے لیکن کچھ باتیں ضرور ایسی تھیں اور ہیں جنھیں تعمیر میں خرابی کی ایک مضمر صورت سے تعبیر کر سکتے ہیں اور جن کے نتیجہ میں اس نظام کی شکست و ریخت تاریخ کی اہم تبدیلیوں کا حصہ بنی ہوئی نظر آتی ہے جسے اس کا ایک منطقی انجام کہنا چاہیے جس کے بعد یہ پر شکوہ نظام وقت اور تاریخ کی کڑی دھوپ میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔

اہم بات یہ ہے کہ مولانا کی نظر اس کی داخلی کمزوریوں کی طرف بھی گئی جن کا تجزیہ انھوں نے معاشرتی عوامل کے تحت بھی کیا اور اسی کے ساتھ انگریزوں کے قائم کردہ سودی نظام کی طرف جو سود در سود کے حلقے در حلقے پھیلتے اور بڑھتے ہوئے حال کی صورت میں زرداری و پٹہ داری کی عفریتی قوتوں کو آگے بڑھاتا رہا اور استحصال کی بدترین شکلیں سامنے آتی گئیں۔۔۔

اس ضمن میں ایک بڑے خارجی دباؤ کے اثرات کے جائزے اور تجزیے کے باوصف مولینا نے جاگیردار طبقہ اور زمیندارانہ طرز معاشرت کے رویہ سے صرف نظر نہیں کیا اور اسس ناقابل فراموش حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔

"انگریزی حکومت کے زمانہ میں جو قدر و منزلت زمینوں اور جائدادوں کی بڑھ گئی ہے اس کا عشر عشیر بھی زمانۂ سابق میں نہ تھا معمولی ضرورتوں میں زمینوں کو فروخت کر دینا رہن رکھ دینا (بلکہ ذرا ذرا سی بات پر خوش ہو کر) بخش دینا معمولی خدمتوں کے صلہ میں گاؤں کا گاؤں ہبہ کر دینا مسلمانوں بالخصوص مسلمان رؤسا کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا"

بات یہیں ختم نہیں ہوتی جاگیردارانہ مزاج اور زمیندارانہ افتاد طبع کے زیر اثر رقابتوں اور قبائلوں کا جو سلسلہ چلتا تھا اور اب بھی چلتا ہے اس میں نوبت قتل و خون تک پہنچ جاتی تھی اس سلسلہ میں طلبی و حق تلفی کی عبرتناک مثالیں الگ سامنے آتی تھیں اور مقدمہ بازی کا عفریت، جس طرح پیر تسمہ پا کی طرح کاندھوں پر سوار ہو جاتا تھا۔ بڑی بات یہ ہے کہ حضرت نے ان سچائیوں کو فراموش کرتے ہوئے ان معاملات پر کوئی گفتگو نہیں کی اور اس طرح معاشرتی مسائل کو اسباب معیشت سے جوڑنے کی کوشش کی کہ وہی بیشتر ہمارے معاشرتی رویوں کی بنیاد ہوتے ہیں

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا کا جس خاندان سے تعلق اور جدی آبائی رشتہ تھا اس کی املاک کو جب ایک پڑوس راج نے تاراج کیا تو ایک ماہ تک گاڑیوں میں لوٹ کا مال لے جایا جاتا رہا۔ جب عدالتی چارہ جوئی کی گئی تو یہ لوگ قلت سرمایہ اور دیوانی کے مصارف کی کثرت کی وجہ سے اپنے چیرہ دست حریف کا مقابلہ نہ کر سکے نتیجہ یہ ہوا کہ مدار آمدنی کا پیری مریدی اور نذرانوں کی آمد پر رہ گیا۔

مولانا کے دادا کے زمانہ میں خاندانی جاگیر و جائداد میں جو حصہ بنتا تھا وہ روپیہ میں دو آنے آٹھ پائی تھا۔ ان کے والد تک آتے آتے یہ حصہ بھی مہاجنوں کے یہاں رہن رکھا جا چکا تھا اور وہ مرحوم مختصر سی نئی تعلیم اور معمولی سی نیم سرکاری ملازمت کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

مولانا نے اپنے خاندان کی یہ کہانی سنا کر ہمارے سامنے شمالی اور وسط ہند کے بے شمار خاندانوں کے المناک انجام کی داستان دہرائی ہے اور اس پر آمادہ، بلکہ ایک معنی میں مجبور کیا ہے کہ ہمارے علمار مسلمانوں کے مذہبی مسائل کے ان کے معاشی و معاشرتی مسائل پر بھی زیادہ سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ سوچیں۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت کہ ہمارے بیشتر علما کی تحریروں میں، جو ہمارے لیے رہنما روشنیوں کا درجہ رکھتے ہیں یہ مسائل اپنے صحیح مادی سیاق وسباق کے ساتھ بہت کم زیر بحث لائے ہیں۔

مسلمانوں کے بعض طبقات روایتی سطح پر اپنی مذہبی فکر کے زیر اثر اور بہت کچھ تاریخی جبرہ دستیوں کے پیدا کردہ نفسیاتی جبر کے تحت کس طرح سوچتے رہے اور اس پر عمل کرتے رہے کچھ اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ مولانا کے والد خاندان کی تنگ دستی، ہجوم افلاس اور معاشی بدحالی کی وجہ سے علوم عربیہ کی تحصیل سے محروم رہے بہ مشکل مڈل پاس کیا اور نارمل کرکے مدرسی کے پیشہ میں آگئے بعض احباب نے انگریزی سیکھنے کا بھی مشورہ دیا اس کی طرف طبیعت مایل بھی ہوئی لیکن خواب میں دیکھا کہ وہ کثافتوں اور غلاظتوں میں گھر گئے تو اس کا خیال ترک کر دیا۔

معمولی واقعہ ہے لیکن اس کا پس منظر معمولی نہیں ہے اور برصغیر کی تاریخ کے ایک اہم موڑ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہمارے علمار اور مذہبی طبقہ کی تہذیبی فکر بحیثیت مجموعی انگریزی تعلیم کا مخالف رہی ہے اور اس کی وجہ خود انگریزوں سے منافرت ہے جس کی جڑیں برطانوی ہند میں ہندوستان کی سیاسی وسماجی تاریخ کے بطون میں پھیلی ہوئی ہے۔ طبقہ علما اور ان کے زیر اثر مسلمانوں کا یہ رویہ انگریزوں کی حکمت عملی کے خلاف ایک احتجاج کی صورت میں سامنے آتا ہے یہ بھی تنظیمی مقاطع یا معاشرتی سطح پر نون کوآپریشن Non- Co-opiration کی ایک صورت تھی انگریزوں نے اپنی جارحانہ سیاست اور تاجرانہ لوٹ کھسوٹ سے ہندوستان کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً جو شدید نقصانات پہنچائے تھے یہ ردعمل اسی کا پیدا کردہ تھا۔

میں انگریز حکومت کے سیاسی اقدامات کے تحت علمار کی موثر حیثیت کو مسلم معاشرہ میں ختم کردینا بھی شامل تھا۔ قضاۃ کے دستوری ادارہ نیز مسلم اوقاف کی ضبطی اور ان کی آمدنی سے چلتے ہوئے مدارس کے خاتمہ کی اسکیم۔

اب یہ الگ بات ہے کہ یہ مسایل وقت کے ساتھ ساتھ مختلف فیہ بھی بنتے چلے گئے سرسید علیہ الرحمہ اور مولانا قاسم نوتوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے قومی اکابر یا دیوبند اور علی گڑھ کے مابین جو نظریاتی اختلاف اور ذہنی کشمکش ملتی ہے وہ اسی کا شاخسانہ ہے اس پر بھی مولانا کے یہاں انگریز ہی سے بالواسطہ وبلا واسطہ اخذ واستفادہ کی گوناگوں اور متنوع مثالیں ملتی ہیں جو اس کا ثبوت ہے کہ اداراتی وابستگی کے باوصف مولانا کی نظر زمانہ کے بدلتے ہوے تقاضوں اور قوم کی نبض پر رہی۔ لیکن اس پر بھی تاریخی نظرداری اور تعبیری فکر فرمائی اس کی ضرورت تھی اور اس کے پس منظر میں مختلف طبقوں کی سماجی نفسیات کا رول رہا ہے اس کی طرف سے کلیتاً صرف نظر بھی مناسب نہ تھا

ایک اور مسئلہ بھی نقش حیات کی سیر میں ایک اہم موضوع فکر و خیال کی حیثیت میں سامنے آتا ہے اور وہ بدعت سے اباوانکار کا رویہ ہے جو دیوبندی مسلک کے عین مطابق ہے تاریخ جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے مختلف طبقوں اور قوموں کے تہذیبی و معاشرتی رویے اور ذہنی تقاضے ہمارے تہذیبی افکار و اقدار پر اپنا اثر ڈالتے رہے۔ مختلف تہذیبوں کی اور رنگا رنگ پرچھائیاں مسلم معاشرہ کے دل و دماغ پر بار بار اس کی طرح چھاتی رہی ہیں لیکن دین ودانش کے اصل سرچشموں کی طرف رجوع کے ساتھ، دینی نظام افکار و اقدار کو ہمارے علما کے اس طبقہ نے ہر طرح کی آمیزشوں سے پاک رکھنا ضروری سمجھا اور ان تمام رنگوں اور خوشبوؤں کو قبول کرنے سے انکار کیا جو ہماری تاریخ کا بہتا ہوا دریا" رہ آورد" کے طور پر اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھا تھا۔ مذہبی سطح پر اصلیت پسندی یا پیورٹن ازم کا یہ رویہ غیر صحیح نہ تھا اس کی اپنی افادیت اور معاشرتی اہمیت تھی اور ہے ـــــ مولانا نے

اپنے اداراتی مسلک کی پاسداری و پیروی میں اس سلسلہ میں جو کچھ کہا اور لکھا ہے وہ بہت کچھ واشگاف انداز میں ان کی زبان اور زبان قلم پر آیا ہے اس ضمن میں انھوں نے وہابیت اور دیوبند کے مکتب کے مابین اختلافات کو بے حد معقول دلائل کے ساتھ پیش کرنے کی سعی مشکور کی ہے لیکن مجھ ایسے ایک عام آدمی lay man کے لیے یہ بات زیادہ اہم ہے کہ مولانا کے یہاں لچک انداز کے باوصف کہیں بھی بے رحمانہ تنقید نہیں۔ دینی مسایل میں تلاش و تعبیر کی روشوں کو اگر وہ خلوص پر مبنی ہوں یوں بھی نظر کی سنگینی کے ساتھ دیکھا اور پرکھا بھی نہیں جاسکتا۔

ان اکابر کا متفق علیہ قول یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کے کسی قول اور عقیدہ میں سو احتمال ہوں جن میں سے ۹۹ احتمال کفر کے ہوں اور ایک احتمال بھی ایمان کا ہو تو اس کی تکفیر جائز نہیں

اس لیے بھی کہ بدلتے ہوے نظام فکر و عمل کا تعلق صرف تقلید روایت سے نہیں ہوتا بدلتے ہوئے تاریخی ماحول اور تہذیبی رشتوں سے بھی ہوتا ہے۔ مختلف طبقوں قوموں اور ملتوں کی مذہبی نفسیات سے بھی ان سب کو کسی ایک خانہ میں رکھ کر دیکھنا مشکل ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے ترجمۂ قرآن پاک کے دیباچہ میں بڑی حکیمانہ بات کہی ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانے کے مسلمانوں کے مسایل مختلف ہوتے ہیں۔ عقاید میں یکسانیت و ہم آہنگی کی بات الگ ہے لیکن عقاید کی رنگارنگی اور تعبیرات کی معنی آفرینی میں علم و حکمت، حرف و حکایت، ارادت و ارشاد، فہم و وہم اور عشق و عقیدت نہ جانے کتنے موثرات کو دخل ہے جن سے اثر و تاثر قومی، علاقائی اور طبقاتی زندگی میں قریب قریب ایک ناگزیر مرحلہ ہوتا ہے اور مسلک کی پاسداری کو بھی ہم کلیتاً معاشرتی تہذیبی سیاسی اور تاریخی عوامل سے الگ کر کے تو نہیں دیکھ سکتے۔

علمار مسایل دین اور آئین شرع مبین کے بعض پہلوؤں کی تعبیر و تشریح میں وہی کردار کرتے ہیں جو اصحاب صحیفہ و کتاب رسولوں کے مقابلہ میں انھیں کے سلسلہ کے

دوسرے انبیا انجام دیتے تھے۔ لیکن جب بات تعبیر و تفسیر اور تفقہ اور تفکر کے مرحلہ میں داخل ہوگی تو اختلاف تعبیر کی کوئی نہ کوئی صورت بھی ضرور پیدا ہوگی ایسی شکل میں ترجیح کا حق تو حاصل ہوگا اخراج محض کا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسوم کہنہ اور رواج عامہ کی مخالفت اصلاح و تربیت کے نظام کا ایک حصہ ہے۔ جس کی افادیت اور دینی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن ایک طرف تو بعض باتیں علم و حکمت کے دائرہ میں نہیں عشق و عقیدت کے دائرہ میں آتی ہیں اور اصل و فرع اور کلی اور جزئی کا جو فرق ہے وہ پابندی مسلک کے جذبے اور اس علمی فروغ کے لمحات میں نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے بات جواز کی نہیں مسایل و معاملات میں فیصلہ دہی کے وقت دل و نظر کی گنجایش کی ہے۔

مسلک و عقاید میں بعض فروعی اختلافات بھی کبھی بنیادی حقیقت اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے صدق و خلوص اور اپنے اختیار کردہ مسلک کی سچائی اور اچھائی پر یقین کرنے والے ایک دوسرے کی تردید، تفسیخ و تکفیر پر بھی زور دیتے نظر آتے ہیں۔ لیکن مولانا کے یہاں اس معاملہ میں بھی احتیاط و انضباط کا رویہ سامنے آتا ہے اور اس کی علمی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

ہمارے فقہ کے مسایل ائمہ اربعہ میں بھی دھنک کے رنگوں کا سا اختلاف ہے اور صوفیانہ سلسلوں میں مولانا مرحوم کے یہاں مختلف سلسلوں سے جو ہم رشتگی ملتی ہے وہ اس امر آشنائے حقیقت کے یہاں رواداری کی صورت میں بھی سامنے آتی ہے۔ اور مختلف ڈسپلن اور آرڈر سے متعلق طریق رسائی کے ساتھ وابستہ حقیقتوں کا سراغ لگانے کی کوشش سے ملی یہاں تک کہ مولانا مراقبہ قبور تک کے قایل نظر آتے ہیں۔

نقش حیات کا ایک اور اہم فکری پہلو کسی روحانی سلسلہ سے وابستگی اور کسی مرشد کامل کی جستجو ہے اور اس کا خصوصیت سے لایق ذکر مرید و مرشد کے مابین مزاج و مذاق کی مکمل ہم آہنگی ہے۔ عشق و عقیدت کے اس رمز کو روحانی رشتوں کی وسعت اور نشاندہ

کی بلندی سے وابستہ بھی دیکھا جا سکتا ہے اور اخلاقی تربیت کے طریقۂ کار سے بھی۔

راقم الحروف کے لیے اس روحانی سلسلۂ فکر وعمل سے عدم وابستگی کے ساتھ اس کے بارہ میں کچھ کہنا مشکل ہے لیکن مطالعہ کے دوران یہ بات بار بار ذہن میں آئی کہ مولانا نے فیوض وبرکات کا ذکر تو ایک سے زیادہ موقعوں پر کیا اور کیا بھی جانا چاہیے کہ وہی تو اس راہ سلوک کی سیر اور روحانی گل گشت کی خوشبوئیں اور دل آویز روشنیاں ہیں، لیکن تصرفات و کشف وکرامات پر اسرار کا ذکر نہیں کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ذہن و دل کے اس خطرے سے ہمیشہ باخبر رہے۔

مولانا کے یہاں ادراتی فکر اور بزرگوں کے مسلک کی پیروی کے نقوش کہیں واضح اور کہیں غیر واضح صورت میں ہیں لیکن مولانا کی تحریروں کے بین السطور ہی سے اور ان کے بہت سے جملوں اور فقروں سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن سے ہر مرحلہ میں نہ سہی لیکن جہاں کوئی اہم موڑ آتا ہے وہاں سوالیہ نشان قائم کرتا ہوا گزرتا ہے اپنی خاندانی دولت وثروت کے بارے میں وہ بزرگوں سے چلی آئی ہوئی روایات کو نقل کرنے کے بعد "واللہ اعلم" لکھنا نہیں بھولتے، جس کے معنی بھی ہیں کہ وہ ان امور میں شک کی گنجائش سے انکار کرنا ناپسند فرماتے تھے

مولانا کو اپنے اس دور کے خواب بہت عزیز ہیں اسی لیے انھوں نے اپنی روحانی زندگی کے ان دلچسپ تجربات اور سیر وسلوک کے ان کے مناظر ومرایا کو ایک زمانہ تک اپنے حافظہ وخیال میں محفوظ رکھا جبکہ خواب وخیال کے بر بھول بھلیاں وقت گذرنے پر فکر ونظر سے عام طور پر محو ہو جاتی ہیں۔ مثلاً انھوں نے دیکھا تھا کہ جس گولر کے درخت کے سایہ میں خانقاہ قدوسیہ میں قیام کے دوران انھوں نے مراقبہ وریاضت کے اوقات گذارے تھے عالم رویا میں اس کی ایک ٹہنی شاخ گل کی طرح اپنے ثمر خوش لذت کے ساتھ، بلندیوں سے ٹوٹ کر ان کے دامن مراد میں آپڑی ظاہر ہے کہ اس کی یہ تعبیر تھی اور

ہونی چاہیے کہ حضرت والا روحانی مرادات اور آسمانی فیوض و برکات سے کامیاب ہوں گے یا

آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ حدود حرم میں سوئے ہیں اور کوئی آپ کے پیروں کو دیکھ کر یہ کہہ رہا ہے کہ یہ پیر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ہیں اس کی یہ تعبیر بڑی دلچسپ اور معنی آفریں ہے کہ آپ اپنے سفر حیات میں پیروی سنت اور اسوۂ رسالت پر عامل رہیں گے۔ بایں ہمہ ان خوابوں کے بیان کے ساتھ جن میں سے یہاں صرف دو ہی کی طرف اشارہ کیا گیا آپ نے عالم خواب کے اس تجزیہ و تعبیر پر اپنی بات کو ختم کیا۔

"ان رویائے صالحہ پر کوئی یقین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اولاً یہی امر مشتبہ ہے کہ رویا منجملہ رویائے صالحہ ہیں بھی یا نہیں۔ اور اگر رویائے صالحہ میں سے ہو تو بھی اس کا من کل الوجوہ محفوظ رکھنا بھی مشتبہ ہے اگر محفوظ مانا بھی جائے تو تعبیر مشتبہ رہ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ بجز انبیا کسی کا خواب شریعت میں حجت نہیں۔

خود انبیا علیہم السلام کے معاملہ میں بھی کچھ ایسا ہوا ہے کہ انبیائے متقدمین کے یہاں خواب اور ندا کی روایت یا دوسرے لفظوں میں الہام غیبی کی یہ صورت زیادہ روشن رہی ہے لیکن قلب محمدی تک لاتے لاتے وحی والہام نے ایک دوسری شکل اختیار کر لی جس کی طرف اقرأ باسم ربك الذی خلق میں اشارہ ہے یا پھر جیسے ہم آیات بینات کے اس نورانی سلسلہ میں دیکھتے ہیں والنجم اذا ھوی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی روشنی میں علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے۔

بہت سے علمی اور مذہبی معاملات میں فیصلہ وہی ہے اگر اس رویہ کو سامنے رکھا جائے تو وہ عنصر باقی نہیں رہتا جس کی موجودگی میں بہت سے فیصلے مشکوک اور مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ اگر اس روشن نقطۂ فکر کو سامنے رکھا جائے تو بہت مختلف فیہ مسائل میں افہام و تفہیم کی راہیں زیادہ روشن اور نکتہ رس ذہن زیادہ شفاف ہو جائے گا۔

مولانا کی زندگی ایک بڑے معروف انسان کی زندگی تھی تعلیم و تدریس تلقین و ارشاد تہذیب و معاشرت کے مختلف دوائر میں تقسیم تھی اور ایک دائرہ دوسرے دائرہ سے یا تو ناقابل تقسیم صورت میں مربوط تھا۔ اس پر بھی یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا اور آج بھی یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ مولانا اتنی مصروفیات اور گوناگوں ذمہ داریوں کے ساتھ اس ماحول میں سانس لینے کے لیے کچھ وقت نکال لیتے تھے جسے گھر آنگن کی فضا کہا جاتا ہے اور جس سے وابستگی اور مولانا کے یہاں وابستگی ایک عجیب قسم کی محبت اپنا خلوص جذبۂ خدمت اور خوشبوئے وفا کا اظہار کرتی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا فضا سے متاثر ہوئے انھوں نے جن مسائل پر قلم اٹھایا اور جنھیں اپنی علمی اور تحقیقی گفتگو کا موضوع بنایا اس فضا کی تصویر کشی تو کیا اس کی فضا بندی کے لیے بھی شاید انھیں وقت ملا پھر بھی تعلق خاطر اور شفقت کا جذبہ بے اختیار ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور ان کی انسانی شخصیت ایک اور تابناک روپ اور اس کا حسن معصومیت مثال کے طور پر وہ موقع جہاں انھیں اتنا وقت گذرنے پر انھیں اپنا پہلا بچہ الطاف یاد آتا ہے وہ اس کی خوبصورتی اور ہونہاری کا ذکر کرنے لگتے ہیں اور اس وقت اس خیال کو بھی دہرا جاتے ہیں کہ اسے نذر لگ گئی تھی۔ جس کے بعد وہ کبھی تندرست نہ ہوا اور بہت جلد یہ معصوم پھول مرجھا گیا۔

نظر گذر کا تصور، فکر و خیال کی اس حیثیت کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں معاشرہ اپنے فہم و وہم کی دھوپ چھاؤں کے ساتھ زندگی اور ذہن کا وہ منظر پیش کرتا ہے جس کی جڑیں ہماری تہذیبی نفسیات کی تخفیفی زمین میں ہوئی نظر آتی ہیں۔ مولانا کی قومی زندگی کا سب سے بڑا مشن تحریک آزادی اور جذبۂ حریت کو عام کرنا تھا۔ وہ ایک بڑے محدث، فقیہ، صاحب نسبت بزرگ جس نے نصف صدی سے بھی زیادہ لمبے عرصہ تک اہل ارادت اور اصحاب تقوی و طہارت کی روحانی قیادت فرمائی ان کے دلوں کو اور حرص و ہوس کی دام انگنی ان کی روح کی روشنیوں کو بچانے کی سعی کی اس کے باوجود ان کے وقت کا ایک،

ایک بڑا حصہ تحریک آزادی کو فاتحانہ عزم اور ناقابل تسخیر جذبوں کے ساتھ آگے بڑھانے میں صرف ہوا۔ وہ انگریز دشمنی میں بہت پیش پیش تھے اور اس غیر ملکی استعمار کے خلاف جہاد کو اپنی میزان قدر میں بہت بڑا درجہ دیتے تھے ان کے یہاں وطنیت کے تصور کو بھی جارحانہ علاقائیت اور مفاد پسندانہ قوم پرستی سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا ان کے سامنے تو اس ملک کی تاریخ اور اس کی تہذیبی روایات سے وابستہ اس کا شاندار ماضی تھا۔

انھوں نے انگریزوں کے خلاف بہت کچھ کہا اور لکھا لیکن صرف باغیانہ انداز میں ان اسباب وعلل کے تذکرہ اور ان تاریخی حالات کے تجزیہ کے ساتھ جو ملک کی معاشرتی اور حقیقی تباہی کا باعث ہوتی تھی اور جن پالیسیوں نے ہندوستان کی قومی آزادی ہی سلب کی تھی اس کی ذہنی زندگی کو بھی تباہ کر دیا تھا

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

اس ضمن میں بڑی بات یہ ہے کہ مولانا کی نظر صرف قوم وملک سیاسی حکومی کی طرف نہیں گئی اس تاجرانہ لوٹ کھسوٹ اور صنعت کارانہ استحصال کی طرف جس نے ہندوستان کو تعلیمی تہذیبی فکری اور معیشی تباہی کے کنارے پر لاکر کھڑا کر دیا تھا۔ اسباب بغاوت اور تحریک آزادی عوامل ومحرکات کے طور پر مولانا کے تاریخی تجزے اور سند وبرہان کے لیے خود انگریز دائری کے حوالے وہ علمی طریق برساتے ہیں جس کے لیے طبقہ علما میں غیر معمولی انفرادیت اور امتیاز اور مولانا کی یہ اصابت تاریخی ژرف نگہی وہ دوررسی اس ولی اللہی طرز فکر کی یاد دلاتی ہے جس کے ساتھ اس حکیم مشرق نے اپنے تاریخی تجزیے میں مغلوں کے وسطی عہد کی معیشت اور صنعتوں کی درجہ بندی غیر رفاہی انداز نظر جاگیردارانہ معارف بیجا کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔

مولانا حسین احمد مدنی رح

اسلام کی اخلاقی حجت

مولانا اخلاق حسین قاسمی

دلی میں شیخ الاسلام سمینار منعقد ہو رہا ہے ، اس تقریب پر حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رہ کے بارے میں مختصر تاثرات پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں ۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ یہ سعادت صرف ہندوستان کے علمار اسلام کے حصہ میں آئی ہے کہ انھوں نے باطل اقتدار کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں قائدانہ طور پر حصہ لیا جبکہ دوسرے ملکوں میں آزادی اور انقلاب کی عوامی لہر سے علیحدگی اختیار کر کے وہاں کے علمار نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ۔ جیساکہ سمرقند اور بخارا کی مثال سے ظاہر ہوتا ہے ۔

ہندوستان کے علمار کرام میں بھی خصوصیت کے ساتھ یہ شرف وافتخار جماعت شیخ الہند (حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ) کے لئے مقدر تھا ۔ مولانا حسین احمد مدنی رہ اسی جماعت کے مجاہد کبیر تھے ۔

مولانا اشرف علی تھانوی رہ کا قول ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث میں عام علمار کے مقابلہ میں دو خصوصیتیں نمایاں ہوتی ہیں ۔

مولانا حسین احمد مدنی میں ہمت اور تواضع کی خصوصیات ہیں ۔

علم الاخلاق کے لحاظ سے ہمت اور تواضع دو متضاد صفتیں ہیں اور ان دونوں کا کسی ایک شخصیت میں جمع ہونا انسانی کسب وعمل سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ موہبت الٰہی سے تعلق رکھتا ہے۔

ہمت اور حوصلہ کی سرحدیں تکبر و نخوت سے ملتی ہیں، حوصلہ مند انسان کے اندر غرور کا پیدا ہو جانا ایک فطری امر معلوم ہوتا ہے، اسی طرح تواضع و خاکساری کی صفت سے انسان کے اندر عملی سستی پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔ لیکن جس شخصیت میں ہمت ہوگی مگر تکبر نہ ہو تواضع ہو مگر سستی اور عملی ضعف نہ ہو تو وہ شخصیت کسی کار خاص کے لئے خدا تعالیٰ کی قدرت کا عطیہ ہوتی ہے۔

مولانا مدنی کو میں نے اسلام کی اخلاقی حجت کہا ہے

مولانا حسین احمد مدنی نے تحریک حریت میں ایک سرگرم اور پرجوش قائد کی طرح حصہ لیا، مولانا اور مولانا کے رفقاء (جو اپنے عہد کے جلیل القدر محدث اور فقیہ تھے) کا سیاسی نظریہ مسلم اکثریت کے خلاف تھا۔

تقسیم کی سیاسی تحریک مذہب کے سہارے اور قرآن وحدیث کے غلط استعمال کی قوت سے چلائی جارہی تھی اور اس منافرت انگیز تحریک سے اسلام کی تصویر کو بگاڑا جارہا تھا یعنی قومی خوش حالی پر اسلام کے وقار کو قربان کیا جارہا تھا، اسلام کے نام پر اسلام کی عظیم ہستیوں کو مطعون کرنے کا مذموم اور ملعون جذبہ جوش مار رہا تھا، اسلام اور اسلامی اقدار کی روح سے خالی سیاسی قیادت اس پر اظہار فخر و مباہات کر رہی تھی کہ ہم نے مسلمانوں کو علماء کی قیادت سے نجات دلا دی۔ غیر مسلم حلقوں میں اسلام کو نفرت اور خون خرابے کا مذہب ظاہر کرنے کی کوشش کی جارہی تھی اور اس کا حاصل اس کے سوا کچھ نکلنے والا نہ تھا کہ چند افراد کو اقتدار کی اعلیٰ کرسیاں حاصل ہو جائیں اور سرمایہ دار مسلمانوں کو سرمایہ جمع کرنے اور شاہانہ عیش

وعشرت کی زندگی گذارنے کی کھلی آزادی مل جائے۔

علماء اور مشائخ طریقت نے جس سرزمین پر اسلامی اخلاق وآداب کی قوت سے اسلام پھیلایا اس سرزمین کو اسلام کے حق میں گرم کرنے اور مسلمانوں کیلئے نفرت اور بارود بچھانے کا کام یہ مٹھی بھر اصحاب مفاد انجام دے رہے تھے، یہ تحریک ملت اسلامیہ ہند کے حق میں مجموعی طور پر ایک بےمقصد تحریک تھی اور آج یہ حقیقت آنکھوں کے سامنے ہے۔

اس ماحول میں صوفیائے ربانی اور علمائے حق کی دعوتی اور تبلیغی روح کا تحفظ کرنا ان کے جانشین بزرگوں کا فرض تھا، اور اس فرض کو ادا کرنے میں جماعت شیخ الہند کے جس فرد جلیل نے نمایاں طور پر حصہ لیا وہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی تھے۔

مولانا مدنی نے تقسیم ملک (جو دراصل تقسیم ملت) کی تحریک تھی اسکا نہایت پرجوش طریقہ پر مقابلہ کیا ـــــ کہا جاتا ہے کہ قدرت کو یہی منظور تھا، لیکن قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کا اصول یہ ہے

نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی۔ قدرت اس راہ کے حوالہ کر دیتی ہے جس راہ پر انسان دوڑتا چلا جاتا ہے۔

(النساء ۱۱۵)

تقسیم پسندوں کو ان کا مقصود مل گیا، ملت اسلامیہ تین حصوں میں بٹ کر اب مزید ٹکڑوں میں تقسیم ہونے کے لئے پر تول رہی ہے

اقلیتی خطوں کے جن مسلمانوں نے اس تحریک کے لئے خون بہایا وہ آج چالیس سال کے بعد سر پکڑ کر رو رہے ہیں۔

جن مسلمانوں نے اپنا آبائی وطن نہ چھوڑا ـــ تقسیم کی بچھائی ہوئی بارود میں جھلستے رہے، انھیں دھوبی کا کتا، گھر کا نہ گھاٹ کا، قرار دیا گیا ـــــ لیکن آج مہاجر قومیت ـــ پانچویں قومیت ـــــ کے نعرہ نے ثابت کر دیا کہ دھوبی کا کتا کون ہے۔؟

وہ بڑے بڑے اہل قلم جنہوں نے تقسیم کے وقتی نشہ سے مسحور ہو کر مولانا مدنی اور ان کے رفقاء کو بدنام کیا آج وہ اپنے توبہ نامے شائع کر رہے ہیں۔

۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی جو تحریک پاکستان کے ذہنی اور نظریاتی قائد تھے ان کا توبہ نامہ چھپ چکا ہے۔

مسلم حکومت کے عہد میں مشائخ طریقت نے اخلاقی تربیت کے کام کو سنبھالا مسلم حکومت ہر دور میں خاندانی حکومت رہی۔ اسلامی حکومت نہیں رہی ــــ اسلامی حکومت کا مشن دولت وحشمت کا حصول نہیں ہوتا، بلکہ اسلام کی توسیع و اشاعت ہوتا ہے، اسلامی حکمراں ہر ہر قدم پر اس کا خیال رکھتے ہیں کہ بندگانِ خدا کے اندر اسلام کی محبت پیدا ہو، خاندانی حکمراں سیاسی اقتدار پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے نہ اسلام کی توسیع پر دھیان دیتے ہیں اور نہ اس کو اہمیت دیتے ہیں۔

مسلم حکومت کے ان مخالف اسلام اثرات کو دور کرنے کے لئے مشائخ ربانی نے دربار سے دور رہ کر عام انسانوں کی خدمت کو اپنا مشن بنائے رکھا اور دربار سے دور رہنے کی بناء پر مسلم بادشاہوں کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں برداشت کیں۔

غور سے دیکھا جائے تو مولانا حسین احمد مدنی اسی مشن کے علمبردار تھے، مولانا مدنیؒ نے سیاست کے خارزار میں کود کر اسلامی اخلاق و آداب کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بقول حضرت شیخ الہندؒ کا اپنے ایک مہمان ہندو بنیے کے پیر دبانا اور شیخ الہند کے جانشین مولانا مدنی کا کنور محمد اشرف بیرسٹر (کمیونسٹ لیڈر) کے پیر دبا کر انھیں اٹھانا معمولی واقعات نہیں ــــ بلکہ ایک خاص مشن کی نشاندہی ہے۔

آزادی کی تحریک اس اسلام دشمن قوم (انگریز) کے خلاف تھی جس کے ہاتھوں

اس وقت مسلم دنیا غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی اور جس قوم کے تہذیب (مغربی تہذیب) اسلام کی بیخ کنی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

مولانا مدنی کے دل میں اس اسلام دشمن مغربی طاقت کے خلاف شدید ترین غصہ ونفرت موجزن تھی اور اسی غصہ وجلال کا اظہار وہ آزادی ہند کے پلیٹ فارم سے کرتے تھے۔

اور اس کی سزا انگریز نواز حلقوں کی طرف سے توہین وتحقیر اور الزام تراشیوں کی صورت میں مولانا کو دی جاتی تھی ـــــ انگریزی حکومت بھی مولانا کو اپنے بدترین دشمن کے طور پر قید وبند کی مصیبتوں میں مبتلا کرتی تھی۔

یہ دوگونہ امتحان تھا جس میں وہ مرد غیور گرفتار تھا۔

مخالف مسلمانوں کے ہاتھ سے پہنچنے والی تکلیفوں کو وہ شریف وسید مومن خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتا تھا اور مسلمانوں کو معذور سمجھ کر ان کے حق میں ہدایت کی دعا کرتا تھا جو اسکے نبی کا اسوۂ حسنہ ہے۔

اور صبر وتحمل کا یہی اسوہ اسلام کی وہ اخلاقی حجت ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام اور صوفیائے حق کا مشن رہا ہے۔

شاعر مشرق علامہ اقبال نے جس سیاسی اصطلاح پر مولانا مدنی کے خلاف شعر کہے آج اسی شاعر اسلام کے صاحبزادے جاوید اقبال صاحب اپنے والد کے حوالوں سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ علامہ اقبال اس جمہوری حکومت کے قائل تھے جسمیں اسلامی اقدار (دیانت اور مساوات) کا دور دورہ ہو ـــــ وہ ایسی مذہبی اسٹیٹ کے حامی نہیں تھے جس کا مطالبہ پاکستان کے علماء مذہب کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔

تحریک آزادی کے دور میں ایک مذہبی جماعت نے اسلامی خلافت کا نعرہ لگایا اور اس تحریک میں وہ نظری شدت اور انتہا پسندی اختیار کی گئی کہ تحریک

آزادی میں حصہ لینے والوں کو طاغوت پرست کہا گیا اور خلافت الٰہیہ سے بہچنے ہر بات کو اسلام مخالف نظریہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔

وطن اور قوم کے الفاظ کو غیر اسلامی تصور کے دائرہ میں شامل کیا گیا، اور اس طرح بالواسطہ طور پر انگریز کی غلامی کا سہارا لگایا گیا۔

ایک مسلم خطہ وجود میں آگیا —— لیکن وہ خطہ مسلم حکومت سے آگے نہ بڑھ سکا، یہاں تک کہ عاجز آکر تحریک اسلامی کے قائدین نے اس نظام سے سمجھوتہ کرلیا جو ان کے اصول یعنی خالص اسلامی اصول پر طاغوتی نظام تھا

پھر اس شکست و ہزیمت کے لئے فقہ کی وہی اصطلاح (اہون البلیتین) استعمال کی گئی، جس اصطلاح پر فرار اور بزدلی کی پھبتی کسی گئی تھی۔

اس وقت وہ لوگ اصحاب عزیمت مجاہد تھے جو تحریک آزادی کے مصائب (قید و بند) سے محفوظ گوشۂ عافیت میں نظری بحثیں چھیڑ رہے تھے —— اور وہ لوگ طاغوت پرست تھے جو اسلام دشمن طاقت کے نشانہ پر تھے اور جیل کی تاریک کوٹھریوں میں تکلیفیں اٹھا رہے تھے۔

لیکن ایک دو صدی کے بعد نہیں نصف صدی کے اندر ہی یہ حقیقت کھل گئی کہ وہ خود فریبی تھی یا اغیار کی سازش جس میں جذباتی نعرہ بازی اور اسلام خالص کی آوازیں لگا کر تحریک آزادی کے مجاہدوں کو مطعون کرنا اور عام مسلمانوں میں ان کی مذہبی عظمت کو کم کرنے کی کوشش کرنا تھا۔

تقسیم پسند طبقہ جس ملت کو مردہ لاش سمجھ کر ہندوستان میں چھوڑ گیا تھا اس ملت کی نشاۃ ثانیہ کا سہرا جس جماعت کے سر ہے، مولانا مدنی اس جماعت کے امیر و امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے حکومت کے ایوان میں بیٹھ کر بہ آواز بلند کی کہ ہندوستانی

مسلمان ہندوستان کے باعزت اور برابر کے شہری ہیں اور ان کی ملی پہچان پندرہ سو برس کی زرّیں روایات کا ثمرہ ہے جسے۔۔آزاد ہندوستان میں ٹیڑھی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا ـــــ اور مولانا مدنی نے پیرانہ سالی کے باوجود آزاد ہندوستان کے کونہ کونہ میں پھر کر مسلمانان ہند کے اندر ملی غیرت وحمیت پیدا کی اور مولانا حفظ الرحمن، مولانا محمد میاں مولانا احمد سعید اور مفتی عتیق الرحمن اور دینی مدارس اور دینی خانقاہوں کے سیکڑوں علمار ومشائخ کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کر کے انھیں قیام امن وحفاظت کے میدان میں سرگرم جہاد رکھا۔

دینی تعلیم کے ادارے قائم کرائے اور ان کی سرپرستی فرمائی اور اپنے شاگردوں کو ان مدارس میں جم کر بیٹھنے کی تلقین کی۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کے نتیجہ میں انگریزی اقتدار سے نہ صرف ہند کو آزادی نصیب ہوئی بلکہ ملت اسلامیہ کے مظلوم حصے بھی برطانوی چنگل سے نکل گئے ہندوستان اگر متحد رہ کر آزاد ہوتا تو ملت اسلامیہ ہند آزاد ہندوستان میں ایک متحد اور مضبوط تاریخی طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ـــــ مگر اغیار نے سازش کر کے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک ایسی کش مکش میں مبتلا کر دیا ہے جس سے نکلنے کے ابھی تک آثار نظر نہیں آرہے۔

مولانا حسین احمد مدنی کی صدارت (دارالعلوم دیوبند) کا دور بڑا بابرکت تھا مولانا مدنی کی تعلیم وتربیت نے (۴۴۸۳) علمار وفضلار کی عظیم کھیپ دنیا کو عطا کی اور مولانا مدنی کا یہ عطیہ تمام مشائخ دارالعلوم سے زیادہ تھا ـــــ جو آج ہند و پاک کے دینی نظام کو چلانے میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔

ہمیں مولانا اسعد مدنی صاحب سے بحیثیت جانشین شیخ الاسلام کے بجا طور پر یہ توقع رکھنی چاہئے کہ وہ حضرت شیخ کے حقیقی مشن (اسلامی تعلیم ودعوت) پر پوری توجہ دیں گے اور دوسری مصروفیات پر اس جدوجہد کو مقدم رکھیں گے۔

بیتی باتیں

از:۔ مسعود حسن صدیقی

۱۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ تحریر نہ تو تحقیقی مقالہ ہے نہ ادبی شاہکار۔ یہ صرف ان باتوں کا سادہ الفاظ میں تذکرہ ہے جو میرے ساتھ یا میری موجودگی میں پیش آئیں اور جن سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے کسی گوشہ پر روشنی پڑتی ہے اور جو تحقیقی کام کرنیوالے حضرات کے کام آسکیں گی، جس زمانہ کی یہ باتیں ہیں اس زمانہ میں ہیں اور میرے ساتھی جن میں اکثریت میرے بزرگوں کی تھی عموماً علماء حضرات کا نام لیتے تھے اور جب صرف "مولانا" کہتے تھے تو مقصود حضرت شیخ الاسلامؒ ہوتے تھے۔ لہٰذا اس تحریر میں اِسی مناسبت اور اُسی محبت و عقیدت کے جذبہ سے حضرت شیخ الاسلامؒ کیلئے صرف لفظ "مولانا" ہی استعمال کروں گا۔

۲۔ آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کی بات ہے جب میں فیض عام ہائی اسکول میرٹھ میں پڑھتا تھا ایک دن صبح کو گھر سے نکلا تو جگہ بجگہ مسلمانوں کو "دیوبند کے مولانا حسین احمدؒ" کی تعریف میں رطب اللسان پایا۔ دریافت کرنے پر جو بات معلوم ہوئی وہ مختصر تمہید کے ساتھ اس طرح تھی کہ:۔

مدرسہ دار العلوم میرٹھ کے سالانہ اجلاس ہو رہے تھے اور اس وقت کے دستور کے مطابق اجلاس کی ایک نشست میں اپنے اپنے مذہب کی حقانیت پر ہندو، مسلم اور

عیسائی حضرات کی مقابلہ کی تقاریر ہوئیں۔ اور ان تقریروں میں دہلی کے پنڈت رام چندر کی تقریر سب سے زیادہ کامیاب رہی۔ پنڈت جی نے اس پر زور دیا تھا کہ ہندو دھرم فطری مذہب ہے اور اس میں گوشت کھانے کی ممانعت ہے جو ایک فطری امر ہے یعنی گوشت کھانا فطرت کے خلاف ہے۔ پنڈت جی کے دلائل کا مسلمان مقرر قابلِ اطمینان جواب نہ دے سکے اور وہ جلسہ اس طرح ختم ہوا کہ خود مسلمان حاضرین جلسہ بھی یہ سوچنے لگے کہ اس مناظرہ میں پنڈت جی جیت گئے۔ لہٰذا جلسہ کے منتظمین نے پنڈت جی کو دوسرے دن کیلئے بھی روک لیا، اور صبح سویرے ایک آدمی کو دیوبند بھیج کر مولانا حسین احمد صاحبؒ کو بلایا گیا، پنڈت جی سے دوبارہ تقریر کیلئے کہا گیا جسے پنڈت جی نے بخوشی قبول کر لیا، اس کے جواب میں مولانا نے جو تقریر کی اس سے پنڈت جی اتنے بوکھلائے کہ وہ درمیان تقریر میں ہی بھاگ کھڑے ہوئے، مسلمان بہت خوش ہوئے اور مولانا کا نام دوسرے دن ہر مسلمان کی زبان پر تھا، میرا دل چاہا کہ میں بھی مولانا سے ملوں، چنانچہ دارالعلوم گیا اور مولانا سے جو ایک کمرہ میں آرام کر رہے تھے سلام کے بعد مصافحہ کیا اور بیٹھ گیا مولانا نے نام پوچھا اور دریافت کیا کیسے آنا ہوا، میں نے کہا آپ سے ملنے آیا ہوں، فرمایا کہ باہر بہت سے علماء بیٹھے ہیں اُن سے ملئے، میں نے کہا آپ بڑے مولانا ہیں اور بزرگ ہیں، اس لئے آپ ہی سے ملنے آیا ہوں، فرمایا آپ نے مجھے بزرگ کیسے جانا، میں نے کہا سب کہتے ہیں، فرمایا کہ لوگوں کے کہنے کا اعتبار نہیں کرنا چاہیئے، آپ کو بہت لوگ ملیں گے جن کی لمبی داڑھیاں ہیں، عمامہ اور جبہ پہنتے ہیں اور لوگ ان کو بزرگ مانتے ہیں، لیکن وہ لوگ مسلمانوں کو دھوکہ دینے کیلئے بزرگوں کی شکل بناتے ہیں، آپ کو کیا معلوم کہ میں بھی ایسا ہی دھوکہ دینے والا شخص نہیں ہوں، آپ ابھی چھوٹے ہیں، بغیر تحقیقات کے کسی کو بزرگ نہیں مان لینا چاہیئے، یہ بات میرے ذہن میں جم گئی اور بالآخر اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ایک چھٹی کے دن صبح سویرے دیوبند کیلئے روانہ ہو گیا، اسٹیشن

سے دارالعلوم دیوبند کیلئے تانگہ لیا جوان دنوں دو آنہ میں ہو جاتا تھا، تانگہ والے نے پوچھا "کس کے یہاں جاؤ گے" میں نے مولانا کا نام لیا، کہنے لگا "بڑے مولوی جی کے ہاں"۔ میں نے تصدیق کی اور اس سے دریافت کیا کہ مولانا کیسے آدمی ہیں؟ اس نے راستہ بھر مولانا کی تعریف کی اور ایک مکان کے سامنے لیجاکر تانگہ روک دیا کہ "لیجئے۔ یہ ہے بڑے مولوی جی کا گھر"۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولانا دارالعلوم تشریف لے گئے ہیں۔ درو ملدم کے بالکل سامنے ایک پرانا مکان تھا جس کی مرمت ہو رہی تھی، میں نے پہلے مزدوروں سے اور پھر راج سے مولانا کے متعلق سوالات کئے۔ پھر چونکہ آگے کچھ نہ تھا واپس شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ لمبی سڑک دو رویہ دوکانیں، راستہ بھر دوکانداروں سے، طالب علم شکل کے نوجوانوں سے معمر لوگوں سے غرض جس سے بھی ممکن ہو سکا تحقیقات کی اور کوئی شخص ایسا نہ ملا جس نے مولانا کی برائی کی ہو۔ اب اتنی دور نکل آیا تھا کہ مولانا کے یہاں واپسی کے بجائے اسٹیشن کا رخ کیا۔ یہ بھی خیال تھا کہ اگر مولانا دریافت کریں گے کہ کیسے آنا ہوا تو کیا جواب دوں گا۔ لہٰذا میرٹھ واپس پہنچ گیا۔

۳ — کچھ عرصہ بعد ہم نے اپنے محلہ کے لڑکوں کی ایک انجمن قائم کی جس کا نام انجمن اطفال المسلمین رکھا۔ کچھ دنوں بعد اس کا نام تبدیل کر کے "انجمن مصلح الاطفال" رکھ دیا، میں اس کا ناظم تھا، دل چاہا کہ ایک بڑا جلسہ کیا جائے اور اس میں مولانا کو بلایا جائے چنانچہ ایک خط مولانا کو لکھدیا اور دعوت دیدی، مولانا تو ہم سے واقف نہیں تھے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو پوسٹ کارڈ کو ایک طرف ڈال دیتا اور جواب کی ضرورت بھی نہ سمجھتا اور بہت ہوتا تو انکار کر دیا جاتا لیکن قربان جایئے مولانا کے۔ انھوں نے میرٹھ کے ایک معروف مولوی صاحب کو خط لکھا کہ میرے پاس ایسا ایسا دعوت نامہ آیا ہے۔ میں تو جانتا نہیں۔ آپ بتایئے کہ یہ کون ہیں اور کیسے لوگ ہیں۔ جن صاحب سے دریافت کیا گیا تھا وہ ہم سے اور ہماری انجمن سے بخوبی واقف تھے، لیکن انھوں نے مولانا کو جواب دیا

کہ یہ مفتی واڑہ کے لڑکوں کی جماعت ہے، بچوں کا کھیل ہے، ان لوگوں نے مولانا محمد علی کو بھی اسی طرح بلایا تھا اور ان کی تذلیل ہوئی لہٰذا آپ تشریف نہ لائیں، اس پر مولانا نے فیض عام ہائی اسکول کے سیکنڈ ماسٹر (جس کو آج کل وائس پرنسپل کہتے ہیں) مولوی محمد فاضل صاحب مرحوم کو جو دیوبند ہی کے رہنے والے تھے خط لکھا کہ مفتی واڑہ میرٹھ کے لڑکوں کی ایک انجمن ہے مصلح الاطفال کے نام سے، اس نے مجھے اپنے جلسہ میں تقریر کرنے کیلئے بلایا ہے، فلاں مولوی صاحب کو میں نے لکھا تھا وہ کہتے ہیں بچوں کا کھیل ہے ساتھ ہی ان مولوی صاحب نے مولانا محمد علی کے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ تو بلند شہر سے متعلق تھا نہ کہ میرٹھ سے اور وہ لڑکوں کی انجمن نہیں تھی، آپ مجھے تحقیق کر کے لکھیں کہ کیا صورت ہے چنانچہ فاضل صاحب مرحوم نے مجھے بلایا اور اصل واقعہ دریافت کیا، میں نے صورت حال بیان کی، انھوں نے مجھ سے انجمن کے متعلق کاغذات طلب کئے، میں نے رجسٹر ممبران، رجسٹر آمد و خرچ، رسید بکیں، رجسٹر کارروائی جلسہ وغیرہ لیجا کر دکھائے، وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے مولانا کو لکھا کہ یہ انجمن لڑکوں کی ضرور ہے لیکن یہ لڑکے ہمت افزائی کے مستحق ہیں، مختصر یہ کہ مولانا تشریف لائے اور جامع مسجد میں اُن کی تقریر ہوئی، مولانا قاضی بشیر الدین صاحب قاضی شہر میرٹھ جو میرے دادا ہوتے تھے صدر جلسہ تھے، قاضی صاحب مرحوم سے جب میں نے صدارت کی درخواست کی تو انھوں نے شکایت کی کہ ان سے پہلے تذکرہ کیوں نہ کیا، میں نے عرض کیا "ڈر تھا کہ آپ منع نہ کر دیں کہ بچہ ہو، اتنے بڑے عالم کو کیوں بلاتے ہو"؟ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ باوجود اس بات کے کہ ہمارے خاندان کا تعلق علماء دیوبند سے قدیمی تھا، ہم نے مولانا کے قیام و طعام کا بندوبست بھی انجمن کے پیسہ سے علیحدہ کیا تھا مبادا بزرگوں کے درمیان میں آجانے سے ہماری حیثیت ثانوی نہ ہو جائے اور ہم مولانا سے قریب نہ ہو سکیں، انجمن کے کام میں میرے برابر کے شریک مفتی محمد طیب صاحب اور مفتی معظم علی صاحب مرحوم بھی تھے۔ مفتی محمد طیب صاحب

میرٹھ میں وکالت کرتے ہیں اور خاموش سوشل ورکر ہیں، اور بہت عرصہ تک فیض عام انٹر کالج کے سکریٹری رہے ہیں، آج کل حمیدیہ گرلز اسکول کے کرتا دھرتا ہیں۔ مولانا کے اس ایک فعل سے درجنوں لڑکے دیندار ہو گئے اور قوم کے خادم بن گئے۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔ اس کے بعد مولانا سے دلی تعلق ہو گیا اور مولانا بھی ہم پر شفقت فرمانے لگے، جب بھی میرٹھ تشریف لاتے مجھے یاد فرماتے اور سال میں ایک مرتبہ مدینہ کی کھجوروں کا تحفہ بھی بھیجتے جس کی اہمیت کا اندازہ آج نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد جب کالج میں داخلہ لیا تو انجمن کا نام بھی تبدیل کیا اور انجمن مصلح الاطفال سے وہ انجمن اصلاح المسلمین ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد مولانا بشیر احمد صاحب کٹھوری نے مشورہ دیا کہ انجمن کو توسیع دیکر بڑے پیمانے پر چلایا جائے چنانچہ انھوں نے علاوہ ان نوجوانوں کے جن کو ہم نے دعوتِ شرکت دی تھی میرٹھ کے ممتاز حضرات کو بھی دعوت دیدی۔ جب جلسہ ہوا تو اس میں پروفیسر محمود علی صاحب گرامی، محمد فاضل صاحب صدیقی، عقیل محمد صاحب وکیل، محمد یحییٰ صاحب تنہا وکیل، مولوی حبیب اللہ صاحب مولوی شوکت علی صاحب سبزواری، مولوی مشیت اللہ صاحب مدرسین مدرسہ ہائے عربی جیسے بزرگ اور سب سے بڑھ کر ہمارے سب کے بزرگ قاضی بشیر الدین صاحب قاضیٔ شہر موجود۔ ہم حیران رہ گئے۔ مولانا بشیر احمد صاحب کی تجویز پر یہ سب حضرات مجلس عاملہ کے رکن بنائے گئے۔ خود مولانا بشیر احمد صاحب کٹھوری مجلس عاملہ کے رکن تھے ہمارے استاد محمد فاضل صاحب صدیقی کو صدر منتخب کیا گیا۔ مجھے ناظم اور مفتی محمد طیب صاحب کو نائب ناظم بنا دیا گیا، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ مولانا کے فرمانے کے مطابق کیا گیا تھا، وہ نوجوان لڑکوں سے کام لینا چاہتے تھے، لہٰذا ان سب ہی بزرگوں نے مولانا کے فرمان کی تعمیل کی۔ اس انجمن اصلاح المسلمین نے جس میں میرٹھ کے سب ہی علماء اور بہت سے ممتاز انگریزی داں شریک ہی نہ تھے بلکہ مجلس عاملہ کے رکن بھی تھے۔

جس شان سے میرٹھ میں کام کیا ہے اس سے میرٹھ کے معمر حضرات اچھی طرح واقف ہیں۔ اسکے سالانہ جلسوں میں حضرت شیخ الاسلامؒ، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، مولانا احمد سعید صاحبؒ، مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ جیسے بزرگانِ دین کے علاوہ مشہور انگریز نومسلم ڈاکٹر خالد شیلڈریک نے بھی تقریر کی۔ بہرصورت یہ سب مولانا کی توجہ اور مولانا بشیر احمد صاحب کھوریؒ کی رہبری کے باعث ہوا ورنہ ان سب بزرگوں کے سامنے مجھ جیسے طالب علم کی کیا حیثیت تھی، میرے دوست اور عزیز مفتی محمد طیب صاحب اور حافظ برادران (حافظ حمید اللہ صاحب مرحوم اور حافظ حفیظ اللہ صاحب) برابر کے شریک کار تھے۔ میرے میرٹھ چھوڑنے کے بعد دوسرے ساتھیوں نے انجمن کا کام جاری رکھا، ان میں مولوی محمد مبین صاحب، مفتی عبدالخالق صاحب اور چودھری سجاد اللہ صاحب کا ذکر ضروری ہے لیکن افسوس کہ کچھ سال بعد یہ انجمن ختم ہو گئی لیکن مولانا کی توجہ سے اس انجمن کے ذریعہ بہت سے نوجوان دین سے قریب ہو گئے اور قوم کے خادم بنے۔

۵۔ غالباً ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ بہار کے ایک صاحب حج کیلئے پیدل روانہ ہوئے، ہر چار قدم پر دو رکعت نماز پڑھتے تھے اور ہر دو میل کے بعد منزل کرتے تھے، وہ میرٹھ سے بھی گذرے اور میرٹھ چھاؤنی میں ایک ملٹری کنڈیکٹر کے یہاں منزل کی، میرٹھ کے متعدد ذمہ دار اور ممتاز حضرات نے ان کی دعوت کی جس میں انھوں نے مجھے بھی بلایا، واقعہ طویل ہے لیکن مختصر یہ کہ ان صاحب سے میرٹھ کے سب ہی چھوٹے بڑے متاثر تھے لیکن میں ان سے متاثر نہ ہو سکا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر ان کو حج کا شوق ہے تو جلد سے جلد پہنچنے کی سعی کرنی چاہیئے تھی اور حرم شریف میں نمازیں پڑھتے، یہ سڑکوں پر نمازیں پڑھنے کا کیا مطلب ہے، تاہم میرٹھ چھوڑنے سے پہلے انھوں نے مجھ سے کہا کہ فجر کی نماز میرے ساتھ پڑھئے، فجر کے بعد میں اگلی منزل کیلئے روانہ ۔

ہوتا ہوں اور جانے سے پہلے آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، میں نے والدہ صاحبہ مرحومہ سے کہا کہ صبح مجھے ایسے وقت جگا دیں کہ فجر کی نماز لعل کرتی جاکر پڑھوں اور میں سو گیا میں نے خواب دیکھا کہ میرے ایک دوست مولوی مبین صاحب آئے اور مجھ سے کہا کہ ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں اور ان کا وعظ ہے، وہاں چلتے ہیں، چنانچہ ہم دونوں روانہ ہو گئے، راستہ میں ایک سرنگ پڑی جس میں دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے، اور طوائفیں بیٹھی ہوئی تھیں، ہم نے لوگوں سے مطلوبہ جگہ جانیکا دوسرا راستہ دریافت کیا، ہم سے کہا گیا کہ وہاں جانیکا بس یہی راستہ ہے چنانچہ ہم اسی راستہ سے روانہ ہوئے اور راستہ میں تھک کر ایک پلنگ پر سستانا پڑا، بالآخر جب جلسہ گاہ سے کچھ فاصلہ ہی پر تھے تو دیکھا کہ ایک صاحب (جوان پٹنہ والے صاحب کے بالکل مشابہ تھے) ناچ رہے ہیں اور گا رہے ہیں، ہمارے جلسہ گاہ پہنچنے سے قبل ہی جلسہ ختم ہو گیا، اور جو لوگ جلسہ گاہ سے واپس آرہے تھے سب تعریف کر رہے تھے کہ سبحان اللہ کیسا شاندار وعظ تھا اور ہم کو حیرت تھی کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں، چنانچہ واپس ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ واپسی میں راستہ وہ تھا جو لعل کرتی سے شہر آتا ہے، غرض کیا دیکھتے ہیں کہ مخالف سمت سے مولانا ایک تانگہ میں تشریف لا رہے ہیں، ہم نے سلام کیا، مولانا نے تانگہ رکوایا، مصافحہ کے بعد میں نے عرض کیا کہ ایک صاحب اس اس طرح حج کیلئے جا رہے ہیں، سب لوگ تعریف کرتے ہیں لیکن میرا دل نہیں مانتا، مجھے یہ اچھا نہیں لگتا، فرمایا جو آپ کا دل کہتا ہے وہی صحیح ہے اور تانگہ والے سے تانگہ چلانے کو فرمایا، آنکھ کھل گئی۔ والدہ صاحبہ مجھے جگا رہی تھیں اور مسجد سے اذان کی آواز آرہی تھی، چنانچہ ان صاحب سے ملنے میں نہیں گیا۔

اس کے چند ماہ بعد موانہ میں میرٹھ ضلع کانگریس کا اجلاس تھا اور مولانا شرکت کیلئے تشریف لائے، حافظ حمید اللہ صاحب، حافظ حفیظ اللہ صاحب اور میں مولانا کو اسٹیشن لینے گئے اور موانہ ساتھ گئے، موانہ سے واپسی پر راستہ میں مجھے شرارت سوجھی،

میں نے ان حاجی صاحب کا پورا واقعہ بیان کیا اور مولانا کی رائے دریافت کی خاموش سنتے رہے، جب میری بات ختم ہوئی تو فرمایا کہ دوبارہ کیوں دریافت کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ میں تو پہلی مرتبہ ہی دریافت کر رہا ہوں۔ فرمایا "اچھا جو آپ کا دل کہتا ہے وہی صحیح ہے" اور آنکھیں بند کرلیں، میں حیران رہ گیا کہ خواب کی بات کا مولانا کو علم تھا اور جواب میں الفاظ بھی وہی استعمال کئے جو خواب میں استعمال کئے تھے۔ اللہ اللہ کیا شان تھی اور کیا درجہ تھا۔ بعد میں اُن حاجی صاحب کے متعلق عجیب عجیب باتیں سنیں جن کا بیان لاحاصل ہے۔

۶۔ اسی زمانہ کے لگ بھگ مولانا بشیر احمد صاحب کٹھوری نے ایک دن انجمن اصلاح المسلمین کے جلسہ کے موقع پر فرمایا کہ میں بھٹہ کا کام چھوڑ رہا ہوں، بہت دن سے اس میں نقصان ہو رہا ہے، اب کوئی دوسرا کام کروں گا، دوسرے ماہ میٹنگ میں دریافت کرنے پر کہ دوسرا کون سا کام کرنے کا ارادہ ہے فرمایا کہ بھٹہ ہی لگاؤں گا، سب کو حیرت ہوئی اسلئے کہ مولانا بشیر احمد صاحب اپنا فیصلہ عام طور پر بدلا نہیں کرتے تھے چنانچہ جب اُن سے تبدیلیٔ رائے کا سبب دریافت کیا تو فرمانے لگے کہ مولانا سے میں نے عرض کیا تھا کہ میں بھٹہ کا کام چھوڑ رہا ہوں اسلئے کہ بہت دن سے نقصان ہو رہا ہے۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ آپ بھٹہ ہی کا کام کریں، اب اس میں انشاء اللہ نفع ہوگا، اس لئے میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا، مجھ جیسے بدعقیدہ لوگوں کو اس پر تعجب ہوا لیکن وقت نے بتایا کہ مولانا بشیر احمد صاحب کو اس کے بعد اسی کام میں پہلے سے زیادہ نفع ہوا۔

۷۔ مولانا اپنے متوسلین سے فرمایا کرتے تھے کہ ہر مسلمان کو ہمیشہ جہاد کیلئے تیار رہنا چاہیئے، اور جہاد کی نیت سے جو تیاری بھی حالات کے اعتبار سے ممکن ہو وہ کرتے رہنا چاہیئے، چنانچہ ایک دن انجمن اصلاح المسلمین کے جلسہ کے بعد تقریباً ایک بجے

رات کو فیض عام ہائی اسکول (جواب انٹر کالج ہے) کے ہوسٹل کے سامنے اپنے ہی مخصوص حضرات بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور مولانا ہدایات دے رہے تھے کہ جس سے جو ممکن ہو وہ کام جہاد کی نیت سے کرنا چاہیئے، اس میں لاٹھی چلانا، بنّوٹ، بندوق چلانا، تیرنا، پہلوانی وغیرہ کرنا شامل تھے۔ اس مختصر نشست میں حکیم محمد اسحاق صاحب کٹھوری بھی تشریف رکھتے تھے، حکیم صاحب سے مولانا کی بہت بے تکلفی تھی یہاں تک کہ بہت مرتبہ حکیم صاحب کی جیب سے زبردستی روپیہ نکال کر مٹھائی بھی منگا لیتے تھے، حکیم صاحب بہت سادہ مزاج بزرگ تھے، انھوں نے اس نشست کا تذکرہ ایک دوسری محفل میں کر دیا جہاں ایک ایسے صاحب بھی تشریف فرما تھے جو حکومتِ برطانیہ کی جاسوسی بھی کرتے تھے لیکن اس وقت تک اس کا کسی کو علم نہیں تھا، چنانچہ انھوں نے نمک مرچ لگا کر اس نشست کا تذکرہ کمشنر میرٹھ ڈویژن مسٹر پی، ڈبلو، مارش سے کر دیا اور سب لوگوں کے نام دیدئے، ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ گذری بازار کی اونچی مسجد میں ان لوگوں کو مولانا کی ہدایت پر بم بنانا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی اچانک ایک سی، آئی، ڈی والے صاحب جو مولانا کے بیحد معتقد تھے تشریف لائے اور اطلاع دی کہ کل صبح ان ان لوگوں کے یہاں تلاشی ہوگی اور اس کا پس منظر بھی بتایا، چنانچہ صبح سویرے ہی محلہ اندرکوٹ کے چاروں طرف مسلح پولیس نے گھیرا ڈال دیا اور تلاشیاں شروع کر دیں میرے پاس اور تو کیا ہوتا ضبط شدہ تحریروں کا ایک انبار تھا، چنانچہ اس سب کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس پر دل تو بہت دُکھا لیکن اس وقت اس کے علاوہ کوئی صورت بھی نظر نہ آئی۔ اس ریکارڈ میں پانچ سو علماء کا مشہور فتوٰی بھی تھا، اور قصہ خوانی بازار پشاور کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ بھی تھی۔ اسی طرح اور بہت سے اہم کاغذات تھے جن کے ضائع ہونے کا ابتک افسوس ہے اور یہ افسوس اسلئے اور زیادہ ہوا جب میرے گھر کی تلاشی بھی نہیں ہوئی بلکہ مولوی مسعود صاحب مدرس

مدرسہ اسلامیہ میرے ہم نام ہونے کے باعث چکّر میں آ گئے اور ان کے گھر کی تلاشی ہو گئی یہ بیچارے اس مجلس میں شریک بھی نہیں تھے۔

۸۔ اسی زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ میرٹھ میں آل انڈیا مسلم نیشنلسٹ کانفرنس ہوئی جس میں ہندوستان کے تمام مشہور مسلم قومی لیڈر جمع ہوئے، قدرتی طور پر مولانا بھی مدعو تھے اور انھوں نے شرکت کا وعدہ فرمایا تھا لیکن کانفرنس کے ایام میں وہ سخت بیمار ہو گئے اور چلنے پھرنے سے بھی معذور تھے، مولانا نے شرکت سے معذرت چاہی، اِدھر تمام لیڈر اور خاص کر ڈاکٹر سید محمود اِس پر مصر کہ مولانا کو کسی نہ کسی طرح ضرور بلایا جائے، چنانچہ مولانا سے کہا گیا کہ آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ کانفرنس میں شریک ہوں گے، لہٰذا اپنا وعدہ پورا کیجئے، مولانا تشریف لائے اور دو مضبوط طاقتور طالب علموں کے سہارے بمشکل اور انتہائی تکلیف کیساتھ اس طرح کہ ہر قدم پر چہرہ کا رنگ متغیر ہوتا تھا۔ یہ کیفیت دیکھی تو سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ سب ہی نے معذرت چاہی اور کہا ایسی تکلیف میں آپ کو نہیں آنا چاہیئے تھا، ہم کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ فرمایا میں نے تو آپ سے معافی چاہی تھی لیکن آپ نے معاف ہی نہیں کیا لہٰذا حاضر ہو گیا، یہ تھا ایفائے وعدہ۔ اس پوری تفصیل کے چشم دید گواہ مفتی محمد اشفاق صاحب میرٹھ میں موجود ہیں۔

۹۔ ہماری انجمن اصلاح المسلمین کا جلسہ تھا، جس رات مولانا کی تقریر تھی اسی دن مولانا کو جامع مسجد میرٹھ کے باہر کار سے اترتے وقت اطلاع دی گئی کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا انتقال ہو گیا، انا للہ پڑھا اور جلسہ میں تقریر سے پہلے اس حادثہ کا تذکرہ دلدوز انداز میں فرمایا اور حاضرین سے کہا کہ سب ڈاکٹر صاحب کی مغفرت کیلئے دعا کریں، چنانچہ مولانا کے ساتھ ہزاروں کے مجمع نے دعائے مغفرت کی، یہ بات غیر معمولی نہ ہوتی اگر ڈاکٹر سر محمد اقبال نے حضرت مولانا کے خلاف قومیت کے مسئلہ پر اتنے سخت الفاظ

استعمال نہ کئے ہوتے، اس سے حضرت مولانا کی وسعتِ قلبی کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۰۔ اس واقعہ سے ایک اور دعا بھی یاد آئی۔ قیام بلجیم کے زمانہ میں میں سخت بیمار رہا گو بیماری تو کئی ماہ رہی تقریباً ایک ماہ موت و زیست کے درمیان لٹکا رہا، میرٹھ اطلاع ہوئی تو میرے ماموں اور خسر قاضی محمد نعمان صاحب (جو دیوبند کے رہنے والے تھے) دیوبند گئے، مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا "حضرت! بھائی مسعود بیمار ہیں۔ ان کی صحت کیلئے دعا فرمائیں، دریافت کیا کون بھائی مسعود اور تمہارے کس بھائی کا نام مسعود ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ قاضی مسعود صاحب میرٹھ والے جو آج کل ہندوستانی سفارت خانہ بلجیم میں ہیں۔ دریافت فرمایا" وہ آپ کے کس رشتہ سے بھائی ہیں"۔ امام صاحب نے کہا پیر بھائی ہیں، پھر بیماری کی کیفیت دریافت کی اور معلوم ہونے پر دعاء کیلئے ہاتھ اٹھائے اور حاضرین مجلس سے فرمایا کہ آپ حضرات بھی میرے ساتھ قاضی مسعود صاحب کی صحت کیلئے دعا فرمائیں۔ بعد میرے ماموں کے خط سے یہ سب تفصیل معلوم ہوئی اور پھر اندازہ ہوا کہ اس دعا کے بعد ہی طبیعت صحت کی جانب مائل ہوئی، اس کو چاہے میری خوش عقیدگی پر محمول کر لیا جائے لیکن اس انداز سے دعا کرنا کم از کم یہ ضرور ظاہر کرتا ہے کہ اپنے نام لیواؤں سے ان کو کتنا تعلق تھا۔

۱۱۔ ایک مرتبہ میں مولانا سے ملنے دفتر جمعیۃ علماء ہند گیا، مولانا سامنے والے کمرہ میں جہاں قیام فرمایا کرتے تھے بیٹھے تھے اور بھی کئی حضرات تھے۔ اتنے میں مولانا حفظ الرحمان صاحب، مولانا محمد میاں صاحب اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب تشریف لائے، اور انھوں نے وہاں بیٹھے لوگوں سے فرمایا کہ کچھ مشورہ کرنا ہے۔ چنانچہ سب لوگ اٹھ کر جانے لگے میں بھی اٹھنے لگا، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا" قاضی صاحب آپ بیٹھے رہیں"۔ میں ٹھہر گیا، ان حضرات نے مولانا سے فرمایا کہ آپ قاری صاحب (مولانا قاری محمد طیب صاحب) کو پاکستان سے واپس بلانا چاہتے ہیں، مولانا نے فرمایا" جی ہاں"

ان تینوں حضرات نے اصرار کیساتھ بار بار کہا کہ ان کو واپس نہ بلائیں لیکن مولانا اپنی رائے پر قائم رہے۔ فرمایا کہ دارالعلوم کے مفاد میں ہیکہ وہ اس وقت واپس آئیں۔ بالآخر تینوں حضرات ناکام کمرہ سے چلے گئے اور مولانا نے اسی وقت اٹھ کر پنڈت جواہر لعل نہرو کو ٹیلیفون کیا، وقت لیا، خود تشریف لے گئے اور وزیر اعظم سے اُن کی واپسی کی منظوری لیکر آئے۔ (نوعمر حضرات کو شاید نہ معلوم ہو کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند پاکستان تشریف لیگئے تھے اور مستقل قیام کے ارادہ سے گئے تھے) لیکن حالات ناساز گار پاکر وہاں پریشان تھے اور واپس آنا چاہتے تھے مگر قانوناً آ نہیں سکتے تھے) چنانچہ قاری صاحب کو واپس بلایا گیا اور دارالعلوم دیوبند کا اہتمام پھر ان کو سپرد کر دیا گیا، اس واقعہ سے مولانا کے انتہائی خلوص وللّٰہیت کا اندازہ وہ حضرات کر سکتے ہیں جنھیں دارالعلوم کے اس وقت کے حالات کا علم ہے۔

۱۲ - ختم کرنے سے پہلے ایک واقعہ اور عرض کر دوں، میرا خاندان مذہبی تھا میرے قریبی بزرگ سب داڑھی رکھتے تھے، گھر سے باہر بھی مجھے دینی ماحول ملا، اسلئے داڑھی میں نے کبھی نہیں منڈائی لیکن چونکہ کلّوں پر گِنے چُنے بال نکلتے تھے اس لئے ان کو کاٹ دیتا تھا اور داڑھی صرف ٹھوڑی پر تھی، بیعت کی درخواست کی تو صرف یہ فرمایا کہ داڑھی رکھ لیں گے، میں نے کہا جی ہاں، لیکن ہوتا یہ تھا کہ جب بال بڑھے تو بے تکے۔ اسلئے انھیں پھر کاٹ دیتا، بار بار داڑھی پر اصرار اور باوجود اقرار کے پھر چھوٹی ہو جاتی، آخر ایک دن جامع مسجد سے دفتر جمعیۃ علماء جانے کیلئے تانگہ میں سوار ہوئے، ساتھ میں مولانا بشیر احمد صاحب کٹھوری تھے، انھوں نے مجھ سے فرمایا "قاضی صاحب دفتر چلیں گے"۔ میں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا تو آئیے بیٹھ جائیے، میرا ایک قدم تانگہ پر اور ایک نیچے کہ مولانا نے فرمایا "آپ میرے ساتھ نہیں بیٹھیں گے"۔ مولانا بشیر احمد صاحب نے مولانا کی طرف دیکھا تو فرمایا جب میرا کہنا نہیں مانتے اور داڑھی نہیں رکھتے تو میرے ساتھ کیوں؟ اور تانگہ والے

نے کہا چلو، اس وقت بہت سے حضرات موجود تھے، اور میرے ساتھ پہلی بار ایسا معاملہ ہوا، مجھے بُرا بھی لگا اور شرمندگی بھی ہوئی، چنانچہ گھر کی جانب روانہ ہوگیا، پھر خیال آیا کہ اگر اس وقت نہ گیا تو پھر کبھی جانا نہیں ہوگا، اسی شش و پنج میں کئی بار دفتر جمعیۃ کی جانب چلا اور کئی بار گھر کی طرف چلا، بالآخر دفتر چلا ہی گیا، دفتر جاکر معلوم ہوا کہ مولانا اسٹیشن چلے گئے، اسٹیشن گیا، ٹرین میں تلاش کیا اور اس ڈبہ میں جس میں مولانا قیام پذیر تھے پہنچ کر سلام کیا، فرمایا "آپ تشریف لے آئے" اور اپنے سامنے کی جگہ پر اشارہ کرکے فرمایا کہ یہاں بیٹھئے، میں بیٹھ گیا، ساتھ میں جانیوالے ایک صاحب سے فرمایا کہ پانی دیجئے، انھوں نے صراحی میں سے پانی دیا، اس میں سے مولانا نے تھوڑا سا پانی پیا، باقی میرے آگے بڑھایا بہت سے ہاتھ آگے بڑھے، سختی سے فرمایا کہ میں آپ کو نہیں دے رہا اور ہاتھ کھینچ لیا جب سب ہاتھ ہٹ گئے تو پھر میری جانب بڑھا کر فرمایا لیجئے یہ پیجئے، میں نے لیکر پانی پی لیا، اس پانی کا پینا تھا کہ ایک عجیب قسم کا سکون محسوس ہوا اور طبیعت نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ داڑھی جیسی بھی نکلے پوری رکھنی ہے، اس کے بعد کبھی طبیعت میں ڈگدہ نہیں پیدا ہوا۔ مجھ جیسے بدعقیدہ آدمی کو بھی اس پانی کے غیر معمولی اثر کو قبول کرنا پڑا، اللہ اللہ کیا عجیب شخصیت تھی۔

میں نے صرف وہ چند باتیں عرض کی ہیں جن میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی سبق ہے اور جو کسی نہ کسی اچھے عمل کی جانب راغب کرنیوالی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

آخر میں درخواست ہے کہ جو صاحب اسے پڑھیں وہ میرے لئے رضائے مولیٰ کی اور حضرت شیخ الاسلامؒ کیلئے اعلیٰ سے اعلیٰ درجات کی دعا فرمائیں۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

مولانا نجم الدین اصلاحی

اپنے استاذ ترجمان القرآن حضرت مولانا حمید الدین فراہی صاحب تفسیر نظام القرآن رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے یہ شعر میں نے سنا تھا ؎

پوچھنی تھیں ہمیں بھی کچھ باتیں　　کاش ملتا جو مرد کامل ایک

ناچیز تھوڑے سے تصرف کے ساتھ یوں پڑھا کرتا ہے ؎

پوچھ لیں ہم نے کام کی باتیں　　مل گیا ہم کو مرد کامل ایک

اپنے دور کے مرد کامل حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ وعلی اتباعہ الی یوم الدین۔ جن کی یادگار میں دہلی کے اندر ابھی ماضی قریب میں عظیم الشان سمینار ہوا اور خوب ہوا، باوجود متعدد دعوت ناموں، احباب کے اصرار اور بزرگوں کے حکم کے عمر کی زیادتی اور غیر معمولی ضعف کی بنا پر حاضری کی سعادت سے محروم رہا۔ بقول میر مرحوم ؎

سُبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے ٭ دست کوتاہ تا سبو نہ گیا

سمینار کے کنوینر ڈاکٹر رشید الوحیدی پروفیسر جامعہ ملیہ دلّی اور با صلاحیت فاضل دیوبند ناچیز سے بہت قریب اور مانوس ہیں موصوف کا والا نامہ مورخہ ۲۰؍ مارچ ۸۸ئ؁ سیمنار کی مختصر روداد کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ ناچیز اپنی حرماں نصیبی پر کچھ دیر...... ڈاکٹر صاحب کے والا نامہ کے آخری فقروں کو اب نمبر ہے

تمام مقالوں کے مرتب کرنے کا ــــ جناب سے گذارش ہے کہ کچھ عنایت فرمادیں تاکہ شامل کروں۔ اچھا بھائی شامل کرلیجئے کیونکہ اب بزم میں اہل نظر اور تماشائی بھی نہیں رہے کہ........ حالانکہ اگر حضرت مدنی رحمہ اللہ کے سیمنار میں بقول شاعر سر کے بل بھی جانا ہوتا تو صحیح معنوں میں حق ادا نہ ہوتا ؎

لو جئتکو قاصداً اسعیٰ علیٰ بصری

لم اقض حقاً وای الحق ادیت

رحلت مدنیؒ پر جن بزرگوں اور احباب نے مجھ کو تعزیتی خطوط لکھے ان میں فراہی درس قرآن کے ساتھی اور تدبر قرآن جیسی معرکۃ الآرا تفسیر کے مصنف اور فہم قرآن کے معلم بھائی مولانا امین احسن کا والا نامہ اس مضمون کا آیا۔

برادر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بھائی مولانا مدنی کو دیکھ لیا تھا، اس لئے میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہنے کی ہمت کر رہا ہوں کہ مولانا مدنیؒ اپنی سیرت، اخلاق اور کردار میں اتنے بلند اور اونچے تھے کہ پورے ہندو پاک بلکہ عالم اسلامی میں شاید ہی کوئی ان کا مثنیٰ رہا ہو۔ اگر خدا نے فرصت اور توفیق بخشی تو اپنے استاد مولانا فراہیؒ اور مولانا مدنی پر جن سے مجھکو دلی عقیدت ہے اپنے تاثرات پیش کروں گا۔ اس سیرت اور کردار کا عالم دیکھنے میں نہیں آیا۔

موقع کی مناسبت سے اپنا ایک واقعہ بھی سنا دینا چاہتا ہوں، چند سال کا عرصہ ہوا کہ راقم الحروف کو تکیہ رائے بریلی جانے کا اتفاق ہوا کیونکہ میرے آباء واجداد کو نسبت بیعت وارادت اسی خانوادہ قطبیہ سے تھی ۲-۳ دن قیام رہا اور مولانا علی ندوی زاد شرفہم نے مہمان نوازی کا حق ادا کردیا، جب رخصت ہونے لگا تو میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ مولانا نجم الدین اصلاحی میں نے یہ بات اب تک کسی سے

نہیں کہی تھی، تم سے کہہ رہا ہوں کہ اگر سید احمد بریلوی قدس سرہ کا کوئی مثنیٰ تھا تو وہ مولانا حسین احمد مدنی تھے، مولانا مدنی کا کانگریس سے تعلق رکھنا ان کے تہجد سے کم نہ تھا، میرے ساتھ مولانا عبدالقدوس اصلاحی مدرس مولانا آزاد تعلیمی مرکز اس جگہ تھے، میں نے ان سے کہا کہ گواہ رہو اور پھر میں نے مولانا علی میاں ندوی زید مجدہم سے عرض کیا کہ اس کی تشریح آپ کو کرنی ہوگی چنانچہ مولانا مدنی رحؒ کے وصال پر آپ نے مفصل مضمون میں اس اہم مسئلہ کو بیانی کر دیا ہے جو سیرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ میں ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے، میں تو علی وجہ البصیرت یہ اعتقاد رکھتا اور برملا کہا کرتا ہوں کہ امام الہند مولانا آزاد، استاد امام مولانا فراہی اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہم اللہ کا بھی کوئی اور ہند و پاک میں مثنیٰ نہیں تھا عالم اسلامی میں رہا ہو تو خدا ہی جانے

قدرت کا انتقام

ہم نے اس صدی میں جو سب سے بڑا گناہ کیا ہے کہ ہم نے اپنی بڑی بہترین شخصیتوں کی جو صاحب دل بھی تھے، اور صاحب دماغ بھی ناقدری بلکہ تذلیل کی آج افق تا بہ افق نظر دوڑایئے اور قدرت کا خاموش انتقام دیکھئے نہ کوئی اسیر مالٹہ محمود حسن نہ امام الہند مولانا آزاد اور نہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نظر آتا ہے، حالانکہ ملتوں کے لئے متاع تفکر اور صالح قیادت سب سے بڑی نعمت ہوتی ہے اس سے ہم نے خدانے نہیں اپنے آپ کو محروم کر لیا، حیات رفتہ اور دولت گم شدہ اب واپس نہیں آسکتی جب تک علم و عمل کی راہ پر ہمارا کارواں چل نہیں پڑتا۔

سیرت و کردار کی دین میں اہمیت

سیرت و کردار کا معاملہ بڑے عزم و جزم اور ریاضت کا محتاج ہوتا ہے

جہاں تک ظاہری عقائد و عبادات کا تعلق ہے ان کو نباہنے والے تو دین کے

زوال اور انحطاط کے بعد بھی بہت سے نکل آتے ہیں، لیکن کردار جو مغز دین اور روح دین ہے اس کا اہتمام بڑے بڑوں کے اندر بھی نہیں پایا جاتا، اہل مذاہب میں یہ کمزوری بہت نمایاں رہی ہے کہ انھوں نے عقائد و عبادات کے خاطر بڑے بڑے معرکے اٹھائے ہیں، لیکن کردار کی تعمیر پر بہت کم توجہ کی ہے، چونکہ اس امت مرحومہ کی رہنمائی بذریعہ بر و تقویٰ کی گئی ہے اس وجہ سے کردار کے پہلو پر خاص زور قرآن حکیم اور ارشاد نبی کریم نے فرمائی ہے کہ یہ مقام بر و تقویٰ بغیر اعلیٰ کردار کے جن میں ایفائے عہد اور صبر کو اولین اہمیت حاصل ہے۔ حاصل نہیں ہو سکتا ہے حالانکہ تمام عقائد و عبادات سے اصل مقصود اعلیٰ سیرت و کردار کی تعمیر ہی ہے اللہ و رسول پر ایمان لانے اور نماز روزے کے اہتمام سے مقصد صرف چند باتوں کو مان لینا یا چند رسموں کو مان لینا ہی تو نہیں ہے، ان کا اصل مقصود تو یہ ہے کہ اللہ و رسول پر ایمان لانے سے انسان کے اندر جو روشنی پیدا ہوتی ہے اس سے ہمارے دل جگمگا اٹھیں اور نماز روزے سے جو مضبوط انفرادی و اجتماعی کردار پیدا ہوتا ہے وہ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کی خصوصیت بن جائے، یہ نہ ہو تو تمام عقائد و عبادات سمجھئے کہ بالکل بے جان اور بے روح ہیں، یہی وہ راز قرآنی ہے کہ ہر جگہ عقائد و عبادات کی طرف توجہ دلائی ہے تاکہ اس سے غفلت نہ ہونے پائے، چونکہ امتحان و آزمائش کا اصلی میدان کردار اور سیرت ہی کا میدان ہے انسان کا اصلی خزانہ جو وہ دین کی مدد سے حاصل کرتا ہے یا کر سکتا ہے مضبوط و پاکیزہ سیرت ہی ہے، یہی چیز اس کو انفرادی زندگی میں بھی ہر مقام و تقویٰ پر سرفراز کرتی ہے اور اجتماعی زندگی بھی اس کے لئے ابرار، صالحین شہدار و صدیقین کی صحبت کی ضامن بنتی ہے، لہٰذا اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے کہ مسلمان ہر قسم کی آزمائشوں اور ہر طرح کے فتنوں میں اپنے اس خزانہ کی حفاظت کیلئے چوکنا

رہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے اجزائے سیرت وکردار میں صبر اور ایفائے عہد کو بمنزلۂ شیرازہ کے قرار دیا، ایفائے عہد کے اندر تمام چھوٹے بڑے حقوق و فرائض آجاتے ہیں، خواہ وہ خلق سے متعلق ہوں یا خالق سے، خواہ وہ کسی تحریری معاہدہ سے وجود میں آتے ہوں یا کسی نسبت، تعلق رشتہ داری اور قرابت سے، خواہ ان کا اظہار واعلان ہوتا ہو، اللہ و رسول، ماں اور باپ، بیوی و بچے، خویش و اقارب، کنبہ و خاندان، پڑوسی اور اہل محلہ، استاد اور شاگرد، نوکر اور آقا، ملک اور قوم ہر ایک کے ساتھ ہم کسی نہ کسی ظاہری یا مخفی معاہدہ کے تحت بندھے ہوئے ہیں، بر اور تقویٰ کا لازمی تقاضہ ہے کہ ان تمام مجاہدوں کے حقوق ادا کرنے والے بنیں گویا ایفائے عہد کی اصلی روح ایفائے حقوق ہے اور ایفائے حقوق انسان کے تمام چھوٹے بڑے فرائض کو محیط ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے ساتھ صبر کی صفت کو جمع کرکے یہ واضح فرما دیا کہ ہر وہ مزاحمت جو ایفائے حقوق کی اس راہ میں حائل ہو مومن اور مردِ کامل، عزیمت و استقامت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرے اور کسی حال میں بھی طمع، پست ہمتی اور خوف سے مغلوب ہو، کیونکہ انسان کا عزم انھیں راہوں سے آزمائش میں پڑ سکتا ہے، پس اگر کوئی مرد کامل ان حالتوں میں موقف حق پر ثابت قدم رہنے میں کامیاب ہو جائے تو اسکے بر و تقویٰ کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے؟

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی فداہ ابی و امی ان علمائے حق میں سے تھے "لم ترَ العیون مثلہ ولم یرَ ہو مثل نفسہ" یعنی آپ ان وفا پرستوں میں سے تھے کہ جو عہد کر لیا تو وہ خواہ کچھ بھی ہو اس کے سبب انھیں کیسے ہی تکالیف اور نقصانات سے دوچار ہونا کیوں نہ پڑے لیکن اس نے پیٹھ نہیں دکھائی بلکہ جان کی بازی لگا کر اس کو پورا کیا، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا

جنگ آزادی میں جو منفرد کارنامہ تھا وہ پوری تاریخ آزادی ہند میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ اپنے افران اور اراشیل میں تعلق مع اللہ کی غیر مرئی طاقت کے بل بوتے پر اعلاء کلمۃ اللہ کے ہر محاذ پر ڈٹ گئے اور اپنی متحرک زندگی سے ثابت کر دیا کہ مسلمان دین سے ہٹ کر دنیا بھی نہیں پا سکتا اور نہ کبھی اس نے پائی ہے، اسلام کی یہی منطق ہے۔ ؎

گر مہر خدا است بر خاتم دل
عالم ہمہ در زیر نگینت بہ دہند
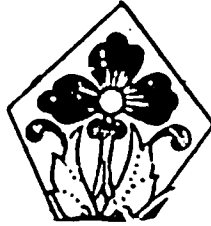
سیاسی شعور

از ــــــــــــــ ڈاکٹر سید عبد الباری

۔ اگر لارڈ ریڈنگ اسلئے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کو جلادیں، حدیث شریف کو مٹادیں اور کتب فقہ کو برباد کردیں تو سب سے پہلے اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں۔

یہ تھی وہ صدائے خارا شگاف جو برطانوی استعمار کے خلاف خالق دینا ہال کراچی کے اندر عین انگریز حکومت کے مجسٹریٹ کے روبرو بلند ہوئی تھی جہاں مولانا حسین احمد مدنی کو دیگر چھ رہنماؤں کے ساتھ گرفتار کرکے اس الزام کے ساتھ عدالت کے روبرو پیش کیا گیا تھا کہ انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف ترک موالات کا ملک و ملت کو پیغام دیا تھا اور انھیں الفاظ پر شیخ الاسلام نے اپنے بیان کو ختم کیا تھا۔ اس جملہ کا یہ اثر تھا کہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے بے ساختہ آگے بڑھ کر شیخ وقت کی قدم بوسی کی اور پھر ہندوستان کے

کوچے کوچے میں یہ نغمہ گونج اٹھا تھا ؎

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی ٭ ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
تم کو محلوں میں رہنا مبارک ٭ تم کو تکیے مسہری مبارک
ہم کو مٹی پہ سونا مبارک ٭ ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

اپنے مشفق استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ساتھ مالٹا میں ایک طویل ایام اسیری گذارنے کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھے ہوئے ابھی کچھ ہی مدت گذری تھی کہ پھر شیخ الاسلام کو پیغام اسیری آ پہنچا اور یہ سلسلہ آزادی ہند تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا۔ برصغیر کی اس صدی کی نصف اوّل کی تاریخ میں طبقۂ علماء میں جن چند ہستیوں کو کبھی اس تاریخ ساز کارنامے کی وجہ سے فراموش نہ کیا جا سکے گا کہ انھوں نے مسلمانوں کو بے عملی دبے حسی کی دھند سے نکال کر حکومت و مملکت کے مسائل سے دلچسپی لینے اور امامت و قیادت کا خواب دیکھنے اور مذہب و سیاست کے درمیان ٹوٹے ہوئے رشتے کو بحال کرنے کی کوشش کی، ان میں شیخ الاسلام کا نام صف اول میں نظر آتا ہے۔

قدیم نصاب تعلیم اور خالص مذہبی نظام تربیت کے سانچے میں ڈھلا ہوا یہ پیکر زہد و تقویٰ جس کی رگ رگ میں مشرق کی تمام تابندہ روایات اور تہذیبی اقدار کا لہو دوڑ رہا تھا، اور جس نے خالص مذہبی ماحول میں اپنے دور کے ثقہ ترین اور تقدس مآب افراد سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی اور جس کے اندر عجم کا رنگ طبیعت اور عرب کا سوز دروں دونوں پوری دل کشی کے ساتھ موجود تھا اپنے عہد کے علماء و مشائخ کی صفوں میں بعض مخصوص اوصاف کی وجہ سے سب سے نمایاں و ممتاز ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ قرار دی جائے گی کہ اس نے

شاہ ولی اللہ کی اس تابناک روایت کا چراغ جسے اس کے اسلاف نے اپنے خون جگر سے روشن کیا تھا بجھنے نہیں دیا کہ مذہب کو ریاست کے امور مملکت کے مسائل سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اور اسلام ایک ایسا نظام حیات ہے جو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے جملہ شعبوں میں مکمل رہنمائی کرتا ہے اور زندگی کے کسی گوشہ کو مذہب کے دائرہ اطاعت سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مسلمان جس ملک میں رہتا ہے، جس معاشرہ میں آنکھیں کھولتا ہے اور جس خاندان کے آغوش میں تربیت حاصل کرتا ہے اس کے مسائل اور اس کی ذمہ داریوں سے اس کے دکھ اور اس کے کرب سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے شعور کی آنکھیں ایک ایسے ہنگامہ پرور دور میں کھولیں جو نہ صرف اس برصغیر کی تاریخ میں بلکہ ایشیا اور افریقہ کی تاریخ میں بے حد انقلاب آفریں دور تھا۔ اس صدی کے ربع اول میں مسلمانوں کا سیاسی و اجتماعی زوال اور تہذیبی اختلال اپنی آخری حدوں تک پہنچ گیا تھا، ایک طرف ترکمان سخت کوش خاک و خون میں مل رہا تھا اور پہلی جنگ عظیم کے بعد دول یورپ سلطنت عثمانیہ کی تکا بوٹی کر رہے تھے، دوسری طرف حرم مقدس میں شریف مکہ کی ریشہ دوانیاں جاری تھیں اور کھلے بندوں ناموس دین مصطفٰے کا سودا انگریز سامریوں کے ہاتھوں کر رہا تھا اور تیسری طرف ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا دل وطن سے باہر طرابلس و بلقان کے خونچکاں واقعات سے تڑپ رہا تھا اور وطن کے اندر تقسیم بنگال کی منسوخی، مہاسبھا و آریہ سماج کی شدھی و سنگھٹن کی تحریکوں، مسجد کانپور کے ایک حصے کے انہدام اور پھر جلیانوالا باغ کے خوفناک واقعات سے لرزاں و ترساں تھا۔ پوری ملت ڈوبے ہوئے تاروں کے ماتم میں یا پھر شکستہ آرزوؤں اور خونچکاں حسرتوں کے ماتم میں مصروف تھی، کسی

طرف سے امید و آرزو کی کوئی کرن پھوٹتی نظر نہیں آتی تھی، اس نازک مرحلہ میں مشیت الٰہی نے ملت کو ایک نیا ولولہ سفر عطا کرنے کے لئے ایک نہیں کئی کئی چراغ روشن کردیئے، ایک طرف ابوالکلام کی نوائے سینہ تاب بلند ہوئی، دوسری طرف علی برادران کی سیماب پا اور زلزلہ شخصیت سامنے آئیں جیسے پر جوش پہاڑی ندی بہہ رہی ہو یا کوئی آندھی گھن گرج کے ساتھ آرہی ہو، تیسری طرف حکیم مشرق علامہ اقبال نمودار ہوئے اور عالم اسلام کو اتحاد کا پیغام اور ایشیا کے مظلوم انسانوں کو درس خودی دیا اور نہایت خود اعتمادی کے ساتھ یہ پیغام دیا ؎

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

ان سب چراغوں کے علاوہ علمائے ملت کی انجمن میں ایک اور انوکھا چراغ روشن تھا، وہ اگرچہ ہندوستان کے ایک گوشہ میں جل اور پگھل رہا تھا مگر اس کی روشنی پورے عالم اسلام میں پھیل رہی تھی، وہ اپنے عہد کی تاریخ کا مزاج شناس اور آنے والے طوفانوں کا رمز شناس تھا، دیوبند میں شیخ الہند محمود الحسن پورے عالم اسلام کے غم اور غلام ہندوستان کی فکر میں گھل رہے تھے، انھیں کی دامن تربیت میں مشیت ایزدی نے اودھ کے ایک دور دراز علاقہ سے ایک لالہ صحرائی کو لاکر ڈال دیا تھا۔

شیخ الہند نے دیوبند کو ایک بین الاقوامی مرکز بنادیا تھا، ان کے کردار کی عظمت اور ان کی بے پناہ وسعت ظرف نے انھیں ایک ایسی شمع بنادیا تھا جس کے گرد پروانوں کا ہجوم تھا، وہ ملت کے اتحاد، اسلام کے غلبہ اور دین متین کے وقار کی بحالی کے لئے سراپا آرزومند تھے۔ اس مقصد عالی کے حصول کیلئے کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھے، زندگی کی آخری گھڑی تک وہ یہی خواب دیکھتے

رہے کہ ایشیا کے پابہ زنجیر انسانوں کو کس طرح نجات دلائی جائے۔ ان کی انگلیاں حالات کی نبض پر تھیں اور وہ آنے والے طوفان سے خبردار تھے، وہ عالم اسلام کے گوشے گوشے میں جو کربناک طوفان اُٹھ رہے تھے ان سے باخبر تھے اور ان کے مداوا کے لئے متفکر تھے، انھوں نے پورے ایشیا کی آزادی کے لئے ایک منصوبہ بنایا تھا اور نہایت خاموش سفارت اور طویل و مخفی سلسلہ خط وکتابت کے ذریعہ اسے کامیاب بنانا چاہتے تھے، اس کی تفصیلات ہم ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے جب دیکھتے ہیں تو محو حیرت رہ جاتے ہیں، انگریزی سامراج اپنے غیر معمولی وسائل اور خفیہ تنظیموں کے بہت بڑے جال کے باوجود مدت تک اس منصوبہ کا بھید نہ پاسکا اور اس کی بہت سی کڑیوں سے آخر تک ناواقف رہا، افسوس کہ یہ تحریک ناکام رہی ورنہ شاید آزادی تیس پینتیس سال قبل ہی حاصل ہوتی اور زیادہ باوقار طریقہ سے حاصل ہوتی، اس تحریک میں آخری طور سے رنگ بھرنے کے لئے جب شیخ الہند عرب پہنچے تو حالات کا پانسہ پلٹ چکا تھا، شریف مکہ کی ہوا و ہوس اور انگریزوں کے مکر و فریب کی چالیں کامیاب ہوئیں اور شیخ الہند کو اپنے عزیز شاگردوں کے ساتھ گرفتار کرکے مالٹا بھیج دیئے گئے، مولانا حسین احمد مدنی کی سیاسی زندگی کا یہی نقطۂ آغاز ہے اور اس کے بارے میں یقین کیساتھ کہا جاسکتا ہے کہ محدود قوم پرستی کے بجائے عالمگیر انسان دوستی اور ملی اخوت کے وسیع تر جذبے سے اس کی ابتدا ہوئی۔

مولانا حسین احمد مدنی ؒ نے دیوبند ہی میں اس ادارہ کی نصف صدی کی روایات جہاد و انقلاب کی حرارت اپنے خون کے ہر ہر قطرہ میں اتار لی تھی، اسی حرارت کو مزید تب و تاب مدینہ منورہ کی سرزمین پر حاصل ہوئی تھی جہاں وہ اپنے والدین کے ساتھ اس صدی کے اوائل میں چلے گئے تھے، دس سال تک انھوں نے

حرم نبوی میں اللہ کے کلام اور اسکے رسول کی تعلیمات کا درس دیا تھا، انکے شاگردوں میں رومی، شامی، مصری، ترک، ہندی اور عرب ہر طرح کے نوجوان تھے۔ یہاں پر مولانا مدنی کی آرزوئے جہاد وانقلاب کو فروغ حاصل ہوتا رہا، یہ تمنا وہ ہندوستان ہی سے لے کر آئے تھے اور ایک کمیونسٹ دانشور ڈاکٹر اشرف کے مطابق۔

"شاید کم لوگوں کو اس کا علم ہو کہ مرحوم نے بچپن ہی سے جہاد کی تیاری شروع کر دی تھی اور نوجوانی میں ان کا یہ معمول تھا کہ مئی کی تپش اور دھوپ میں گھنٹوں ریت یا پتھر کے فرش پر چلا کرتے تھے اور جاڑوں میں کڑاکے کی سردی میں نیم برہنہ بیٹھے رہتے تھے بعض دوستوں نے جب اس لا ابالی پن کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ آئندہ جیلوں میں اس سے زیادہ سختیاں بھگتنی پڑیں گی۔"

(الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ۲۹)

پھر یہی سبق مولانا کو اپنے استاد شیخ الہند سے بھی حاصل ہوا تھا کہ ظالم کے روبرو کلمۂ حق کہنے میں انسان کو اپنی جان کی مطلق پروا نہیں کرنی چاہئے، شیخ الہند کے اندر بھی یہی آرزو شمع کی مانند فروزاں تھی کہ خدا کی راہ میں انھیں اپنی زندگی قربان کرنے کا کوئی موقع حاصل ہو، زندگی کے آخری لمحات میں آپ نے حسرت کے ساتھ اس کا اظہار فرمایا۔

"مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں مگر افسوس ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں تمنا تو یہ تھی کہ میدان جہاد میں ہوتا اور اعلائے کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کئے جاتے۔" (نقش حیات حصہ دوم ص۲۶۰)

مالٹا کے ایام اسیری نے شیخ الاسلام کے سیاسی شعور اور بین الاقوامی فہم و فراست کو پختہ تر کر دیا، ان کے اندر اپنے استاد جیسی وسعت نظر اور آفاقیت پیدا

ہونے لگی، مالٹا میں ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء کے درمیان انگریزوں نے جن بین الاقوامی قیدیوں کا کیمپ لگایا تھا، ان میں ایشیا و افریقہ کے چوٹی کے سیاسی و فوجی لوگ تھے، ان میں جرمن، آسٹرین، بلگیرین، ٹرکش عرب اور ہندوستانی سبھی تھے، ان سے تبادلۂ خیالات کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں، یہ سب برطانوی استعمار کے مارے ہوئے تھے، یہاں مسلمانوں میں آزادئ ہند کے سب سے بڑے علمبردار شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے شاگرد رشید مولانا حسین احمد مدنی نے انگریزوں کی ایشیائیوں اور افریقیوں سے نفرت و حقارت کے برتاؤ کو دیکھا خاص طور سے ہندوستانیوں کے ساتھ ان کے ذلت آمیز طرز عمل کا قدم قدم پر مشاہدہ کیا، چنانچہ شیخ الاسلام لکھتے ہیں کہ:

"میں نے بیرونی ممالک میں مشاہدہ کیا تھا کہ دوسرے ممالک میں ہندوستانی خواہ مسلمان ہوں، ہندو یا سکھ ہوں یا پارسی وغیرہ ایک ہی نظر حقارت سے دیکھے جاتے ہیں اور سب کو نہایت غلام بنا دیا جاتا ہے (نقش حیات حصہ دوم)

حضرت شیخ نے دنیا کی تمام قوموں میں انگریزوں کے اندر سب سے زیادہ عداوت اور بغض و کینہ مسلمانوں کے سلسلے میں پایا جن سے وہ صلیبی جنگوں کا انتقام لینا چاہتے تھے اور پہلی جنگ کے زمانے میں ترکی سلطنت کو ختم کر کے دل کی آگ بجھانا چاہتے تھے، لسان العصر اکبر نے اسی حقیقت کو شعر کی زبان میں بیان کیا ہے ؎

کلیسا کے مقابل آج مشکل میرا جینا ہے
کہ غیروں سے اسے غصہ ہی ہے اور مجھ سے کینہ ہے

مولانا محمود الحسن کی ریشمی رومال کی تحریک کی ناکامی یقیناً ان نفوس قدسیہ کے لئے ایک بہت بڑا صدمہ ثابت ہوئی ہوگی، اس لئے کہ اوّل تو وطن اور عالم اسلام

کی آزادی کا جو خواب انھوں نے دیکھا تھا اور جس کی خاطر مدتوں تک بے شمار جتن کئے تھے وہ چکنا چور ہو گیا، دوسرا اسے چکنا چور کرنے میں غیروں کے ساتھ اپنوں کی بھی کرم فرمائی شامل تھی، مگر عمر کے آخری مراحل میں جب کہ شیخ الہند اس اندوہناک ناکامی کے غم اور مالٹا کی اذیت ناک اسیری کی کلفتوں سے دوچار تھے اس عالی حوصلہ انسان کے عزم و ہمت کا چراغ گل نہ ہوا اسلئے کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے تربیت یافتہ جاں نثار اس مشن کی تکمیل کے لئے وہ ساری صفات استقلال و پامردی پیدا کر چکے ہیں جو اس صبر آزما لڑائی کو جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے، مولانا حسین احمد اپنی خود نوشت سوانح نقش حیات میں اپنے مرشد و مربی کے عزم و ثبات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی عبارت میں آشاروں کا سا خروش اور روانی پیدا ہو جاتی ہے، بقول غالبؔ

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

درج ذیل سطور ایک خوش آہنگ با محاورہ اور سلیس و رواں نثر کا نمونہ ہیں مولانا کے قلم سے پر جلال استعاروں اور پر ہیبت تمثیلوں کی جھڑی لگ گئی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک عربی زبان و ادب میں مہارت تامہ رکھنے والا صاحب زبان ہی ہم سے ہم کلام نہیں بلکہ ایک اردو نثر کا مزاج شناس اور اردو کے اسالیب بیان کا مزاج داں جس کی مادری زبان اردو بلکہ اودھی ہے ہم سے مخاطب ہے۔ مولانا کی نثر کے ساتھ ان کے سیاسی مشن کے جائزے کیلئے یہ طویل اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"شروع شروع میں بہت زیادہ مشکلات قیاس سے زیادہ سامنے آئیں، سخت اور تیز آندھیوں کا سامنا کرنا پڑا، باد سموم کے جھلسا دینے والے تھپیڑوں نے طمانچے مارے، احباب و اقارب مار آستین بن گئے ہر شخص ناصح اور خیر خواہ بن کر سد راہ بنا، اور کیسے ساتھ ہوتا، انگریزوں

نے اس قدر پیش بندی کر رکھی تھی کہ سیاسیات کی طرف آنکھ
اٹھانا سنہ ستاون کا سماں باندھتا تھا. آزادی وانقلاب کا اگر
کوئی خواب بھی دیکھتا تو پتہ پانی ہوجاتا تھا، ہوم رول یا خود
اختیاری حکومت کی خواہش بھی زبان پر لانا برق جہاں سوز سے
زیادہ تباہ کن شمار کی جاتی تھی. برطانوی تشددات اور مظالم کے
ہونے نے اس قدر حکومت اور دماغوں کو متأثر کر رکھا تھا کہ بہت
سے نفوس میں اللہ تعالیٰ کا خوف اس قدر نہ پایا جاتا تھا جتنا کہ
انگریز کا خوف مستولی تھا، خفیہ پولیس اور سی آئی ڈی میں ایسے
لوگ کام کر رہے تھے جن پر شبہ کرنا بے دینی اور کفر سمجھا جاسکتا تھا
چاروں طرف سی آئی ڈی کا جال بچھا ہوا تھا، پھر کس طرح امید کی
جاسکتی تھی کہ کوئی شخص ہم خیال ہم زبان یا ہم محل ہوسکتا تھا
خصوصًا جب کہ ہر شخص آزادی کے ذکر کرنے سے کان پر ہاتھ دھرتا
ہو۔ ان حالات میں شیخ الہند نے اپنی کشتی بحر زخار میں ڈالدی
اور طوفان میں کود پڑے اور لوگوں کو ہم خیال بنانے لگے، بڑے
بڑے علماء ومشائخ سے چونکہ ناامید و مایوس تھے (جیسا کہ ہمیشہ
فرمایا کرتے تھے کہ مشہور مولویوں اور پیروں سے امید نہ رکھنی
چاہیئے اور فرماتے تھے کہ بعض اہل اللہ نے مجھ کو یہ نصیحت کی تھی)
وجہ ظاہر ہے کہ ان کو اپنی بڑائی کی وجہ سے سب سے زیادہ خطرات
لاحق ہوجاتے ہیں اس لئے اپنے تلامذہ اور مخلص سمجھدار مریدوں کو
ہم خیال بناتے رہے۔"

شیخ الہند کے ایسے مخلص وجانباز معتقدوں وشاگردوں کی تعداد ہزاروں

تھی اور پورے برصغیر بلکہ مشرق وسطیٰ میں پھیلی ہوئی تھی، ان سب کو شیخ الہند نے اپنے مشن میں جھونک دیا اور آگے چل کر سب کا سید طائفہ حسین احمد مدنی کو بننا تھا، بقول شاعر مشرق ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

مالٹا کے بعد تربیت، ریاضت اور قرآن کی دوسری منزل تحریک خلافت تھی اور مولانا حسین احمد ہندوستان آکر اس بھٹی میں کود پڑے، ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلماء ہند کی تنظیم بھی وجود میں آگئی، اور ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار علماء ملکی و بین الاقوامی سیاست میں حصہ لینے کے لئے ایک منظم گروہ کی حیثیت سے منظر عام پر آگئے، شیخ الہند کا یہ خواب برگ و بار لایا کہ مسلمانوں کا مذہب انھیں رہبانیت نہیں سکھاتا بلکہ بنی نوع انسان کے اجتماعی مسائل حل کرنے اور معاشرہ کی ضروریات پورا کرنے اور خیر امت ہونے کی حیثیت سے تمام انسانوں کے لئے خیر و برکت اور ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ بننے کا سبق دیتا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی نے دین کے اس جامع تصور کو لوگوں کے سامنے رکھا اور خانقاہوں اور مدرسوں سے کھینچ کر لوگوں کو میدان عمل میں لانے کی زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔ بقول مولانا محمد میاں،

"آپ کا نظریہ یہ تھا کہ علم کا نتیجہ رہبانیت نہیں ہے بلکہ علم کو سیاست کے میدان میں رہنما ہونا چاہئے اسی سے اسلام کا مذہب کی حیثیت سے اور مسلمانوں کا ملت کی حیثیت سے وقار قائم رہ سکتا ہے"

(الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص ۱۳، ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء)

چنانچہ ان بزرگوں کے لئے تحریک استخلاص وطن میں شرکت ایک مذہبی فریضہ

تھا، حُبّ الوطنی ان کے نزدیک کوئی سیاسی مسلک اور جذبہ نہیں تھا بلکہ ایک دینی فریضہ اور مذہبی جذبہ تھا، چنانچہ جس ولولہ اور جس سرفروشی کے ساتھ ان بزرگوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا اس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی، جدید ہندوستان کا مؤرخ ان اہل اللہ کے کارناموں کے معاملے میں اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لے تو اس سے ان کی عظمت نہیں گھٹ سکتی، حقیقت یہ ہے کہ ۷ رکروڑ مسلمانوں کی روحانی و تہذیبی امامت و قیادت کرنے والے یہ افراد اگر جنگ آزادی میں شامل نہ ہوتے تو شاید یہ لڑائی نہ جیتی جاسکتی۔

مولانا حسین احمد مدنی نے ۹ر جولائی ۱۹۲۱ء میں کراچی کی خلافت کانفرنس میں وہ تاریخ ساز ریزولیوشن پیش کیا جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان اور پورے ایشیا کو انگریزی استعمار سے آزاد کرانے کی جدوجہد مسلمانوں کو دینی و مذہبی حیثیت سے شامل ہونے کی راہ ہموار کردی اور اس انقلاب آفریں فتویٰ سے جو جمعیۃ العلماء نے ۴۲۵ علماء کے دستخط سے شائع کیا تھا جنگ آزادی کا صحیح معنوں میں بگل بج گیا، اس فتوی کا لب لباب یہ تھا کہ اعدائے دین سے محبت و دوستی اور موالات حرام ہے اور انگریزی حکومت کے استحکام و انصرام میں شمولیت کفر ہے۔ مولانا مدنی نے اس موقع پر مسلمانوں کو عالمگیر اخوت کا پیغام خلافت کے اسٹیج پر سے مسلمانان ہند کو دیا تھا، اور محدود قوم پرستی کے تیشہ کو اپنے تیشۂ ایمان سے چکنا چور کر دیا تھا، مولانا نے فرمایا تھا کہ:

> قرآن کہتا ہے کہ مسلمان کہیں ہوں کسی رنگت کے ہوں کسی نسل کے ہوں، مشرق کے رہنے والے ہوں یا مغرب کے، گورے رنگ کے ہوں یا کالے رنگ کے ہوں، کسی قسم کی زبان رکھتے ہوں، ان میں کسی قسم کا کوئی اختلاف ایسا نہیں ہے جس کی وجہ سے ایک مسلمان دوسرے

سے غافل ہو سکے یا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ایسی حالت میں
چھوڑ سکے جس میں اس پر یا اس کی کسی عزت یا مال پر صدمہ پہنچتا ہو،
یہ قرآنی آیت صاف طور پر دلالت کرتی ہے کہ مسلمانوں میں آپس میں
ایک دوسرے میں ایسا ارتباط ہونا چاہیے جیسا کہ ایک بھائی کو دوسرے
بھائی سے ہوتا ہے"

مولانا نے اس موقع پر پوری جرأت ایمانی کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا تھا کہ مسلمانوں
کو قرآن میں حکم ہے کہ اے مسلمانوں جو لوگ تمھاری عظمت، تمھارے ملک، تمھاری
دولت، تمھاری عزت کو برباد کرنا چاہتے ہیں اور جو لوگ تمھارے مذہب کو دنیا
سے ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ تم مقابلہ کرو، مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ
اسلامی شہروں میں سے کسی پر کسی طرف سے حملہ ہو تو اس کے لئے بھی تمام روئے
زمین کے مسلمانوں پر یہ حکم فرض ہو جائے گا کہ وہ اپنی جان و مال اور روپیہ پیسہ سے
ان کا مقابلہ کریں اور مسلمانوں کی مدد کریں اور کافروں کو ان کے شہروں سے نکالدیں
مولانا نے مسلمانوں کو خبردار کیا تھا کہ آج یورپ یہ چاہ رہا ہے کہ حکومت اسلامی
روئے زمین پر باقی نہ رہے۔

(کراچی کا تاریخی مقدمہ ص ۶۰ تا ۶۴ ۔ مرتبہ عبدالقادر بیگ مطبوعہ اردو اکیڈمی)

اسی زمانے میں حکیم مشرق علامہ اقبال بھی عالمگیر اخوت اور بین الملی اتحاد
کا پیغام مسلمانوں کو دے رہے تھے۔ ؎

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا ۔ نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے ۔ نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر

اسی موقع پر علمائے دین نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ چونکہ قوانین دیوانی و فوجداری
خلاف شرع ہیں اس لئے ان کے مطابق فیصلے کے لئے عدالتوں میں جانا یا ان پر

اجرائے عمل کیلئے پیشۂ وکالت اختیار کرنا بھی ناجائز ہے، اور ایسے تعلیمی اداروں سے بھی علیحدگی ضروری ہے، جہاں اسلام کی صورت مسخ کرنے اور ذہنوں کو دین سے برگشتہ کرنے والی تعلیم دی جاتی ہے، کراچی کے مشہور مقدمے میں اپنے بیان تحریری کا آغاز مولانا حسین احمد مدنی نے ان الفاظ سے کیا تھا کہ ہندوستان ایک مذہب پرست ملک ہے اور ہندوستان کی حکومت کے لئے مذاہب کی رعایت کرنی نہایت ضروری سمجھی گئی ہے اس سلسلے میں مولانا نے ملکہ وکٹوریہ کے مذہبی آزادی کے اعلان کا ذکر کیا تھا جس کی پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں انگریز خلاف ورزی کر رہے تھے، مسلمانوں کی جان و مال کی حرمت پر شیخ الاسلام نے اس موقع پر جو تقریر فرمائی تھی وہ اتحاد ملی کے ایک چارٹر کی حیثیت رکھتی ہے، اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولانا ملت پرست کے بجائے محض قوم پرست تھے ان کی تردید کرتی ہے — مولانا نے چھ آیات قرانی اور ۴۲ احادیث صحیحہ کا حوالہ دیتے ہوئے خون مسلم کی حرمت پر روشنی ڈالی تھی، اس موقع پر ابن ماجہ کی یہ حدیث بھی پیش کی تھی کہ

۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کعبہ شریف کا طواف فرما رہے تھے اور فرماتے تھے کہ اے کعبہ کیا ہی اچھا ہے تو اور کیا ہی اچھی ہے تیری ہوا، تو کس قدر بڑا ہے اور تیرا احترام کس قدر بڑا ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ مومن کی جان اور مال کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تیری حرمت سے زیادہ ہے۔

اسی مضمون کو سودا نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

اس موقع پر مولانا نے ترمذی کی یہ حدیث بھی پیش کی تھی کہ دوزخ کے سات دروازے

ہیں ان میں سے ایک دروازہ اس شخص کے لئے ہے جس نے میری امت پر تلوار اٹھائی:

مولانا نے آخر میں فرمایا تھا کہ

"اگر گورنمنٹ کا منشار مذہبی آزادی سلب کرنے کا ہے تو صاف صاف اعلان کیا جائے تاکہ سات کروڑ مسلمان اس بات پر غور کرلیں کہ آیا ان کو مسلمان رہنا منظور ہے یا گورنمنٹ کی رعایا، اور اسی طرح ۲۲ کروڑ ہندو بھی غور کرلیں کہ ان کو کیا کرنا ہے کیونکہ جب مذہبی آزادی ہی چھینی گئی تو سب کی چھینی جائے گی۔"

اکبر الٰہ آبادی نے اس موقعہ پر فوج میں موجود مسلمانوں پر طنز کیا تھا کہ سہ

شیخ پر خیر بھی کرتے ہیں نمازی بھی ہیں آپ
مدد کفر بھی ہے رونق اسلام بھی ہے

مولانا حسین احمد سے زیادہ انگریزوں کے لبرازم اور انسانی حقوق کے معاملہ میں بلند بانگ دعوؤں کے کھوکھلے پن کا کون جاننے والا تھا انھوں نے اپنی آنکھوں سے پہلی جنگ عظیم کے دوران اس قوم کے مکر و فریب اور وحشت و بربریت کے مناظر دیکھے تھے۔ وہ اس قوم کے جو مجموعہ فتنہ و فساد تھی کے پر فریب انداز سے اچھی طرح واقف تھے، غدر ۱۸۵۷ء سے لیکر تحریک خلافت و تحریک ترک موالات تک برصغیر اور مشرق وسطیٰ کی تاریخ کا ایک ایک باب اور ایک گوشہ ان کی نگاہوں کے سامنے تھا، ہماری اس صدی کے رہناؤں میں ان کا تاریخی شعور سب سے زیادہ بالیدہ و بیدار تھا، بقول مولانا واجد الحسینی گو کھلے کے بعد تاریخی اعداد و شمار کو اس قدر برجستہ بیان کرنے والا مولانا مدنی کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا،

(الجمعیۃ ص۳۰)

نقش حیات کے دونوں حصوں میں وہ غدر ۱۸۵۷ء سے ریشمی رومال کی تحریک

کے خاتمہ تک کے تمام اہم واقعات کو آئینہ کی طرح سامنے رکھ دیتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں؛

یہی وہ امور تھے جس نے مسلمانوں میں ایک تڑپ پیدا کردی تھی، یہ تڑپ کیا تھی، ایک درد تھا، پوری ملت کا درد تھا جو اس کو گلو خلاصی پر مجبور کر رہا تھا، یہ ایک نیم بسمل قوم کی اضطرابی حرکت تھی جس کا منشا یہ تھا کہ ملک اور ملت ان مصائب سے نجات پائے جن کے نشتر شب و روز جسد ملت کے ہر رگ و پے میں پیوست تھے: (نقش حیات حصہ اول، آخری پیراگراف)

کراچی کے مقدمہ کے بعد ۲½ سال جیل میں گذار کر مولانا جب باہر آئے تو تپ کر کندن بن چکے تھے، اب انھوں نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ قوم کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی اور برق رفتاری کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں جاکر عام ہندوستانیوں اور اپنی ملت کے افراد کو مخاطب کرنے اور جھنجوڑنے لگے سیاسی بیداری کے ساتھ اخلاقی تربیت اور روحانی تزکیہ کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ مسلمانوں کے عافیت پسند طبقہ اور مذہب کا ایک محدود تصور رکھنے والے دیندار گروہ کے طلسم مسلمانوں کو نکالے بغیر کوئی انقلاب نہیں آسکتا مغرب سے مرعوبیت ختم کرنے میں انھوں نے اپنی تقریر و تحریر اور وعظ و نصیحت سے کلیدی رول ادا کیا، وہ انگریزی سامراج کے ان ستونوں کو گرانا چاہتے تھے جو انھیں کی ملت کے ان افراد نے تعمیر کیا تھا جن کو اپنی دنیا عزیز تھی، نقش حیات میں وہ ڈبلو ڈبلو ہنٹر کا یہ قول نقل کرتے ہیں، جو اس کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" سے اخذ کیا گیا ہے۔

مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں جو

واقعی باعزت و خود دار ہیں، دنیا دار لوگ ہمیشہ قائم شدہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں، ہمارے انگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے انکار نہ کرنا جانتا ہو، ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے یخ بستہ حقائق کے مقابلہ میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی امداد حاصل ہے، یہ لوگ اگرچہ کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائیداد کے مالک ہیں، اپنی نمازیں ادا کرتے ہیں اور بڑے اہتمام سے مسجدوں میں جاتے ہیں لیکن ضروری اور اہم مسائل پر سوچنے کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے"

خوش قسمتی سے تحریک خلافت ہی کے دور میں اہل قلم کی ایک ایسی جماعت اور سامنے آئی جو یورپ کے سائنس و فلسفہ کا طلسم توڑنے اور اس شاخ نازک کی حقیقت واضح کرنے لگی، اسی زمانہ میں جمعیۃ کا اخبار الجمعیۃ نکلا جس کی ادارت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سنبھالی اور اسی دور میں الجہاد فی الاسلام جیسی کتاب تصنیف کی، دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی کے دبستان نے مولانا سلیمان ندوی جیسا عالم دین پیدا کیا جنھوں نے مغرب کے فسوں کو توڑنے اور مشرق کے علم و فضل اور روحانیت کی مستحکم بنیادوں کو واضح کرنے کی کوشش کی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے بھی مغرب کے خلاف قلمی جہاد چھیڑ دیا اور علامہ اقبال و اکبر الٰہ آبادی نے شاعری کی زبان میں اہل مشرق کو بیدار کرنے کی جد وجہد کی۔

شیخ الہندؒ نے اس ہوشربا دور میں انگریزوں سے گلو خلاصی اور ہندوستان میں ایک خود مختار اور آزاد حکومت کا خواب دیکھا اور اسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے

برادران وطن سے تعاون کی اشد ضرورت محسوس کی، مولانا حسین احمد مدنی جس مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے وہ اسلام کی پوری دنیائے انسانیت کے بہی خواہ کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ ایک بار مولانا احتشام الحق کاندھلوی کی روایت کے مطابق مولانا محمد الیاس نے مولانا مدنیؒ سے مسلمانوں کے لئے دعا کرنے کی درخواست کی تو شیخ وقت نے تیز لہجہ میں فرمایا کہ کیا غیر مسلم مخلوق خدا نہیں، مولانا مدنیؒ نے ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت سے تعاون کا اصول اپنے استاد سے اخذ کیا تھا، جنھوں نے اتحاد و تعاون کے لئے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کچھ بنیادی اصول معین کر دیئے تھے، شیخ الہند مولانا محمود الحسن علیگڑھ میں جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد جب دہلی تشریف لائے تو یہاں جمعیۃ العلماء کے دوسرے اجلاس کی صدارت فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا:

"میں ان دونوں قوموں (ہندؤں اور مسلمانوں) کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں، اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اسکے لئے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کے لئے میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حالات اگر اس کے مخالف ہو گی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے ناممکن بنا دے گی۔"

شیخ الہند نے مزید فرمایا تھا کہ:

"ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی اور طاقتور ہو ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست دے سکے گی، ہاں یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائیدار اور خوشگوار

دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اسکے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کی تقریب میں فریقین کے مذہبی امور میں سے ادنی امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری متصور ہو، مجھے افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت سے لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لئے اپنے مذہب کی حد سے گذر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتا ہے۔

شیخ الہند کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھی معاملات اور سرکاری محکموں میں رقابتوں پر افسوس تھا، بہرحال ملک کی اکثریت سے اصولی اتحاد کا درس شیخ الہندؒ نے دیا تھا، اس کی شیخ الاسلام نے زندگی بھر پیروی کی اگرچہ اس راہ میں انھیں فرقہ پرست قوتوں کی وجہ سے اکثر نہایت کبیدہ خاطر ہونا پڑا، مذکورہ بالا خطبہ میں شیخ الہند نے وضاحت کردی تھی کہ مذہبی حقوق اور اسلامی تشخص کو قربان کرکے کسی طرح کا اتحاد قائم نہیں کیا جا سکتا، مرحوم نے نظریاتی اور فکر و عقیدہ کی بنیاد پر ہندوستان میں الگ الگ قوموں کے وجود کو بھی تسلیم کیا تھا جیسا کہ نقش حیات حصہ دوم کی مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ بعد میں چل کر کانگریس نے جب جغرافیائی بنیاد پر قومی وحدت کا تصور پیش کیا اور اس کی مولانا حسین احمد مدنی نے حمایت کی تو اس عہد کے بہت سے اسلامی مفکرین نے انھیں تنقید کا نشانہ بنایا، اگرچہ شیخ الاسلام جغرافیائی بنیاد پر ایک ہندوستانی قوم کے تصور سے قطعاً یہ معنی نہیں لیتے تھے کہ مسلمان اپنے ملی تشخص کو ترک کردیں یا اپنے مذہبی حقوق کو خیرباد کہدیں دراصل مولانا قوم یا NATION کو ملت سے الگ ایک سیاسی اصطلاح کے طور

پر محدود معنوں میں استعمال کرتے تھے ، جہاں تک ملی و مذہبی غیرت کا معاملہ ہے دو قومی نظریہ کے علمبرداران کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے ۔ اس طرح کے معاملات میں مولانا مرحوم سے تمام اصحاب اجتہاد کی طرح خطائے اجتہادی تو ممکن ہے لیکن ان کے خلوص و للّٰہیت پر کسی کو انگلی اٹھانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ، اسلئے کہ ہر طرح کی خود غرضی ، موقع پرستی ، سربلندی و قیادت کی خواہش اور حب جاہ کی آرزو سے مولانا کی ذات بہت بلند تھی ،

شیخ الاسلام کی سیاسی بصیرت کی روداد جمعیۃ العلماء کی سرگرمیوں کے جائزہ کے بغیر نامکمل رہے گی ، برصغیر کے اس صدی کے نصف اول کی تاریخ میں مسلمانوں کی سیاسی تگ و تاز کا جائزہ لینے والے اہل نظر کو یہ شکوہ ہے کہ ملکی سیاست میں مسلمانوں کی کوئی معین پالیسی کبھی نہیں رہی ، مگر میرے خیال میں اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی قیادت میں آزادی ہندوستان تک جمعیۃ العلماء بڑی حد تک ایک معین پالیسی پر کار فرما رہی ہے اور وہ یہ تھی کہ اس ملک میں الگ سے تن تنہا کوئی اسلامی انقلاب نہیں برپا کر سکتے البتہ ایک برابر کے پارٹنر کی حیثیت سے برادران وطن کے ساتھ مل کر اگر وہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیتے ہیں تو ضرور آزادی کے بعد نئے ہندوستان میں ان کو اس ملک میں اپنے مذہبی امتیازات کے ساتھ باوقار زندگی گذارنے کا موقع ملیگا ، مولانا مدنی رح کی قیادت میں جمعیۃ نے کانگریس کے ضمیمہ کے طور پر کبھی کام نہیں کیا جیسا کہ کچھ لوگ اس کے بارے میں یہ رائے قائم کرتے رہے ہیں ، ملک کے سیاسی مورخین خواہ اسے تسلیم نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جمعیۃ نے اپنے ساتویں سالانہ اجلاس میں بمقام کلکتہ ۱۹۲۶ء مولانا سلیمان ندوی کی صدارت میں آزادئ کامل کی تجویز منظور کی تھی جبکہ ابھی کانگریس نہرو رپورٹ کے تار عنکبوت میں الجھی ہوئی تھی جمعیۃ نے نہرو رپورٹ کو مسترد کر دیا تھا اور یہ ریزولیوشن منظور کیا تھا :

۔ چونکہ برادران وطن کے مخالفانہ طرز عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہورہی ہے اس لئے مسلمان اپنی تنظیم کرکے اپنے بل پر ملک کو آزاد کرائیں البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارہ میں اتحاد عمل کرنا چاہیں ان کے ساتھ اتحاد عمل کیا جائے :

(مسلمانوں کا روشن مستقبل، طفیل احمد منگلوری ص ۵۳۱)

اس موقع پر جو نکات طے کئے گئے تھے وہ یقیناً جمعیۃ العلماء کو شیخ الاسلام کی سرپرستی میں مسلمانوں کے سیاسی شعور کی تربیت اور دین کے ایک وسیع و جامع تصور سے ملت کو روشناس کرانے کی سعی مبارک قرار دیئے جائیں گے، وہ نکات یہ تھے

(۱) مسلم قوم عموماً اور علماء بالخصوص سیاسی امور میں غور و خوض کیا کریں۔

(۲) آزادئ ہند کے فریضہ ہونے کے ــــــ وجوہ واسباب کو نہایت غور و خوض سے دریافت کریں اور لوگوں کو سمجھائیں اور دیگر مذہبی امور کی اشاعت کی طرح اس کو بھی ضروری سمجھیں، آزادی اور دیگر حقوق کے سلب ہونے کی مضرتوں اور مفاسد کی اشاعت نہایت پرامن طریقہ سے کرکے ہر مسلمان کو زندہ کریں،

۱۹۳۰ء کے نویں اجلاس میں جو امروہہ میں منعقد ہوا، جمعیۃ نے کانگریس کمیٹیوں کی مہاسبھائی ذہنیت پر اظہار افسوس کیا اور گول میز کانفرنس میں شرکت کو کار بے لاحاصل قرار دیا، دسویں اجلاس میں جو ۱۹۳۱ء میں کلکتہ میں زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد منعقد ہوا جمعیۃ نے مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی اور پرسنل لا کی حفاظت کا مطالبہ کیا، اور اپنے گیارہویں اجلاس میں جمعیۃ نے ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی کی واردھا تعلیمی اسکیم کو نامنظور کر دیا اور اس کے ساتھ ودیا مندر کی تعلیمی اسکیم اور اس کے نام سے اختلاف کیا، کانگریس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کی حق تلفیوں کی تحقیقات کیلئے کمیٹی مقرر کرے، جمعیۃ نے ہندوستانی زبان کو سنسکرت کے قالب میں ڈھالنے پر بھی

اظہار افسوس کیا، ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں جس کی صدارت خود شیخ الاسلام نے کی اور جس میں مولانا کا خطبۂ صدارت ان کی جرآت حق گوئی اور اظہار بے باکی کی وجہ سے انگریزی حکومت نے ضبط کر لیا، جمعیۃ نے ان لوگوں کی مذمت کی جو مسلم پیشہ ور برادریوں کو ذلیل قرار دے کر اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کر رہے ہیں ۱۹۴۲ء میں لاہور میں جمعیۃ نے مولانا حسین احمدؒ کی صدارت میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ مختلف فیہ مسائل پر ایک دوسرے کو سب وشتم نہ کریں اور باہمی تعاون کر کے مثل ایک دیوار کے ہو جائیں، جمعیۃ نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ اسلامی ممالک پر کسی اجنبی طاقت کا تسلط برداشت نہیں کرے گی اور ایسی آزادیٔ کامل کے لیے جد وجہد کرتی رہے گی جس میں مسلمانوں کے سماجی و تعلیمی مسائل پر بھی کچھ تجاویز منظور کی گئیں، سہارنپور کے اجلاس میں جو ۱۹۴۵ء میں شیخ الاسلام کی صدارت میں ہوا جمعیۃ العلماء نے مسلمانوں میں عسکری نظم پیدا کرنے کے لئے انصار اللہ رضا کاروں کو تقویت پہنچانے اور منظم کرنے کا فیصلہ کیا، اس کے علاوہ تنظیم مساجد اور ائمہ مساجد کے ذریعہ مسلمانوں میں اصلاحی نظام عمل کی ترویج واشاعت پر زور دیا گیا، مسلمانوں کو تعلیم کے فروغ اور گھریلو صنعتوں کی طرف توجہ دلائی گئی، کانگریسی وزارت کے کچھ اراکین کی اردو کے سلسلہ میں معاندانہ پالیسی کی مذمت کی گئی اور مسلمانوں کے لیے ایسی مذہبی وسیاسی اور تہذیبی آزادی کا مطالبہ کیا گیا کہ غیر مسلم اکثریت مسلمانوں پر تعدی نہ کر سکے اور اس کی صورت یہ ہو کہ مسلمانوں کو مرکزی ایوان میں مسلمان ممبروں کی تعداد ہندوؤں کے مساوی ہو، گویا اس منزل تک آتے آتے کانگریس کے اندر فرقہ پرست عناصر کی طرف سے خود جمعیۃ العلماء بھی اندیشناک ہو گئی تھی اور مسلمانوں کے تحفظات کا مطالبہ کرنے پر خود کو مجبور پا رہی تھی ایک مرحلہ وہ تھا کہ جمعیۃ کانگریس پر ملکی اعتماد کے ساتھ آزادی کی لڑائی میں شامل ہو گئی تھی اور جب لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس میں مولانا حسین احمد مدنی سے

سوال کیا گیا تھا کہ وہ جمعیۃ کی طرف سے کیا مطالبہ پیش کرنا چاہتے ہیں تو شیخ الاسلام نے صرف اس قدر فرمایا تھا کہ " ہمارا مطالبہ تو ایک ہے وہ یہ کہ ملک کو اختیارات ملنے پر مسلمانوں کو اپنے مذہبی معاملات طے کرنے کے لئے قاضی مقرر کرنے کا حق عطا کیا جائے اور ہم نے کانگریس سے کہدیا ہے کہ جب تک ملک کو آزادی حاصل نہ ہو ہم تو خاموشی کے ساتھ آزادی کی جنگ میں شریک رہیں گے، البتہ آزادی ملنے پر ہمیں یہ حق نہ ملا تو پھر اس وقت اگر ہم میں قوت ہو گی تو ہم اُسے منوالیں گے ،

صد افسوس کہ اس مجاہد قوم کی آرزو کے مطابق نہ تو ملک کو آزادی ملی اور نہ ہی مسلمانوں میں اتنی طاقت باقی رہی کہ وہ اپنے کسی حق کے لئے از سر نو جدوجہد کر سکیں، یہاں تک کہ جب ۱۹۴۹ء میں مولانا کے وطن سے قریب بابری مسجد میں بت رکھدیا گیا اور اس قدیم تاریخی مسجد میں مسلمانوں کو عبادت سے محروم کردیا گیا اس وقت بھی مولانا خون کے آنسو بہا کر رہ گئے اور ان کے گرد و پیش جو افراد تھے وہ اس موقع پر مولانا کی آرزو کے مطابق مسجد کی بازیابی کے لئے میدان عمل میں نہ آسکے اور اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا رہے۔

مولانا نے انگریزوں سے جنگ کے لئے اپنے مربی و استاد کی رہنمائی میں جہد و عمل اور بے مثال قربانی و ایثار صبر و تحمل کا ہتھیار اٹھایا تھا، انگریز شکست کھا کر چلے گئے تو اس مجاہد نے اپنا ہتھیار بھی رکھدیا۔

مولانا اپنی زندگی کے آخری ایام میں تدریسی مشاغل اور بندگان خدا کی روحانی اصلاح میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تاکہ ملت کی اخلاقی و روحانی طاقت برقرار رہے مولانا نے آزادی کے بعد اقتدار میں شرکت گوارا نہ کی اور نہ بدلے ہوئے حالات میں کوئی راہنمائی کی، کانگریس میں ایک طبقہ مسلمانوں سے انتقام پر کمربستہ ہو گیا اور ان کی زبان و تہذیب اور مذہب پر حملہ آور ہونے لگا، مولانا یہ دیکھ کر اندر ہی

اندر کڑھتے رہے، ہر شخص ملک کی خدمت کی قیمت وصول کرنے میں لگ گیا اور مولانا ان عظیم مقدس اور مخلصانہ جدوجہد کا یہ انجام دیکھ کر حیران وششدر رہ گئے اس لئے کہ انھوں نے اپنی ساری سیاسی جدوجہد ایک دینی فریضہ سمجھ کر کی تھی۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی:

"مولانا اس کام کو اپنا ایک دینی فرض سمجھ کر اور ایک عقیدہ وارادہ کے ماتحت کر رہے تھے، وہی بے غرضی وہی مستعدی وہی جفاکشی جو ایک سپاہی میں میدان جنگ کے اندر ہوتی ہے۔

(الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر)

جنگ آزادی کے آخری چند سال مولانا پر بہت سخت گذرے جب کہ خود ان کی ملت کا ایک بڑا طبقہ ان کے مدمقابل آگیا اور ان کے دین وایمان اور ان کے کردار واخلاص ہر شئی پر حملہ آور ہوگیا مگر اس وقت بھی وہ جس بات کو حق سمجھتے تھے اس کا پوری بے جگری کے ساتھ اعلان کرتے رہے، جب انگریز جیسی جابر طاقت سے ذرہ برابر نہ ڈرے تو پھر اپنوں کی حماقتوں سے کیا ہراساں ہوتے، کمال یہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمن کے الفاظ میں:

"اس کے سامنے ایسے مسئلے آئے کہ اگر وہ عوام کے رجحانات کی پیروی کرتا تو کروڑوں گردنیں اس کے سامنے جھک سکتی تھیں اور اگر وہ خاموش رہتا تو اپنے ارادتمندوں کی نظر میں اور اونچا ہوسکتا تھا لیکن اسی حمایت حق اور اپنے ضمیر کی آواز بلند کرنے میں نہ اعزاز واحترام کا خیال کیا اور نہ برگشتگی عوام کا خوف اسکے پلئے ثبات میں کوئی جنبش پیدا کر سکا۔"

(الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء)

آزادی کے بعد شیخ الاسلام اپنی قوم کے کچھ ناعاقبت اندیش افراد کی کی ستم رانیوں کو فراموش کرکے اس کشتی کی ٹوٹی ہوئی پتوار کو درست کرنے میں لگ گئے، اور لوگوں میں خود اعتمادی، مستقبل کی طرف سے اطمینان اور وطن میں رہنے اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کی تبلیغ کرتے رہے، ترک وطن سے انھوں نے مسلمانوں کو روکا اور تقسیم کے وقت دہلی میں یہ اعلان فرمایا۔ میں نے تو ہندوستان میں مرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

افسوس کہ آخری ایام میں انھیں عالی ہمت اور عالی ظرف معتقد شاگرد نہ ملے جس طرح شیخ الہند کے پاس ان کے آخری ایام میں جاں نثاروں کا ایک جھرمٹ موجود تھا، مولانا کے گرد و پیش ایسے لوگ تھے جن کی وجہ سے بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی شیخ الاسلام کا زیادہ وقت اشخاص یا جماعتوں کے تذکرے یا سطحی تبصرے یا تعویذ دعا کی فرمائش پر گذرتا، مولانا اپنی فطری عالی ظرفی سے کسی کو گرانی یا ناگواری کا احساس نہ ہونے دیتے، اب بھی وہ مسلسل سفر میں رہتے اور اب بھی درِ دولت مہمانوں کی کثرت سے آباد تھا اور اب بھی ان کی دریا دلی کا فیض جاری تھا، اور انھوں نے اپنی بلند نظری سے ملک کی آزادی پر جو توقعات قائم کی تھیں اور اپنی فطری شرافتِ نفس و پاکیزگی سے اس ملک کی اکثریت کے متعلق جو اندازے لگائے تھے وہ کہاں تک صحیح ثابت ہوئے اور ان کو زبان و کلچر مذہبی تعلیم اور پرسنل لا کے تحفظ کے بارے میں (جس کو کانگریس کے منشور اور ہندوستان کے دستور نے ضمانت کی تھی) اپنی آخری عمر میں جو مایوسی ہوئی، ان کو اپنی سیاسی جدوجہد کے رفیقوں اور جیل کے ساتھیوں کے متعلق (صاحب اختیار و اقتدار ہوجانے کے بعد) جو تلخ اور دل شکن تجربے ہوئے آج ان کو خواہ زبان پر نہ لایا جاسکے مگر آنے والے مورخ کے قلم کو ان کے اظہار سے روکا نہ جاسکے گا۔"

(الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ۲۵)

لیکن ایسا نہیں کہ آخری ایام میں وہ ملک وملت کے روشن مستقبل سے مایوس ہوگئے ہوں، ان فرقہ پرست عناصر کی ریشہ دوانیوں سے نبرد آزما ہونے کا ان کے اندر اب بھی حوصلہ برقرار تھا جو آزادی کے ثمرات سے ملک کے کمزور طبقات کو محروم کرنا چاہتے تھے، اب وہ خدا سے ایسے سرکشوں کی سرکوبی کے لئے دست بدعا تھے اور قنوت نازلہ اس جوش وولولہ سے پڑھتے تھے کہ بقول مولانا علی میاں معلوم ہوتا تھا کہ محراب میں شگاف پڑجائیں گے اور الفاظ نہیں بلکہ شرارے ہیں جو آپ کے دل سے نکل رہے ہیں۔ اور اخیر میں اس عظیم المرتبت مذہبی وسیاسی رہنما کے بارے میں یہ عرض کروں گا کہ میرے نزدیک وہی انسان عظیم ہے جو اپنی بہترین صلاحیتوں کو پورے طور پر عمر کے آخری مراحل تک بروئے کار لاتا رہے اور زندگی کے کسی مرحلہ میں پست ہمت اور دل شکستہ نہ ہو اور نہ اپنی زندگی کے مشن سے کنارہ کش ہو اور اس کی امید و آرزو کا چراغ ہزار آندھیوں کے بالمقابل جلتا رہے۔ اس پیمانے پر جب ہم دیکھتے ہیں تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کو اس صدی کا ایک عظیم وعالی مرتبت انسان فخر کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

۱۸۷۹ء - ۱۹۵۷ء

از: شمس تبریز خان
استاذ شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی

عالم ربانی — قطب زمانہ — اور مثالی قائد

اسلام جس طرح دین کا حال ہے، اسی طرح اس نے اپنی تابناک تاریخ کے ہر دور میں انسانیت کو علم وعمل، مذہب وسیاست، دین وادب، خدمت خلق وخدا پرستی، حمیت دینی وانسان دوستی، زہد وتقویٰ اور حکومت وقیادت، غرض دین ودنیا کی ایسی جامع ومثالی، تاریخ ساز اور عہد آفریں ہستیاں پیدا کیں جو صرف دنیائے اسلام یا مشرق وایشیا ہی کے لئے باعث فخر وناز نہیں بلکہ ساری دنیائے انسانیت کے لئے لائق احترام، قابل تقلید اور سرچشمۂ وجدان وفیضان ہیں، وہ ایسی عبقری ونابغہ شخصیات ہیں جنھوں نے اپنے علم وعمل سے جہان تازہ آباد کئے ہیں اور اپنی خود شناسی اور خدا آگاہی کے طفیل انھوں نے نئی تاریخ بنائی ہے، دنیائے انسانی میں نئی جوت جگائی ہے، اور انسانی خدمت کے نئے چمن آراستہ کئے ہیں، اور انسانیت کے چمن زار میں نئے لالہ وگل کھلائے اور نفرت وتعصب، فرقہ پرستی وجانبداری، ظلم واستحصال، استعمار واستبداد کے اندھیروں اور آندھیوں میں اپنے نفس گرم، سوز دروں جذبۂ بے اختیار، اور خلوص فراواں سے نئے چراغ روشن کئے اور انقلابی مشعلیں

جلائی ہیں اور نیابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور میراث نبوی سے خلق خدا اور ملک خدا کو فیض یاب کیا ہے، امت محمدیہ کی ایسی ہی عظیم نابغۂ روزگار شخصیات اور ممتاز اصحاب دعوت وعزیمت میں عالم ربانی، شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ کی ذات گرامی بھی تھی جنھیں ہم شیخ الاسلام کے مقدس لقب سے یاد کرتے ہیں۔

درس نظامی، سلسلۂ ولی اللّٰہی ومجددی اور دارالعلوم دیوبند کی روایتی ومثالی جامعیت اور ہمہ گیری کا آخری اور نادر روزگار نمونہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی جامع، کثیر الجہات اور عبقری شخصیت تھی جن کی ذات ستودہ صفات میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا جذبہ، احیائے سنت اور ثبات واستقامت حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے فرزندان والا تبار کی فراست ایمانی اور غیرت دینی اور مجتہدانہ فکر ونظر، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا دینی فہم وفراست اور اسلامی غیرت وحمیت، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا تقویٰ وتفقہ وخدمت حدیث وسنت، اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے اجتہادی علم وعمل کے گوناگوں عناصر، بڑی جامعیت وتوازن اور حسن وخوبی کے ساتھ جمع ہو گئے تھے اور جو بظاہر انھیں پر ختم ہو گئے۔

حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے حضرت مدنیؒ کی جامعیت کے تعارف میں تحریر فرمایا تھا، "۱۸۵۷ء کے بعد دارالعلوم کے قیام سے جس تعلیمی، دینی، روحانی اور روحانی تحریک کا آغاز ہوا تھا اسکے کئی انقلابوں اور دوروں کی تکمیل مولانا مدنی کی ذات پر ہو کر اس ۱۹۵۷ء ہی میں اس کی انتہا ہو گئی مگر ابتدا کی صدی ۱۸ تھی اور انتہا کی صدی ۱۹ (۱۸۵۷ء) کے بعد اس کی ابتدائی کڑی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی ذات تھی

درمیانی کڑی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تھے جنھوں نے اس کو شباب تک پہنچایا۔ اور آخری کڑی حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ تھے جنھوں نے اس کو انتہا کو پہنچایا۔ اور اس طرح ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک سو برس کے عرصے میں اس تحریک کا دور مکمل ہو گیا۔[۱]

۱: عالم ربّانی و فاضل اجلّ

حضرت مدنیؒ کی جامعیت کے تین پہلو بہت ممتاز و نمایاں ہیں۔ ایک پہلو عالم ربانی و فاضل اجل کا ہے دوسرا ایک عارف کامل اور شیخ وقت کا ہے، تیسرا ایک مثالی قائد و رہنما کا ہے حضرت مدنیؒ کی سیرت کا علمی پہلو سیاسی اور روحانی مشاغل کے ہجوم میں کم نمایاں ہوا جسے پورے طور پر نمایاں کرنے کی ضرورت ہے، ایک عالم دین و صاحب درس ہونے کے لحاظ سے انھیں فقہ و حدیث سے خاص مناسبت تھی جس کا عمدہ نمونہ ان کی تقریریں اور تحریریں ہیں جن میں وہ بہ کثرت احادیث کے حوالے دیتے ہیں ان کے تلامذہ کا کہنا ہے کہ وہ درس و تقریر میں ایک حافظ حدیث نظر آتے تھے ان کی درسی تقریروں سے بھی ان کی محدثانہ عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، جن میں سے کچھ شائع ہو چکی ہیں[۲]۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ حضرت مدنی اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ تحقیق حدیث کے سلسلے میں ایک دوسرے سے استفادہ کرتے اور ایک دوسرے کے بڑے قدرداں اور مرتبہ شناس تھے۔

روح سنت اور درایت حدیث اور اس کے مقصد و منشا تک رسائی ان کی خصوصیت تھی، حدیث کا حفظ و استحضار ایسا تھا کہ جس کی وجہ سے اہل نظر

---

[۱] الجمعیۃ دہلی، شیخ الاسلام نمبر ص ۱۳۔

[۲] مثلاً: عارف مدنیہ (تقریر ترمذی از حضرت مدنی) مرتبہ مولانا سید طاہر حسن صاحب نیز تقریر ترمذی جسے مولانا افضال الحق صاحب قاسمی اعظمی ایک عرصے سے مرتب فرما رہے ہیں

انھیں حافظ حدیث سمجھتے تھے، اکثر تقریر و گفتگو میں حدیث مع سند کے پڑھتے تھے، مختلف دینی معاشرتی اور سیاسی مسائل میں برمحل احادیث سے استفادہ واستناد ان کی خاص ادا تھی اور اس کے لئے وہ مشہور و منفرد تھے، اجتماعی زندگی اور سیاسی زندگی میں ان کا خاص سابقہ علمائے بریلی، قائدین مسلم لیگ اور جماعت اسلامی سے ہوا اور تینوں کے مقابلے میں آپ کا علم و نظر، دینی ذوق و مزاج، اور تفقہ و اجتہاد نمایاں طور پر سامنے آیا اور اس نے برصغیر ہند و پاک کی دینی معاشرتی فضا پر اپنے گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کئے، اہل بدعت کے مقابلے پر "الشہاب الثاقب" احقاق حق اور ابطال باطل کا پورا سامان رکھتی ہے، مسلم لیگ کا جواب انھوں نے علمی و سیاسی دونوں سطح سے دیا اور دونوں میں اپنے دلائل کی معقولیت اور برتری قائم رکھی۔ اس سلسلے یعنی دو قومی نظریے کی تردید اور ہندوستان کے مخصوص حالات میں ہندو مسلم اتحاد و تعاون کے جواز اور ضرورت پر آپ نے جو رسالے تحریر فرمائے ان سے آپ کے دینی فہم و فراست کے ساتھ سیاسی و معاشرتی بصیرت بھی پوری طرح عیاں ہے، ایسے رسالوں میں "متحدہ قومیت اور اسلام" "مسلم لیگ کیا ہے" "پاکستان کیا ہے" "مسلم لیگ کی آٹھ مسلم کش سیاسی غلطیاں" وغیرہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اپنی دینی غیرت و حمیت اور اسلامی اقدار و روایات کے تحفظ کے جذبے کے تحت انھوں نے مولانا مودودی کے افکار کا تنقیدی جائزہ لیا اور رسالہ "ایمان و عمل" اور "مودودی دستور و عقائد" تحریر فرمایا، اور مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی امیر جماعت اسلامی سے اپنی مراسلت[1] میں جماعت کے فکر سے ۱۹ نکات میں اپنے علمی و دینی اختلاف کا اظہار کیا جن میں سے بیشتر دلائل و نکات کا وزن اب بھی محسوس کیا جاتا ہے۔

---

[1] مولانا مدنی سے مراسلت ص ۱۰-۲۱ (دہلی ۱۹۸۴ء)

۱۳۱۶ھ میں آپ کے دودمان عالی نے مدینہ طیبہ ہجرت کی اور ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۵ھ تک حرم مدنی میں آپ کا حلقۂ درس قائم ہوا جس میں عرب و عجم نے آپ سے استفادہ کیا، طلبہ کے ہجوم اور آپ کے درس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ روزانہ تہجد سے عشار تک آپ کو ۱۴ ، ۱۵ اسبق پڑھانے ہوتے تھے[۱]، آپ کے اس حلقۂ درس سے عالم عربی کے بعض ممتاز علمار نے بھی استفادہ کیا جن میں شیخ محمد بشیر ابراہیمی الجزائری وغیرہ ممتاز ہیں، جنھوں نے اپنے ملک کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا، ان کے ایک معاصر اور ممتاز عالم و مصنف مولانا عاشق الٰہی میرٹھی آپ کے اخلاقی علمی اور تدریسی مقام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مولانا حسین احمد صاحب کا درس بحمداللہ حرم نبوی میں بہت عروج پر ہے اور عزت وجاہ بھی حق تعالیٰ نے وہ عطا فرمایا ہے کہ ہندی علمار کو کیا معنی مینی و شامی بلکہ مدنی علمار کو بھی وہ بات حاصل نہیں، ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشار، آپ سرتاپا خلق، مہماں نواز، غیور باحیا، اور بعض ان صفات حمیدہ سے متصف ہیں جن پر دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے"[۲]

اسارت مالٹا (۱۹۱۷ء — ۱۹۲۰) کے ایک سال بعد ہی جولائی ۱۹۲۱ء کو خلافت کانفرنس کراچی میں آپ کی پیش کردہ تجویز ترکِ موالات پر مقدمہ قائم ہوا، آپ نے ۲۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو جو عدالتی بیان دیا وہ جہاں افضل الجہاد کا نمونہ ہے وہیں کتاب وسنت اور کلام و فقہ کے استحضار کی بھی ایک اعلیٰ مثال ہے[۳]

سلہٹ (آسام) میں آپ کا قیام بھی علمی و دینی خدمات کا ایک شاندار ریکارڈ

---

[۱] حیاتِ شیخ الاسلام از مولانا سید محمد میاں ص ۳۱ (دیوبند ۱۹۴۸ء)

[۲] تذکرۃ الرشید از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص ۱۵۸، ۱۵۹۔

[۳] اسیران مالٹا از مولانا محمد میاں ص ۱۱۰ — ۱۲۵۔

رکھتا ہے جس نے آسام و بنگال کے مسلمانوں کی علمی و دینی تربیت میں مؤثر کردار ادا کیا اور جس کے اثرات آج بھی محسوس کئے جاتے ہیں۔

پھر دارالعلوم دیوبند کی مسند حدیث پر سرفرازی سب سے بڑا علمی و دینی اعزاز تھا جو ۱۳۴۶ھ میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رہ کے استعفیٰ کے بعد آپ کو حاصل ہوا اور آپ نے تیس سال سے زائد عرصے تک تادم آخر اپنے سیاسی مشاغل کے ساتھ اس دینی و علمی منصب جلیل کے فرائض بڑی سرگرمی، خلوص اور توازن کیساتھ انجام دیئے، راویوں کا بیان ہے کہ لمبے لمبے اسفار سے واپسی پر بھی بغیر آرام کئے آپ درس میں مشغول ہو جاتے تھے، مگر زور بیان اور تفہیم و تشریح حدیث کے معمول میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا، مولانا سید محبوب رضوی تحریر کرتے ہیں کہ سنہ ۱۳۴۶ھ میں جب حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم سے مستعفی ہوئے تو آپ کے سوا جماعت دارالعلوم میں کوئی ایسی شخصیت موجود نہ تھی جو دارالعلوم کی اس مہتم بالشان جگہ کو اس کے شایان شان پُر کر سکے اس لئے اکابر کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی۔[1]

اگر آپ کے درس بخاری و ترمذی وغیرہ کے علمی افادات شائع ہو جاتے تو علم و دین کی ایک اہم خدمت انجام پا جاتی اور فقہ و حدیث کے مستند ذخیرے اور ولی اللٰہی علوم و افکار سے متعلق لٹریچر میں ایک وقیع و معتد بہ اضافہ ہوتا۔

علمی و دینی لحاظ سے "مکتوبات شیخ الاسلام" کی چار جلدیں (جنھیں مولانا نجم الدین اصلاحی نے اپنے حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے) بہت اہمیت رکھتی ہیں، اور ان سے ایسا ہی فیض حاصل ہوتا ہے جیسے حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ اور حضرت مجدد الف ثانی رہ جیسے بزرگوں کے اصلاحی رسائل و مکتوبات سے ہوتا

---

[1] تاریخ دارالعلوم از سید محبوب رضوی ص ۸۳، ۲۷ (دیوبند ۱۹۷۸ء)

ہے۔ ان کی روح اصلاً تو دینی و اصلاحی ہے مگر ان میں سیاسی و علمی، معاشرتی اور ثقافتی امور پر بھی بڑی اچھی بحثیں آگئی ہیں اور وہ اپنے ماحول و معاشرے اور معاصر زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں اور اپنے لکھنے والے کے اخلاص و خیر خواہی کی وجہ سے زرِ خالص عیار اور لولوئے آبدار جیسی قدر و قیمت رکھتی ہیں اور مجموعی طور پر ان سے ماضی قریب کے علمی، دینی اور سیاسی مباحث و مسائل پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

اسی طرح حضرت کی خود نوشت سوانح حیات "نقشِ حیات" میں سوانح سے زیادہ عالمِ اسلام اور برصغیر کی سیاسیات و اقتصادیات کے مباحث آگئے ہیں اور برطانوی استعمار کے پس منظر اور نتائج و عواقب سے متعلق بڑا قیمتی، سیاسی اقتصادی اور تاریخی مواد یکجا ہوگیا ہے جو ہمارے علمی و دینی حلقوں کی دسترس اور معیار و مذاق سے دور سمجھا جاتا ہے، مگر برصغیر کی سیاسیات کو سمجھنے کے لئے وہ ناگزیر مواد کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے علاوہ اس کے بغیر تحریک ولی اللہی تحریک شیخ الہند اور تحریک آزادیٔ ہند کو بھی نہیں سمجھا جاسکتا۔ کتاب کے حیرت انگیز سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مشتملات جہاں حضرت مدنی کے ذہنی افق کی وسعت اور زمانہ کے حالات و ضروریات سے گہری واقفیت کا پتہ دیتے ہیں وہیں ہمارے دینی و علمی حلقوں کے لئے عبرت و بصیرت کی مہمیز بھی ہیں، ممتاز مؤرخ ڈاکٹر تاراچند حضرت کی ان "دنیوی" معلومات پر اس طرح حیرت کا اظہار کرتے ہیں

"مذہبی معاملات میں ان کا علم گہرائی اور وسعت دونوں میں غیر معمولی تھا، لیکن یہ سخت تعجب کی بات ہے کہ کس طرح ایک مولوی نے ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی تاریخ اور مغربی

طاقتوں سے اسلامی ملکوں کے تعلقات کے بارے میں اس عظیم مقدار میں اطلاعات فراہم کرلیں؟"[1]

۲۔ قطب زمانہ اور عارفِ کامل

علم کو انھوں نے عمل کے لئے حاصل کیا تھا اور نمونۂ عمل کے لئے ان کے سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ تھا، جس سے انھیں شیفتگی و فریفتگی رہی، زندگی کے ہر چھوٹے بڑے مرحلے پر وہ اتباعِ سنت کا اہتمام والتزام رکھتے تھے، کھانے پینے، آدابِ مجلس، عادات و عبادات، سیاسیات و معاملات اور زندگی کے ہر شعبے سے متعلق وہ سنت ہی سے رجوع کرتے تھے اور یہی روحِ تصوف ہے۔ عرفان و سلوک سے ان کا تعلق علمی بھی تھا اور نسبی بھی مگر اکابر علمائے دیوبند اور حضرت مجدد و شاہ صاحب کے طرز و مسلک کے مطابق تصوف و سلوک کی کتاب و سنت سے مطابقت اور اس کا جواز ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا، سیاسیات کی طرح انھوں نے عرفانیات میں بھی اجتہاد سے کام لیا اور ہندوستانی تصوف میں عجمی اور نوفلاطونی اثرات کے سبب ترک دنیا، گوشہ گیری اور مردم بیزاری کی صفات پیدا ہو گئی تھی اور وہ عملی زندگی سے تقریباً ترک تعلق کر چکا تھا صوفیا و مشائخ صرف اصلاحِ نفس، دروں بینی اور خداشناسی کی دعوت دے رہے تھے، مگر اس کے ساتھ ہی خدمتِ خلق، اصلاحِ معاشرہ اور عمومی صلاح و فلاح کی تعلیمات سے صرفِ نظر کر رہے تھے اور غیر اسلامی تصوف کے رہبانی طرز کو اپنائے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو زندگی اور معاشرے سے الگ کر کے ان کے اندر منفی، مجہول، اور بر خود غلط انداز، احساسِ کمتری اور شکست خوردگی، و پسپائی کے رجحانات پیدا کر کے انھیں زندگی اور زمانے کے نئے چیلنج اور

---

[1] تاریخ تحریکِ آزادیٔ ہند از ڈاکٹر تاراچند ۳/۳۶۲ (دہلی ۱۹۸۵ء)

نئے تقاضوں سے دور کر رہے تھے اور مجموعی طور پر منفی اور غیر صحت مند رجحانات کی افزائش کا باعث بن رہے تھے اور مسلمانوں کے اندر دین و دنیا کی تفریق کا غیر اسلامی تصور پیدا کر کے لوگوں کے اندر ذہنی و عملی کش مکش، تعطل اور رجعت پسندی کے احساسات کی پرورش کر رہے تھے، انفرادی صلاح و فلاح پر زور کے سبب ملی اجتماعی سفاد اور معاشرتی فلاح کا کام بری طرح متاثر ہو رہا تھا، ایسے افسوسناک ماحول میں حضرت مدنیؒ نے اپنے معاصر صوفیاء کے برخلاف کتاب وسنت، سلف صالحین اور اکابر علماء دیوبند کے ذوق و مسلک کے مطابق اجتہادی اقدام کرتے ہوئے، انفرادی و اجتماعی دینی و دنیوی، سیاسی و معاشی فلاح و صلاح کا پروگرام بنایا اور اس پر عزیمت و استقامت کے ساتھ عمل پیرا ہوئے اور ایک بار پھر دنیا کو یہ پیغام دیا کہ ؎

طریقت بجز خدمت خلق نیست
ز تسبیح و سجادہ و دلق نیست

آپ کے مسلک میں خداشناسی، خدمت خلق سے نہیں روکتی تھی، اور نہ اصلاح نفس اور تعمیر ذات کی فکر اصلاح معاشرہ میں حائل ہوتی تھی، بلکہ ان کا جذبۂ اصلاح زندگی کے ہر شعبے کو اپنے دائرے میں لینے کی کوشش کرتا تھا، اور وہ اپنے کو کسی خود ساختہ و مصنوعی دائرے اور حد میں محدود نہیں کر سکتا تھا وہ ان کی ذات کی گہرائیوں اور اندروں سے پھوٹتا تھا اور ناقابل تسخیر تھا اور وہ دین و دنیا دونوں کی صلاح و فلاح، اور زندگی کی تعمیر نو کے بغیر مطمئن نہ ہو سکتا تھا ؎

گفت او گلیم خویش بدر میبرد ز موج
ایں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

برصغیر ہند و پاک کی متصوفانہ روایت، صلح کل، وسیع المشربی میں یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ طریقت نے شریعت پر ناروا برتری حاصل کرلی تھی اور منکرات ومنہیات پر نکیر قصۂ پارینہ بن چکا تھا ایسے اباحی ماحول میں حضرت شیخ الاسلام رہ نے اعفار لحیہ اور شعائر اسلامی کی سنت اور اسلامی تہذیب کے فراموش کردہ نقوش و آثار کو از سر نو زندہ و تابندہ بنانے کے لئے عالی ہمتی اور اولوالعزمی سے کام لیا، وہ ریش تراشوں سے مصافحہ سے کتراتے اور امکانی نکیر فرماتے تھے، اور اس موضوع پر انھوں نے ایک مستقل رسالہ بھی تصنیف فرمایا۔

ایک بڑے صاحب دل نے درویش کامل کی یہ صفات بتائی ہیں کہ "اس میں آفتاب کی سی شفقت، دریا کی سی سخاوت اور زمین کی طرح فروتنی اور تواضع ہونی چاہیئے" حضرت شیخ کے جاننے والے جانتے ہیں کہ اور بہت سے اخلاقِ فاضلہ کے ساتھ ان میں یہ صفات حسنہ بھی بخوبی جمع تھیں اور آپ اپنی ذات سے اخلاق محمدیہ کا پیکر جمیل تھے، اور آپ کے اخلاق کریمانہ کے واقعات اور مشاہدات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے لئے مجلدات درکار ہیں [1]

انبیاء کرام علیہم السلام انسانوں کی تربیت و اصلاح کے لئے آتے ہیں اور یہی کارنامہ مثالی و معیاری طور پر خاتم النبیین و سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیرت و سنت کے ذریعہ انجام دیا، علمائے ربانی و حقانی چونکہ بقول نبوی ورثۂ انبیاء ہوتے ہیں اسلئے وہ نبوی علم و عمل کی میراث و امانت امت تک حسب توفیق و صلاحیت پہنچاتے ہیں، تقسیم ملک سے پہلے اور ماضیٔ قریب میں اپنے اپنے طرز پر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اور شیخ الاسلام

---

[1] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو کتاب "حیات شیخ الاسلام کے حیرت انگیز واقعات، انفاس قدسیہ" از مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔

حضرت مولانا مدنیؒ نے اس میراث نبوی کو جس اولوالعزمی وعالی ہمتی، اور جس فراوانی کے ساتھ تقسیم کیا اور جس طرح ان کے انفاس قدسیہ سے ایمان کی باد بہاری چلی اور برصغیر ہندو پاک کی فضاؤں پر اخلاق فاضلہ، اعمال حسنہ، ایمان ویقین، اصلاح ذات ومعاشرہ، احیائے سنت اور تجدید دین کے جو اثرات مرتب ہوئے ان کی کوئی دوسری مثال نہ ملے گی اور ان کے اصلاحی وتجدیدی کارنامے اس کے بجا طور پر مستحق ہیں کہ اکابر اسلام اور مشاہیر امت کی تاریخ دعوت وعزیمت اور تذکرۂ تجدید واحیائے دین میں انھیں ممتاز جگہ دی جائے کہ وہ تاریخ اسلام کا ایک طلائی سلسلہ اور زریں حلقہ ہیں ؎

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانۂ تست

ممتاز مبلغ وداعی مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی مرحوم حضرت مدنیؒ کی سیرت کے احسانی پہلو کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ بارگاہ امدادیہ سے فیض یاب ہوئے، اور دربار رشیدی سے فیوض حاصل کئے، آخر میں تادم آخر حضرت شیخ الہندؒ سے کسب کمال کیا، غرض ہر طرح دولت اخلاص سے بھرپور اور بادۂ عشق سے مخمور ہو گئے، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جس دریا کا ایک پیالہ بھی ضبط کرنا مشکل ہے حضرت مدنیؒ سات سمندر چڑھائے ہوئے ہیں، پھر بھی ضبط موجود ہے، کیا مجال ہے کہ ساغر چھلک جائے"[1]

۴ــــ **مثالی قائد ورہنما** | آج کل کی سیکولر، لادین، اخلاق سے معرّا،

---

[1] اسیرانِ مالٹا از مولانا سید محمد میاں ص ۲۸۰ (دہلی ۱۹۷۶ء)

اصول واقدار سے بے پرواسیاست اس درجہ آلودہ اور گندی ہوگئی ہے کہ کسی شریف اور ثقہ انسان کو سیاسی کہنا درحقیقت اس کی توہین اور ہتک عزت کے مرادف ہے اور سیاست کی کتنی ہی صفائی دی جائے اور اسے اصول ودیانت کا پابند بتایا جائے مگر لوگوں کو اس کے بارے میں خوش گمان ہونا اور ان کی غلط فہمی دور کرنا مشکل ہے۔

تاہم اگر اسلامی سیاست اور اس کی اصول پرستی، دیانت داری، خود احتسابی اور ضابطہ پسندی، اس کی اخلاقی و دینی پابندی اور احتیاط واعتدال پسندی کی روایات، کتاب وسنت کی تعلیمات کو سامنے رکھا جائے تو اس طرز سیاست کو سمجھا جاسکتا ہے جسے ہندوستان میں علمائے حق خصوصاً حضرت مجدد،، شاہ ولی اللہ اور ان کے مکتب فکر سے وابستہ علمار نے اختیار کیا اور جسے عصر حاضر میں شیخ الاسلام حضرت مدنی،، اور جمعیۃ علمائے ہند نے اپنایا

اپنے زمانے میں شیخ الہند،، حضرت مدنی،، مولانا آزاد، اور ان کے ہم خیال علمار نے یہ شدت سے محسوس کیا کہ انگریزی اقتدار ہندوستان کے علاوہ عالم اسلام کے لئے بھی تباہی وبربادی کا باعث ہے اور ہندوستان کی آزادی سے عالم اسلام کو بھی برطانوی ومغربی استعمار واستبداد اور جارحیت وآمریت سے نجات ملے گی اور اسلامی طرز حیات کو فروغ پانے اور آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملے گا، حصول آزادی کی راہ میں چونکہ کانگریس بھی سرگرم تھی اس لئے جمعیۃ علمار بھی آزادی کی جدوجہد میں اس کے ساتھ شامل ہوگئی اور حضرت شیخ الہند اور پانسو علمار کے دستخطوں سے ترک موالات کے فتویٰ کے ذریعہ شرعی تائید بھی مل گئی، جدوجہد آزادی میں غیر مسلموں کی شرکت اور ان سے اشتراک عمل کا اجتہاد حضرت سید احمد شہید،، اور ان کے رفقار نے اپنی تحریک میں جہاد میں کیا

تھا، یہ روایت اور جذبۂ جہاد و اجتہاد حضرت نانوتوی و حضرت گنگوہی اور حضرت شیخ الہند کے واسطہ سے حضرت مدنی کو ملا تھا، انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود مدینہ کے مابین معاہدے سے استنباط کرکے جہاد آزادی میں مسلمانوں کی شرکت کا راستہ کھول دیا، یہ اپنے زمانے کا نہایت اہم اور تاریخی اجتہاد تھا، جس سے برصغیر ہند و پاک میں اسلام اور مسلمانوں کی قسمت وابستہ تھی اور جو ان کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوا۔

جمعیۃ علماء اور مولانا آزاد و حضرت مدنی نے تقسیم ہند کی مخالفت کسی محدود اور ذاتی و جماعتی مفاد کیلئے نہیں بلکہ اسلام، مسلمانوں اور اہل وطن کے فائدے کیلئے کی تھی، تقسیم ہند کے نتیجے میں برصغیر میں دعوت اسلامی کی تبلیغ و اشاعت میں شدید موانع، اور دو قومی نظریہ کے تحت پیدا ہونے والی فرقہ وارانہ نفرت و عداوت، باقی ماندہ مسلمانوں کی کس مپرسی اور پسماندگی، فسادات و نقصانات، اور خود پاکستان کے سیاسی و اقتصادی عدم استحکام اور غیر ملکی طاقتوں کی دست نگری و محتاجی اور صحیح معنوں میں اسلامی جمہوریہ نہ ثابت ہونے اور بنگلہ دیش کے وجود میں آنے یا علیحدگی اختیار کرنے کے عظیم خطرات سے تحریر و تقریر کے ذریعہ مسلمانوں کو آگاہ کرنے میں انھوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، اور اخلاص و ہمدردی اور نصیحت و خیر خواہی کا کوئی دقیقہ انھوں نے فروگذاشت نہیں کیا، لیکن مسلم لیگ اور بعض کانگریسی لیڈروں کی ضد، وقتی اور محدود سیاسی و اقتصادی فائدوں کی توقع اور موہوم اندیشوں کے باعث یہ انہونی ہوکر رہی اور ملک غیر فطری طور پر تقسیم ہوگیا اور ان اصحاب فراست کی ہر بات پوری ہوئی اور وہ تمام خطرات و خدشات سامنے آئے جن سے ان مخلص بزرگوں نے آگاہ کیا تھا۔

نیتوں کا حال اللہ ہی جانتا ہے مگر بظاہر پاکستان موہوم خوف وطمع کی بنیاد پر بنا تھا اور ہندوستان کے اقلیت میں رہ جانے والے مسلمانوں کی حق تلفی اور ان سے عمداً بے پروائی اور بیدردی برتی گئی تھی، اس کے برخلاف مولانا آزاد اور مولانا مدنی کا مسلک وموقف ایمان ویقین، عزیمت واستقامت، عالی ہمتی اور بلند طبعی ملک وملت کے لئے اخلاص وخیر طلبی اور اسلامی روایات کے عین مطابق تھا جن میں دعوت اسلامی کے محاذ سے پسپائی، ملت کے ساتھ بیوفائی اور محدود سیاسی واقتصادی فائدوں کے لئے مسلم وغیر مسلم کی تفریق وتقسیم کی کوئی نظیر نہیں ملتی نہ اس کی کوئی شرعی دلیل ہے۔

مولانا آزاد اور مولانا مدنیؒ نے پوری استقامت کے ساتھ تقسیم ہند کی مخالفت کی اور تقسیم کے بعد بھی انتشار وتذبذب میں مبتلا مسلمانوں کو قیام ہند پر آمادہ کرنے، ان کی ڈھارس بندھانے اور ان کے لئے سازگار حالات پیدا کرنے کے لئے کسی عملی جدوجہد سے دریغ نہیں کیا، حقیقت یہ ہے کہ انھی بزرگوں کی کوششوں کے نتیجے میں ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل محفوظ ہوگیا، اور مسلم لیگ کی غلط کاریوں کے بُرے نتائج کی کسی قدر تلافی ہوسکی، خاص طور پر حضرت مدنیؒ اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب کے صبر وثبات، عزیمت واستقامت اور مقناطیسی شخصیت اور مرکزیت وروحانیت کے سبب اکھڑے ہوئے مسلمانوں کے قدم پھر سے جم گئے اور انھوں نے بدلے ہوئے حالات کو معمول پر لانے کا فیصلہ کرلیا، اور ایک بے مثال تخریب وتباہی میں تعمیر وترقی کا منصوبہ بنالیا۔ ع

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

ڈاکٹر تارا چند جمعیۃ علماء اور حضرت مدنیؒ کے مؤمنانہ ومجاہدانہ موقف کی

تحسین کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"وہ تحریک آزادی کی جنگ میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیتے رہے، اپنی سیاسی کارروائیوں اور قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے وہ کئی مرتبہ قید کئے گئے، کوئی چیز، گورنمنٹ کی ترغیب وتحریص مسلم لیگ کی مخالفت، مخالف علماء کے حملے اور خود ان کی قوم کے بچھڑے ہوئے لوگوں کی گالیاں، آزادئ ہند اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں انھوں نے جو پختہ اور پرجوش عقیدہ قائم کیا تھا، اس سے ان کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ پیدا کرسکی ....

علماء دیوبند جنھوں نے تحریک آزادی میں ممتاز اور نمایاں حصہ لیا تھا انھوں نے جمعیۃ علماء کی بنیاد رکھی جس کی غرض یہ تھی کہ چوٹی کے مسلم علماء وفضلائے ہند مذہبی اور سیاسی امور میں متفقہ رائے قائم کرسکیں .... درحقیقت یہ ایک قریب المرگ جنگوں سے کھیلنے والے بوڑھے سورما (شیخ الہندؒ) کی اپنے ساتھیوں کے لئے ایک پکار تھی کہ اس برسرحق جنگ کو جاری رکھیں اور اس وقت تک دم نہ لیں جب تک کہ فتح حاصل نہ ہوجائے"[1]

[1] تاریخ تحریک آزادئ ہند از تاراچند ص ۲۰۳، ج ۳

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
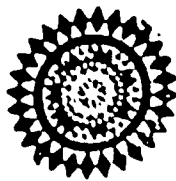
حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا خلق عظیم و لطف عمیم

از ضیاء الدین اصلاحی، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ذات گرامی علم و عمل، رشد و ہدایت، دین و تقوی اور شریعت و طریقت کی جامع اور سرفروشی و جاں بازی اور شرافت اخلاق و مکارم اسلامی کا بے مثال نمونہ تھی، وہ درحقیقت سلف صالحین کی یادگار اور اسلام کی جیتی جاگتی تصویر تھے، ان کی پاکیزہ اور مقدس زندگی سے اسلام و ایمان کی حقیقت، سیرت و کردار سے خلق محمدی کا جلوہ اور ان کی ایک ایک ادا سے اسوۂ صحابہ آشکارا تھا، دین کے متفرق جلوے، اس دور کے اور بھی صلحاء اور اخیار میں رہے ہوں گے مگر ان کی ذات "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کی مصداق تھی۔

مولانا کا حال عام مشائخ و مرشدین سے مختلف تھا وہ "نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری" کے قائل تھے، اس لئے ایک طرف اگر وہ بزم ولایت اور مسند علم کے صدر نشین تھے تو دوسری جانب رزمگاہ حیات اور کارزار عمل

کے مجاہد اور سپاہی بھی تھے، اگر ریاضت، عبادت اور شب بیداری انکا طرۂ امتیاز تھا تو قوم و ملک کی خدمت اور سیاسی سرگرمیاں ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھیں، جس کیلئے انھوں نے ہر قسم کی جد و جہد کی اور قربانی دی۔

کسی ایک مضمون میں ان کی جامع کمالات شخصیت کے خط و خال نمایاں کرنا ممکن نہیں اور مجھے تو دو چار دفعہ سے زیادہ ان کی زیارت و دید کی سعادت بھی میسر نہیں آئی ہے اسلئے میں ان کی خصوصیات و کمالات کی تصویر کشی کا حق ادا نہیں کر سکتا، تاہم الامر فوق الادب کے بموجب ان کو قریب سے دیکھنے اور جاننے والوں کے خرمنوں سے خوشہ چینی کر کے ان کی سیرت و کردار کے بعض نمونے پیش کرنے پر اکتفا کروں گا، میرے لئے خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جانا بھی کچھ کم مایہ فخر نہیں۔ ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

خلق عظیم اور لطف عمیم مولانا کے صحیفہ حیات کا نہایت روشن، موثر اور سبق آموز پہلو ہے جو مفقود النظیر اور عدیم المثال ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی رقم طراز ہیں:-

"یہاں (دیوبند) کی حاضری کا یہ بالکل پہلا موقع تھا، اسٹیشن پر دیکھا تو مولانا خود استقبال کیلئے موجود، مولانا کی بزرگی کے قائل خوش عقیدہ حضرات جس بنا پر بھی ہوں، اپنی نظر میں تو ان کی بڑی کرامت ان کا ایثار، انکسار، تواضع، بے نفسی ہی ہے، علم و فضل، فقر و درویشی کی بحثوں کو چھوڑیئے لیکن جہاں تک ؎

ہم نے ہر ادنی کو اعلی کر دیا ✿ خاکساری اپنی کام آئی بہت

کا تعلق ہے، مولانا... اس دیکھنے والے کی نظر میں اپنی نظیر بس آپ ہی ہیں اور

محمد علی جوہر نے یہ شعر کہا تو اپنے شیخ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے حق میں ہے لیکن صادق مولانا دیوبندی پر بھی لفظ بہ لفظ آرہا ہے ؎

ان کا کرم ہی انکی کرامت ہے ورنہ یاں ؛ کرتا ہے کوئی پیر بھی خدمت مرید کی[1]

مولانا دریابادی ایک اور موقع پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"لیکن جہاں تک تواضع، ضبط نفس، ایثار وانکسار اور جذبہ خدمت کا تعلق ہے مولانا حسین احمد صاحب کی ذات اپنی جگہ بے نظیر ہے، ہاں خود ان کے استاذ شیخ الہند کی نظیر ہو تو ہو یا پھر ان ہی کے بڑے بھائی مولانا سید احمد فیض آبادی مہاجر مدنی تھے"[2]

حضرت مدنیؒ کے خلق عظیم کے جلوے نہایت گوناگوں ہیں، ایثار، اخلاص سادگی، مروت، شرافت نفس، سیر چشمی، عالی ظرفی، حسن سلوک، تواضع، انکسار، سخاوت، بذل، قناعت، استغنا، غیرت، خودداری، عفو، حلم، ضبط، تحمل، صبر، استقلال، جذبہ خدمت خلق بڑوں کی عظمت و توقیر اور چھوٹوں پر لطف و شفقت کس کس چیز کا ذکر کیا جائے، یہ سب ان کے ایسے مسلمہ فضائل وخصائص ہیں جو ضرب المثل بن گئے ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:۔

"جو چیز ہر شک و شبہ اور ہر بحث و نزاع اور ہر اختلاف سے بالاتر ہے وہ ان کی بلند سیرت، پاکیزہ شخصیت، بے غرض جد وجہد، بے داغ زندگی اور مکارم اخلاق ہیں جنھوں نے ان کی ذات کو کھرا سونا اور سچا موتی بنا دیا تھا اور ان کو اخلاقی و طبعی بلندی کے اونچے مقام پر پہنچا دیا تھا... ان کو انسانیت

---

[1] حکیم الامت ص۱۲۱ [2] ایضاً ص۱۰۹

د آدمیت، شرافت، سیادت اور اخلاق و کردار کی بڑی بلندی پر پایا اور اسی چیز
نے مولانا کی بلندی کا نقش دل و دماغ پر قائم کیا۔[1]
ذیل میں مولانا کی بے داغ زندگی، پاکیزہ سیرت اور خلق عظیم کے کچھ دلآویز نمونے
پیش کئے جاتے ہیں۔

خدمتِ خلق

حقوق اللہ و حقوق العباد کو ادا کرنا ہی اصل دین و شریعت ہے
مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زندگی ان دونوں کی جامعیت کا
مجسم نمونہ تھی، ان کے نزدیک سلوک و طریقت کے مدارج طے کرنے کا زینہ بھی خدمتِ خلق
ہی ہے۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست ❖ بتسبیح و سجادہ و دلق نیست

مشہور حدیث نبوی خیر الناس من ینفع الناس کے مطابق مولانا کی زندگی
خلقِ خدا کی خدمت و نفع رسانی کیلئے وقف تھی، انکے آئین شریعت میں مردم آزاری اور
ایذا رسانی سے بڑا کوئی گناہ نہ تھا۔

مباش درپے آزار و ہرچہ خواہی کن ❖ کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

دلجوئی، مدارات اور فیض رسانی انکی سرشت میں داخل تھی، کسی کو پریشان دیکھتے
تو تڑپ اٹھتے اور جس طرح ممکن ہوتا اس کی پریشانی دور کرتے، لوگوں کا کام کرنے، ان
کی ضرورتیں پوری کرنے، مشکلات میں ان کا مددگار اور سہارا بن جانے اور انکی راحت
رسانی کا سامان کردینے میں ان کو خاص لطف و انبساط اور بڑا کیف و انشراح ہوتا تھا،
لوگوں کی دل شکنی سے بچنے کیلئے مولانا کا معمول ہوگیا تھا کہ ابھی ایک سفر سے واپس نہیں
آئے کہ دوسرا شروع ہوجاتا تھا۔ ع ما آب من سفر الا الی سفر

---

[1] پرانے چراغ ص ۱۰۹

بڑھاپے میں بھی اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، موسم کی ناسازگاری و بے اعتدالی اور بیماری آزاری کوئی چیز بھی ان کے سفر میں مانع نہ ہوتی تھی، ان کو نہ اپنی بیماری کی پرواہ ہوتی اور نہ آرام کا خیال ہوتا، ہر قسم کی صعوبت و مشقت برداشت کرکے سفر کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر انھوں نے انکار کر دیا تو لوگوں کی دل شکنی ہوگی جو انھیں کسی حال میں گوارا نہ تھی، چنانچہ ضعف، پیری، علالت اور دوسرے طبعی اسباب و اعذار کے باوجود سفر کرتے اور جب مخصوص نیازمندان کو ان حالات اور مجبوریوں کی وجہ سے سفر سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تو وہ اس پر سخت برہمی ظاہر کرتے اور فرماتے کہ مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے بندے مجھ سے کہیں چلنے کیلئے اصرار کریں اور میں انکار کر دوں، میں کیا ہوں اور میری کیا قیمت ہے، یہ مٹی کا جسم ہے جب تک چل رہا ہے اس سے کام لینا چاہیئے۔ وہ جہاں لوگوں کی دلجوئی اور دلداری کے خیال سے دور دراز کے پر مشقت سفر کرتے وہاں سفر میں دوسروں کی خدمت اور آرام کا بڑا خیال بھی رکھتے، خود تکلیف اٹھاتے مگر ساتھ کے لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے دیتے، جن مسافروں سے کوئی واقفیت اور جان پہچان نہ ہوتی مولانا ان کو بھی مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر آرام پہنچانے کیلئے فکرمند اور سرگرم رہتے، تھکے ماندے مسافروں کا پیر دبانے لگتے، ان کی مدد کیلئے کمربستہ رہتے اور ان کی کوئی خاص زحمت اور دشواری ہوتی تو اس کو رفع کرنیکی فکر فرماتے، یہاں تک کہ ان کو آرام و راحت پہنچانے کیلئے وہ سارے کام بھی بہت خوش دلی اور طیب خاطر سے انجام دیتے جن کو کرنے میں عموماً لوگوں کو کراہیت ہوتی اور گھن آتی ہے۔

ایک دفعہ ریل کے ایک سفر میں ان کے ایک شاگرد کو جو خادم کی حیثیت سے ساتھ تھے استنجے کا تقاضا ہوا لیکن جب وہ بیت الخلا میں داخل ہوئے تو اسے گندہ پاکر واپس لوٹ آئے، مولانا اسے تاڑ گئے چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد وہ خود بیت الخلا میں تشریف لے

گئے اور اس کی مکمل صفائی کرنیکے بعد واپس آئے تو ان سے فرمایا کہ فراغت کیلئے جلیئے، جب وہ دوبارہ گئے تو اسے ایسا صاف ستھرا پایا کہ نہایت دم بخود ہوئے۔ سچ ہے۔ ع

سروری در دین ما خدمت گری است

اس طرح کے واقعات بیشمار ہیں، انکی راحت رسانی اور خدمت خلق کی یہ سبق آموز داستان مشہور ادیب و انشا پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کی زبانی سننے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:۔

"دوسروں کو شاید کام لینے میں وہ لطف نہ آتا ہو جو ان مولانا کو دوسروں کا کام کر دینے میں آتا ہے، گھر پر آکر ملئے تو آپ کیلئے کھانا اپنے ہاتھ سے جاکر لائیں، آپ کیلئے بستر بچھادیں، سفر میں ساتھ ہو جائے تو دوڑ کر آپ کیلئے ٹکٹ لے آئیں، قبل اس کے کہ آپ ٹکٹ گھر کے قریب بھی پہنچ سکیں، تانگے کا کرایہ آپ کی طرف سے ادا کردیں اور آپ کا ہاتھ اپنی جیب میں پیسہ ٹٹولتا ہی رہ جائے، ریل پر آپ کا بستر کھول کر بچھائیں، آپ لوٹے میں پانی لے آئیں، آپ کا سامان اپنے ہاتھ سے اٹھانے لگیں، تین دن کے قیام دیوبند میں روایتیں مشاہدہ بن کر رہیں اور شنیدہ دیدہ میں تبدیل ہو کر تکلفات اور خاطریں اور مہمان داریاں کھانے پر کھانا اور چائے پر چائے"[1]

آگے مولانا دریابادی مرحوم مولانا مدنی کی سربراہی میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح کی خدمت میں تشریف لیجانے کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"تانگہ خانقاہ امدادیہ کے دروازہ پر رکا اور کرایہ مولانا حسین احمد صاحب نے دیا سہارنپور اسٹیشن پر کھانا بھی تو ان ہی نے مسلم ہوٹل میں لیجا کر کھلایا تھا اور دیوبند اسٹیشن پر ٹکٹ بھی تو وہی جھپٹ کر لے آئے تھے اور ہم دونوں[3] سن میں ان سے کہیں چھوٹے منھ

---

[1] الفرقان وفیات نمبر ص۲۷ [2] حکیم الامت ص۱۳ [3] یعنی خود مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی مرحوم۔

دیکھتے ہی رہ گئے تھے جس سفر میں وہ ساتھ ہوں چھوٹی اور بڑی ہر قسم کی خدمت گذاری میں کون ان سے بیش پا سکتا ہے۔[1]

مولانا عبدالماجد دریا بادی کے جادو نگار قلم نے حضرت مدنیؒ کے جذبہ خدمت اور حسن خلق کی یہ تصویر بھی کھینچی ہے:-

"دیوبند جایئے تو مولانا اسٹیشن پر پیشوائی کو موجود، چلنے لگئے تو اسٹیشن تک مشایعت پر آمادہ، کھانا کھانے بیٹھئے تو وہ لوٹا لئے ہاتھ دھلانے کو کھڑے ہوئے، پانی مانگئے تو گلاس لئے خود حاضر، تانگہ کا کرایہ وہ اپنے پاس سے دیدیں، ریل کا ٹکٹ وہ دوڑ کر لے آئیں ہوٹل میں کھانا کھایئے تو بل وہ خود ادا کریں، سفر میں ساتھ ہو تو بستر وہ کھول کر بچھادیں غرض مالی اور بدنی چھوٹی بڑی خدمت کی جتنی صورتیں ہو سکتی تھیں سب میں مرید تو مراد کے درجہ پر پہنچ گیا اور جو صاحب مراد وارشاد تھا وہ چاکری اور حکم برداری میں لگا ہوا ہے"[2]

مہمان نوازی

مولانا عبدالماجد دریابادی کی جو تحریر اوپر نقل کی گئی ہے اس سے مولانا مدنی کی ضیافت اور مہمان نوازی کا اندازہ ہوا ہوگا، دراصل یہ ان کی وہ خصوصیت ہے جس میں ان کے دور میں کوئی اور ان کا شریک وسہیم نہ تھا، ان کا گھر سرائے یا مسافر خانہ تھا جہاں تقریباً چالیس پچاس مہمان اور منتظر روز قیام کرتے تھے اور کبھی کبھی تو مہمانوں کا ایک ہجوم اور جم غفیر ان کے گھر پر آجاتا مگر مولانا کو نہ کسی قسم کا انقباض ہوتا اور نہ کوئی گھبراہٹ ہوتی بلکہ ان کی بشاشت وفرحت بڑھ جاتی تھی اور وہ ان کو کھلا پلا کر قلبی راحت وسکون محسوس کرتے تھے، مہمانوں میں صرف طالبین ومسترشدین ہی نہ ہوتے تھے بلکہ دعا وتعویذ کیلئے آنیوالے بھی ہوتے تھے، یہاں تک کہ بعض لوگ بازار اور تحصیل کے کاموں اور دوسری ضرورتوں سے آتے اور کھانے کے وقت حضرت کے

---

[1] حکیم الامت ص۱۱۴ [2] ایضاً ص۱۲۶

دستر خوان پر پہنچ جاتے، وہ ایسے لوگوں سے واقف بھی ہو جاتے مگر اپنے چہرے بشرے یا کسی ادا سے نہ کوئی ناگواری ظاہر کرتے اور نہ انکی خاطر مدارات ہی میں کوئی کمی کرتے۔ اپنے خادموں اور متعلقین کو بھی ہدایت اور تاکید تھی کہ اگر کسی کے بارہ میں انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے مقدمات کی پیروی اور خالص ذاتی و مادی اغراض سے آیا ہے تب بھی اسکے اکرام اور مدارات میں فرق نہ آنے دیں اور اگر کوئی خادم اس طرح کے لوگوں کے متعلق کچھ کہہ دیتا تو وہ اس کی سخت سرزنش فرماتے اور بڑی برہمی ظاہر کرتے۔

بعض لوگ بے تکلف مہینوں انکے یہاں پڑے رہتے اور مہمان ہوتے مگر ان کی پیشانی پر کوئی بل نہ آتا۔ ایک دفعہ ایک صاحب کئی ماہ سے ان کے یہاں بلاوجہ فروکش تھے، اتفاق سے گھر کے ایک صاحب اور کسی خادم نے ان سے کہہ دیا کہ آپ بلاوجہ کیوں پڑے ہیں، کوئی کام دیکھئے چنانچہ وہ چلے گئے، مولانا مدنیؒ کو اس کا پتہ چلا تو بہت برہم ہوئے اور ان دونوں سے فرمایا میرے مہمان سے یہ سلوک کرنیکا تمہیں کیا حق تھا[1]۔

جہاں تک بس میں ہوتا وہ خود ہی مہمانوں کی خبر گیری فرماتے اور انکی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے ہر طرح مستعد اور سرگرم عمل رہتے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کے مہمان خانہ اور مہمان نوازی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"ان کا مہمان خانہ ہندوستان کے وسیع ترین مہمان خانوں اور انکا دستر خوان ہندوستان کے وسیع ترین دستر خوانوں میں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ انکا قلب اس سے بھی زیادہ وسیع تھا، بعض واقفین کا اندازہ ہے کہ پچاس مہمانوں کا روزانہ اوسط تھا، اس میں ہر طبقہ اور ہر حیثیت کے لوگ ہوتے تھے، مولانا کی بشاشت، انتظام، مستعدی اور اہتمام بتلاتا تھا کہ انکو کس قدر قلبی مسرت اور روحانی لذت حاصل ہو رہی ہے، ضیافت و مہمان نوازی اور اطعام طعام انکی روحانی غذا اور طبیعت ثانیہ بن گئی تھی[2]"

---

[1] الجمعیۃ مدنی نمبر صفحہ ۱۲   [2] پرانے چراغ صفحہ ۱۱۳

مولانا مہمانوں کے اکرام کی بنا پر انہی کے ساتھ خود بھی کھانا تناول فرماتے اگر کبھی اس معمول میں بیماری یا کسی خاص عذر کی بنا پر فرق آتا اور خود کھانے میں شریک نہ ہوتے تو صاحبزادہ والاتبار مولانا سید اسعد مدنی کو ہدایت و تاکید تھی کہ وہ مہمانوں کے ساتھ کھانے میں شریک رہیں، ایک دفعہ انھیں حضرت کے ایام مرض میں ان کے علاج میں دوڑ دھوپ کی وجہ سے کچھ دیر ہوگئی اور وہ مہمانوں کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہو سکے تو بہت برہم ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ میرا کھانا باہر بھیجو میں خود مہمانوں کے ساتھ کھاؤں گا، صاحبزادہ محترم نے بڑی لجاجت سے معافی مانگی اور آئندہ ایسی غلطی نہ کرنیکا وعدہ کیا اور اہلیہ محترمہ نے بھی سفارش کی تو غصہ ٹھنڈا ہوا۔[1]

جو کھانا پکتا وہی سب مہمانوں کیلئے ہوتا اور خود بھی وہی تناول فرماتے، اپنے لئے یا کسی کیلئے کوئی امتیاز اور خصوصیت روا نہ رکھتے تھے، اتباعِ سنت کے خیال سے اس عاشق رسول کے دسترخوان پر عموماً ایک ہی قسم کا سالن ہوتا تھا اگر کسی مخصوص اور معزز مہمان کی وجہ سے کوئی خاص اہتمام اور تکلف کیا جاتا تو بلا امتیاز سارے مہمانوں کیلئے اس دن یہی کھانا ہوتا تھا، ایک مرتبہ ریف کے مجاہدِ اعظم امیر عبدالکریم کے برادر نسبتی مصطفےٰ رشید رسولی صاحب اپنے دورۂ ہند میں دیوبند پہنچے اور حضرت مولانا کے مہمان ہوئے تو ان کی وجہ سے اس روز کھانے میں مرغ کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن یہ صرف انہی کیلئے مخصوص نہ تھا بلکہ جو لوگ اس دن دسترخوان پر موجود تھے سب کو مرغ کا گوشت دیا گیا۔[2]

مہمانوں کی ہر ضرورت کا بنفس نفیس خود خیال رکھتے، ان کی آمد کی خبر پاکر پیشوائی اور استقبال کیلئے اسٹیشن تشریف لیجاتے، روانگی کے وقت مشایعت فرماتے اور کرائے کے پیسے بھی دیتے، مہمانوں کو سامان اٹھانے کی زحمت نہ دیتے بلکہ ان کا سامان خود اٹھاتے، ان کا بستر کھول کر بچھا دیتے، اگر کوئی مہمان بیمار ہو جاتا تو خود ہی اس کی دوا

---

[1] الحرم مدنی نمبر صفحہ ۱۲ [2] نئی دنیا عظیم مدنی نمبر

لاتے، رات میں مہمان جب سو جاتے تو چپکے سے جاکر ان کا پاؤں دبانے لگتے۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ کے فیض و کرم کا دریا ہمیشہ رواں رہتا اور ان کے دسترخوان کی فیاضی و سخاوت کا سلسلہ سال بھر جاری رہتا لیکن حدیث نبوی کے مطابق رمضان المبارک میں ان کا دریائے جود و سخا پورے طور پر امنڈنے لگتا، انکی مجلسوں میں حاضر ہونے والوں نے اسکی مکمل تفصیل قلمبند کی ہے مگر طوالت کے خوف سے اسے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

فیاضی و دریادلی

اس بیمثال مہمان نوازی سے ان کے قلب کی وسعت و کشادگی اور طبیعت کی فیاضی و سخاوت کا اندازہ ہوتا ہے وہ پوشیدہ اور مخفی طور پر بھی لوگوں کی دل کھول کر امداد فرماتے تھے، غریب اور نادار طلبہ کو مستقل وظائف دیتے اور ان کی ہر طرح کفالت فرماتے، یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری اور ضرورتمندوں کی برابر مدد کرتے تھے کوئی سائل اور ضرورتمند ان کے یہاں سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا، اپنے عزیزوں اور قرابت داروں کو پریشان دیکھتے تو ان کی پریشانی رفع کرنے کیلئے انھیں بڑی بڑی رقمیں یکمشت دیدیا کرتے، بعض ضرورتمند اور محتاج اشخاص یا بیوہ عورتیں خطوط لکھ کر اپنی احتیاج اور پریشانی بیان کرتیں تو ان کے نام فوراً منی آرڈر روانہ فرماتے۔

ایفائے عہد

مولانا وعدہ کے بڑے پکے تھے اسلئے وعدہ شکنی کو کسی حال میں بھی گوارا نہ کرتے تھے چاہے اس کیلئے انھیں کیسی ہی سخت زحمت کیوں نہ اٹھانی پڑتی، وہ جب کسی چیز کا عزم کر لیتے تو پھر اس کو فسخ کرنیکا خیال بھی دل میں نہیں لاتے اوپر ذکر آیا تھا کہ انھیں کثرت سے سفر کرنا پڑتا تھا، وہ جب کسی جگہ جانے کا وعدہ کر لیتے تو اس کو ہر حال میں پورا کرتے، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ بجنور کے کسی جلسہ میں تشریف لیجانیوالے تھے، عین وقت پر سخت موسلا دھار بارش شروع ہو گئی، ٹرین آنے میں جب ۱۵ - ۲۰ منٹ کی دیر اور رہ گئی تو انھوں نے تانگہ منگوانے کیلئے کہا، قاری اصغر علی

صاحب نے کہا اس وقت بارش سخت ہو رہی ہے اس میں کیسے تشریف لیجائیں گے، بھیگنے سے بیمار ہو جانیکا اندیشہ ہے اسلئے سفر ملتوی فرما دیں، تار بھیج کر اطلاع کر دی جائیگی مولانا نے بہت ناگواری سے فرمایا خوب وہاں ہزاروں کا مجمع اکٹھا ہو گا اسے میری تن آسانی سے کتنا دکھ ہو گا، چنانچہ اسی شدید اور طوفان خیز بارش میں روانہ ہو گئے اور یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان جب کسی بات کا وعدہ کر لیتا ہے تو اسے ضرور پورا کرتا ہے اور منافق کی طرح وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

ایک دفعہ بستی تشریف لے گئے تھے وہاں سے ٹانڈہ کے قریب کسی گاؤں میں ایک تقریب میں شرکت کیلئے روانہ ہونا تھا جس کا وعدہ کر لیا تھا، بستی سے گورکھپور ہوتے ہوئے شاہ گنج پہنچے، یہاں سے اکبرپور کی گاڑی پر سوار ہونا تھا، دسمبر کا آخری مہینہ تھا اور سردی شباب پر تھی، ٹرین میں بھی ٹھنڈک کم نہ تھی، کھڑکیوں سے سرد ہوا آ رہی تھی مگر شاہ گنج کے پلیٹ فارم پر تو غضب کی سردی تھی، پالا پڑ رہا تھا اور تیز و تند بچھوا ہوا کے جھونکے بھی آتے تھے، مولانا اس قیامت کی سردی میں بھی ۳ بجے شب میں پلیٹ فارم پر اپنے رفیق سفر مولانا احمد حسین لاہرپوری کیساتھ موسم کی شدت اور سردی کی زیادتی کا مقابلہ کر رہے تھے، مولانا لاہرپوری سے ضبط نہ ہوا اور کہنے لگے حضرت آپ کیساتھ سفر میں رہنا آسان کام نہیں، مولانا نے فرمایا ایک جدید تعلیم یافتہ نوجوان نے سفر میں میرے ساتھ رہنا چاہا، ۱۵ روز بعد علیل ہو کر اپنے مکان چلے گئے اور بعد کو واپس آنے کی ہمت نہ کر سکے[1]۔

بعض دفعہ سخت بیمار ہوتے، تیز بخار ہوتا لوگ اصرار سے منع کرتے کہ اس حالت میں سفر کا ارادہ ترک کر دیں مگر وعدہ کرنے کے بعد پروگرام کو درہم برہم کرنا یا ملتوی کرنا جانتے ہی نہ تھے۔

---

[1] نئی دنیا عظیم مدنی نمبر ص ۲۰۱ و ص ۲۰۲

قناعت و استغناء

مولانا کے خلق عظیم کا ایک مظہر قناعت و استغنا بھی ہے، وہ چاہتے تو بیش قرار تنخواہ بھی ان کو مل سکتی تھی اور وہ اعلیٰ عہدہ اور بڑے منصب پر بھی فائز ہو سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنے اسلاف کی یادگار دارالعلوم سے جدا اور بے تعلق ہونا اور اسکی خدمت سے دست کش ہونا کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں کیا اسلئے مدۃ العمر اسی کے معمولی اور قلیل مشاہرہ پر قانع اور راضی رہے، ایک بار حکومت مصر کی جانب سے جامع ازہر میں شیخ الحدیث کے عہدہ کی پیشکش بھاری تنخواہ پر ہوئی، سواری کیلئے موٹر اور سال میں ایک دفعہ ہندوستان آنے جانے کا کرایہ بھی پیش کیا گیا مگر مولانا اس دانہ و دام کے چکر میں کہاں پڑنے والے تھے [۱]

برو ایں دام بر مرغ دگر نہہ ⁖ کہ عنقا را بلند است آشیانہ

سفر اور جلسوں میں شرکت روزآنہ کا معمول تھا، فرسٹ کلاس یا سکنڈ کا کرایہ پیش کیا جاتا اسکے علاوہ ایک خادم بھی ساتھ لانیکی اجازت تھی مگر مولانا کی قناعت پسند طبیعت اسکو قبول نہیں کرتی اور وہ تھرڈ کلاس میں تنہا سفر کرتے اگر لوگ پیشگی رقم بھیج دیتے تو وہ فاضل رقم واپس کر دیتے اور اصرار کے بعد بھی قبول نہ فرماتے۔

ایام سفر کی تنخواہ مدرسہ سے نہ لیتے، یہانتک کہ اسکی ضرورت سے بھی سفر کرتے تو ان دنوں کی تنخواہ نہ لیتے، علالت کی چھٹی با تنخواہ لینے کا حق ہوتا تھا مگر ان دنوں کی تنخواہ بھی نہ لیتے، اپنے خاص خدام اور نیاز مندوں کا اگر خط نہ آتا اور ملاقات کو عرصہ گذر جاتا تو اطلاع کرکے خود انکی دلجوئی اور دریافت حال کیلئے انکے یہاں پہنچ جاتے اور واپسی کے وقت اصرار کے باوجود کرایہ کی رقم نہ لیتے، یہ اور اس طرح کی متعدد باتوں سے ان کی بے نیازی، قناعت اور شان استغنا کا اندازہ ہوتا ہے اب ایسی مثالیں کہاں ملیں گی؟

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ ⁖ افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

---

[۱] نئی دنیا عظیم مدنی نمبر صـ ۲۱۵

غیرت و خودداری

مولانا نہایت غیور اور خوددار واقع ہوئے تھے اسلئے کسی کا دست نگر اور ممنون احسان ہونا انھیں بالکل گوارا نہ تھا، مولانا علی میاں لکھتے ہیں "الید العلیا خیر من الید السفلی" پر ساری زندگی عمل رہا، وہ بہت کم دوسرں کے ممنون ہوئے اور ایک عالم کو ممنون کیا، ہر موقع پر وہ کوشش کرتے تھے کہ ان کا ہاتھ اونچا رہے اور استفادہ کے بجائے ان کو نفع و افادہ کا موقع ملے، اگر کسی نے ذرا سا بھی ان کے ساتھ سلوک کیا اور کسی موقع پر کوئی خدمت انجام دی ہے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس فکر میں رہتے تھے کہ اس کیساتھ کوئی سلوک کریں اور اسکے حق کو ادا کریں۔[1]

ان کے خوردوں اور نیازمندوں کو اکثر ان کی زجر و توبیخ اسلئے برداشت کرنی پڑتی تھی کہ وہ معمولی اور ادنیٰ خدمت بڑھ کر انجام دینا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی کی دعوت پر حضرت ان کے وطن راجہ پور سکرور (ضلع اعظم گڈھ) تشریف لیجا رہے تھے، راستے میں ہم طلبائے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی درخواست پر تھوڑی دیر کیلئے مدرسہ پر رک جانا منظور فرمایا۔ سخت گرمی تھی، ہم طالب علموں نے پنکھا جھلنا چاہا تو سختی سے منع فرمایا اور بہت غضب ناک ہوئے، اس طرح کے اور موقعوں پر دوسروں کو بھی برابر انکی ڈانٹ ڈپٹ سننی پڑتی تھی، اگر کبھی دروازے کی طرف انھیں جاتے دیکھ کر کوئی ان کے لئے دروازہ کھول دیتا یا کھولنے کی کوشش کرتا تو اس سے بھی منع کرتے اور سخت برہمی ظاہر فرماتے۔ دراصل ان کی غیرت و خودداری اپنے لئے نہ کسی طرح کی کوئی خصوصیت و امتیاز پسند کرتی اور نہ کسی کا ممنون کرم ہونا گوارا کرتی۔

مخالفین کیساتھ حسن سلوک

مولانا حسین احمد مدنی کا حسن خلق اور شریفانہ برتاؤ صرف دوستوں اور قدردانوں ہی کے لئے مخصوص نہ تھا بلکہ ان کی نظر میں دوست، دشمن، موافق، مخالف، اپنے پرائے، سنی شیعہ،

---

[1] پرانے چراغ ص۱۱۳ و ص۱۱۴۔

مسلم ہندو سب برابر تھے اور وہ سب کے کام آکر قلبی راحت محسوس کرتے تھے، جن لوگوں نے ان کی مخالفت اور ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا تھا وہ بھی جب کوئی ضرورت اور احتیاج لیکر ان کے پاس آئے تو وہ نہایت خوشی اور انشراح سے ان کی ضرورت پوری کرتے ۱۹۴۷ء سے پہلے سیاسی مہم اور الیکشن کے دوران مولانا کے خلاف جو طوفان بدتمیزی برپا کیا گیا اور جس وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا گیا اس کے ذکر سے آج بھی ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے مگر مولانا کی زبان پر کبھی بھول کر بھی کوئی کلمہ شکایت نہ آیا، ان کا استخفاف کرنیوالے بھی خدمت میں سفارشی خط لکھانے اور اپنا کام کرانے کیلئے آتے تو مولانا نہایت بشاشت اور پورے نشاط کیساتھ ان کی فرمائش پوری کرتے، اس موقع پر اگر کسی خادم اور مخلص نے گذشتہ قصوں اور دکھڑوں کا ذکر کرنا چاہا تو اس کو سختی سے منع کیا۔

دشمنوں سے اعراض و مسامحت اور ان پر رحم و کرم مولانا کا نمایاں وصف تھا، وہ اپنے مخالفوں سے عفو و درگذر کرنے ہی پر بس نہ کرتے بلکہ ان کو نفع پہنچانے کی فکر میں رہتے، جو لوگ سب و شتم، خشت باری، مخالفانہ نعرے، اشتہار بازی اور جلسوں کو درہم برہم کرنے کے علاوہ حرب و ضرب اور جدال پیکار پر آمادہ ہو جاتے تھے حضرت ان کے لئے بھی دعائے خیر فرماتے تھے۔

اگر کوئی اذیت پہنچاتا اور تحقیر و استخفاف کرتا تو اس کے ساتھ بھی ہمدردی اور شفقت کا معاملہ فرماتے، ایک بار جمعیۃ علماء کے ایک پروگرام کے تحت رنگون تشریف لیگئے مگر بعض اسباب کی بنا پر چند ہی روز بعد بحری جہاز سے واپس آنا پڑا، میزبان حاجی داؤد ہاشم نے اپنے خاص ملازم محمد ذاکر کو بھی کلکتہ تک کیلئے ساتھ کر دیا تھا، مولانا کا ٹکٹ فرسٹ کلاس اور ذاکر صاحب کا ملازم کی حیثیت سے تھرڈ کلاس کا تھا، مولانا کی سیٹ جس کمرہ میں تھی اس میں کوئی دوسرا مسافر نہ تھا اس لئے انھوں نے چاہا کہ ذاکر صاحب بھی زیادہ وقت یہیں گذاریں لیکن جہاز کا بوائے اس پر معترض ہوا؛ اس لئے مولانا خود زیادہ وقت تھرڈ کلاس

میں ذاکر صاحب کے پاس گذارتے تھے، کلکتہ پہنچنے پر دستور کے مطابق بوائے فرسٹ کلاس
کے مسافروں سے انعام یا بخشش مانگنے آیا، گو اس نے راستہ میں مولانا کو تکلیف دی تھی اور
ذاکر صاحب کا اصرار تھا کہ حضرت اس کو ایک پیسہ بھی نہ دیں، اس زمانہ میں ایک روپیہ بھی
نہایت قیمتی ہوتا تھا اور کوئی صاحب بہادر بھی اس سے بڑا انعام بوائے کو نہیں دیتا تھا
مگر مولانا نے چار روپے نکالے، بوائے کو اسے لینے کی ہمت نہ ہوئی اور اس نے اپنی بدسلوکی
اور بدتمیزی کا انتقام اور مذاق سمجھا مگر مولانا نے فرمایا تمہارے ہی لئے ہے، اس کے بعد
اس نے جھجکتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور مولانا نے چاروں روپے دیدیئے[1]۔

تواضع، انکسار، سادگی اور وضعداری

مولانا کی زندگی تکلف و تصنع سے خالی اور بناوٹ سے پاک تھی، جس سے ملتے نہایت بے تکلفی سے ملتے، اور اپنی خوش طبعی اور ظریفانہ باتوں سے اسے
مانوس اور بے تکلف بنا لیتے، اس لئے اپنے لئے کسی طرح کا اعزاز و اکرام پسند نہ فرماتے،
اگر لوگ انہیں آتے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو جاتے تو وہ سخت کراہیت اور ناراضگی کا اظہار
فرماتے اور لوگوں کو کھڑے دیکھ کر ٹھہر جاتے اور جب تک بیٹھ نہ جاتے رکے رہتے اور
مجلس میں نہ آتے۔

اگر کسی کے یہاں کسی عذر اور خاص وجہ سے رات کو دیر میں پہنچتے اور گھر والے
کھانے سے فارغ ہو چکے ہوتے تو جو کچھ بچا کھچا کھانا ہوتا اسی کو کھا لیتے اور از سر نو کھانا
پکانے کی زحمت نہ دیتے، لکھنؤ اس زمانہ میں سیاسی ہنگاموں اور سرگرمیوں کا خاص مرکز
تھا اس لئے مولانا وہاں اکثر تشریف لیجاتے تھے دوسرے قومی و سیاسی رہنما بڑے اور
شاندار ہوٹلوں یا قیصر باغ کے پرانے محلات یا امرا کی کوٹھیوں میں قیام کرتے مگر مولانا اپنی
سادگی اور انکساری کی بنا پر ان جگہوں میں قیام کرنا پسند نہ کرتے بلکہ ہمیشہ بازار جھاؤلال

---

[1] الفرقان وفیات نمبر ص۶۷ و ص۶۸۔

میں حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی کے مکان میں قیام کرتے جوان سے بیعت تھے۔ اس گھر کے قریب ہی مسجد تھی اور یہاں مولانا کو اپنے معمولات پورا کرنے میں سہولت ہوتی تھی، اگر ڈاکٹر صاحب مولانا کی وجہ سے کچھ تکلف کرتے تو شکایت فرماتے۔

مولانا نے اپنی اس وضعداری اور معمول میں کبھی فرق نہیں آنے دیا، سیاسی اہم کانفرنسوں اور کانگریس کے جلسوں کے وسیع پروگرام اور ان میں ہمہ وقت شرکت اور مباحثوں میں حصہ لینے کی بنا پر تاخیر کے باوجود ہمیشہ ڈاکٹر صاحب ہی کے یہاں قیام کرتے اور یہیں کھانا کھاتے اور استراحت فرماتے۔

مولانا مدنی ہمیشہ اپنے کو ننگ اسلاف لکھتے اور ایثار رسمًا یا تکلفاً نہیں کرتے تھے بلکہ وہ واقعتاً اپنے کو ننگ اسلاف ہی سمجھتے تھے، وہ اپنے وجود کو بے حقیقت اور بے قیمت خیال کرتے تھے، مولانا علی میاں ایک مرتبہ کم عمری میں ان کا ہاتھ دھلا رہے تھے اور وہ بڑے درد وحسرت کے ساتھ یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

ذهب الذين يعاش فی اکنافهم ؛ بقی الذين حياتهم لا تنفع

(اور وہ لوگ رخصت ہو گئے جن کے سائے میں زندگی گذر جاتی تھی اور وہ لوگ رہ گئے ہیں جن کی زندگی کچھ کارآمد نہیں)۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کا بیان ہے کہ اکثر وہ یہ شعر بھی پڑھا کرتے تھے خصوصاً اس وقت جب کوئی ان سے بیعت کی درخواست کرتا ؎

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم ؛ در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا[1]

حقیقت یہ ہے کہ عجز و فروتنی اور تواضع وانکسار ان کی طبعی خصوصیت اور شخصیت کا خاص جوہر تھا، اس میں نہ تکلف وتصنع کا کوئی شائبہ ہوتا تھا اور نہ نام ونمود اور مکر و ریاکاری کا کوئی جذبہ، چھوٹے بڑے، امیر غریب، عالم نامی سب کے ساتھ خندہ پیشانی سے

---

[1] پرانے چراغ ص۱۱۵۔

پیش آتے، لوگ مدعو کرتے تو انکی دلجوئی کے خیال سے دعوت رد نہ کرتے اور اپنے آرام و راحت کا خیال کئے بغیر ان دور دراز علاقوں میں بھی پہنچ جاتے جہاں نہ سڑک ہوتی اور نہ سواری کا راستہ، مولانا اپنی عاجزی و فروتنی کی وجہ سے کئی کئی میل کا سفر بیل گاڑیوں سے طے فرماتے۔

ان کی سادگی پسند طبیعت کو اپنے لئے کسی قسم کا اہتمام اور تکلف سخت گراں گذرتا تھا۔ مولانا محمد منظور نعمانی کے وطن سنبھل کے ایک مدرسہ میں کوئی بڑا جلسہ ہوا اس میں حضرت والا کے علاوہ جماعت دیوبند کے دوسرے اہم اکابر مولانا مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ بھی شریک تھے، ایک صاحب نے سب کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا اور سواری کا انتظام بھی کیا، اور تمام حضرات سواری ہی سے ان کے مکان پر پہنچے مگر مولانا مدنی اپنے ایک شاگرد کی رہبری میں پیدل تشریف لے گئے، حالانکہ ۱۲ بجے کا وقت اور گرمی کا موسم تھا اور جلسہ گاہ سے ان کے مکان کا فاصلہ ایک میل تھا[1]

انسان کا نفس بڑا موٹا ہوتا ہے وہ خودستائی اور اپنی تعریف و تحسین بھی کرتا ہے اور جب دوسرے اس کی مدح و ستائش کرتے ہیں تو خوب مگن ہوتا ہے مگر مولانا عجز و انکسار کا پیکر تھے، خودستائی تو درکنار اگر کوئی ان کے سامنے انکی تعریف و توصیف کرتا تو نہایت برافروختہ ہوجاتے، انھیں اپنی کسی قسم کی ستائش سننا گوارا نہ ہوتی فوراً اس کی تردید فرمانے لگتے اور یہ حدیث بھی بیان کرتے کہ "منہ پر تعریف کرنیوالے کے منہ میں خاک ڈال دو"۔ ایک مرتبہ وہ ۱۹۳۶ء میں مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ تشریف لائے، مشہور قوم پرور شاعر اور اعظم گڈھ کے بہت ہی ممتاز اور کامیاب وکیل مولوی اقبال احمد خاں سہیل مرحوم نے اس موقع کیلئے ایک تہنیتی نظم کہی تھی، پوری نظم میں

---

[1] الفرقان وفیات نمبر ص۲۔

مولانا کی کچھ ایسی مبالغہ آمیز تعریف نہیں کی گئی تھی، ان کی نظم کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ صاحب تفسیر تدبر قرآن مولانا کا خیر مقدم کرنے کیلئے کھڑے ہوئے ان کی تقریر میں مولانا کی مناسب اور مبنی برحقیقت خصوصیات و کمالات کا تذکرہ تھا لیکن جب مولانا مدنی تقریر فرمانے کیلئے کھڑے ہوئے تو تہنیتی نظم اور خیر مقدمی تقریر پر اپنے شدید غم و غصہ اور سخت برہمی کا اظہار فرمایا اور دونوں حضرات کی زجر و توبیخ کی اور اوپر والی حدیث بھی بیان کی۔

اخلاص اور بے غرضی

مولانا حسین احمد مدنی رح کا ہر کام حسبۃً للہ ہوتا تھا، اس میں نہ کوئی غرض و طمع شامل ہوتی تھی اور نہ ریا و نمود کا کوئی دخل ہوتا تھا، اخلاص و بے نفسی ان کی سرشت میں داخل تھی، اور یہی ان کے تمام اعمال و مساعی کا محرک بھی تھی، جو لوگ مولانا کے سیاسی طرز فکر کے مخالف تھے یا اس کو ان کی خطائے اجتہادی سمجھتے تھے وہ بھی اعتراف کرتے تھے کہ ان کی ساری تگ و دو میں نہ خود غرضی و موقع پرستی کا کوئی شائبہ تھا اور نہ سربلندی و قیادت کی ہوس اور خواہش تھی، حرص و طمع اور حب جاہ سے اللہ نے ان کے دل کو پاک رکھا تھا۔

صحت اور آرام کی پرواہ کئے بغیر وہ مسلسل سفر، ہمہ وقت کے دورے اور پیہم سیاسی سرگرمیاں ایک دینی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے تھے اور اس میں ان کی کوئی ادنیٰ غرض اور معمولی منفعت شامل نہ ہوتی، ہندوستان کی جنگ آزادی میں انھوں نے نہایت سرفروشی اور جانبازی سے بڑا نمایاں اور قائدانہ حصہ لیا اور اس راہ میں جو غیر معمولی صعوبتیں اور مشقتیں جھیلیں اس میں کسی مادی منفعت اور ذاتی مصلحت و فائدہ کا کوئی دخل نہ تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:۔

"جب ہندوستان آزاد ہوگیا اور ملک میں حکومت خود اختیاری قائم ہوئی تو وہ اپنے اصلی کام درس و تدریس اور تزکیہ و ارشاد میں ایسے مصروف اور سیاسی جدوجہد

کے میدان سے ایسے کنارہ کش ہو گئے جیسے ان کا کام ختم ہو چکا ہو، صفِ اوّل کے قائدین میں میرے خیال میں تنہا وہ ایک ایسے شخص تھے جنھوں نے اپنی پچھلی سیاسی زندگی اور قربانیوں کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت وصول نہیں کی اور وقت سے فائدہ نہیں اٹھایا یہاں تک کہ جب ان کو صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے سب سے بڑا اعزازی خطاب عطا کیا گیا تو انھوں نے اس کے قبول کرنے سے صاف معذرت کر دی، اگرچہ ان کی طبعی تواضع وانکسار نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ یہ ان کے اسلاف کے شیوہ و مسلک کے خلاف ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ اپنے دامنِ اخلاص پر خفیف سے خفیف داغ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے ان کے اس فیصلے نے ایک بار پھر اس حقیقت کا اظہار کر دیا کہ ؏

عنقا را بلند است آشیانہ

نہ صرف سیاسی جدوجہد بلکہ انھوں نے اپنے کسی جوہر، کسی کمال، کسی متاع اور کسی ہنر کی کوئی قیمت نہیں لی[1]

وہ اپنی بے غرضی اور اخلاص کی وجہ سے نہ کبھی مصلحت پسندی اور دو رنگی اختیار کر سکے اور نہ مکاری، ریاکاری، فریب اور طمع کاری کو اپنا شیوہ بنا سکے جو آج کل کے سیاسی لیڈروں کا عام وطیرہ ہے۔

صاف گوئی

مولانا مدنیؒ متواضع، خلیق، ملنسار، متحمل مزاج اور عجز و فروتنی کا پیکر ہونے کے باوجود بڑے صاف گو اور بے باک تھے، اس میں نہ کسی کی رو رعایت کرتے تھے اور نہ کسی طرح کی لاگ لپیٹ سے کام لیتے، دینی و اسلامی معاملات میں حمیت، غیرت، تشدد اور صلابت رائے کیلئے بہت ممتاز تھے اور اس میں کسی قسم کی مداہنت مصلحت اور نرمی کو پسند نہیں کرتے تھے ان کے نزدیک جو بات درست اور صحیح ہوتی اس کو برملا اور علی الاعلان کہہ دیتے اور اس معاملہ میں نہ کسی لومت لائم

---

[1] پرانے چراغ ص۱۱۱۔

کی پرواہ کرتے اور نہ کسی کی آزردگی اور ناراضگی کا خیال کرتے۔

تقسیم سے قبل کے ہنگامہ خیز ماحول میں مولانا کی رائے اور ان کا سیاسی خیال عام مسلمانوں کے جذبات وخواہشات اور اس وقت کی مقبول قیادت کے سیاسی طرز فکر سے جدا تھی لیکن مولانا نے نہ اس کی ذرا بھی پرواہ کی اور نہ ان کے جذبہ صادق حقیقت شناس نظر اور احساس فرض نے ان کو رائے عام کے سامنے سپر انداز ہونے دیا بلکہ اپنے عقیدہ وضمیر کے مطابق اس خیال کو جس کو وہ صحیح سمجھتے تھے پوری جرأت وبے باکی سے پیش کیا اور رائے عام کی طاقت کے سامنے کلمہ حق کو فرض وافضل سمجھ کر ادا کیا اور اپنے خیالات کی تبلیغ واشاعت فرمائی اس کیلئے پورے ملک کا دورہ کیا اور جا بجا تقریریں بھی کیں جس کا انھیں بڑا سخت خمیازہ بھگتنا پڑا جس کی ایک حد تک تفصیل اوپر گذر چکی ہے لیکن یہ مرد حق ہیں اور حق آگاہ ان شدائد ومحن کا سامنا کرتا رہا مگر حق کو باطل کہنے یا دونوں کو گڈمڈ کرنے کیلئے تیار نہ ہوا ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش ✧ میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

احتیاط، ذمہ داری اور معاملات کی تحقیق وتفتیش اور چھان بین

مولانا کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ معاملات کی حقیقت کو جاننے اور اس کی تہہ تک پہنچنے کی پوری کوشش کرتے اور جو بات کہتے یا کرتے تھے، بشریت کے تقاضے سے یہ تو ہوسکتا ہے کہ کسی معاملہ کی تحقیق میں ان سے کبھی خطا سرزد ہوجاتی رہی ہو لیکن غور وفکر اور تامل وتحقیق کے بعد ہی وہ کوئی رائے قائم کرتے تھے اور فیصلہ کرتے تھے جس سے ان کی احتیاط اور ذمہ داری کا پتہ چلتا ہے چنانچہ جب ان کی تحقیق اور چھان بین سے ان کے نزدیک کوئی بات صحیح، درست اور محقق ثابت ہوجاتی تو پھر کسی کی مروت یا رعایت نہ کرتے اور جو کچھ سمجھتے تھے اس کو دوسروں کو بھی بتانا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے ۱۹۳۶ء میں

مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تکفیر کا ہنگامہ برپا ہوا، جماعت دیوبند کے اکثر علماء و مفتیان کرام اس ہنگامہ میں پیش پیش اور تکفیری مہم میں پوری طرح شریک و دخیل تھے لیکن صرف مولانا کی ذات تنہا تھی جس نے اس ہنگامہ سے اپنے کو علیحدہ رکھا اور دیوبند سے بنفس نفیس معاملہ کی تحقیق و تفتیش کیلئے سرائے میر کا سفر کیا چنانچہ جب چھان بین کے بعد انھیں یقین و اطمینان ہو گیا کہ یہ دونوں بزرگ اس معاملہ میں بے گناہ اور بے قصور ہیں تو انھوں نے ان کی تکفیر سے اپنی برأت کا اعلان کیا اور اپنی جماعت کے اکابر و اساطین کے علی الرغم ان مظلومین کی حمایت و دفاع کیلئے پوری طرح کمربستہ ہو گئے، اسکی وجہ سے انھیں اپنے حلقہ کے لوگوں کی سخت ناراضگی بھی مول لینی پڑی۔

اگر کسی معاملہ کی ان کو تحقیق نہ ہوتی تو اس کے متعلق اظہار خیال و اظہار رائے سے باز رہتے، ایک دفعہ کسی صاحب نے اپنی ایک کتاب پیش کی اور اس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی، مولانا نے اِدھر اُدھر سے اسے دیکھا اور یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ جب تک پوری کتاب بغور نہ پڑھ لی جائے اسکے متعلق کچھ لکھنا مناسب نہیں۔

ایک دفعہ ایک مدرسہ کے لوگوں نے اصرار کیا کہ اس کے معائنہ کے رجسٹر پر حضرت چند سطریں تحریر فرمادیں، ارشاد ہوا کہ جب تک مدرسہ کا معائنہ نہ کرلیا جائے اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا جاسکتا اور اس وقت معائنہ کا کوئی موقع نہیں البتہ دعا کئے دیتا ہوں[1]

عزم واستقلال

مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ذات عزم و استقلال اور صبر و استقامت کا پہاڑ تھی، وہ جس بات کو طے کر لیتے اور اس کا قطعی اور مصمم ارادہ فرمالیتے پھر اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہوتا اور کہیں سے ان کے پائے ثبات و استقلال میں لغزش نہ پیدا ہوتی تھی، جس چیز کو وہ حق و صواب سمجھتے اس سے نہ کوئی ان کو منحرف اور برگشتہ کر سکتا تھا اور نہ کسی کے انکے ساتھ دینے اور نہ دینے اور کسی

---

[1] الجمعیۃ مدنی نمبر صفحہ ۴۶

کی اسکی رضامندی یا ناراضگی اور تحسین یا ملامت کی پرواہ کرتے بلکہ یکہ وتنہا اپنے موقف پر پوری مضبوطی کیساتھ جمے رہتے، انکے معتمد رفقاء اور مخلص نیاز مند بھی انکے ارادے کو تبدیل نہیں کرسکتے تھے۔

مولانا اپنے استاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کیساتھ آزادی وحریت کی جس راہ پر گامزن ہوئے اسمیں طوفان آئے، آندھیاں چلیں، بگولے اٹھے، زلزلے آئے، بجلیاں کوندیں، کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا، لیکن یہ مرد حق آگاہ وحق پرست اپنی جگہ پر پہاڑ بن کر کھڑا رہا اور اسکے پائے ثبات میں جنبش نہ آئی، گالیاں سنیں اور قید وبند کی اذیتیں برداشت کیں مگر استقامت کی اس بھاری چٹان میں تزلزل نہ آیا۔

تقسیم کے بعد جب مسلمانوں کے قدم اکھڑ چکے تھے اور خود حکومت کی سازش سے انھیں ملک سے بے دخل کرنیکی مہم چلی ہوئی تھی، مولانا خود استقلال واستقامت کی چٹان بنے رہے اور مسلمانوں کو بھی مکمل طور پر جمے رہنے اور صبر وشکر سے ہندوستان ہی میں ٹھہرے اور رکے رہنے کی تلقین فرماتے رہے، ان کی ان باتوں اور ان کے طرز عمل سے مسلمانوں کو بھی بڑا حوصلہ اور ہمت ملی اور ان کے اکھڑے ہوئے قدم جمے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خلق عظیم اور لطف عمیم کے جلوے نہایت گوناگوں ہیں، ان کی بے داغ زندگی اور پاکیزہ سیرت وکردار کے یہ نقوش لازوال ہیں، کاش ہم ان سے سبق لیکر اپنی سیرت کی تعمیر وتشکیل کرتے تاکہ ملک اور ملت کے مقدر کا ستارہ پھر چمک اٹھے آج ملک جس شدید بحران اور اخلاقی پستی اور گراوٹ میں مبتلا ہے، آئندہ اس کا انجام بد سے بدتر ہو سکتا ہے، اس بحران پر قابو پانے کیلئے ضروری ہے کہ اس زعیم ملک، فخر وطن اور نازش دین وملت کی سیرت وکردار کو نمونہ عمل اور مشعلِ راہ بنایا جائے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

کے اسفار پورنیہ

(مکمل و مختصر اجمالی جائزہ)

حضرت شیخ الاسلام رح کے اسفار پورنیہ کو ہم زمانہ کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

(۱) حصولِ آزادی یعنی ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء سے قبل کے اسفار۔

(۲) حصول آزادی کے بعد کے اسفار۔

حصول آزادی سے قبل جنگ آزادی کے زمانے میں اور بعد حضرت شیخ الاسلام رح کے قدیم پورنیہ ضلع کے مندرجہ ذیل مقامات پر تشریف آوری کا اب تک ناکارہ راقم الحروف کو پتہ چل سکا ہے۔

(۱) پورب کاشی باڑی (موجودہ مغربی دیناج پور مغربی بنگال کشن گنج سے دس میل پورب) (۲) کشن گنج (ضلع پورنیہ) (۳) علاقہ بہادر گنج (ضلع پورنیہ) (۴) مجلس پور (موجودہ مغربی دیناج پور مغربی بنگال) (۵) کٹیہار (موجودہ ضلع کا صدر مقام) (۶) جلال گڈھ (ضلع پورنیہ) (۷) ڈوریا (ضلع پورنیہ) (۸) ارریہ صدر مقام (ارریہ سب ڈویزن ضلع پورنیہ) (۹) لہٹوڑہ (ضلع پورنیہ) (۱۰) بن منکھی (ضلع پورنیہ) (۱۱) بارا عیدگاہ (ضلع پورنیہ) (۱۲) بشن پور پرسرائے (ضلع پورنیہ) (۱۳) بیر نگر (ضلع پورنیہ) (۱۴) جدوا پٹی

(موجودہ ضلع مدھے پورہ) (۱۵) محرم پور رگھیلی (موجودہ ضلع مدھے پورہ) (۱۶) مرلی گنج (موجودہ ضلع مدھے پورہ) (۱۷) بھوکراہا اسلام پور (ضلع پورنیہ)

آزادی سے قبل کے اسفار

مخدومی حضرت مولانا منور حسین صاحب نور اللہ مرقدہٗ خلیفۂ اجل حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سہارنپوری مہاجر مدنیؒ نے ایک بار فرمایا آزادی سے قبل کے زمانے میں حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ پورب کاشی باڑی کئی دفعہ تشریف لے گئے ہیں۔

اسی زمانے میں کشن گنج بھی تشریف لائے تو دو ایک بار کشن گنج کے کسی مارواڑی کے ہاں ٹھہرے، مزید فرمایا! حضرت کانگریس کے دوران میں بہادر گنج کے علاقہ میں بھی تشریف لے گئے وہاں شرافت علی مستان وغیرہ کانگریس کے ورکر تھے۔ ان اسفار کی تفصیلات ابھی تک راقم الحروف کو نہیں مل سکی ہیں

جلال گڈھ کا پہلا سفر ۳۱ء یا ۳۲ء

حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ غالباً ۳۲ء میں جلال گڈھ تشریف لائے وہاں ایک انجمن قائم ہوئی تھی جس کا نام انجمن اسلامیہ جلال گڈھ تھا حضرت شیخ الاسلامؒ کے ساتھ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا عبدالوہاب صاحب دربھنگویؒ، مولانا قمر و مولانا عثمان صاحب دربھنگوی و دیگر علمائے کرام تھے حضرت کو انجمن کے جلسہ میں شرکت کی دعوت حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب اور ان کے صاحبزادے حضرت مولانا عبید اللہ صاحب دربھنگوی نے دی تھی، انھیں حضرات نے انجمن کی بنیاد ڈالی تھی، حضرت کے میزبان محمد حسن صاحب مرحوم مہیں ساکن لبوڑہ نزد جلال گڈھ کے تھے۔

یہ بہت شاندار جلسہ تھا۔ ہزاروں ہزار کی تعداد میں لوگ دیہاتوں سے اُمڈ امنڈ کر آئے تھے، حضرت نے اس میں تقریر فرمائی ہزاروں ہزار کی بیعت ہوئی،

استاذی حضرت مولانا بشیر الدین قاسمی مدظلہ العالی مسکونہ پی ٹی ڈومریا سب ڈویژن ارریہ ضلع پورنیہ مرید حضرت شیخ الاسلام اور خلیفہ حضرت فدائے ملت مدظلہ العالی دامت برکاتہم اس جلسے کے متعلق فرماتے ہیں۔

: ایسا اجتماع پہلی بار ان آنکھوں نے دیکھا، وہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا جب ہی دیوبند کا شوق دل پر طاری ہوا، ہزاروں ہزار شرف بیعت سے مشرف ہوئے:

انھیں حضرات کی زبانی چند واقعات اس جلسے کے سلسلے کے سنئے۔

ایک واقعہ یہ ہوا کہ مہمانوں کے ہجوم کی وجہ سے کھانا کھلانے کا الگ الگ انتظام کیا گیا تھا، حضرت کے بہت سے احباب و متوسلین ساتھ کھانے سے محروم ہوگئے۔

اس پر حضرت نے فرمایا "میں تو مولانا عبدالعزیز کا قیدی ہوں" یہ سنکر مولانا عبید اللہ دربھنگوی نے اپنے ابا مولانا عبدالعزیز سے فرمایا کہ یہ طریقہ حضرت کو ناپسند آیا:

چنانچہ عام دسترخوان جاری کیا گیا، حضرت خوش ہوگئے شاگرد رشید حضرت مولانا بشارت کریم گڑھول شریف مظفرپور اور پورنیہ ضلع کے عالم حضرت مولانا انعام الحق صاحب کجلھوی چچا و خسر مولانا جواد الحق مرحوم کی تقریر بہت علمی اور لاجواب ہوئی، حضرت شیخ الاسلام سن کر بہت خوش ہوئے دعائیں دیں اور فرمایا:

"پورنیہ میں ایسے لعل موجود ہوتے ہوئے ہمیں کیوں بلایا گیا" پھر ان کی بہت تعریف فرمائی۔

جلال گڈھ کا دوسرا سفر ۱۹۳۶ء

مولانا بشیر الدین صاحب قاسمی مدظلہ العالی کے بیان کے مطابق حضرت شیخ الاسلام، غالباً دوسری بار پھر جلال گڈھ تشریف فرما ہوئے، حضرت کا یہ سفر

مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے سلسلہ میں ہوا تھا، جبکہ مسلم لیگ کے خلاف جہاد تھا اس بار بھی بھاری تعداد میں حضرت کے دست حق پرست پر ہزاروں افراد نے بیعت کی۔

مولانا موصوف تحریر فرما ہیں کہ: اس بار کٹیہار میں سعید پور سے واپس لوٹتے ہوئے لیگ کے غنڈوں نے اذیت در اذیت پہنچائی، اس لیے ارباب مسلم پارلیمنٹری بورڈ نے حفاظت کے خیال سے چند پشاوری نوجوانوں کو بندوق کے ساتھ سفر کرایا۔"

آزادی کے بعد کے اسفار

حضرت شیخ الاسلام، ۱۹۴۸ء میں کشن گنج تشریف لائے، پورنیہ ضلع جمعیت کانفرنس میں شرکت فرمائی، آپ نے یہاں دو دن قیام فرمایا، اتحاد و ترقی کے جلسے میں شریک ہوئے، ہندو مسلمانوں کو مل جل کر رہنے کی تلقین فرمائی، مسلمانوں کو جم کر رہنے کی اور اپنے پیغمبرؐ کے طور طریقوں پر زندگی گذارنے ملکی بھائیوں سے مل جل کر رہنے اور دیش کی ترقی کے کاموں میں حصہ لینے کی تاکید فرمائی۔

۲۲/اپریل ۱۹۴۹ء کو کٹیہار تشریف لائے، وہاں سے جلال گڈھ اور ارریہ تشریف لے گئے، سیرت کے جلسوں میں تقریر فرمائی، مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت اور سنت پر گامزن ہونے کی تلقین فرمائی، کافی لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت بھی ہوئے، آپ نے مسلمانوں کو ہندوستان میں جم کر رہنے کی اور دوسری ذات کے لوگوں سے محبت اور پریم کے ساتھ زندگی گذارنے اور دیش کی ترقی میں حصہ لینے کی تلقین کی،

۱۹۵۰ء میں مدرسہ محمدیہ کاشی باڑی تشریف لے گئے اور مدرسے کے سالانہ اجلاس میں تقریر فرمائی، اس موقع پر کافی بیعتیں ہوئی۔

۱۲ر فروری ۱۹۵۱ء کو آپ بیرنگر بہریا تشریف لائے سیرت کے جلسے میں تقریر کی، اور تین دن یہاں قیام فرمایا۔

غالباً ۱۹۵۲ء میں آپ بن منکھی سے بیرنگر۔ للکوریہ، جدوا ہٹی، محرم پور، نگھیلی مرلی گنج تشریف لے گئے۔

۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۳ء کو مالدہ سے کٹیہار تشریف لائے اور وہاں کی جامع مسجد میں تقریر فرمائی، ۴ر مارچ ۱۹۵۶ء کو آپ کٹیہار تشریف لائے، وہیں سے ڈوریا، کشن گنج، کاشی باڑی (مغربی دیناج پور) تشریف لے گئے، کشن گنج اور ڈوریا کے جلسوں میں تقریر فرمائی، ان اسفار میں بھی ہر جگہ ہزاروں ہزار کی تعداد میں لوگ بیعت ہوئے

ضلع پورنیہ پر حضرت شیخ الاسلام کے مسلسل اسفار کے اثرات

علم دین کا شوق شمالی مشرقی بہار یعنی پورنیہ اور اطراف پورنیہ میں پہلے خالص دینی تعلیم کے حصول کا شوق برائے نام تھا، یہاں کے لوگ اپنے بچوں کو عموماً فارسی پڑھاتے تھے اور فارسی کی تعلیم خاصی ہوتی تھی انگریزوں کے عہد میں انگریزی تعلیم کا کچھ رواج ہونے لگا، اعلیٰ دینی تعلیم خال ہی خال طلبہ حاصل کرتے تھے، پورنیہ میں عربی کا بس ایک مدرسہ تھا مدرسہ محمدیہ، اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے چشمۂ رحمت غازی پور (یوپی) کچھ کچھ طلبہ جاتے تھے، ان اطراف میں حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی قدم رنجہ فرمائی سے پہلے دیوبند، مظاہر علوم یا ان جیسے اداروں میں یہاں کے بس اکّے دکّے طالب علم

ہی تھے۔

مگر حضرت شیخ کے اس ضلع کے برابر اسفار اور ان کی دعاؤں کی برکت سے یہاں کے عوام میں علم دین کا شوق نسبتاً زیادہ ہونے لگا، اور اس کے حصول کے لئے دیوبند، سہارنپور، گنگوہ، جلال آباد، مراد آباد وغیرہ مدرسوں میں جانے کا سلسلہ چل پڑا۔

حضرت شیخ کٹیہاروی نور اللہ مرقدہ (حضرت مولانا منور حسین صاحبؒ) رقم طراز ہیں۔

سابق ایام میں . . . .

۱۳۴۵ھ میں جب یہ بندہ مظاہر علوم پہنچا تو اکیلا پورنوی تھا۔ اسی طرح دارالعلوم دیوبند میں بھی ایک پورنیہ کے مولوی زین الدین مرحوم تھے، اب الحمدللہ ۲۰۰ سے اوپر طلبہ پورنیہ کے صرف مظاہر علوم میں ہیں اور دارالعلوم دیوبند میں بھی ایک سو کے قریب ہیں، اب تو یوپی و بہار کا شاید ہی کوئی دینی مدرسہ ہو جس میں پورنیہ کے کم و بیش طلبہ نہ پڑھتے ہوں، الحمدللہ ہزار سے اوپر علماء اور حفاظِ کرام ہو چکے ہیں اور اکثر گاؤں میں عالم اور حافظ پائے جاتے ہیں۔

مزید رقم طراز ہیں:

پہلے تو پورے ضلع میں دو تین ہی عربی مدرسے تھے جن میں عربی کی شرح جامی تک کی تعلیم ہوتی تھی، مگر اب تو ماشاءاللہ مدرسوں کے جال بچھ گئے ہیں ۱۳۵۸ھ میں عربی کا بڑا مدرسہ دارالعلوم لطیفی نام سے کٹیہار میں قائم ہوا، جس میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم کا سلسلہ چلا آرہا ہے اس مدرسہ کا فیض بہت پھیلا کر ضلع پورنیہ میں سینکڑوں علماء اور حفاظ تیار ہو گئے، اور ہر سال ہوتے ہی جارہے ہیں، الحمدللہ علیٰ ذلک۔ مزید برآں علماء حفاظ، قراء، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

دارالعلوم دیوبند، دلی، لکھنؤ، مراد آباد، مئو، میرٹھ، وغیرہ سے فارغ ہوکر قافلہ در قافلہ آرہے ہیں۔"

علم دین اور علماء کی قدر و منزلت میں اضافہ انگریزوں نے غلط پروپیگنڈہ کے ذریعہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے فارغین کو وہابی مشہور کر رکھا تھا اور مسلم عوام میں ان کے وقار کو گرانے اور ان سے نفرت و تکدر پیدا کرنے کی کوشش بلیغ کی تھی، نیز ان کی کانگریس میں شمولیت کی بنا پر لیگی حضرات نے بھی ان سے بدظنی پھیلا رکھی تھی اور خطہ پورنیہ کے مسلم عوام بھی بڑی حد تک اس سے متاثر ہوئے تھے۔

لیکن ان علاقوں میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے مسلسل اسفار بیان و تقریر، بیعت و ارشاد کے ذریعہ جہاں عوام کے دلوں میں علم دین و علماء کی قدر و منزلت کا سکہ بیٹھا وہاں دارالعلوم دیوبند کے اغراض و مقاصد بھی کھل کر سامنے آئے اور اس کی بقاء و تحفظ کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہوئی

دارالعلوم دیوبند کا تعارف حضرت شیخ الاسلامؒ نے اپنے اسفار کے دوران میں عوام سے اپیل کی کہ وہ دل کھول کر ان اداروں کو چندہ دیں، کہیں کہیں اپنے ساتھ دیوبند کے نمائندہ خصوصی حضرت مولانا شاہ علی صاحب و دیگر ذمہ دار سفراء کو بھی ساتھ لیتے آتے، ان کا تعارف کراتے ہوئے ان کو دارالعلوم کا چندہ حوالہ کرنے کی اپیل کی، اس کا اثر بہت اچھا پڑا اور خواص و عوام جب ہی سے دارالعلوم دیوبند کو چندہ دینے لگے، اور سفراء کے تاخیر سے پہنچنے یا نہ پہنچنے کی صورت میں منی آرڈر سے بھی چندے بھیجنے لگے۔

دینی مدارس کا قیام جن جن علاقوں میں حضرتؒ نے تقریر فرمائی دینی تعلیم کے حصول کی طرف عوام کو متوجہ فرمایا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد درس نظامی کے

کے مدرسوں کی بنیاد پڑی اور بچوں کو دینی تعلیم دلانے کا رواج عام ہوتا گیا، اور آج یہ حال ہے کہ پورے قدیم ضلع پورنیہ میں ہزار سے زائد مدرسے ہیں جن میں سے بعض اعلیٰ تعلیم بھی دے رہے ہیں۔

بدعات اور غیر اسلامی رسومات کی کمی جہاں جہاں حضرت شیخ الاسلام رح کے قدم مبارک پہنچے وہاں کثیر تعداد میں مرد اور عورتیں حلقۂ ارادت میں داخل ہوئیں، حضرت مولانا بشیر الدین صاحب قاسمی رقم طراز ہیں۔

"جن جن مقامات پر حضرت مرشد قدس سرہٗ (حضرت شیخ الاسلام رح) کی تشریف آوری ہوئی ہے ان ان مقامات پر ہزاروں ہزار کی تعداد میں مرد اور عورتیں سلسلہ میں داخل ہوئیں، اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہیں، مدرسہ قاسمیہ گیا کی ملازمت کے دور میں ان مقامات پر جانا ہوا تو کوئی گاؤں متوسلین سے خالی نہ ملا" لوگوں کے کثرت سے سلسلہ میں داخل ہونے کی وجہ سے بدعات غلط رسومات، غیر اسلامی طور طریقے میں دھیرے دھیرے کمی آتی گئی، اور بڑی حد تک مسلم معاشرہ میں سدھار ہوتا گیا، ضلع پورنیہ میں محرم کے موقع پر ڈھول باجے اور تعزیہ داری کا بڑا زور تھا، قبر پرستی اور غلط پیروں کی پیروی تقریباً ہمہ گیر تھی، جہاں جہاں کے لوگ حضرت رح سے بیعت ہوئے وہاں خصوصاً مذکرہ بالا باتوں میں کمی آتی گئی۔ ویسے حضرت رح کے وعظ و تبلیغ سے عمومی اثر بھی پڑا۔

ڈاڑھی رکھنے کا رواج حضرت رح جب بیعت فرمایا کرتے تھے تو ڈاڑھی چھوڑنے کا وعدہ بھی لیا کرتے تھے اور عمومی وعظ و تبلیغ کے دوران میں مسلمانوں کو اپنے یونیفارم (ڈاڑھی) میں رہنے کی تاکید فرماتے تھے، لہٰذا مردوں میں جو لوگ بیعت ہوتے تھے وہ ڈاڑھیاں چھوڑنے لگتے اور اسلامی شعار

کا ان میں دھیرے دھیرے رواج ہوتا گیا، بیرنگر سب ڈویژن ارریہ ضلع پورنیہ حضرت" دو مرتبہ تشریف فرما ہوئے، جتنے لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے انھوں نے ڈاڑھیاں رکھنی شروع کر دیں۔ اب اس علاقہ کا یہ حال ہے کہ یہ سُنّت تقریباً عام ہوگئی ہے اور یہاں کے نوجوان بھی بعض تو شروع سے اور کچھ ایک خاص عمر کے بعد ڈاڑھی رکھنے لگتے ہیں، اس علاقے میں ڈاڑھی کٹانا معیوب سمجھا جاتا ہے، جو لوگ آپ سے بیعت نہ بھی ہوتے تھے اور حضرت کے پاس کسی چیز کے لئے دعا کرانے حاضر ہوتے تھے، ان میں سے بعض کو ڈاڑھی کے متعلق تلقین فرمانے کے واقعات بھی ملتے ہیں، بعض ایسے لوگ بھی تھے —— جنھوں نے لیگ کے زمانے میں آپ اور آپ کے رفقار کو ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، آپ نے ان کو اس شعار اسلامی کے اختیار کرنے کے وعدے پر صرف معاف ہی نہیں فرما دیا بلکہ ان کی دعوت بھی منظور فرمائی۔ اس علاقے میں جب ہی سے اس سنّت کے علاوہ سلام کرنے اور لاٹھیاں لے کر چلنے کا بھی عام رواج ہوگیا ہے، چونکہ اس علاقے کے ہر چہار طرف کثیر ہندو آبادی ہے اس کے زیر اثر پہلے یہاں کے مسلمانوں میں دھوتی باندھنے اور بغیر ٹونٹی والے لوٹا رکھنے کا رواج عام تھا، مگر اب دھوتی باندھنے والے خال ہی خال نظر آتے ہیں، لنگی اور پائجامے کا رواج عام ہو چلا ہے اور بدھنا بھی رکھنے لگے ہیں، یہی حال ان علاقوں کا بھی ہے جہاں جہاں حضرت، تشریف لے گئے۔

سودی کاروبار میں کمی اس ضلع کے مسلمانوں میں سودی کاروبار عام تھا لوگ مختلف شکلوں میں سود کھایا کرتے تھے حضرت شیخ الاسلام، کی جہاں جہاں تشریف آوری ہوئی ہے ان کے بیعت و ارشاد اور وعظ و پند کے زیر اثر وہاں کے مسلمانوں سے یہ لعنت بڑی حد تک دور ہوتی

جارہی ہے، ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ بعض مقامات پر حضرت کو لوگوں نے لے جانا چاہا مگر معلوم ہوا کہ وہاں کے لوگ سود کھاتے ہیں تو جب تک توبہ کر لینے کی سچی شہادت نہیں مل گئی آپ نے تشریف لے جانا گوارہ نہیں فرمایا، للکوریہ (موجودہ ضلع مدھے پورہ) اور محرم پور بگھیلی کے اسفار کے دوران اس قسم کے واقعات ملتے ہیں۔

شادیوں میں سادگی اور مہر فاطمی کا رواج اس ضلع کے لوگ عام طور پر مہر فاطمی کو جانتے بھی نہ تھے مگر حضرت شیخ الاسلام، کا کہیں ورود مسعود ہوا اور بعض متوسلین و معتقدین نے اپنے بیٹے بیٹیوں کا عقد کرانا چاہا تو آپ نے مہر فاطمی کی شرط رکھی، جب فریقین نے منظور کیا تو عقد پڑھانا منظور فرمایا۔

بحالت موجودہ یہاں اگرچہ مہر مثل کا رواج نسبتہً زیادہ ہے مہر فاطمی پر بھی کافی شادیاں ہونے لگی ہیں، نیز تلک، جہیز، زیورات، اور بھوج بھات میں جو فضول خرچیاں پہلے ہوتی تھیں، نسبتہً کم ہونے لگی ہیں، اور خصوصی طور پر درمیانی درجے اور غربا، کے طبقے میں بڑی سادگی اور کم خرچی کے ساتھ شادیاں انجام پانے لگی ہیں، اس کے برعکس جن علاقوں میں آپ کی تشریف آوری بڑی کم ہوئی یا نہیں ہوئی ہے وہاں ہنوز شادی کے سلسلے کے غیر شرعی رسومات اور فضول خرچیاں نسبتہً زیادہ ہیں۔

نماز اور ذکر اللہ میں اضافہ جس جس علاقہ میں حضرت شیخ الاسلام، تشریف لے گئے وہاں نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، اذان و تسبیح تہلیل سے فضا گونج اٹھی ہر جگہ لوگ کچھ ایسے نظر آنے لگے جن کے ہاتھوں میں تسبیح، زبان پر ذکر اور آنکھوں میں آنسو ہوتے، اصلی اور جعلی پیر میں فرق

محسوس کیا جانے لگا۔

مخدومی ومکرمی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں۔

"اس وقت جو ہندوستان میں اسلام اور مسلمان قائم ہیں یہ انھی بزرگوں کا احسان ہے، ہندوستان میں جو مسجدیں اس وقت قائم ہیں ان میں جو نمازیں پڑھی جارہی ہیں اور پڑھی جاتی رہیں گی یہ ان کا طفیل ہے، ہندوستان میں جتنے مدرسے ہیں اور خانقاہیں قائم ہیں اور جو فیوض وبرکات ان سے صادر ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے انھیں کے رہین منت ہوں گے ان سب کا ثواب ان کے اعمال نامے میں لکھا جاتا رہے گا۔"

اس سلسلے میں مولانا حسین احمد مدنیؒ نے سارے ملک کا دورہ بھی کیا، ایمان افروز اور ولولہ انگیز تقریریں کیں اور اپنے ذاتی اثر ورسوخ، اپنی تقریروں اور خود اپنے طرز عمل سے مسلمانوں کو اس ملک میں رہنے اس کو اپنا ملک سمجھنے، اور حالات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔"

یہ بات پورنیہ کے متعلق اس طرح کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت پورنیہ، اور اطراف پورنیہ میں جو اسلام اور مسلمان قائم ہیں ان میں اتباع شریعت اور احیائے سنت اور اتحاد واتفاق کی جو فضا قائم ہوئی ہے، یہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے اس ضلع میں مسلسل دورے اور ان کے گنے چنے جاں نثار متوسلین کی جہد مسلسل کا نتیجہ ہے، اس وقت قدیم، جدید پورنیہ اور اطراف پورنیہ میں جو مسلمان آباد ہیں، جو مسجدیں قائم ہیں، جو مدرسے اور خانقاہیں قائم ہیں، آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد حضرت نوراللہ مرقدہٗ کے اسفار اگر اس خطہ میں مسلسل نہ ہوئے ہوتے تو یہ خطہ آزادی کے بعد مسلمانوں سے خالی ہوتا، نہ یہاں مسجدیں ہوتیں اور نہ اذانوں کی آواز سنائی دیتی، نہ اتنے کثیر مدرسے ہوتے، نہ تبلیغ کا اتنے بڑے پیمانہ پر

اجتماع ہو سکتا جیسا کہ یکم مارچ ۱۹۸۴ء میں ارریہ کورٹ میں ہوا۔

حضرت شیخ کٹیہاروی بہاری (حضرت مولانا منور حسین صاحب نوراللہ مرقدہٗ) خلیفۂ اجل حضرت شیخ الحدیث سہارنپوری رح نے بار بار فرمایا اور صحیح فرمایا:۔

"اس ضلع میں جو تم دینی، مذہبی، تبلیغی اور تعلیمی ترقیات دیکھ رہے ہو یہ شیخ الاسلام رح کے قدوم میمنت لزوم کی برکات اور ان کی دعاؤں کے اثرات ہیں"

انھوں نے ایک دفعہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب پورنوی بہاری خلیفہ حضرت شیخ الاسلام رح سے دیوبند میں فرمایا تھا کہ:۔

"پورنیہ نہ کہو، پورنیہ شریف کہو"

"تم تبلیغی و تعلیمی مہم کو اور تیز کرو اور جم کر کرو، لگاتار محنتیں کرو، تعلیم کو عام کرو تو ایک دن آئے گا جب پورنیہ حضرت شیخ الاسلام رح کے قول کے مطابق پورنیہ شریف بن کر رہے گا"

ماشاء اللہ پورنیہ حضرت شیخ الاسلام رح کی دعاؤں، تقریروں اور بیعت و ارشاد کی محنتوں کے سبب سے خصوصی طور پر دینی ترقیات کی راہ پر گامزن ہے
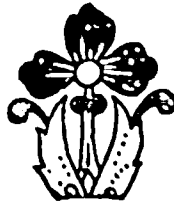
از ــــــــــــــــــــ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب ، بجنور

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ! اما بعد

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھسے ؛ حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق ؛ جو تجھے حاضر موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینہ میں تجھکو دکھاکر رُخِ دوست ؛ زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھاکر تجھے تلوار کرے

حضرات ! شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحبؒ مدنی کی حیات میں اتنی بڑی ہمہ گیری اور اجتماعیت ہے کہ تاریخ میں ایسی شخصیات کم ہی نظر آئیں گی ، ہر زمانہ میں ایسا شخص واحد جماعت کہلایا ہے ، حق تعالیٰ شانہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا ہے ۔

ان ابراھیم کان امۃ قانتۃ للہ ۔ ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے امت قانت تھے ۔

حضرات مفسرین کرام نے اہل لغت کے حوالے سے ذکر فرمایا ہے کہ جامع الاوصاف اور امام وقت کو امت کہا جاتا ہے ، یہی صاحب قاموس نے بیان

فرمایا ہے اور استدلال میں ایک حدیث بھی ذکر کردی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضؓ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا

ومعاذ امۃ للہ وقانتہ للہ (مدارک) . معاذ اللہ کی امت اور اللہ کے فرماں بردار ہیں۔

شخصیات کی ہمہ گیری اور اجتماعیت اور جامع الاوصاف ہونے پر کسی شاعر نے کہدیا ہے

ولیس من اللہ بمستنکر ؛ ان یجمع العالم فی واحد

اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ سینکڑوں برس کے بعد امت کی رہنمائی، لوگوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت میں مختلف اوقات اور اقران میں ایسے جامع الاوصاف اور کمالات اپنے مومن سچے بندے پیدا فرمائے ہیں کہ جنھوں نے امت کی ہر موڑ پر ہر نوع کی رہنمائی کی ہے، ایسے ہی حضرات کے جسم اقدس پر نیابت رسول کا مقدس لباس مزین اور رونق افزا ہوا ہے، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحبؒ مدنی انھیں مقدس حضرات میں سے ہیں کہ جن کو شیخ الاسلام کہا جاتا ہے

حضرت اقدس سرہ ۱۲۹۶ھ میں ضلع فیض آباد کے قصبہ ٹانڈہ میں سید حبیب اللہ صاحب مرحوم کے یہاں پیدا ہوئے اور ۱۳۷۷ھ میں وصال ہوا دارالعلوم دیوبند کے قبرستان میں مدفون ہیں، دارالعلوم دیوبند میں ہی پڑھا اور آخر میں عرصہ دراز تک یہیں پڑھایا، چودہ سال تک مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں درس حدیث دیا، کافی عرصہ تک اپنے استاذ مولانا شیخ الہندؒ کے ہمراہ مالٹا میں اسیر رہے وہاں سے آکر ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لیا، عمر کا کافی حصہ جیلوں میں گذارا اور آخر میں پیغام توحید و رسالت لوگوں کو پہنچاتے ہوئے اللہ سے جاملے۔

ہماری مختصر سی داستاں نے
مرتب کر دیئے لاکھوں فسانے

حضرت شیخ الاسلام رحمہ کی خدمات تو بہت ہیں، لیکن ان خدمات میں سے جن کو کارنامہ کہا جاتا ہے ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے، سیاسی اعتبار سے حوصلہ شکن اور قدم ڈگمگا دینے والا زمانہ ۱۹۳۶ء کا ہے کہ جب آپ نے مسلم لیگ کو کامیاب کیا تھا اور لیگ کے قائدین نے پھر معاہدہ شکنی کی تھی، یہ بہت بڑی سیاسی شکست تھی، ایسے حالات میں جماعتیں دفن ہوجاتی ہیں، لیکن حضرت نے اپنے عمل سے بتلادیا کہ ؎

کب پھرا کرتا ہے سیل حوادث سے مردوں کا منہ
شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں

شب و روز و مہینہ سے زیادہ تک پھر جمعیۃ علمائے ہند کے اس نظام کو زندہ کیا جو لیگ کی وابستگی سے مردہ ہوچکا تھا، قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں جاکر لیگ کی غلط پالیسی کا پردہ چاک کیا اور جمعیۃ علمائے ہند کو زندگی بخشی اور پھر کانگریس کے ساتھ مل کر ملک آزاد کرایا۔

حضرت نوراللہ مرقدہٗ کی حیات میں اسی قسم کے بہت سے کارنامے ہیں جب آپسی اختلافات کی بنا پر دارالعلوم دیوبند سے جبال العلم علامہ انورشاہ کشمیری مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ حضرات علیحدہ ہوئے اور جامعہ ڈابھیل کی بنیاد پڑی اس وقت دارالعلوم کو اس کی خصوصیات کے ساتھ باقی رکھنا ہر ایک آدمی کے بس کا کام نہیں تھا، جس مسند پر بیٹھ کر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور علامہ انورشاہ کشمیری درس دے چکے ہوں، ان کی جگہ بیٹھ کر ان ہی خصوصیات کو باقی رکھتے ہوئے نہیں بلکہ ان کو جلا دے کر مسند درس کو سنبھالنا یہ آپ

کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔

واقعاتی اعتبار سے تو یہ اگرچہ ایک معمولی بات سمجھی جائے گی، لیکن جن لوگوں نے دارالعلوم میں پڑھا ہے اور دورۂ حدیث میں شرکت کی ہے وہ جانتے ہیں کہ پہلے زمانے میں اس حلقہ میں مدرسین حضرات آکر شرکت کیا کرتے تھے اور تیاری کے بعد شریک درس ہوا کرتے تھے، احادیث کی روشنی میں مسلک امام اعظم ابوحنیفہؒ پر اعتراضات کے جوابات، اس مسلک کی حقانیت کو کتاب اللہ سے ثابت کرنا، سائل کے سوال کا جواب، اسناد اور رجال کے معیار پر کتابوں اور صفحات کے حوالہ سے دینا اور ثابت کر دینا کہ علمیت انوریت ہی کا کام نہیں ہے، بلکہ حسینیت میں اس سے کہیں زیادہ بہار ہے ؎

ریختی کی تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

یہ سب خصوصیات اور کارنامے اپنی اپنی جگہ مکمل ایک داستان ہیں، دفتر دیوان ہیں، کون ان سے انکار کر سکتا ہے، لیکن انیسویں صدی کا تاریخ ہند میں امت مسلمہ کو ہندوستان میں ایک زندہ امت کی طرح باقی رکھنا، یہ تاریخ عالم کا بہت بڑا کارنامہ ہے، آپ کو معلوم ہے کہ ــــ ہندوستان کی مساجد میں اذانیں کیوں بلند ہو رہی ہیں، مساجد کی محرابوں میں کس وجہ سے تلاوت قرآن ہو رہی ہے، یہ دینی مدارس کیوں آباد ہیں یہ خانقاہیں کیوں قائم ہیں، ۱۹۴۷ء میں سہارنپور کے قدم اکھڑنے والے تھے، اس کے بعد دھیرے دھیرے پورا ہندوستان مسلمانوں سے خالی ہو جاتا، اس وقت ہمارے ان تین بزرگوں یعنی مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور شیخ عبدالقادر

رائے پوری نے طے کیا کہ ہمیں جمنا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام رح نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا، بھاگتے ہوئے قدموں کو جمایا، تقریباً دو سال مسلسل جدوجہد کرنے کے بعد آدمیوں کے اس سیل رواں کو جو پاکستان بھاگا جارہا تھا روکا، اور آب رود گنگا کی داستان کو پھر زندہ کرکے دکھا دیا، آج ملک میں ہر چہار جانب جو اسلام اور اسلام کے نام لیوا چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور ملک کی جمہوریت کو جمہوریت بنائے ہوئے ہیں، یہ انھیں مردانِ باخدا کا طفیل ہے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز حضرت شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ کی تحریک احیائے دین سے ہوا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اکبری الحاد و بے دینی کا بڑی پامردی اور جرأت ایمانی سے مقابلہ کیا۔

مسلم معاشرہ کو اس بادشاہی تخت و تاج کے الحاد سے محفوظ رکھنے میں اپنی تمام تر توانائی صرف فرما دی، حضرت مجدد صاحبؒ نے اپنے عظیم المرتبت مکتوبات کے ذریعہ علوم و معارف کے وہ دریا بہائے کہ جن کی نمی کو آج تک بُعد زمانہ کے باوجود محسوس کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

شیخ احمد سرہندیؒ کی وفات ۱۰۳۴ھ کے بعد تجدید احیائے دین کا یہ منصب فاخرہ اور خلعت عظیمہ حکیم الامت حضرت الامام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے حصہ میں آیا، جس کا حضرت الامامؒ نے تاحد امکان حق ادا فرمایا، شاہ صاحب

نے اپنے دور کا منظر غائر جائزہ لیا اور اپنی خداداد صلاحیت و مومنانہ فراست سے کام لے کر امت مسلمہ کو جس راہ پر ڈالا وہ ٹھیک وہی راہ ہے جو سیدھی حضور پاک علیہ الصلوۃ والتسلیم تک جاتی ہے، آپ کی فکر انگیز تصانیف کا اگر نگاہ عمیق سے مطالعہ کیا جائے تو آپ کی تعلیمات کے دو حصے سمجھ میں آتے ہیں (۱) علوم ظاہری کی ترویج و اشاعت کے ذریعہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی لایعنی خرافات و بدعات کا خاتمہ (۲) علوم باطنی (روحانیت) کے ذریعہ قلب کو غیر اللہ سے پاک وصاف کرنا۔ ایک طرف آپ نے علوم ظاہری کی ترویج و اشاعت کے لئے مسلمانوں کو ایک مربوط نظام دیا، اور دوسری طرف علوم باطنی کے لئے خانقاہی زندگی کو اصلاح کا بہترین ذریعہ قرار دیکر صلحا اور اخیار امت کو ذکر و شغل کے ذریعہ صفائی قلب کی طرف متوجہ کیا۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ آپ کے بعد آپ کی مسند سنبھالنے والے آپ کے صاحبزادوں اور شاگردوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں اوصاف ودیعت فرمائے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا یہ فیض سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی شکل میں جلوہ گر ہوا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ایک طرف درس حدیث جاری فرما کر شائقین علوم نبوت کو علوم ظاہری سے آراستہ فرمایا اور دوسری طرف علوم باطنی کی تکمیل کیلئے باقاعدہ ایک خانقاہی نظام قائم فرمایا، یہ سلسلہ برابر چلتا رہا تاہم ایک وقت آیا کہ ہندوستان پر غیروں کی حکومت ہوگئی، اس وقت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے جانشین خصوصاً سید احمد شہید رہ نے خانقاہوں سے نکل کر میدان جنگ کو اپنے خون کی سرخی سے لالہ زار بنانے کا فیصلہ کیا، اسوقت کے لحاظ سے ان کا یہ فیصلہ مسلمانوں اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی بقا و تحفظ کے لئے

ضروری اور برمحل تھا، یہ وہ دور تھا جب اساتذۂ حدیث نے درسگاہوں کو اور اصحابِ باطن نے خانقاہوں کو چھوڑ کر انگریزی سامراج کو للکارا اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک کہ اس سامراج کی جڑیں نہ کاٹ ڈالی گئیں، یہ شاہ صاحبؒ کے بالواسطہ یا بلا واسطہ جانشین ہی تھے جنھوں نے کبھی دونوں لائنوں سے اور کبھی کسی نے ایک لائن سے اور دوسرے نے دوسری لائن سے شاہ صاحبؒ کے اس نصب العین کو زندہ رکھا جو انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے لئے متعین فرمایا تھا۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد علمائے دیوبند نے جو اپنی فراست ایمانی میں یگانۂ روزگار تھے محسوس کیا کہ موجودہ صورتِ حال سے اگر کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا ممکن ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ علوم ظاہری کا ایک ایسا مرکزی ادارہ قائم کیا جائے جس میں علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ مجاہدین حریت بھی پیدا کئے جائیں، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی۔ دارالعلوم دیوبند نے اپنے بانیوں کے منشاء و خواہش کے مطابق ایسے ایسے رجال پیدا کئے جنھوں نے ایک بار پھر عرصۂ دراز کے بعد شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے اس مشن کو حیات نو بخشی جس کو انھوں نے اپنا مقصد حیات قرار دے کر اپنے جانشینوں کو اس کے لئے تیار کیا تھا۔

انھیں مردان حق آگاہ میں ایک شخصیت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہٗ کی بھی تھی۔ حضرت شیخ الاسلام، ایک طرف اپنے استاذ محترم مجاہد حریت حضرت شیخ الہند کے علوم کے امین قرار پائے اور دوسری طرف قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رہ کے فیض تربیت نے آپ کو ایک بلند بالا مقام عطا فرمایا۔

تحفظ دین مبین، حریت وطن، ترویج واشاعت اسلام، علوم اسلامیہ، احیائے سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور فیوض روحانی حضرت شیخ الاسلام رحکے وہ اوصاف خصوصی ہیں جو آپ کی سوانح حیات کے سنہری ابواب ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام کی نسبت سے منعقد ہونے والے اس سمینار میں حضرت مدنی رحکے ارشد تلامذہ، اجل خلفاء اور متوسلین کی ایک بڑی تعداد اپنے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے موجود ہے، یہ حضرات آپ کی ہمہ جہت صفات زندگی اور کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے، میرا مقصد تو حضرت کے صرف ایک عنوان حیات "فیوض روحانی" پر مختصر الفاظ میں عرض کرنا ہے۔

میرے مطالعہ شیخ رحکی طویل مدت اس بات کی شاہد ہے کہ اولیاء اللہ کی خصوصیات، جو تذکرہ کتب تاریخ میں پڑھا تھا حضرت مدنی رحان خصوصیات کے عدیم النظیر نمونہ تھے، اشغال واذکار کی تکمیل کے بعد روح پاکیزہ اور دل انوار وتجلیاتِ الٰہیہ کا مرکز بن چکا تھا، چشم مبارک میں بادۂ عرفان کا سرور، اور ہونٹوں پر ارباب عشق کی پر کیف مستی ہمہ وقت متبسم نظر آتی تھی، لب ولہجہ کی شیرینی کوثر وتسنیم کی لطافتوں کو سمیٹے ہوئے تسخیر قلوب کا تمام سامان مہیا کئے ہوئے تھی،

حضرت شیخ الاسلام نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے میخانہ سے معرفت کا جو گھونٹ حضرت گنگوہی جیسے ساقی کے جام سے نوش فرمایا تھا اس کا پرتو سانس کی آخری آمد ورفت تک چہرۂ انور پر رقصاں نظر آرہا تھا۔

حضرت شیخ الاسلام کی قلبی خواہش تھی کہ بیعت وارشاد کا سلسلہ حضرت شیخ الہندؒ سے قائم فرمائیں مگر چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کسی کو بیعت نہیں فرماتے تھے اور اکثر لوگوں کو حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں بھیجدیا کرتے تھے حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق صاحبؒ کو آپ کے اور آپکے

بھائی سید احمد صاحبؒ کے متعلق یہ مشورہ دیا تھا کہ ان دونوں کو حضرت گنگوہیؒ سے بیعت کرادیں، چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ کی خواہش کے مطابق حضرت شیخ الاسلام آستانۂ رشیدی پر حاضر ہوکر سلسلۂ بیعت میں منسلک ہوگئے، حضرت مولانا گنگوہیؒ نے حضرت کو بیعت تو کرلیا مگر اوراد و وظائف تلقین نہیں فرمائے صرف اتنا فرمایا کہ اب چونکہ تم مکہ معظمہ جارہے ہو اس لئے وہاں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے ذکر کردینا وہ اوراد و معمولات پر لگا دینگے، چنانچہ حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر ذکر و اشغال کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے۔ حضرت شیخ الاسلام کو اپنا ہاتھ حاجی صاحبؒ اور مولانا گنگوہیؒ کے ہاتھوں میں دینا تھا کہ مبشرات اور رویائے صالحہ کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس میں کبھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے، اور کبھی حضرات شیخین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زیارت سے ایک بار خواب میں حضرت عثمان غنیؓ کی زیارت حاصل ہوئی۔ جسکی تعبیر حضرت گنگوہیؒ نے نسبت عثمانی سے فرمائی۔ اس سے بڑھ کر کسی شخصیت کیلئے اور کیا طرۂ امتیاز ہوسکتا ہے کہ خود حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم خواب میں تشریف لاکر عطیات سے نوازیں

حقیقت یہ ہے کہ حضرت "شیخ الاسلام" ایک فرد، ایک شخص اور ایک انسان نہیں بلکہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، آپ کی ذات گرامی ہمہ صفت اور ہمہ جہت، آپ کی شخصیت حکمت قاسمی، زہد رشیدی، فراست محمودی اور عرفان امداد اللہی کا سنگم تھی، جس نے ایک صدی کی پوری ہندوستانی تاریخ کو حیات نو بخشی، حضرت مدنیؒ کی ذات گرامی اسقدر ہمہ صفت موصوف تھی کہ اگر کوئی یہ پوچھے کہ ہمارے اسلاف میں حضرت شیخ عبدالقادر صاحب جیلانیؒ، خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کیسے تھے تو ہمارے لئے ان کی عظمت شان کا اعتراف کرانے کے لئے حضرت شیخ الاسلامؒ کی ذات گرامی کی طرف اشارہ کرنا کافی تھا۔

حضرت شیخ مدنی، کو کسی نے بہت بڑا مفسر و محدث جانا کسی نے عظیم عالم دین اور شیخ طریقت سمجھا، کسی نے سیاسی رہنما اور مجاہد قرار دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت رحمۃ اللہ میں یہ سارے کمالات موجود تھے، لیکن میری نظر میں کہیں زیادہ آپ کا وہ روحانی مقام تھا جس سے عام طور پر دنیا ناواقف تھی اور وہ تھا حضرت، کا روحانی کمال۔ جس کے اسرار و کوائف کو حضرت، نے پردہ اخفار میں رکھا۔

آپ کے روحانی کمالات میں خاص بات یہ تھی اور یہ بات شیخ کامل ہی کو حاصل ہوتی ہے کہ آپ کی بارگاہ میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ حاضر ہوتے مگر فیض یاب وہی ہوتا جو تبدیلیٔ احوال و قلب کی نیت سے حاضر ہوتا اور دل کو تقیدات سے پاک و صاف کر کے مجاہدہ اور نفس کشی کے ارادہ سے آتا چنانچہ حضرت مدنی" کی خدمت میں بڑے بڑے اہل علم، فلسفی، دانشور آئے مگر آستانۂ مدنی کے روحانی فیض سے محروم ہی رہے، ہاں جو لوگ تزکیۂ نفس کے ارادہ سے حضرت، سے منسلک ہوئے ان میں سے ایک بڑی تعداد ایسے خوش نصیب حضرات کی بھی ہے جن کو حضرت والا نے بیعت وارشاد کی اجازت سے سرفراز فرمایا ایسے خلفار مجازین کی تعداد ۱۶۷ بتائی گئی ہے جن میں سے ۴۲ حضرات اس وقت بقید حیات ہیں اور حضرت کے روحانی فیض کو پھیلانے میں مصروف ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات روحانی کے بین شواہد و واقعات میں سے یہ کرامت بھی تھی کہ آستانہ پر حاضر ہونے والے حضرات اپنے دل و دماغ میں مختلف قسم کے خیالات و سوالات لے کر آتے تھے اور بسا اوقات زبان سے اظہار کئے بغیر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے اُن شبہات کا ازالہ اور سوالات کا جواب اطمینان بخش مل جاتا تھا، کیا خوب کہا گیا ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ⁂ گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

حضرت شیخ الاسلام رح کے روحانی کمالات کا اندازہ حضرت تھانوی رح کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے:

"مجھ کو اپنی موت پر فکر تھا کہ بعد میں باطنی دنیا کی خدمت کرنے والا کون ہے مگر حضرت مدنی رح کو دیکھ کر تسلی ہوئی کہ یہ دُنیا ان سے زندہ رہے گی"

(بروایت مولانا عبدالمجید صاحب بچھرانوی خلیفہ حضرت تھانویؒ)

ایک بار بڑی دلسوزی کے ساتھ فرمایا۔

"بھائی میں مولانا مدنی جیسی ہمت مردانہ کہاں سے لاؤں میں مولانا حسین احمد مدنی کو ان کے سیاسی کاموں میں مخلص اور متدین جانتا ہوں، البتہ مجھے اُن سے حُجت کے ساتھ اختلاف ہے اگر وہ حجت رفع ہو جائے تو میں اُن کے ماتحت ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے کو تیار ہوں"

(بروایت حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ)

حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری خلیفہ خاص حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی روایت ہے کہ ایک بار حضرت رح نے فرمایا،

"ہمارے اکابر دیوبند میں بفضلہ تعالیٰ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں چنانچہ شیخ مدنی میں دو خداداد خصوصی کمال ہیں ایک مجاہدہ جو کسی دوسرے میں اتنا نہیں اور دوسرے تواضع، چنانچہ سب کچھ ہونے کے باوجود اپنے کو کچھ نہیں سمجھتے"

ایک بار حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نے اپنے درس میں فرمایا تھا "مولانا حسین احمد مدنی رح اس زمانے کے اولیاء اللہ کے امام ہیں"

حضرت رحمہ اللہ کے دور میں بلاشبہ آپ کی شان ولایت، انداز قطبیت و علامات غوثیت اور ظہور کرامت شہرۂ آفاق تھی اور آج بھی ہے، آپ کی ذات سے جا بجا سلوک و تصوف کے چراغ روشن ہوئے، اور تزکیہ و تطہیر کی سنتیں زندہ ہوگئیں، اور لاکھوں گمراہ اور بے راہ انسان شریعت محمدیہ کے سانچے میں ڈھل گئے، اپنے سلسلے کی ایسی باصلاحیت جماعت چھوڑ گئے جن کی خانقاہوں سے صدیوں تک اسلامی تصوف کی مشعل روشن رہے گی، بلاشبہ آپ کی ذات ایک چلتی پھرتی خانقاہ تھی، سچ تو یہ ہے کہ آپ اس شعر کے مصداق تھے ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ

خواجہ حسن ثانی سلمانی

درخت اپنے پھل پھول اور پتوں سے پہچانا جاتا ہے، میں نے حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کو نہیں دیکھا، لیکن ان کے خلف الرشید مولانا اسعد مدنی کو دیکھا ہے اور ان کے وسیع دستر خوان سے اس بہار کا تصور کیا ہے جو کبھی ان کے والد ماجد کے زمانے میں اس گلستاں کی قسمت رہی ہوگی،

حضرات!

چشتیہ سلسلے کے مشہور بزرگ شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے روٹی کو اسلام کا چھٹا رکن کہا تھا۔ اور شاید اس لئے کہا تھا کہ مذہب اسلام دین و دنیا کو احاطہ کئے ہوئے ہے، روٹی آدمی کی پہلی ضرورت بھی ہے اور ایسی ضرورت بھی جو ایک طرف انسانی زندگی کی ساری خوبیوں کی بنیاد بن سکتی ہے اور دوسری طرف ساری خرابیوں کی جڑ بھی ثابت ہو سکتی ہے، یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ لنگر کی روایت چشتی خانقاہوں کی قدیم روایت ہے لیکن اس روایت کے دو حصے ہیں، ایک حصہ یہ کہ ہر بھوکے کا پیٹ بھرا جائے، اچھے برے اپنے پرائے کسی کی تمیز نہ ہو، یہاں تک کہ یہ خیال بھی نہ رکھا جائے کہ جس کا پیٹ بھرتے ہیں وہ زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد بھی اپنے سامنے رکھتا ہے یا نہیں، بس جو آئے اس کو کھانا کھلادو، لیکن اس روایت کا دوسرا حصہ اور زیادہ اہم حصہ یہ ہے کہ انسانوں کا پیٹ اس طرح نہ بھرا جائے جسطرح

مویشیوں کے لئے چارے اور سانی کا انتظام کیا جاتا ہے، بلکہ یہ بھوکے لوگ اگر بے مقصد زندگی بسر کرتے ہیں تو انھیں زندگی کا مقصد بتایا جائے، اور اگر مقصد ان کے سامنے ہے تو اس تک پہنچانے کا اہتمام ہو، ان کی رہبری کی جائے۔

ایسے لوگوں کی تعداد کثیر ہے جو عادتاً انسان ہیں یا عادتاً مسلمان ہیں آدمی کے بچے ہیں، اس لئے کچھ باتیں اچھی بری آدمیوں کی سیکھ لی ہیں، مسلمان ماں باپ کے گھر میں جنم لیا ہے اس لئے چند عادتیں مسلمانوں کی سی پڑ گئیں، اور ایسے لوگوں کی تعداد کم ہے جو ارادتاً انسان بننے کی کوشش کرتے ہیں، اور ارادۃً مسلمان ہونا اور بننا چاہتے ہیں کہ کوشش اور سعی سے کچھ سیکھیں اور چھوٹی ہوئی چیزوں کو حاصل کریں۔

میں نے حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کی شخصیت، ان کے گھر اور ان کی خانقاہ کا جو حال معتبر لوگوں سے سنا ہے اُس سے یہ اندازہ ہوا کہ وہاں نہ تو ایسی خالی خولی سوکھی تعلیم تھی جس میں اسلام کے چھٹے رکن روٹی کی چھٹی ہو چکی ہو، نہ ایسی روٹی تھی جو بے مقصد زندگی بسر کرنے والے نکموں کی فوج تیار کر کے قوم کو اپاہج بنا دے۔

دیوبند سیرگاہ اور تفریحی مقام شاید کبھی بھی نہیں رہا، وہاں جو بھی جاتا تھا اور جاتا ہے وہ کچھ سیکھنے کچھ حاصل کرنے ہی کے لئے جاتا ہے، اور یہ سیکھنا اور حاصل کرنا صرف کتاب رٹنے تک محدود ہو جائے تو اسے پورا سیکھنا اور کچھ حاصل کرنا نہیں کہہ سکتے جس کی نمائندگی ایک کامل اور مکمل دین کرتا ہے، مدرسے کو خانقاہ اور خانقاہ کو مدرسہ بنانے کی ضرورت اسی لئے رہتی ہے کہ انسانی زندگی کا کمال ان دونوں کے ملنے اور ساتھ چلنے ہی سے حاصل ہوتا ہے، ہمارے جن بزرگوں نے مدرسوں کو خانقاہ اور خانقاہ کو مدرسہ بنایا ہے ان میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ

کی ذات گرامی بہت نمایاں ہے

میری نسل کے لوگوں نے حضرت مرحوم کی سخت گیری کا حال بہت سنا ہے ایک کثیر تعداد مخالفانہ پروپیگنڈے سے متاثر بھی ہوئی ہے، لیکن میں جب جب اس طرح کی باتیں سنتا تھا مجھے اپنے دو بزرگوں کی گفتگو یاد آتی تھی۔ ایک استاذ محترم حضرت مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم جو خاصے مولوی دشمن تھے لیکن بعض اوقات بڑی دردمندی سے فرمایا کرتے تھے کہ میاں ہم ان کٹر مولویوں کو کوستے تو ہیں لیکن یاد رکھنا کہ دین کا معیار انھی سے قائم رہے گا اور مسجدیں انھیں کے دم سے آباد ہونگی کوٹ پتلون والے گرےجویٹوں سے یہ توقع مت کرنا کہ وہ دینی معاملات میں احتیاط برتیں گے اور مسجد میں اذان دیں گے اور نماز پڑھائیں گے۔

دوسری گفتگو مجھے اپنے والد مرحوم حضرت خواجہ حسن نظامی کی یاد آتی ہے جو حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کا ذکر کرتے تھے کہ ان سے جب پوچھا گیا کہ کیا آپ جدید تعلیم اور علی گڑھ تحریک کو واقعی ایسا مضر اور برا سمجھتے ہیں کہ ہمیشہ طنز کرتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں، تو وہ کہتے تھے کہ ہرگز نہیں، میں جدید تعلیم اور علی گڑھ تحریک کی افادیت کا پوری طرح قائل ہوں، میں تو صرف روک تھام کرنے اور اعتدال قائم رکھنے کے لئے طنز کرتا ہوں کہ نئی نسل کہیں حد سے آگے نہ بڑھ جائے۔ گویا وہ اپوزیشن اور حزب مخالف کا کردار ادا کرتے تھے۔ اپوزیشن یا حزب مخالف کا رول حضرت مولانا مدنی کے سامنے یقیناً نہ آیا ہوگا لیکن ان کا مقصد سختیوں سے غالباً یہی تھا کہ سونا تپ تپ کر کندن بنتا رہے

حضرت مدنی اگر سختی نہ برتتے تو آج اسلامی شعائر کی بے حرمتی روزمرہ کا معمول بن چکی ہوتی۔ انھوں نے دینی معاملات میں بھی استقامت دکھائی اور اپنے سیاسی مسلک پر بھی مضبوطی سے جمے رہے۔ اس استقامت اور مضبوطی نے نہ

دین کو روز بدل جانے والا فیشن بننے دیا اور نہ سیاست نعرے بازوں کی نذر ہوئی، انھوں نے مسلمان اقلیت کو اکثریت کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کی جو رائے دی تھی اسکے درست ہونے کے آج وہ لوگ بھی قائل ہوگئے ہیں جو کل نعرے بازی کے سیلاب میں بہہ گئے تھے۔ یہ ان کی اس رائے ہی کا فیضان ہے کہ آج اس ملک میں سیکولرزم اور مل جل کر رہنے اور سب کے حقوق مساوی ہونے کی بات کی جارہی ہے، کل تک جو لوگ حضرت مدنی کے اس رویے پر ناک بھوؤں چڑھاتے تھے کہ وہ ڈاڑھی منڈوں سے مصافحہ نہیں کرتے ان کو یہ خبر نہ تھی کہ ایک دن آئے گا جب ان کو اپنی شناخت IDENTILY کی ضرورت مذہبی حیثیت کے علاوہ سیاسی حیثیت سے بھی پڑے گی۔ اگر ان کو نمک کے کان میں نمک بننے سے بچنا ہے تو کوشش کرکے یہ بتانا بھی ہوگا کہ وہ نمک نہیں ہیں کچھ اور ہیں، اپنے اس وجود اپنی اسی پہچان کے ساتھ ان کا یہ مشورہ کہ وطن والوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملاکر چلو ایسا صحیح مشورہ تھا کہ اگر مسلمان ایک ہوکر اس پر عمل کرتے تو ان کے بہت سے مسائل پیدا ہی نہ ہوتے۔

حضرت مدنی نے ایک نہیں کئی نسلوں کی براہ راست تربیت فرمائی، اور ایسے جانشین بھی چھوڑ گئے جنھوں نے ان کے کام کو جاری رکھا، ان کے چراغ سے بے شمار چراغ جلے ہیں، خود مجھے بھی یہ فخر ہے کہ ان کے شاگردوں کا شاگرد ہوں اور میرے خاندان کا ان کے خاندان سے خصوصی تعلق رہا ہے۔ والدی و مرشدی حضرت خواجہ حسن نظامیؒ، حضرت مدنی علیہ الرحمہ کے خواجہ تاش تھے یعنی دونوں نے حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کا فیض پایا تھا، اور تعلیم کے زمانے میں حضرت مدنیؒ کے بھائی صاحب سے

خواجہ صاحب کی ایسی دوستی تھی کہ مدینہ منورہ میں پندرہویں شعبان میسر آئی تو خواجہ صاحب نے شب بیداری کے لئے انھی کے گھر کا انتخاب کیا تھا۔

حضرات!

اس سمینار کے ذریعہ ایک راستہ کھلا ہے حضرت مدنی تک پہنچنے کا راستہ نہیں، بلکہ ان کے ذریعہ خود اپنی بازیافت کا راستہ، شاید زندگی بھر ان کا مقصد بھی یہی رہا کہ ہم ان کے ذریعہ اپنے آپ کو پاتے رہیں، خدا کرے یہ راستہ بند نہ ہو، ہم اپنے آپ کو فراموش نہ کرنے پائیں۔
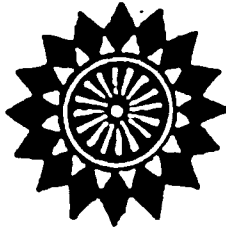
—— وشوا ناتھ طاؤس۔ فاضلکا پنجاب

حب الوطنی مسلمان کے ایمان کا جزو ہے۔ فرزندانِ توحید کے سامنے انکے پیغمبر جلیل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ موجود ہے جس سے وطن کی محبت آشکارا ہے اور اپنے ملک سے فطری تعلق کے مضبوط جذبات کا اظہار ہوتا ہے، جب نبی آخرالزماں حضور سرورِ کائناتؐ نے کفار کے ظلم و ستم سے مجبور ہو کر بحکم خداوندی اپنے وطن مکہ سے ہجرت فرمائی تو ارشاد فرمایا:۔

"اے مکہ خدا کی قسم روئے زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے اگر میری قوم تیرے اندر سے مجھے نہ نکالتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا"

سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے جذباتِ وطن یہ ہیں تو کیا ممکن ہے کہ کوئی سچا مسلمان حُبِ وطن سے خالی ہو؟ مسلمان اپنے دین کی رُو سے اور قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں اس امر کے پابند ہیں کہ وہ اپنے لئے غیر مُلکی اقتدار کو پسند نہ کریں، یہی بات ہے جس کو علماء حق نے سمجھا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی سربراہی و رہنمائی کی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جب مغلیہ سلطنت رُو بہ زوال تھی اور فرنگی اقتدار

کے سائے ملک پر منڈلا رہے تھے۔ اُنہوں نے نعرۂ حق بلند کر کے قوم کے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کرنے کی کوشش کی اور ایک انقلابی جماعت بنانے کا عزم کیا۔ اُنہوں نے ایک ایسا نظام وضع کیا اور ایک ایسے معاشرے کا تصور پیش کیا جس کی بُنیاد حق کوشی، ایمان و ایقان، صدق و صفا، عہد و امانت، امن و آشتی، عدل و انصاف، آزادئ ضمیر، احترامِ انسانیت، تحفظِ جان و مال اور معاشی مساوات پر تھی۔ افسوس زندگی نے اُن کو مُہلت نہ دی اور وہ طریقۂ کار وضع کرنے کے بعد اسے عملی جامہ پہنانے سے قبل دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند ارجمند سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کی ایک حیثیت متعین کر دی اور اس کے دارالحرب ہونے کا اعلان کیا۔ اُنہوں نے فرنگیوں کے مکر و فریب کے خلاف فتویٰ جاری کیا اور مجاہدین کی تیاری کے لئے اپنی مہم شروع کی۔ حُسنِ اتفاق سے اُنہیں رائے بریلی کے قدیم بزرگوں کی اولاد کا ایک ہونہار شاگرد سید احمد شہید میسر آگیا۔ اُنہوں نے عملی بنیادوں پر مجاہدین کی ایک جماعت تشکیل کی اور اپنی دعوتِ تجدید و احیاءِ اسلام کا رُخ جہادِ اکبر کی طرف موڑ دیا اور صوبہ سرحد کو مرکز بنا کر آزادئ وطن کی سعی شروع کی۔ جو لوگ سید احمد شہید کی تحریک کا رُخ ہندوستان کے ایک فرقہ کے خلاف موڑنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اُن کی دور بینی، فراخ دلی اور بلند نگاہی کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حضرت سید احمد شہید کا طرزِ عمل اور منشا کیا تھا یہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی کتاب "نقشِ حیات" کے اس اقتباس سے ظاہر ہے۔

"سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط و اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو شرکت کی دعوت دی اور اس میں

صاف صاف اُنہیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد مُلک کے بدیسی لوگوں کے اقتدار کو ختم کرنا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہو گی اس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے۔ ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ریاست گوالیار کے مدارالمہام اور مہاراج دولت رائے سندھیا کے وزیر و برادرِ نسبتی راجہ ہندو راؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس سے آپ کے اصلی عزائم اور مُلکی حکومت سے متعلق آپ کے نقطہ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔"

اس کے بعد اس خط کو نقل کیا ہے جو طویل ہے اور جس میں دربار گوالیار کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اطمینان سے نہ بیٹھے کیونکہ فرنگی حکومت سرطان کی طرح ملک میں پھیل رہی ہے جس نے عزت والوں کی عزت خاک میں ملا دی ہے۔ نہ مسلمان اس سے محفوظ ہیں اور نہ ہندو۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اس خط کا جو تجزیہ کیا ہے وہ اُنہی کے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں۔

"(۱) آپ انگریزوں کو بیگانگان، بعید الوطن اور پردیسی سمجھتے تھے اور اُن کے تغلّب سے تنگ آکر اُن سے لڑنے کا عزم رکھتے تھے۔

(۲) آپ ہندوستان کو اپنا ملک و وطن سمجھتے تھے۔

(۳) جہاد سے آپ کا مقصد خود اپنی حکومت قائم کرنا ہرگز نہیں تھا۔

(۴) آپ مظلومیت اور پامالی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں شریک جانتے تھے اور جہاد سے آپ کی غرض دونوں کو ہی اجنبی اقتدار کی مصیبت سے نجات دلانا تھا۔"

حضرت مولانا مدنیؒ نے آگے چل کر بیان کیا ہے کہ تحریک آزادی جو علماء کے ہاتھوں انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ سے شروع ہوئی اور جس کا سنگِ بنیاد رکھنے والے شاہ عبدالعزیز

محدث دہلوی اُن کے خاندان کے لوگ اور اُن کے شاگرد ہیں اُن میں فرقہ داریت اور تنگ دلی کا نام تک نہ تھا، نہ اُن کا مقصد دُنیاوی مفادات، مُلک گیری، خودغرضی، عہدوں اور منصبوں کا حاصل کرنا یا کسی کو غلام بنانا تھا، اور یہ تحریک شخصی یا کسی فرقہ کی حکومت فسطائیت کے لئے عمل میں نہیں لائی گئی تھی بلکہ حقیقی جمہوریت اس کا نقطۂ نظر تھا۔

حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کا گروہ مردانِ خود آگاہ اور خدا پرستوں کا لشکر تھا جنہوں نے دنیاوی آسائشوں سے بے نیاز ہو کر آزاد قبائلی علاقے کی سنگلاخ چٹانوں پر میدانِ جہاد آراستہ کیا اور راہِ حق میں شہادت کا بلند مرتبہ حاصل کیا۔ اس کے بعد علمار صادق پور نے قربانی اور جاں نثاری کی شاندار مثال قائم کی، بعد ازاں علمار دیوبند نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران معرکہ شاملی میں بے پناہ جراٗت و شجاعت کا مظاہرہ کیا۔

استخلاصِ وطن کے لئے برادرانِ اسلام کی کاوشوں اور قربانیوں کی بڑی طویل داستان ہے اور اس کا کچھ حصہ میں نے اختصار کے ساتھ اس لئے بیان کر دیا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کے آزادیٔ وطن کے مشن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ماضی اور حال کی کڑیاں ملائے بغیر صورتِ حال کا صحیح تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ماضی کو کُرید نا میرے لئے ضروری تھا۔ اَب میں اپنے اصل موضوع یعنی حضرت مولانا مدنیؒ کی وطنی خدمات کی طرف آتا ہوں۔

حضرت کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو یہ سمجھنے میں کوئی مُشکل نظر نہیں آتی کہ اُن کی ذات بابرکات ہندوستان کے لئے قدرت کا ایک عطیہ تھی۔ اُنہوں نے ایک قائد کی حیثیت سے ملک و ملت کی آزادی کے لئے جو دلیرانہ جدوجہد کی اور ایک مجاہد کی حیثیت سے ایمانِ کامل، زہد و تقویٰ اور صبر و ایثار کو زادِ راہ بنا کر جس پامردی کے ساتھ فرنگی استعمار خانوں کو خاکستر کیا وہ تاریخِ ہند کا ایک تابناک باب ہے۔ یہ شعر اُن پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

تاریخ اسیرانِ وفا پوچھئے کیا ہو
آیا تھا ابھی ہوش کہ زنداں نظر آیا

ایک محاذ پر وہ انگریزوں سے نبرد آزما تھے تو دوسری طرف مسلمانوں کی گمراہ قیادت کو بے نقاب کرنے میں مصروف تھے جو پوری ملت کو صراطِ مستقیم سے دُور لے جا رہی تھی۔ ایک طرف وہ زورِ بازوئے قاتل آزمانے کے لئے بے خوف و خطر اُس مقام کی طرف بڑھتے رہے جہاں ہر لمحہ دار و رسن کی آزمائش تھی تو دوسری طرف ماحول کی ناسازگاری اور اپنوں کی جفا کاریوں کا سامنا استقلال و استقامت سے کرتے رہے۔ اُنہوں نے فرنگی استعمار خانوں کی دیواروں پر تحریکِ حُریت کی شمع کو اس قدر فروزاں کیا جس سے فرنگی اقتدار کا ایوان جل کر خاک ہو گیا۔ برصغیر کی تاریخ آزادی میں اُن کا کردار اتنا واضح اور اُن کا حصہ اتنا عظیم اور وسیع ہے کہ اس پر کام کرنا ایک ادارے یا ایک اکیڈمی کا کام ہے۔ میرا مختصر مقالہ اُن کی پوری جد و جہد کا احاطہ کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اگرچہ اپنی تعلیمی زندگی کی ابتدا سے ہی حضرت شیخ الہند کی خصوصی توجہ کا مرکز بن چکے تھے اور وہ انہیں اس نہج سے تربیت دے رہے تھے کہ وہ بڑے ہو کر مسلمانانِ ہند کی قیادت کر سکیں۔ اس کے بعد مدینہ منورہ میں قیام کے دوران پیرِ حُریت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے روضۂ اطہر کے سائے میں اُن کی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی، پھر قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہی نے خلعت و دستارِ خلافت بخش کر اُن کو جوہرِ قابل بنا دیا۔ میدانِ عمل میں اُترے تو حضرت شیخ الہند کی معیت میں اسارت مالٹا کے دوران جانبازی و سرفروشی کو مقصدِ حیات بنا لیا۔ اَب وہ کسی خانقاہ کے حُجرے میں زندگی گذارنے والے مولانا نہیں رہے تھے بلکہ

جوہرِ علم و صداقت گوہرِ یکتائے فن — شب چراغِ آگہی، سوز و گدازِ انجمن
مشعلِ راہِ طریقت شمعِ تہذیبِ کہن — آبروئے بزمِ امکاں عظمتِ خاکِ وطن

مردِ میدانِ شجاعت پاسبانِ عقل و ہوش
سُرخیٔ خونِ شہیداں، سرفراز و سرفروش
پیکرِ زہد و تقدس، جانشینِ انبیاء — شانِ تقدیسِ اُمم، ناموسِ دینِ مصطفیٰ
رہنمائے عالمِ اسلام، فخرِ ایشیا — یعنی مولانا حسین احمد اسیرِ مالٹا

حضرت شیخ الہند کے بعد مولانا حسین احمد مدنی اُن کے جانشین قرار پائے اور انہوں نے تحریکِ آزادی کی زمام سنبھال لی۔ ابھی مالٹا سے واپس آئے چند ماہ گذرے تھے کہ جولائی ۱۹۲۱ء میں کراچی میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں حضرت مدنی نے ایک تجویز پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ سرکارِ انگلشیہ کی فوج میں ملازمت کرنا، یا کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین کرنا اور ہر قسم کی اعانت کرنا حرام ہے اور ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ یہ بات ہر فوجی مسلمان تک پہنچا دے۔

شرکائے کانفرنس نے یہ تجویز پاس کر دی اور جب اگلے روز اخبارات میں شائع ہوئی تو انگریزی حکومت کے ایوان لرز اُٹھے۔ اس باغیانہ تجویز کی بنا پر ۱۸ ستمبر ۲۱ء کو دیوبند میں حضرت کی گرفتاری کی افواہ پھیلی تو عوام مشتعل ہو گئے اور انہوں نے انگریز افسر کی قیادت میں دیوبند آنے والی مسلح پولیس پر حملہ کر دیا۔ حالات قابو سے باہر ہو گئے تو سہارنپور سے گورکھا پلٹن مدد کے لئے بُلائی گئی جس نے پُورے شہر اور حضرت کی رہائشگاہ کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت گھر سے باہر تشریف لائے، عوام کو پُرسکون رہنے کی تلقین کی اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔

۲۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کو خالق دِینا ہال کراچی میں حضرت مولانا مدنیؒ اور دیگر شرکائے کانفرنس کے مقدمہ کی سماعت ہوئی اور حضرت نے عدالت کے سامنے وہ پُرجوش بیان دیا جو وطنِ عزیز کی سیاسی تاریخ میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے "قولِ فیصل" کی طرح ایک اہم درجہ رکھتا ہے۔ سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے اُنہوں نے قرآن شریف اور سنت رسول اللہؐ سے

وہ دلائل اپنے موقف کی وضاحت میں پیش کئے کہ ہر سننے والا جزاک اللہ، سبحان اللہ کہہ اُٹھا۔ ہر زبان پر یہ الفاظ تھے کہ اے حضرت یہ آپ ہی کا کمال ہے کہ انگریزی سامراج کی تیغوں کے سائے میں کلمۂ حق بلند کر رہے ہیں۔ بعض اوقات حضرت مدنیؒ کے دلائل و براہین سے سامعین کی یہ حالت ہو جاتی تھی کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے تھے۔ اسی عدالت میں حضرت کے جرأت مندانہ کلمات سن کر رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ان کے قدموں پر گر پڑے تھے اور پاؤں کو بوسہ دیا تھا اور ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

"جو جرأت میں نے آج آپ میں دیکھی ہے آج تک کسی مجاہد میں نہ دیکھی اور نہ سُنی"

یہ تھے ہمارے حضرت مدنیؒ جنہیں انگریز کے دیو ہیکل قید خانے خوف زدہ نہ کر سکے۔ جن کے جذبۂ حب الوطنی اور جرأت ایمانی کے سامنے فرنگی سامراج کے تمام ہتھکنڈے ہیچ ثابت ہوئے اور یہ حسینی چراغ حالات کی تند و تیز آندھیوں کے سامنے بھی ضیا پاشی کرتا رہا۔

یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو اس مقدمے کا فیصلہ سُنایا گیا۔ جیوری نے فوج میں بغاوت پھیلانے کے الزام سے بری قرار دیا البتہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۵۰۵ اور ۱۰۹ کے تحت دو سال قید با مشقت کا حکم صادر کر دیا۔ چند روز بعد حضرت مدنیؒ کو سابرمتی جیل بھیج دیا گیا۔ رہائی کے بعد جب حضرت بڑی خاموشی کے ساتھ تنہا رات کی تاریکی میں دیوبند پہنچے تو لوگوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ جلوس نکالنے پر اصرار کر رہے تھے مگر حضرت نے فرمایا "جلوس کیسا؟ کیا ہم نے برطانیہ کو شکست دے دی ہے۔ مجھے اپنی رہائی کی کوئی خوشی نہیں ہے بلکہ اس بات کا رنج ہے کہ برطانیہ جیتا اور ہم ہارے، کبھی شکست خوردہ لوگ بھی جلوس نکالا کرتے ہیں؟"

سابرمتی جیل سے رہائی کے چند ہی دن بعد انہوں نے کوکناڈا میں جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس کی صدارت کی۔ انہوں نے بڑے سخت الفاظ میں جس جرم پر دو سال کی سزا

ہوئی تھی اُس کو پوری قوت سے دُہرایا۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انہوں نے نہ صرف ہندوستان کی مکمل آزادی بلکہ پورے ایشیا کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ یہ اعلان اُنہوں نے اس وقت کیا جب انڈین نیشنل کانگریس کے بڑے بڑے رہنما محض ہوم رُول قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ کانگریس نے مکمل آزادی کا مطالبہ اس کے چھ سال بعد ۱۹۲۹ء میں اپنے لاہور کے سالانہ اجلاس میں کیا جو دریائے راوی کے کنارے منعقد ہوا تھا مگر حضرت مدنیؒ نے ۱۹۲۳ء میں ہی پُورن سوراج کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن اس غرض سے آیا کہ ہندوستان کی دستوری حکومت کے لئے اپنی سفارشات پیش کرے۔ اس کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ سب سے پہلے حضرت مدنیؒ نے کیا۔ انہیں اعتراض تھا کہ دستور تو بنے ہندوستان کا اور بنائے انگریز جو ہمیں ہرگز منظور نہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس اور دوسری قومی جماعتوں نے اس کے بعد یہ طے کیا کہ سائمن کمیشن کا مقاطعہ کیا جائے۔ ہندوستان کا دستور ترتیب دینے کے لئے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جو نہرو کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کمیٹی نے جو دستور بنایا وہ نہرو رپورٹ کے نام سے شائع ہوا۔ اس رپورٹ میں کامل آزادی کا کوئی تصور نہیں تھا لہٰذا حضرت مدنیؒ نے یہ کہہ کر اسے رد کر دیا کہ ہم مکمل آزادی کے سوا کسی طرح راضی نہ ہوں گے کیونکہ اس کے بغیر نہ تو ہندوستانیوں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور نہ اُن کے مصائب کا خاتمہ ممکن ہے۔ آزادی کی تحریک میں حضرت مدنیؒ انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت اور مدد کرتے رہے کیونکہ اُنکا یقین تھا کہ جو جماعت انقلاب لاتی ہے وہی برسراقتدار بھی آتی ہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کے امروہہ سالانہ اجلاس میں اُنہوں نے بحیثیت جماعت کانگریس میں شرکت کے فیصلے کا باضابطہ اعلان کیا تھا۔

آزادی کی جدوجہد میں حضرت مدنیؒ کسی غرض سے شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ صرف حُبِ وطن کی اُس سنت رسول کو تازہ کرنے کے لئے یہ راستہ اختیار کیا تھا کہ اے مکہ تو کس قدر پاک اور مجھے محبوب ہے۔ یہ وطن سے بے پناہ محبت کا اعلان تھا جسے اِس مجاہدِ اعظم نے زندہ کر کے دکھا دیا۔ اُن کی خود نوشت سوانح حیات "نقشِ حیات" جو گذشتہ ڈیڑھ صدی کی آزادی کی جدوجہد کی غمازی کرتی ہے اُن کی وطن دوستی کی مظہر ہے یہ کتاب اُن کی زندگی بھر کے تجربات و مشاہدات کے علاوہ سیاسی معلومات کا خزینہ ہے جس میں انگریز کی سیاہ کاریوں، چالبازیوں اور عیاریوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح اُنہوں نے جی بھر کے ہمارے مُلک کو لُوٹا اور برباد کیا اور ہم پر احسانات بھی جتائے۔ حقیقت یہ ہے کہ "نقشِ حیات" تحریکِ آزادیٔ ہند کی ایک جامع دستاویز ہے۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں ایک ایسا واقعہ پیش کیا جس نے پورے مُلک کی توجہ اپنی جانب مبذول کرلی۔ ۸ جنوری کو حضرتِ اقدس مولانا مدنیؒ نے پُل بنگش صدر بازار دلّی کے ایک جلسہ میں تقریر کے دوران کہا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں۔ حضرت کی اس تقریر کو دلی کے دو ممتاز اخبارات "تیج" اور "انصاری" نے شائع کیا۔ چند روز بعد دلّی ہی کے دو پرچوں نے "الامان" اور "وحدت" نے اس تقریر کو کچھ دوسرے انداز سے اپنے صفحات میں شامل کیا۔ ان پرچوں سے لاہور کے دو مشہور روزناموں "زمیندار" اور "انقلاب" نے اس تقریر کو نقل کیا اور یہ جملے حضرت مدنیؒ کی کی طرف منسوب کر دیئے کہ اُنہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ چونکہ اِس زمانے میں قومیں وطن سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ بھی اپنی قومیت کی بُنیاد وطن کو بنائیں۔ حالانکہ حضرت مدنیؒ کی اس تقریر کا مدعا محض یہ تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے مسلمانوں اور یہودیوں کو حفاظتِ وطن کے نام پر ملا کر ایک قوم

بنا سکتے ہیں تو ہندوستان کا مسلمان بھی آزادیٔ وطن کے لئے اِس قسم کا اقدام کر سکتا ہے۔

جب اس تقریر کی اخباری اطلاع علامہ اقبال تک پہنچی تو انھوں نے بغیر تحقیق یا تصدیق کئے جھٹ سے بڑے تلخ لہجے میں مولانا مدنیؒ کے خلاف تین فارسی اشعار کی ہجو لکھ ماری جو اُن جیسے سنجیدہ انسان اور عظیم شاعر کی شایانِ شان نہ تھی۔ اس موضوع پر ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور اخبارات میں گرما گرم بحث چل نکلی۔ دونوں طرف سے مضامینِ نظم و نثر کا تانتا بندھ گیا، یہاں تک کہ حضرت مدنیؒ کو اپنے موقف کی وضاحت میں ایک کتابچہ "متحدہ قومیت اور اسلام" کے عنوان سے تحریر کرنا پڑا جس پر مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا حفظ الرحمٰن نے رسالہ "برہان" دلّی میں کئی ماہ تک مدلّل بحث کی۔

حضرت مولانا مدنیؒ کی وضاحت سے علامہ اقبال کا دِل صاف ہو گیا اور اُنھوں نے اظہارِ معذرت کرتے ہوئے اپنے طنزیہ اشعار واپس لے لئے مگر علامہ کے یہ اشعار ان کے انتقال کے بعد "ارمغان حجاز" میں شریک کر لئے گئے اور معذرت کو دیدہ دانستہ غائب کر دیا گیا، حد یہ کہ جس شدت سے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور اُن کی جماعت کے خلاف سیاسی پروپیگنڈہ کیا گیا اس کا عشرِ عشیر بھی اسلام کے خلاف فتنہ آرائی کرنے والی قوتوں کے خلاف مفقود تھا اور اب بھی ہے۔ خود اقبال کے مدرسۂ فکر نے حضرت مدنیؒ کے خلاف قلم درازی کرنے والوں کو چھوا تک نہیں۔

۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی سیاست ایک طوفانی دور سے گذرتی رہی۔ برطانیہ دوسری جنگ عظیم میں اُلجھ گیا تھا۔ اِس جنگ میں برطانیہ کی کوئی مدد نہ کرنے کے اعلان کی پاداش میں بڑے بڑے قومی رہنما اسیرِ زندان بنا دیئے گئے تھے۔ میدان اب فرقہ پرست عناصر اور علیحدگی پسند قوتوں کے لئے کھلا تھا۔ ہندو مُسلم اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا اور فرقہ وارانہ سیاست گُل کھلانے لگی۔ ۱۹۴۵ء میں جنگ کے خاتمے پر قومی رہنماجیلوں سے

باہر آئے تو فرقہ وارانہ جنون اپنی انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ تعصب اور منافرت کی اِس فضا میں ہندستان کی تقدیر کے فیصلے ہونے والے تھے۔

جہادِ حُریت میں وطن دوست مسلمانوں نے قربانی واستقامت، شجاعت اور جاں نثاری کی روشن مثال قائم کی تھی۔ ایک نہیں بے شمار مسلمان مجاہد حُریت تھے جن کے نعرہ ہائے انقلاب سے فرنگی حکومت کی مضبوط اور بلند وبالا دیواریں لرز جایا کرتی تھیں۔ جن کی صدائے حق فضا میں گونجتی تھی تو انگریز حاکموں کی نیندیں حرام ہو جایا کرتی تھیں۔ جن کے جوشِ جہاد، جذبۂ صادق، یقین محکم اور عمل پیہم نے ملک کو آزادی کی منزل کے قریب پہنچا دیا لیکن مسلمانوں کی گمراہ سیاست کے صدقے میں ان انقلابی شخصیتوں کی زندگیاں محرومیوں کا مرقع ہو کر رہ گئیں۔ یہ لوگ جن کے دم سے کبھی قافلۂ آزادی رواں دواں تھا اب عبرت کی بھولی بسری داستانیں بن کر رہ گئے تھے۔ اُن پر آشوب ایام میں آزادیٔ ہند کے قافلہ سالار حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ پر جو کچھ گذری وہ فرزندان اسلام کی بہت بڑی بدنصیبی ہے جس کا خمیازہ وہ اَب تک بھگت رہے ہیں۔ یہ ہندستان کے حسین کے امتحان کا دور تھا۔ استخلاص وطن کے لئے قرآن وسنت کی پیروی کرتے ہوئے اُنہیں کئی جانکاہ راستوں سے گذرنا پڑا۔ باطل پرست قوتوں اور فرقہ پرست جماعتوں کے ہر سب وشتم، طعنہ وتعریض کا مقابلہ انہوں نے پامردی اور خندہ پیشانی سے کیا۔ وہ عمل وہمت کی ایک چٹان اور عزم وبلند حوصلگی کا ایک کوہِ گراں تھے جن کو حوادثات زمانہ اور انقلابات زمانہ اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔

اُن دنوں سیاست کی جن پُرخار وادیوں سے حضرت مدنیؒ کو بار بار گذرنا پڑا اُس کا ذکر مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب "پُرانے چراغ" میں حضرت سے متعلق لکھے گئے خاکے میں کافی تفصیل سے کیا ہے۔ میں اختصار کے ساتھ اُن کے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ اُس ہنگامہ خیز دور میں حضرت مدنیؒ کی رائے اور سیاسی بصیرت عام مسلمانوں کی خواہش اور جذبات

اور اس وقت کی مقبول قیادت کے سیاسی فکر سے بالکل مختلف تھی۔ مسلمانوں کی نئی لیڈر شپ نے مسلمانوں کے جذبات کو اتنا متحرک اور مشتعل کر دیا تھا کہ ان میں کسی مخالف رائے کے سُننے اور برداشت کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ حضرت مدنیؒ کے خُلوص، عزم اور احساس فرض نے اس کیفیت کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کر دیا اور اپنے عقیدے اور ضمیر کے مطابق رائے عامہ کی اس طاقت سے کلمۂ حق کو اپنا فرض اور افضل جہاد سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سفروں اور جلوسوں میں وہ سب کچھ پیش آیا جو مولانا کی شخصیت، اُن کی سابقہ خدمات اور اُن کے علمی و دینی مقام کے بالکل شایانِ شان نہ تھا۔ ایک طبقہ ایسا تھا جو مختلف مقامات پر پیش آرہے ان واقعات سے سخت تکلیف محسوس کرتا تھا اور مولانا کے اعلیٰ مقام اور بے نفسی کی شہادت دیتے ہوئے اِن واقعات کو مسلمانوں کے حق میں نامُناسب سمجھتا تھا۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> "مجھے یاد ہے کہ ایک ایسی ہی مجلس میں جب سید پور کے اسٹیشن کا واقعہ کسی اخبار سے پڑھ کر سُنایا جا رہا تھا اس مجلس میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب فرطِ تاثر سے رو پڑے۔ مشکل سے کوئی ایسا تھا جس کی آنکھیں نم نہ ہوں"

نیشنلسٹ مسلمانوں کو زندگی بھر کی جدوجہد کے بعد جو کچھ ملا وہ ہماری سیاسی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے۔ انہیں اپنوں ہی کے ہاتھوں پسپا ہونا پڑا لیکن حق پرستوں کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے۔ بقول آغا شورش کاشمیری "اُمویوں نے اپنے دور میں ہاشمیوں کا خون حلال کر لیا، نتیجتاً ان کا سچا تذکرہ ایک گھناؤنا جُرم ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد پر منبر و محراب پر تبرّیٰ ہوتا رہا اور یہ سلوک قرن اول کے مسلمانوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت سے تھا۔ ہر دور میں تاریخ اِسی طرح مجروح ہوتی رہی، صداقتوں کو برسوں کی مسافت کے بعد جگہ ملی۔ مثلاً شاہ ولی اللہ اور اُن کے خاندان سے اُس عہد کے مسلمانوں نے کیا سلوک کیا، شاہ عبدالعزیز

کے پائنچے توڑ دیئے، اُن کے بدن پر چھپکلی کا تیل مَلا جس سے انہیں برص ہو گیا۔ آج دعوت و عزیمت اور فکر و نظر کی محراب میں اُن کا نام گونج رہا ہے تو اِس گونج کے پیدا ہونے میں پوری ایک صدی صرف ہوئی ہے، خوانینِ ہزارہ کی غداری سے سید احمد شہید ہو گئے تو اُن کی سیرت تقریباً ایک صدی تک گرد و غبار میں دبی رہی۔ اعتراف و ستائش کے الفاظ گنگ ہو گئے۔ خود مسلمانوں نے اُن کے خلاف گز بھر کی زبانیں تیز رکھیں۔ اَب کہیں جا کے اُن کا نام اُبھرا ہے اور مسلمانوں نے تحریکِ آزادی کے ڈانڈے اُن کی جد و جہد سے ملائے ہیں "

حالات کی سنگدلی ایکبار پھر عود کر آئی۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے دوران امرتسر اور جالندھر کے ریلوے اسٹیشنوں پر ناعاقبت اندیش نوجوانوں نے حضرت شیخ الاسلام کی عزت پر ہاتھ ڈالا اور اُن پر حملہ آور ہوئے۔ جالندھر میں مفسدوں نے مولانا کی ٹوپی اُتار کر پھینک دی اور اُسے پاؤں تلے روندا۔ ایک نے مولانا کی ریشِ مبارک کو نوچا دوسرے نے گال پر طمانچہ مارا حتیٰ کہ ان کے منہ پر تھوکا۔ حضرت کا تکیہ چھین لیا گیا، گندے نعروں اور گالی گلوچ کی بھرمار تھی۔ حضرت کے ساتھ ایک خادم تھا اُس سے یہ سب برداشت نہ ہو سکا اس نے مزاحمت کی کوشش کی تو حضرت نے اُسے منع کر دیا اور فرمایا "تم یہ سب نہیں دیکھ سکتے تو دوسرے ڈبے میں چلے جاؤ، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو" اُس وقت حضرت مدنیؒ "ان اللہ مع الصابرین" کی عملی تفسیر بنے ہوئے تھے۔ جس طرح جگر گوشۂ رسولؐ کے قاتلوں میں سے کوئی بھی آخرت سے پہلے اپنے گناہوں کی سزا سے محفوظ نہ رہا تھا اُسی طرح شمس الحق سے لے کر فضل محمد تک رقصِ ابلیس کرنے والا کوئی بھی مفسد خدا کے خوفناک قہر سے نہ بچ سکا اور آفاتِ سماوی اُن پر نازل ہو کر رہیں۔ ایک بار یہ پھر ثابت ہو کر رہا کہ خدا اپنے محبوب بندوں کو دُکھی کرنے والوں سے کڑا انتقام لیتا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

مولانا محمود الحسن، کنز العلوم
ٹانڈہ۔ فیض آباد

حضرت شیخ الاسلام رح

حیات اور کارنامے

اسلام کا چودہ سو سالہ دور اپنی ابتدا سے آج تک ایسی تاریخ ساز شخصیتوں اور ان کے روشن کارناموں سے بھرا ہوا ہے جن کے زرّیں نقوش تاریخ کا عظیم سرمایہ ہونے کے ساتھ افراد ملت کے لئے ہر دور میں دینی و ایمانی تربیت کے رہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملت اسلامیہ جب بھی اور جس نوع کی بھی ابتلا و آزمائش سے دوچار ہوئی، قدرت نے اس کے دفاع کیلئے بروقت ایسے باصلاحیت جواں ہمت اولوالعزم افراد کو کھڑا کیا جنھوں نے اسبابی ذرائع کی قلت و کثرت سے بے نیاز ہوکر اپنی تمام تر ایمانی جرأت و ہمت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور اپنے عظیم تر مقاصد کے حصول کی راہ میں ایسی بے پناہ قربانیوں کے نمونے پیش فرمائے تاریخ انسانیت جس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اسلام و ملت اسلامیہ کے دفاع کے لئے کوئی رومی و غزالی بن کر اٹھا کوئی شاہ ولی اللہ و مجدد الف ثانی کی صورت میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا کسی نے حضرت سید احمد شہید و مولانا اسمٰعیل شہید کی حیثیت سے میدان جہاد کو رونق بخشی تو کسی نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی صورت میں وقت کی ظالم و عیار ترین طاقت سے ٹکر لی۔

مردان حق کے اس قافلے میں ایسے ایک دو نہیں ہزار ہا ہزار سرفروش مجاہدین ہیں جو آسمان دعوت و عزیمت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور اقصار عالم کو اپنی ایمانی کرنوں سے منور کیا تاریخ اسلامی کا کوئی دوران خدا آگاہ فرزندان توحید سے خالی نہیں رہا۔

مجاہد کبیر حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کی ذات گرامی بھی انھیں مردان حق آگاہ کے زرّیں سلسلے کی ایک تابناک کڑی ہے بیسویں صدی ملک و ملت کے جن چند ممتاز ترین فرزندوں پر فخر کر سکتی ہے یقیناً ان میں سے ایک مایۂ ناز فرد حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ بھی ہیں، اسلام و ملّت اسلامیہ کی ترقی و سرفرازی کے لئے آپ کی مختلف الجہات کوششیں، خدمات اور کارنامے اور ان سب سے بڑھ کر ظالم و جابر برٹش سامراج کے خلاف مردانہ وار عزائم اور مجاہدانہ سرگرمیاں ایسے محیر العقول کارنامے ہیں جن پر ملّت اسلامیہ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔

ایک فرد واحد بیک وقت حدیث و تفسیر، فقہ وغیرہ دینی علوم، زہد و تقویٰ، ارشاد و سلوک اور جہاد حرّیت کے مختلف میدانوں میں جس بےمثال ہمت و عزیمت کے ساتھ رہنمائی کے فرائض انجام دیتا ہے اور پھر سیاست کی سنگلاخ و پرخار وادیوں سے جس جرأت و بیباکی کے ساتھ بے داغ گذر جاتا ہے الفاظ کافی نہیں کہ اس کی کماحقہٗ داد دی جا سکے۔

آپ کے مختلف الجہات کارناموں کے سلسلے میں سب سے نمایاں تین اہم گوشے ہیں، تعلیم و تدریس، جس کی ابتدا گنبد خضراء کے زیر سایہ اس مسجد اقدس سے ہوئی، جو روئے زمین پر خداوند قدوس کی پہلی سجدہ گاہ اور آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس و مبارک نسبت سے ام المساجد ہونے کا شرف رکھتی ہے، اس حلقۂ درس

سے سب سے پہلے سیراب ہونے والے حجاز و یمن، مصر و شام، افغانستان و ترکستان کے تشنگان علوم تھے، حجاز مقدس میں درس کا یہ سلسلہ کم و بیش سترہ سال تک جاری رہا، پھر اس کے بعد جب ۱۳۴۶ھ میں آپ دارالعلوم کی صدارت عظمیٰ پر فائز ہوئے تو ہزارہا تشنگان علوم دینیہ نے آپ سے علمی استفادہ کیا، اس طرح اس آفتاب علم کی ضیاء باریاں تمام اقصار عالم تک پھیل کر پوری دنیا کو قرآن و سنت کے انوار سے منور کرنے کا سبب ہوئیں، اس ایک چراغ سے کتنے ہزارہا چراغ جلے اور ان سے ظلم و جہالت کی تاریک فضاؤں میں علم و عرفان کی کتنی ضیا پاشیاں ہوئیں اور آئندہ کب تک ہوتی رہیں گی اس کا صحیح علم خداوند علیم و خبیر کے سوا دوسرا کو کیا ہو سکتا ہے۔

آپ کی خدمات کا دوسرا اہم گوشہ ارشاد و سلوک اور تربیت باطنی کا وہ عظیم سلسلہ ہے جو آپ کی ذات سے چلا اور ہزارہا طالبان حق کیلئے وصول الی اللہ کا ذریعہ ثابت ہوا، جہاں آپ اسلامی علوم و معارف اور ایشیائی فنون و آداب کے علمبردار تھے اور آپ کی ہمت ظاہری و باطنی سے ملک و بیرون ملک کے ہزاروں علماء اس علمی امانت کے امین بن گئے جو مرکز علم و فن دارالعلوم دیوبند سے آپ کی بدولت نشر ہوتی رہی وہیں رشد و ہدایت اور تزکیۂ باطن کا وہ عظیم سلسلہ بھی آپ سے چلا جس کے ذریعہ سے برصغیر ہند و پاک کے صدہا نفوس وصول الی اللہ کی لازوال دولت سے مالا مال ہوئے اور ان کے ذریعہ ملک کے گوشے گوشے میں اصلاح و ہدایت کے چشمے جاری ہوگئے جو بحمد اللہ طالبان حق و صداقت کی روحانی و ایمانی سیرابی کا بہترین ذریعہ ہیں۔

آپ کا تیسرا بڑا کارنامہ جنگ آزادی ہند کے سلسلہ میں آپ کی وہ مومنانہ و مجاہدانہ سرگرمیاں ہیں جو جابر و قاہر برٹش گورنمنٹ کے مقابلے میں پوری ہمت و

جواں مردی کے ساتھ عمل میں آتی رہیں، انگریزوں نے جس بیدردی کے ساتھ مغل حکومت کو تاراج کیا اور ہندوستانی دولت وثروت کو جس عیاری ومکاری کے ساتھ لوٹ کر انگلستان پہنچاتے رہے تاریخ پر نگاہ رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں، ان بدیشی لٹیروں کی ظالمانہ پالیسیاں ملک کو گھن کی طرح چاٹ رہی تھیں اور بلا امتیاز مذہب وملت تمام برادران وطن ان کے زد میں تھے کوئی بھی سچا محب وطن غلامی کی اس ذلت کو برداشت کرنے پر تیار نہیں ہو سکتا تھا، پھر ہمارے علمائے کرام جو روئے زمین پر نبی کے نائب ہونے کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے ہیں اس لعنت کو کیوں کر گوارا کر سکتے تھے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا دردمند دل ان حالات کو دیکھ کر تڑپ اٹھا اور آپ نے اور آپ کے وفادار وجاں نثار رفقاء وتلامذہ نے اس ظلم وبربریت کے خلاف اعلان جہاد کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا، باوجود بے سروسامانی اس عظیم طاقت سے ٹکر لینے کے لئے اپنی ایمانی جرأت واعتماد علی اللہ کے بھروسے پر میدان کارزار میں کود پڑے اور تادم آخر انتہائی استقلال وپامردی کے ساتھ ان غاصبین کا مقابلہ کرتے رہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ اپنے مشفق استاذ ومربی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے برپا کئے ہوئے اس جہاد میں ہر قدم پر شانہ بشانہ شریک رہے اور ان کے وصال کے بعد اس کاروان حریت کے عظیم قائد کی حیثیت سے جو کردار ادا کر گئے وہ تاریخ آزادی کا ایک روشن باب بن کر ہمیشہ یادگار رہے گا۔

علمی دنیا، ممتاز شخصیتوں اور وسیع النظر ومتبحر عالموں سے کبھی خالی نہیں رہی مگر شرافت وسیادت، اخلاص وللہیت، بے غرضی وبے نفسی، بلند اخلاقی کردار وصفات کے جو عملی نمونے حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی

زندگی میں نظر آئے اس زمانۂ قحط الرجال میں اس کی مثال اگر ناپید نہیں تو کمیاب ضرور ہے،

آج علم وفضل کی نمائش ونمود، فوقیت وفضیلت کا جا وبے جا اعلان و اظہار اہل علم ومنصب کی فطرتوں میں اس طرح رچا دبا ہوا ہے کہ اس کے بغیر شخصیتوں کا تعارف مکمل نہیں سمجھا جاتا مگر جب ہم حضرت شیخ کی زندگی کے شب وروز پر نظر ڈالتے ہیں تو انتہائی حیرت واستعجاب کے ساتھ یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جو بیک وقت بزم علم وعرفان کا صدر نشین، جادۂ ارشاد وسلوک کا رہنمائے کامل، میدان سیاست وسیادت کا شہسوار اور جنگ آزادی وطن کا عظیم قائد ہوتے ہوئے تواضع وفروتنی، عجز وانکساری، سادگی وبے نفسی کا مجسمہ بنا ہوا کبھی مسند علم وارشاد پر جلوہ گر نظر آتا ہے، کبھی خدمت وسیاست کے میدانوں میں سرگرداں دکھائی دیتا ہے تو دل بے اختیار اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ وہی مسلمانی ہے جس کا ذکر کتابوں میں تو ضرور ہے مگر زندگی کے عملی میدانوں میں اس کا شائبہ تک نظر نہیں آتا، پوری زندگی ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین کا مکمل مظہر تھی،

قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ عہدہ ومنصب، مال وجاہ کی طلب وتمنا آپ کو چھو کر بھی نہیں گذری تھی، اپنے کسی کمال وہنر کا کبھی کوئی صلہ نہیں چاہا، دیوبند کی صدر مدرسی کے دوران ملنے والی تنخواہ جس کا اپنے دنیا دار ہونے کا ثبوت دینے کے لئے بار بار اعلان و اظہار فرمایا کرتے تھے وہ آپ کے وسیع مہمان خانہ کا غالبًا ایک ہفتہ کا بھی خرچ نہیں تھی، جب کہ اس تنخواہ کا معتد بہ حصہ اسفار وغیرہ کی

غیر حاضری کی بنا پر اکثر کٹ جایا کرتا تھا۔

آپ کی زندگی کا سب سے بڑا مشن اعلاء حق و اتباع شریعت تھا ظاہری و باطنی طور پر مسلمان ہونا، مسلمان ہو کر جینا، مسلمان ہو کر مرنا، آپ کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین تھا، آپ کے کمالات علمی و ایمانی کے لئے یہ چند صفحات ناکافی ہیں ؎

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

گلچین تو ز تنگیٔ داماں گلہ دارد

شیخ الاسلام تیس بتیس سال دارالعلوم دیوبند میں معزز ترین منصب پر فائز رہے، آپ کی شخصیت نے دارالعلوم پر زبردست اثرات ڈالے، آپ سے پہلے بھی دارالعلوم کی عظمت واہمیت کا اعتراف کیا جانے لگا تھا، اس کی شہرت کا دائرہ بھی بتدریج بڑھتا جارہا تھا، لیکن شیخ الاسلام کی دارالعلوم میں تشریف آوری کے بعد اس کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر آگیا، دارالعلوم کی مرکزیت ومرجعیت میں بھی اضافہ ہوا اور اس کے علمی وروحانی فیوض وبرکات کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔

حضرت شیخ الہند اور علامہ انور شاہ کشمیری کے حلقۂ درس سے ایسے افراد نکلے جو علمی دنیا میں آفتاب وماہتاب بن کر چمکے، لیکن یہ دائرہ بہرحال محدود تھا اس میں گہرائی تھی پھیلاؤ نہیں، عظمت ورفعت تھی مگر وسعت نہیں تھی، یہ دائرہ شیخ الاسلام کے زمانے میں وسیع ہونا شروع ہوا تو خواص کے ساتھ عوام کی نگاہیں بھی دارالعلوم کی سمت اٹھنے لگیں، نئے طلوع ہونے والے سورج کی کرنوں نے پورے

ملک کی نگاہوں کو اپنی طرف پھیر دینے پر مجبور کر دیا، شیخ الاسلام کے علم و فضل، زہد و تقویٰ، جوش عمل، عظمتِ کردار نے احاطہ دارالعلوم پر اپنا زبردست اثر ڈالا، جس کی وجہ سے پورے دارالعلوم پر ایک خاص رنگ چھا گیا، کیا اساتذہ اور کیا طلبہ ہر ایک کا ذہن و مزاج ایک خاص سانچے میں ڈھلنا شروع ہو گیا اور ان کے ظاہر و باطن دونوں میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا، شیخ الاسلام کے دور میں احاطۂ دارالعلوم سے نکلنے والے فضلاء پورے ملک میں اپنی ایک شناخت رکھتے تھے ان کی اپنی انفرادیت تھی، یہی انفرادیت ان کی علامت اور پہچان بن گئی تھی، مسند درس و تدریس سے لے کر رد فرق باطلہ اور بحث و مناظرہ کے اسٹیج تک ان کی شخصیت اپنا رعوب کن اثر ڈالتی تھی، دوسری طرف شیخ الہند کے دل میں پرورش پانیوالے جذبۂ آزادی کی حرارت شیخ الاسلام کے واسطے سے غیر محسوس طور پر فضلاء دارالعلوم کے سینوں میں منتقل ہو گئی، اور اس نے فضلاء دارالعلوم کو جہاد آزادی کی صفِ اول میں کھڑا کر دیا اور انھوں نے اتنی عظیم الشان قربانیاں دیں کہ عصبیت اور تنگ نظری کی بے غیرتی بھی اس سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی، انھیں بے پناہ قربانیوں کا صدقہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمان اپنا روحانی اور جسمانی دونوں وجود برقرار رکھ سکا اور وہ چراغ جلتا رہ گیا جو آندھیوں کی یلغار میں آچکا تھا، یہ کرشمہ ہے شیخ الاسلام کی دارالعلوم سے وابستگی کا، یہ فیض ہے عزیمت و استقامت کے اس پیکر مقدس کا جو احاطۂ دارالعلوم میں تیس بتیس سالوں تک اپنے فیوض و برکات کی متاع گرانمایہ کو پوری فیاضی سے لٹاتا رہا، ان تمام حقائق کے باوجود یہ کتنی حیرتناک حقیقت ہے کہ اسی عظیم المرتبت شخصیت کے ذکر سے تاریخ دارالعلوم یکسر خالی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ دو ضخیم جلدوں میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند نوراللہ مرقدہٗ کی نگرانی میں لکھی گئی ہے اور شائع کی گئی ہے تاریخ میں دارالعلوم کے حالات سن وار لکھے گئے ہیں، لیکن دو باتیں بڑی شدت سے کھٹکتی ہیں اور ایسا خلا محسوس ہوتا ہے جس کا پُر ہونا ناگزیر تھا، ایک تو علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی اور دوسرے کئی اہم اساتذہ کی دارالعلوم سے علٰحدگی کا ذکر ہے، اس علیحدگی کے جو اسباب بیان کئے گئے ہیں ان کو پڑھ کر ان بزرگوں کی عظمت و برتری اور علمی جلالت شان مجروح ہوتی ہے، تاریخ نگار نے ہم کو یہ بتایا ہے کہ ان اکابر نے چند انتہائی معمولی باتوں کی وجہ سے اپنے اسلاف کے خونِ جگر سے تعمیر کردہ ایک مقدس ادارہ کی بنیاد کو زیر و زبر کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا، حالانکہ ان حضرات کی شان اس سے کہیں بلند و برتر تھی. یہ غلط تاثر اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی علیحدگی کے حقیقی اسباب پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کی جگہ سطحی واقعات کا ذکر ایک خالی الذہن انسان کو غلط تاثر دیتا ہے دوسری بات شیخ الاسلام کی دیوبند میں تشریف آوری کا ذکر جب کہ تاریخی تسلسل کے لئے اس موقعہ پر اس کا ذکر انتہائی ضروری تھا، آپ پوری تاریخ دارالعلوم پڑھ جائیے آپ کو کہیں سے بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شیخ الاسلام دارالعلوم میں کب آئے؟ کیوں آئے؟ سلہٹ سے دارالعلوم دیوبند کس نے بلایا؟ ان کی تقرری کب ہوئی اور کس منصب پر ہوئی؟ جس شخصیت نے دارالعلوم کو عالمی شہرت سے ہم کنار کیا جس کی علمی خدمات کی مدت سب سے زیادہ ہے، قیام دارالعلوم سے لے کر شیخ الاسلام کے سانحۂ ارتحال تک جتنے فضلاء دارالعلوم سے فارغ ہوئے ان میں سے نصف تنہا شیخ الاسلام کے دامن فیض سے وابستہ علماء و فضلاء کی تعداد ہے، لیکن تاریخ دارالعلوم ہم کو یہ نہیں بتاتی کہ وہ شخصیت دارالعلوم میں کب آئی اور شیخ الحدیث کے منصب پر تھی بھی یا نہیں؟ کیا یہ بات حیرتناک نہیں ہے، دارالعلوم کی تاریخ کے

مذکورہ بالا دونوں واقعات کو نظر انداز کئے جانے کی وجہ سے قدرتی طور پر یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ کی ترتیب میں ایک خاص نقطہ نگاہ کار فرما ہے اور دانستہ طور پر تاریخ نگاری کے فرائض اور ذمہ داریوں سے چشم پوشی کی گئی ہے

ایک قاری جب تاریخ دارالعلوم میں پڑھتا ہے کہ دارالعلوم کے تمام ممتاز اساتذہ جو ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے، اپنے علم و فضل اور کمال فن کیلئے اپنے دور میں امتیازی شان رکھتے تھے بیک وقت ان تمام حضرات نے دارالعلوم چھوڑ دیا تو کیا دارالعلوم میں یہ جگہیں خالی چھوڑ دی گئیں؟ یا ان جگہوں کو پُر کیا گیا؟ درس حدیث کا سلسلہ جاری رہا یا بند ہوگیا، اگر جاری تھا تو علامہ انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے منصب پر کون سی شخصیت آئی؟ حضرت علامہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی وغیرہ کے جانے سے دارالعلوم میں جو خلا پیدا ہوا، وہ پُر ہوا یا نہیں؟ تاریخ دارالعلوم ہمکو کچھ نہیں بتاتی، حالانکہ اس سال میں ہونیوالے چھوٹے چھوٹے واقعات کا تذکرہ ملتا ہے، دارالعلوم میں کون مہمان آیا، سڑک کب بنی، گیٹ کب تعمیر ہوا، دارالاقامہ کی بنیاد کب پڑی، فن تجوید جاری ہوا، فارسی درجات میں اضافہ کیا گیا، معزز افراد کی آمد پر استقبالیہ جلسے ہوئے، ان کے اعزاز میں کئے جانے والے استقبالیہ جلسوں کی تقریروں کے لمبے لمبے اقتباسات دیئے گئے، ان تمام واقعات کو بڑے اہتمام سے لکھا گیا، لیکن دارالعلوم میں ان اکابر اساتذہ کے نکل جانے کے بعد دورۂ حدیث کا کیا نظم ہوا تاریخ نگار ہم کو اسکی خبر نہیں دیتا اور تاریخ دارالعلوم کی جلد اول کے پانچ سو صفحات سیاہ ہو جاتے ہیں اور جب شیخ الاسلام ۳۲ سال دارالعلوم میں علمی خدمات انجام دے کر اس دنیا سے تشریف لے جاتے ہیں تو چند سطریں تعزیت کے سلسلہ میں ملتی ہیں جس کی ایک سطر یہ بھی ہے کہ آپ دارالعلوم میں ۳۱ سال تک شیخ الحدیث رہے

اللہ مغفرت کرے۔

تاریخ دارالعلوم کے یہ دو باب جو اہمیت کے لحاظ سے پوری تاریخ میں سب سے زیادہ قابل ذکر تھے وہی ناقابل ذکر ثابت ہوئے، یہ کن اسباب کی بنا پر ہوا؟ دانستہ ایسا کیا گیا یا نادانستہ؟ خدا ہی جانے خدا کی باتیں، لیکن ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ایک مورخ کا جو فرض تھا اور ادارہ کے ایک ذمہ دار کی جو ذمہ داری تھی اس کو دانستہ یا نادانستہ پورا نہیں کیا گیا۔

پوری تاریخ دارالعلوم پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تاریخ کی ترتیب ایک خاص نقطۂ نگاہ سے کی گئی ہے، بہت سے واقعات جن کا براہ راست تعلق شیخ الاسلام کی ذات سے تھا ان کی صحیح تصویر کشی نہیں کی گئی، اور بہت سے ایسے حقائق ہیں جن کو چھوا تک نہیں گیا ہے جب کہ ان کا تاریخ دارالعلوم سے گہرا ربط و تعلق ہے اور آزادی کے بعد انھیں مستور حقائق کا سہارا لیا گیا اسی کی بنیاد پر دارالعلوم کی آزاد ہندوستان میں اہمیت و عظمت تسلیم کی گئی۔

تاریخ دارالعلوم کے یہ دونوں باب تفصیل طلب ہیں، اکابر اساتذہ کی دارالعلوم سے علٰحدگی کے حقیقی اسباب پر دو دستاویزی ثبوت ہیں ایک روداد کارروائی مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند ۱۳۴۵ھ شائع کردہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، دوسرا ضمیمہ رسالہ القاسم دیوبند شمارہ ماہ شعبان ۱۳۴۶ھ یہ دونوں اس وقت میرے سامنے ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ میں جو اسباب بیان کئے گئے ہیں وہ غیر واقعی ہیں بلکہ ان کے گرد و پیش ایسی فضا اور ماحول بنا دیا گیا کہ اس ماحول اور فضا میں ان کے لئے رہنا دشوار ہو گیا اور مجبور ہو کر علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی نے استعفا دیدیے اور مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولانا سراج احمد صاحب سے استعفا لیا گیا ان کے علاوہ اور دوسرے

کئی مدرسین بھی دارالعلوم سے علیحدہ ہو گئے، طلبہ کی بہت بڑی تعداد نے بھی رخت سفر باندھ لیا، ان سے اپنا علمی چمن اجڑتا ہوا نہ دیکھا گیا اور وہ گذرتی ہوئی علمی بہار کے ہمسفر ہو گئے اور دارالعلوم کا چمن عندلیبان علوم نبوی کے چہچہوں سے محروم ہو کر گہرے سناٹے میں ڈوب گیا، دارالعلوم کے لئے یہ حادثہ تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ تھا، لیکن دارالعلوم کی بنا اخلاص کے جن مضبوط پتھروں پر رکھی گئی تھی اسی کا یہ فیض تھا کہ تنگ نظری اور آمریت اور اجارہ داری کے تیز و تند طوفان نے دارالعلوم کے در و دیوار کو تو ایک بار ضرور ہلا دیا لیکن اس کو زمین بوس ہونے سے بچا لیا، قدرت کو اس سرزمین سے ابھی علم کا چشمہ جاری رکھنا منظور تھا اسلئے تخریب کے بعد تعمیر، ویرانی کے بعد آبادی ہوئی، خشک سالی کے بعد رحمت کی گھٹائیں اس پر جھوم جھوم کر آئیں اور موسلا دھار برسیں، دارالعلوم کے ابر کرم کو ابھی اور برسنا تھا، ابھی بہت بڑے خطۂ ارضی کی علمی تشنگی بجھانی اسکے مقدر میں تھی، اس لیۓ باد صرصر کے تیز جھونکوں نے چھائی ہوئی گھٹاؤں کو وقتی طور پر ضرور اڑا دیا، لیکن خلیج بنگال سے مشرقی ہواؤں کے دوش پر ایک گھٹا ایسی آئی کہ اس نے کشت زار علم و عمل کو جل تھل کر دیا، وہ ابر کرم شیخ الاسلام کی ذات گرامی تھی۔

شیخ الاسلام دارالعلوم میں تیئیس سال شیخ الحدیث رہے اور منصب صدارت پر فائز رہے اور دارالعلوم کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، دورۂ حدیث کے طلبہ میں اضافہ ہوتا چلا گیا، دارالعلوم کا حلقہ تعارف وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، شیخ الاسلام کا انداز درس علم و فضل زہد و تقویٰ کا اثر طلبہ اور عام اساتذہ پر بڑھتا گیا، شیخ الاسلام کیساتھ طلبہ کی والہانہ عقیدت و محبت روزافزوں تھی بڑی سے بڑی شورش اور بڑے سے بڑا ہنگامہ حضرت شیخ الاسلام کی مداخلت کے بعد جھاگ کیطرح بیٹھ جاتا تھا، اس مرجعیت و مقبولیت کے پس پشت شیخ الاسلام کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے علاوہ اس مشق کی سرگرمیاں تھیں جس کا آغاز آپنے

شیخ الہند کی معیت میں اسارت مالٹا سے شروع کیا تھا، ریشمی رومال کی تحریک میں آپ انگریزوں کی قید سے نہیں بلکہ پھانسی کے تختے سے اُتر کر ہندوستان آئے تھے، اس لئے پورے ملک نے شیخ الاسلام کے استقلال، ثبات قدمی، آزادی کے مشن سے والہانہ وابستگی اور آپ کی عزیمت واستقامت کو عظمت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا، آپ کی عظیم الشان قربانیوں کو عقیدت ومحبت کا نذرانہ پیش کیا تھا سیاسی حلقوں نے آپ کو جانشین شیخ الہند تسلیم کرکے آپ کی عظمت کے سامنے سر عقیدت خم کردیا تھا اس لئے آپ کی ذات ہر ایک کے لئے لائق صد احترام ہو چکی تھی۔

شیخ الہند کا جذبۂ آزادی شیخ الاسلام کے سینے میں منتقل ہو چکا تھا اس لئے درس حدیث کے ساتھ سیاسی سرگرمیاں بھی پوری قوت کے ساتھ جاری تھیں، جمعیۃ علماء تو آپ کی جماعت ہی تھی اس کے علاوہ کانگریس کی تحریکات میں آپ سرگرمی سے حصہ لیتے تھے، یہ سیاسی سرگرمیاں ارباب مدرسہ کے بعض افراد کو پسند نہیں تھیں اور وہ ان پر نکتہ چینیاں کیا کرتے تھے، جیسا کہ شیخ الاسلام مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں

> "مجھکو تعلیمی مشاغل سے فرصت نہیں، ادھر دہلی جانا بخوف نوٹس غیر مناسب معلوم ہوتا ہے، حسب پروگرام وقت پر قانون شکنی کے لئے انشاء اللہ جانا ہوگا۔...... مولانا عبدالحلیم صاحب لکھنوی کو دوسال کی مہمانی کا شرف حاصل ہوگیا، کچھ بعید نہیں کہ کارکنان دارالعلوم دیوبند اس مرتبہ کی مہمانی جیل کے بعد میرا تعلق ہی دارالعلوم سے قطع کردیں، جہاں تک سنا جاتا ہے، لوگ اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح پاپ کٹے"[1]

یہ بات اس وقت کی ہے کہ جب لیگ جمعیۃ العلماء کی حمایت کی وجہ سے الکشن میں سو فیصد کامیاب ہو چکی تھی، اور اس نے کامیابی کے نشہ میں ان تمام شرائط کو بالائے طاق

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۱۹۲

رکھ دیا جو جمعیۃ علماء سے معاہدہ کے وقت طے ہوئی تھیں، اس لئے شیخ الاسلام نے مسلم لیگ کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور اس کی عہد شکنیوں پر آپ نے ایک تفصیلی بیان اخباروں میں دیا تھا جو بعد میں کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا تھا، اس لئے ارباب دارالعلوم میں جو لوگ مسلم لیگ کے ہم نوا تھے انھوں نے شیخ الاسلام کے خلاف محاذ بنالیا۔ مگر سیاست کا نام نہ لے کر درس و تدریس کے مسئلہ کو آڑ بنایا، شیخ الاسلام کے خلاف فرضی ناموں سے بیانات شائع کرائے گئے، یہ بیانات۔ انقلاب "۔" الامان " اور " وحدت " میں بڑے آب و تاب کے ساتھ شائع کئے گئے[1]

یہ اختلاف اس وقت کھل کر سامنے آگیا جب بجنور میں خان ابراہیم کا الیکشن ہوا، کیونکہ یہ بڑے کانٹے کا الکشن تھا، اس موقعہ پر دو اساتذہ دارالعلوم سے رخصت اتفاقیہ لے کر اپنے وطن بجنور گئے اور وہاں چند دن جاکر الیکشن کی مہم میں شریک رہے اس مسئلہ کو لے کر مجلس شوریٰ میں گرم گرم بحثیں ہوئیں اور کوشش کی گئی کہ مجلس شوریٰ ایسا قانون بنادے کہ سیاسی امور میں حصہ لینے والا ملازم مجرم سمجھا جائے اور اس قانون میں کسی طرح کا کوئی استثناء نہو[2] شیخ الاسلام ان دنوں دیوبند سے باہر تھے لیکن صورت حال سے پورے طور پر واقف تھے، اور ان سرگرمیوں کی بھی آپ کو اطلاع تھی جو دیوبند میں آپ کے قیام کے خلاف وجود میں آرہی تھیں، شیخ الاسلام کے مکتوب گرامی سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"حسین احمد کی زندگی اور معیشت بھی دارالعلوم پر موقوف نہیں ہے وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا کی بنا پر اس کا خالق کہیں نہ کہیں سے رزق پہونچائے گا، انشاءاللہ تعالیٰ اسلئے میری مشروط ملازمت میں اگر کلام ہے یا میرے عقیدے یا دستورالعمل میں

---

[1] خط حضرت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند بنام شیخ الاسلام مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۹۸ [2] مکتوبات ج ۲ ص ۱۸۷۔

کلام ہے تو مفاد دارالعلوم اور ملت اسلامیہ کو سامنے رکھ کر آپ اور ممبران تجویز فرمائیں، مجھے اپنے اکابر سے جو کچھ پہنچا ہے اس کو چھوڑ نہیں سکتا اور نہ چھوڑوں گا۔ الا ان یشاء اللہ[۱]

جون ۱۹۴۲ء میں بچھرایوں ضلع مراد آباد میں ایک تقریر کی بنیاد پر شیخ الاسلام کو گرفتار کر کے جیل بھیجدیا گیا، جولائی میں طلبۂ دارالعلوم نے جلوس نکال کر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا تھا، ابھی یہ غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا کہ اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کوئٹ انڈیا طوفان بن کر ملک پر چھا گئی، طلبۂ دارالعلوم کے ذہن و مزاج اپنے محبوب و محترم استاذ حضرت شیخ الاسلام سے والہانہ عقیدت و محبت کی وجہ سے جذبات حریت سے لبریز تھے، انھوں نے بھی دیوبند میں جلوس نکال کر حکومت کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا اور دیوبند تحصیل پر خشت باری کی، پھر بھی وہ ایک ایسے دینی ادارہ کے طالب علم تھے وہ اس سے آگے جا بھی نہیں سکتے تھے، جب کہ ۴۲ء کی اس ہنگامہ خیز اور طوفاں بدوش تحریک میں کوئی جلوس تشدد سے خالی نہیں رہتا تھا، سرکاری املاک کو تباہ کرنا اس تحریک کا بنیادی مقصد تھا اہنسا اور عدم تشدد کی پالیسی ترک کی جا چکی تھی مگر دارالعلوم کے طلبہ نے کسی تشدد کا کوئی خاص مظاہرہ نہیں کیا تھا، لیکن ارباب اہتمام کو یہ بھی اقدام ناپسند تھا، طلبہ کے اس اقدام میں ان کو کانگریسیت کی بو محسوس ہوئی جس سے ان کو نفرت تھی اور ۹۵ طلبہ کا دارالعلوم سے اسی جرم میں اخراج کر دیا گیا اور مزید ستم یہ کہ طلبہ کے اس اقدام کو شیخ الاسلام کے اثرات کا نتیجہ قرار دیا گیا، اور مجلس شوریٰ کو یہ باور کرایا گیا کہ دارالعلوم میں یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ سب صرف اس لئے کہ سیاسی تحریکات میں مولانا مدنیؒ کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے، اگر یہ استثناء نہ ہوتا تو کانگریس کی حمایت میں یہ مظاہرہ نہ ہوتا، حالانکہ اس جلوس سے دو ماہ قبل شیخ الاسلام گرفتار ہو کر مراد آباد جیل میں تھے، طلبہ نے اپنے طور پر بلا کسی دوسرے کے

---

[۱] مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۲۰۶۔

مشورہ کے یہ جلوس نکالا تھا اس کا کسی ذات سے تعلق جوڑنا قطعاً غلط تھا، شیخ الاسلام کو یہ خبر جیل میں ملی کہ جلوس نکالنے کے جرم میں ۹۰ طلبہ دارالعلوم کا اخراج کر دیا گیا ہے، تو آپ نے اپنے ایک خط میں حافظ محمد یوسف انصاری کو ایک تفصیلی خط لکھا اسکے اخیر میں تھا ۔

• یہ مدرسین و ملازمین فقط جذبات ہی تو رکھتے ہیں، اہل حل وعقد کی تشدد آمیز کارروائیوں سے ڈٹ کر علانیہ تحریکات میں حصہ نہیں لیتے تاہم ان کو اصل اصول فساد کہتے ہیں، اصل اصول فساد حسین احمد ہے جو علانیہ تحریکات میں حصہ لیتا ہے اس کو نکالنا چاہئے [۱]

شیخ الاسلام کو نینی جیل میں دیوبند سے ایک خط ملا جس میں مکتوب نگار نے اس افواہ کا ذکر کیا تھا جو اس وقت احاطۂ دارالعلوم میں پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے شیخ الاسلام کے متوسلین کو تشویش تھی اور انھوں نے اپنے خط میں اس تشویش کا کا اظہار کیا تھا، آپ نے ان کو جیل سے لکھا ۔

جو حضرات کہتے ہیں کہ ہم نے ایسا انتظام کیا ہے کہ حضرت مولانا اپنی قید کی مدت پوری کر کے بھی آزاد نہیں ہوں گے، تو آپ حضرات کو اس پر خوش ہونا چاہیئے، حضرت شیخ الہند کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا، میں تو انھیں کا نالائق غلام ہوں اگر ایسے حالات رونما ہو رہے ہیں تو شکر کی بات ہے، کیا تعجب ہے کہ وہی انقلاب پیش آئے جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مخالفت اور ایذا رسانی کرنے والوں پر آیا تھا، بہرحال آج تو تمام ہندوستان میں قید و بند کی آندھی چل رہی ہے اگر میں آزاد بھی ہوتا تو آزاد نہیں رہ سکتا تھا، کانگریس غیر قانونی جماعت ہے

---

[۱] مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ ص ۳۷۱

میں اس کا ممبر ہی نہیں بلکہ یو پی کا نائب صدر بھی ہوں میرے خیالات
اور کلمات شارع عام پر ظاہر ہیں جب تک گورمنٹ برطانیہ یہاں موجود
ہے اور اس کی پالیسی موجودہ پالیسی ہے اس وقت تک میں کیا سارے قومی
اور سرگرم کارکنوں کے لئے آزادی تقریباً مستحیل ہے اس پر جس کا
جی چاہے خوش ہولے اور جس کا جی چاہے کبیدہ خاطر ہو الحب فی اللہ
والبغض فی اللہ ہمارا فریضہ ہے[1]

اس طرح کے درجنوں واقعات ہیں جو صاف طور پر غمازی کرتے ہیں کہ احاطۂ دارالعلوم میں شیخ الاسلام کے بے پناہ اثرات کو دیکھ کر کچھ لوگ ایسی فضا بنانے میں مسلسل مصروف تھے کہ آپ کا تعلق دارالعلوم سے منقطع ہوجائے بالخصوص اگست ۱۹۴۲ء کے بعد جب تحریک پاکستان اپنے شباب پر پہنچی، ملک میں ایک گروہ مستقلاً اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہا لیکن خدا کو ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کی حفاظت منظور تھی اس لئے ساری ذہنی اذیتوں کے باوجود شیخ الاسلام کے ذہن میں دارالعلوم سے علیحدگی کا خیال تک نہیں آیا، البتہ ارباب اختیار جو کچھ کرسکتے تھے کرتے رہے، انھوں نے شیخ الاسلام کے مقام ومرتبہ کو نہیں پہچانا، اس کی آئینہ دار تاریخ دارالعلوم دیوبند ہے، ضرورت ہے کہ اس تاریخ پر نظر ثانی کی جائے اور ان تمام حقائق سے پردہ اٹھایا جائے جن پر دانستہ یا نادانستہ پردہ ڈال دیا گیا ہے۔

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ ص ۲۶۰

غفران احمد ایم، اے

شیخ الاسلام کا نظریۂ قومیت

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا جب ذکر آتا ہے تو بے ساختہ یہ اشعار زبان پر آجاتے ہیں۔

آفاق ہا گردیدہ ام
مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام
لیکن تو چیزے دیگری

اس عظیم مجاہد حریت، عالم بے بدل، مدبر سیاست داں، اور اولوالعزم قائد نے ملک وملت کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور ایثار و قربانی کے جو نمونے پیش کئے ہیں، ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم مشرق کی تاریخ میں انھیں کبھی بھلایا نہ جاسکے گا، بیسویں صدی کا عالم اسلام فخر سے اپنا سر بلند کرکے کہہ سکتا ہے کہ اس کے دامن میں ایک ایسا گوہر بھی ہے جس کی تابانیوں نے حیات وکائنات کو فروغ بخشا اور انسانیت کو مجد و شرف سے نوازا۔

اس عظیم ہستی کے کردار کا سب سے روشن لیکن ساتھ ہی المناک پہلو یہ ہے کہ اس نے ہر طرف پھول بکھیرے، بدلہ میں پتھر کھائے اس نے محرومیوں اور مایوسیوں کی ظلمتوں کو اپنی مسکراہٹوں سے اجالا بخشا، لیکن صلہ زخموں کی شکل میں پایا، خدا شاہد ہے کہ

اس کے جسم کا کوئی ایسا حصہ نہ تھا جو روزانہ ہی صلیبوں سے نہ گذرا ہو، اسکی روح کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس نے صدیوں کا کرب اپنے اندر نہ سمیٹ لیا ہو، لیکن اللہ رے عزیمت! کبھی جو حرف شکایت زباں پہ آیا ہو، یا پیشانی پر کوئی شکن آئی ہو، سیاست کی پُرخار وادی میں ایسے آبلہ پا مجدّد تو کم ہی آئے ہوں گے جو سب کچھ لٹا کر بھی اس پر خوش ہیں کہ ان کا وجود ملک وملت کی راہ میں کام آیا۔

شیخ الاسلام رہ نے کم وبیش سات برس برطانوی جیلوں میں گذارے، وہ پونے چار برس مالٹا میں رہے اپنے اُستاذ محترم اور سیاسی و روحانی راہنما حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رہ کے ہمراہ برطانوی قید میں رہے، قید سے رہائی کے بعد جون ۱۹۲۰ء سے آپ ہندوستان کی سیاست میں تادمِ حیات حصہ لیتے رہے۔

حضرت شیخ الہند کی خفیہ ریشمی رومال تحریک ناکام ہو چکی تھی، اس کے بعد ہندوستانی سیاست میں یکے بعد دیگرے کئی اہم تبدیلیاں آگئی تھیں، اس لئے علمار کے اس طبقہ نے بھی جو ہندوستان کی تحریک آزادی میں شروع ہی سے حصہ لیتا رہا تھا اور جسے عرف عام میں ولی اللّٰہی جماعت کا نام دیا گیا، اپنے سیاسی نظریات کی اشاعت، حریت وطن سرگرمیوں کے لئے جمعیتہ علمار کے نام سے اپنا پلیٹ فارم تشکیل دیا، حضرت شیخ الاسلام اس جماعت کے فکری راہنما شارح اور ترجمان تھے۔

علمار کی اس جماعت نے آغاز ہی سے متحدہ قومیت کا نظریہ اپنایا تھا، غدر ۱۸۵۷ء کو ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی قرار دیا گیا ہے، لیکن اس سے بھی بہت پہلے ولی اللّٰہی جماعت کی راہنمائی میں حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقار نے استخلاص وطن کے لئے جہاد کیا تھا، غدر ۱۸۵۷ء کے دوران میں فرنگیوں کے خلاف جنگ میں علمار نے نمایاں رول انجام دیا، حضرت حاجی امداد اللہ، مولانا محمد قاسم نانوتوی مولانا رشید احمد گنگوھی اور دیگر علمار نے میدان جنگ میں کئی معرکے سر کئے

پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد علمائے کرام نے اپنا محاذ بدل دیا، دارالعلوم دیوبند جیسی درسگاہ قائم کی گئی جو بہت ہی جلد آزادی کی تحریک کا ایک بڑا مرکز بن گئی۔

علماء کی یہ جماعت ملک کو برطانیہ کی غلامی سے نجات دلانا اپنا ملکی اور وطنی فریضہ ہی نہیں سمجھتی تھی بلکہ اپنا شرعی و دینی منصب بھی خیال کرتی تھی، اس نظریہ میں کسی طرح کی ڈپلومیسی نہیں کام کر رہی تھی۔ اور نہ دور دور تک اقتدار کی طلب تھی. عالم اسلام میں یہ ایک ریکارڈ ہے کہ علماء کی ایک جماعت نے مسلسل ڈیڑھ سو برس تک استخلاص وطن کی تحریک میں اس طرح بے غرضانہ اور مخلصانہ حصہ لیا ہو۔ حضرت شیخ الاسلام اسی جماعت کے ایک ممتاز نمائندہ تھے، انھوں نے ان نظریات کے لئے دو محاذوں پر کام کیا ایک طرف متحدہ قومیت کے لئے اپنے دلائل سے شرعی بنیاد فراہم کی، دوسری طرف عقلی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ متحدہ قومیت کا نظریہ ہی ہندوستان کی نجات، فلاح و بہبود اور ترقی کا ضامن ہے، آپ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے زندگی میں ان نظریات کی اشاعت کرتے رہے، چند اقتباسات ملاحظہ ہوں، رسالہ "ہمارا ہندوستان اور اسکے فضائل" میں فرماتے ہیں

" اسلامی کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان ہی میں اتارے گئے اور یہاں ہی انھوں نے سکونت کی اور یہاں سے ہی ان کی نسل دنیا میں پھیلی. سبحۃ المرجان میں حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کا یہاں پھیلنا اور کھیتی وغیرہ کرنا مذکور ہے، بنا بریں اسلامی روایات اور تعلیمات کے مطابق آبائی وطن عہد قدیم سے ہندوستانی مسلمانوں ہی کا ہوگا، جو لوگ انسانی اور اپنی نسل کو ایب نہیں مانتے وہ اس دعوے کے مستحق نہیں ہیں اور مسلمانوں کے لئے اس کو اپنا وطن قدیم سمجھنا ضروری ہے. حسب تعلیمات اسلامیہ اور تصریحات قرآنیہ جتنے پیغمبر اور جانشین دنیا میں ہوئے ہیں سب کا مذہب اسلام ہی تھا، حضرت آدم اور ان کی

اولاد بھی اسلام کی پیرو تھی وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً اور اس کے بعد جب بھی تفرقے ہوئے تو جہاں جہاں بھی انسانی نسلیں تھیں وہاں پیغمبر اور ان کے سچے جانشین بھیجے گئے، وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ، وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ. اور سچے پیغمبر اور ان کے سچے جانشین سب کے سب دین اسلام ہی رکھتے تھے۔ آیات اور احادیث بکثرت اس مضمون پر دلالت کرتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ہندوستان میں بھی قبل زمانہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء آئے ہوں، چنانچہ اولیاء اللہ نے ہندوستان میں مختلف مقامات پر انبیاء علیہم السّلام کی قبریں بطور کشف والہام دریافت کی ہیں حضرت مجدّد الف ثانی اور مرزا مظہر جانجاناں اور دیگر بزرگوں کی تصانیف میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔

خلاصہ یہ کہ قدیم زمانہ سے یہ ملک بھی مذہب اسلام کا گہوارہ رہا ہے، لہٰذا صحیح اور یقیناً صحیح ہے کہ بہ حیثیت مذہب ابتدار سے یہ ملک اسلام کا وطن رہا ہے ''

دسمبر ۱۹۲۳ء میں بمقام کوکناڈا جمعیۃ علمار کے پانچویں سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے مسلمانوں کے تین اہم فرائض گنوائے ہیں، پہلا فریضہ حکومت سے مقابلہ، دوسرا فریضہ جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کو آزاد کرانا اور تیسرا فریضہ آزادی ہندوستان قرار دیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

" ہندوستان کی آزادی کے لئے جن اعمال کی ضرورت ہے تو ان میں سب سے زیادہ اہم اور اوقع اور مفید تر ہندو مسلم اتحاد یعنی ہندوستانی آبادی کا اشتراک عمل ہے مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی فرائض میں سے ہے کہ ہندوستان کی آزادی کی کوشش کریں اور گورنمنٹ کا جب تک اپنے مقاصد نہ منوالیں مقابلہ کرتے رہیں، یہ فرض ان پر ہر حال میں ہے، خواہ وہ تنہا ہوں یا ان کے ساتھ کوئی دوسرا فریق بھی ہو، باری عزّ وجل کا فرمان ہے

وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی اللہ انہ ھو السمیع العلیم وان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللہ ھو الذی ایدک بنصرہ وبالمومنین۔ (سورۃ الانفال)

ترجمہ:۔ اگر غیر مسلم قومیں صلح و آشتی کی طرف مائل ہوں اور ہاتھ بڑھائیں تو تم بھی اس کی طرف ہاتھ بڑھاؤ اور خدا پر اعتماد رکھو، اگر وہ اس صلح و آشتی سے تم کو دھوکا دینے کا ارادہ کرلیا تو اس کا خیال نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ تمکو کافی ہے، اس نے تمھاری تائید اپنی مدد اور مسلمانوں کے ذریعے کی ہے۔

چونکہ ہندوستان مختلف المذاہب قوموں کا مسکن ہے اس لئے یہاں کے باشندوں کے لئے خواہ وہ ترقی کے میدان میں گامزن ہوں یا نہ ہوں، خواہ وہ آزادی و سوراج کے کوشاں ہوں یا نہ ہوں محقق بود و باش اور امن و امان کے لئے ضروری ہے کہ وہ حسن معاشرت اور اخلاق حسنہ کو کام میں لائیں، عالی حوصلگی اور رواداری کے قانون کو پوری طرح ملحوظ رکھیں، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آیات قرآنی اس امر کے نہایت تاکیدی احکام تبلارہے ہیں جس میں تمام دنیا کے انسانوں کے ساتھ بلا تمیز مذہب حسن اخلاق اور مکارم اعمال کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

کیا ہندو مسلم اتحاد کی اس سے بڑھ کر کسی اور ڈھنگ سے تلقین ہوسکتی ہے کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں بشمول کانگریس و مسلم لیگ اسی تشدد کے ساتھ آغاز ہی سے ہندو مسلم اتحاد پر متفق ہوتیں اور برطانوی حکمرانوں کی ریشہ دوانیوں کو محسوس کرتے ہوتے، علمار کی اس طے شدہ حکمت عملی کو اپنا لیتے تو تقسیم ملک کی نوبت ہی نہ آتی، مشرق کا جغرافیہ ہی کچھ اور ہوتا، آج ہندوستان ایشیا کا قائد ہوتا، اور برصغیر اس طرح پہلے دو حصوں اور بعد ازاں تین حصوں میں تقسیم نہ ہوتا۔ شیخ الاسلام اور ان کی جماعت ملک کی تقسیم

سے بہت پہلے تقسیم کے سیاسی نتائج کا ادراک کر چکی تھی چنانچہ شیخ الاسلامؒ نے جون ۱۹۴۰ء میں جمعیۃ علماء کے اجلاس سالانہ منعقدہ جونپور کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"اس زمانہ میں پاکستان کی تحریک زبان زد عوام ہے جس کو بہت سے ناسمجھ بھائی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے تریاق یا اس سے بھی زیادہ مفید بتاتے ہیں، اگر اسکا مطلب اسلامی حکومت علی منہاج النبوۃ جس میں تمام اسلامی حدود و قصاص وغیرہ جاری ہوں مسلم اکثریت والے صوبوں میں قائم کرنا ہے تو ماشاء اللہ نہایت مبارک اسکیم ہے کوئی بھی مسلمان اس میں گفتگو نہیں کر سکتا مگر بہ حالت موجودہ یہ چیز متصور الوقوع نہیں، اگر اس کا مقصد انگریزی حکومت کی سرپرستی میں ایسی حکومت قائم کرنا ہے جس کو مسلم حکومت کا نام دیا جا سکے۔ افسوس کہ میں باوجود غور و خوض اور کثرت مطالعہ اقوال ابھی تک اسکے افادہ کو نہیں سمجھ سکا۔"

شیخ الاسلامؒ نے آگے چل کر دکھایا ہے کہ کس طرح برطانیہ نے ڈیوائڈ اینڈ رول کی پالیسی اپنا رکھی ہے، اس مختصر سے مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں کہ حضرتؒ کی جامع کمالات شخصیت پر روشنی ڈالی جا سکے اور سیاسی نظریات وضاحت کے ساتھ بیان کئے جا سکیں اس لئے حضرتؒ کے سیاسی مسلک کی طرف اشارہ کیلئے اس شعر کو کافی سمجھتا ہوں۔

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

مولانا جلیل احمد سیوہاروی، صدر جمعیۃ العلماء یوپی

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

اس دنیائے ہست و بود کو صناع عالم نے کچھ اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ہر قرن اور ہر زمانہ میں علماء و صلحاء، اولیاء محدثین و مفسرین پیدا ہوتے رہے ہیں، اور کسی بھی ایسے زمانہ کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی، کہ خدا کی زمین خدا کے برگزیدہ بندوں اہل طریقت و شریعت سے خالی رہی ہو بالخصوص ہندوستان کی سرزمین پر تو اس قسم کے بے شمار احسانات ہیں کہ اگر کبھی اس برصغیر میں کسی باخدا بزرگ کی کمی محسوس ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے بیرون ہند کے اہل فضل و کمال کے دل میں سفر ہندوستان کا جذبہ پیدا فرما دیا جیسے حضرت شیخ معین الدین چشتی رح، سید سالار مسعود غازی رح، حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رح بلکہ اگر بعض بزرگوں کے دل کو دیار محبوب کی کشش نے کھینچا بھی تو واپس ان کو ہندوستان ہی آنا پڑا، چنانچہ سیرت اولیاء میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، جب مدینہ تشریف لے گئے تو خواب میں حضورؐ نے فرمایا۔ تم یہاں نہ آؤ بلکہ ہندوستان ہی میں رہ کر دعوت دین کی شمعیں روشن کرو، چنانچہ انھوں نے واپس آکر ہندوستان کی ارض کفر میں اپنا مصلیٰ بچھا دیا اور اللہ نے ان کو ایسا نور عرفان عطا فرمایا جس کی نورانی کرنوں سے متاثر ہو کر ۹۹ ہزار تشنگان ہدایت نے سیرابی حاصل کی، یہ سب اس زمانہ کی باتیں ہیں جب

کسی نہ کسی طرح اہلِ ایمان کے سروں پر مسلم حکومت سایہ فگن رہتی تھی، اس ارضِ کفر میں اسلام کی کمی تو تھی ہی، لیکن ایسا خیال کسی کو نہیں ہو سکتا تھا کہ یہاں سے بالکل اسلام اور مسلمانوں کا استیصال ہو سکتا ہے، لیکن زمانہ کی انقلابی فطرت نے وہ نقش بھی دکھلا دیا جب زمانہ کے مفکرین کو ہندوستان سے اسلام اور مسلمانوں کے کلی طور پر استیصال کا اندیشہ پیدا ہو گیا ـــــ یہ وہ وقت تھا جب مغل دور کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں برٹش ایمپائریت کا دور دورہ جاری ہوا۔ میں اس وقت کے دورِ استبداد کے مظالم کو دہرانا نہیں چاہتا بلکہ صرف اس حقیقت کو واشگاف کرنا چاہتا ہوں کہ جب مسلمانوں کے سر سے حکومت کا سایہ اٹھ گیا اور مسلمانوں کی اسلام پر بقا مشکل نظر آنے لگی اس وقت اہلِ حق علماء ربانیین کی جماعت میں سے ایک مردِ حق شناس، خدا آگاہ انسان کو قدرت نے ہندوستان میں اسلام کے استحکام اور مسلمانوں کے بقا کی خدمت پر مامور فرمایا، اور وہ پاک ہستی ہے مجدد وقت حجۃ اللہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی جنہوں نے اس ملک میں اسلام کی بقاء کے لئے سیاست کی بساط بچھائی، ایک طرف انھوں نے دین کی بقا کے لئے اسلامی تعلیمات کو مروج کرنے کے لئے مدارس قائم فرمائے اور دوسری طرف حکومت سے بقدرِ استطاعت ٹکر لی، پھر ان کا پورا خاندان ایمانی بصیرت کی بنیاد پر، اس راہ پر لگ گیا، اس خاندان کے بعد علماء دیوبند کی وہ جماعت ابھری جس نے برٹش ایمپائریت کے خلاف براہ راست ٹکر لی، اور دل کھول کر دادِ شجاعت دی، جس میں سرفہرست حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، حضرت حافظ ضامن شہید وغیرہ حضرات ہیں جو ولی اللہی سلسلہ کے وارث اور چشم و چراغ ہیں، استقامت سے جمے رہے۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، بظاہر جہاد بالسیف میں ناکامی کے بعد

سلسلہ ولی اللہی کے مردان حق آگاہ نے اب دوسری راہ سوچی اور وہ یہ کہ انگریزوں کے خلاف اور دین کی بقار کے لئے دہری محنت کی ضرورت ہے، چنانچہ دین کی بقا کے لئے مدارس کا جال ملک میں بچھایا، جس میں سرفہرست دارالعلوم دیوبند ہے اور انگریزی سامراج کے خلاف جہاد کے لئے اور دوسری تدبیریں سوچی گئیں، جس کے لئے اللہ تعالیٰ کے دست قدرت نے حضرت شیخ الہند کو منتخب فرمایا تھا، حضرت کی ساری عمر برٹش امپائر کے جہاد میں گذری اور جب وہ وقت آیا کہ " مدت تمام گشت و بپایاں رسید عمر " تو حضرت شیخ الہند کو بہت فکر لاحق ہوئی کہ ہم نے جو اس ملک ہندوستان میں آزادی و استخلاص وطن کی جوت جگائی تھی، افسوس کہ وہ ہماری زندگی میں پروان نہ چڑھ سکی اس لئے حضرت شیخ الہند رح نے ایک روز فرمایا۔ میرا ارادہ شمع آزادی کو فروزاں رکھنے کے لئے ایک کتاب لکھنے کا تھا، لیکن بحمداللہ وہ کتاب اب حسین احمد کی شکل میں تیار ہوگئی ہے، اب ہندوستان میں آزادی کی تحریک چلانے کے لئے میں اپنے بعد حسین احمد کو چھوڑ رہا ہوں۔ اور اس پر بیحد مسرور ہوں۔

مولانا حسین احمد رح :-

حضرت شیخ الہند رح کی بصیرت پر پورے سولہ آنہ برابر اترے آپنے ہندوستان میں استخلاص وطن کے لئے جو جہد وسعی فرمائی وہ کسی بھی صاحب بصیرت کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے، کتنے آدمی ایسے بھی سیاسی ہوتے ہیں جنہیں مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا، اور کتنے ہی مذہبی ہوتے جو سیاست کی ابجد سے بھی بے خبر ہوتے ہیں، یہی سوچ کر نوارباب مسلم لیگ نے حضرت کے زمانہ میں یہ نعرہ لگایا تھا کہ مولوی سیاست کیا جانیں۔ جس پر حضرت شیخ نے جواب دیا تھا۔ مولوی انبیار کے وارث ہوتے ہیں اور انبیار سے بڑا کوئی سیاست داں نہیں ہو سکتا، اس لئے علمار ہی سب سے بڑے سیاست داں

ہیں، مولانا کی سیاست پر آج چاہے ناسمجھ لوگ کچھ بھی کہیں، لیکن دانشوروں کی دنیا سر دھن رہی ہے، میری نگاہیں وہ منظر فراموش نہیں کر سکتیں، جب دارالعلوم دیوبند کے شوریٰ ہال میں مدرسہ کا جلسہ ہو رہا تھا، تو دیوبند کے ایک مغلوب الحال مجذوب شمس الدین تھے، وہ ایک تربوز لے کر دارالشوریٰ کی چھت پر چڑھ گئے اور وہاں سے اسے زمین پر پھینک دیا، تربوز کے پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گئے، اور زور سے چلا کر کہا مولانا کیا کر رہے ہو، فقراء کی جماعت نے ہندوستان کے بٹوارے کا فیصلہ کر دیا، اور ہم نے ہندوستان بانٹ دیا، جب حضرت شیخ الاسلام سے یہ بات ذکر کی گئی تو فرمایا فقراء پارٹی کے فیصلے کے باوجود میں متحدہ ہندوستان کے لئے کوشش جاری رکھوں گا، آج دیکھ لو جتنی مصیبتیں ہند و پاک کے باشندوں پر آچکی یا آرہی ہیں وہ تقسیم ہند ہی کا کڑوا پھل ہیں۔ حضرت کی بصیرت کو سوچو! اگر آزادی ہند کے مدنی فارمولے کو مان لیا جاتا تو اس برصغیر کی آج ہوائیں کچھ اور ہوتیں اور یہاں کے لیل و نہار کی بہاریں ہی دوسری ہوتیں۔

دوسری طرف مذہب کو لیجئے، دارالعلوم کی مسند صدارت کی اہم ذمہ داریوں کے باوجود سیاست اور استخلاص کی کوششوں میں مولانا کا کتنا اہم اور وقیع کردار ہے، الفاظ اور کاغذ کی تنگ دامانی اس کو سمونے سے عذر خواہ ہے، رات دن مسلسل سفر، رات کو ۱۲-۱ بجے تک درس بخاری شریف، سیاسی کانفرنسوں اور اجلاسوں میں خطاب عام، پھر رشد و ہدایت کے سرچشموں کی آبیاری، پیری، مریدی، کا سلسلہ عجیب معاملہ ہے، آزادی رائے کو نبھانے کی اس سے بڑی مثال نہیں تلاش کی جا سکتی، مسلم لیگ والے، جانی دشمن، درپے آزار، عزت کے خواستگار، ایذارسانی اور بدزبانی کا کوئی فقرہ و حربہ ایسا نہ تھا جو یہ اللہ کے بندے حضرت کے خلاف استعمال نہ کرتے ہوں، لیکن کتنے ہی مسلم لیگ کے ممبر ایسے تھے جو مولانا کے مرید تھے اور ان ہی سے رشد و ہدایت کے طلب گار رہتے تھے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ آپ نے کبھی اپنے مسلم لیگی

مرید کو۔ پارٹی چھوڑنے کی ہدایت تو کیا معنی اشارہ تک بھی نہیں کیا۔

حضرت شیخ الاسلام جیسا انسان جو شریعت، طریقت اور سیاست کے تینوں میدانوں کا قدر انداز ہو مشکل سے پیدا ہوتا ہے، مولانا زندگی بھر جمہوریت کے علمبردار ہندو مسلم اتحاد کے بانی اور ملک کی یک جہتی کے لئے کوشاں رہے، لیکن جب لارڈ ماونٹ بیٹن، اور لیڈی ماونٹ بیٹن کی ذہنیت سے شکست کھاکر سردار پٹیل، پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی جی نے تقسیم ہند کے نظریہ کو قبول کرلیا، تو سب سے زیادہ صدمہ امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزادؒ، اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کو ہوا کہ انھوں نے اپنوں اور پرایوں کے ہاتھ سے ہندوستان کو متحد رکھنے کے لئے بےحد ایذا اٹھائی، اور تکلیف جھیلی تھی، تقسیم کا فیصلہ سنکر حضرت شیخ نے فرمایا۔

"میں ہرگز بھی ایسے فیصلے کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں جو اپنے پہلو میں لاکھوں انسانوں کی ہلاکت اور کروڑوں انسانوں کی پریشانیوں کا مستقبل لئے ہوئے ہو"

آپ کی زندگی، عزم و استقلال، عزیمت و ہمت، درس و تدریس تعلیم و تبلیغ اور حریت کی حرارت سے ایسی لبریز تھی کہ آپ کے بلند حوصلہ نے دوسروں میں بھی آزادی وطن کی آگ لگادی اور ملک بھر میں عام طور پر آزادی کے متوالوں کی فوج پیدا ہوگئی، اور بالآخر وہ روز سعید آگیا کہ حضرت نے خود اپنی آنکھوں سے وطن عزیز کو برٹش پنجہ استبداد سے آزاد دیکھ لیا۔! اور نہ صرف ہندوستان، بلکہ مشرق وسطیٰ، ممالک افریقہ بلکہ یورپ سے ہندوستان بلکہ چین تک بحری راستہ میں جتنی قومیں اور ملک بھی پڑتے تھے خدا کے فضل سے ایمپائریت سے خلاصی پانے میں کامیاب ہوگئے۔

حضرت کی پوری زندگی کا مرقعہ آج ہماری نگاہوں کے سامنے موجود ہے، میری آنکھوں نے ان کا وہ جمال جہاں آرا، ۵ سال تک مسلسل (۱۳۵۰ھ تا ۱۳۵۵ھ) دیکھا ہے جس کے بعد اب کوئی نظر میں نہیں سماتا، اپنے نصف صدی سے زائد دار العلوم کی مسند

صدارت پر جلوہ افروز رہ کر لاکھوں تشنگان علوم نبوت کو سیراب فرمایا۔ ۹ سال تک گنبد خضراء کے سایہ میں درس حدیث پاک دیا، اصلاح ظاہر و باطن کے لئے جن لوگوں نے حضرت کا دامن تھاما آج ان کی تعداد کا کوئی حتمی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے آپ کے مریدین میں کتنی ہی وہ شخصیتیں تھیں جن کو مستقل اس سلسلۃ الذہب کو جاری کرنے کی اجازت مل گئی، آج ان کا بھی بہت بڑا فیض ہند و بیرون ہند میں جاری و ساری ہے، اگر ہم حضرت سے وابستگان کی تعداد کا اندازہ لگانا چاہیں تو ان کی تعداد کروڑوں سے بھی متجاوز ہو سکتی ہے۔

حضرت کی شخصیت وہ تھی کہ اگر وہ عوام کے رجحان کی پیروی کرتے تو کروڑوں گردنیں ان کے سامنے جھک سکتی تھیں، اور اگر وہ ہندوستان کی سیاست کی بازیگری میں خاموش رہتے۔ تو ان کا مقام اور بھی بلند ہو سکتا تھا، لیکن اس مرد حق آگاہ نے نہ تو اپنے گرد بے پناہ عقیدت مندوں کی بھیڑ اکھٹی کرنی چاہی اور نہ گوشہ عزلت ہی کو پسند فرمایا، بلکہ قرآن و حدیث اور اسوۂ حسنہ کی روشنی میں جو طریقہ حق و صداقت کا ہو سکتا تھا اور جس کی تلقین جسمانی اور روحانی طور پر ان کو مشفق استاد اور شیخ و مربی سے ملی تھی وہ اس پر بے دھڑک زندگی بھر گامزن رہے، انھوں نے مالٹا کی کال کوٹھریوں میں بھی زندگی گذاری اور برٹش ایمپائیرت کے شکنجے میں کراچی اور سابرمتی جیل میں بھی مصیبتیں جھیلیں اور پوری عزیمت و ہمت اور صبر و استقلال کے ساتھ زندگی بھر اپنے شیخ کی سمجھائی ہوئی صراط مستقیم پر جو درحقیقت جادۂ حق و صواب اور خدا و رسول کی پیروی کا بہترین طریقہ تھا، گامزن رہے، بزرگوں کی فہرست دیکھو تو جامع صفات شخصیتیں بہت کم نظر آئیں گی، جو صوفی ہوتے ہیں ان کے لئے مقرر ہونا ضروری نہیں اور جو مقرر ہوتے ہیں ان کے لئے صاحب قلم ہونے کی کوئی پابندی نہیں، جو صاحب درس و تدریس ہوتے ہیں وہ پند و وعظ سے بے تعلق بھی ہوتے ہیں، اور کتنے ہی واعظ و مقرر

ایسے بھی ہوتے ہیں جو صرف مذہبی وعظ ہی کہہ سکتے ہیں، بساط سیاست پر ایک لفظ نہیں بول سکتے، کتنے دیندار ایسے بھی ہوتے ہیں، جو دنیوی معاملات میں بالکل کورے ہوتے ہیں لیکن ــــــ حضرت شیخ الاسلام کی ذات گرامی ــــــ اگر ہمیں ایک طرف درس و تدریس کی سب سے اونچی مسند صدارت دارالعلوم پر نظر آتی ہے تو دوسری طرف ان کا بے باک قلم بھی میدان صحافت میں جلوہ افروز دکھائی دیتا ہے، اگر ایک طرف طریقہ رشد و ہدایت جاری ہے تو دوسری طرف بساط سیاست کی مہرہ سازی کی مہم ساتھ ساتھ چل رہی ہے، اگر مذہبی اجتماعات میں اخلاق حسنہ اور سنت نبوی کی تلقین کی جارہی ہے۔ تو سیاست کے اسٹیج سے برٹش امپائر کو للکارا جارہا ہے میں نے پانچ سال تک ان کی سیرت کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا کوئی عمل شریعت کے خلاف نہیں ہوسکتا، لیکن اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ تلاش کے باوجود حضرت کا کوئی عمل مجھے سنت کے خلاف دستیاب نہ ہوسکا

غرضیکہ حضرت شیخ الاسلام جیسی جامع شخصیت جو شریعت، طریقت، دین و دنیا مذہب و سیاست بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک ممتاز مقام اور قائدانہ حیثیت رکھتی ہو۔ دنیا میں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ تعالیٰ ہم سب کو آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

سید السادات، رأس المحدثین، تاج الفقہاء، قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر ادب وخطابت، منطق وفلسفہ کے امانت دار، امیرِ کارواں، عزم وثبات کے کوہِ گراں، ہمت مردانہ کے پیکرِ جلیل، علم وبصیرت کے راز دار، باطنی سلسلوں کی پارسائی کے دانا وبینا اور رمز شناس، تقویٰ وطہارت، ضبط اوقات، تکمیل معمولات کے جاں نثار، حب الوطنی کے رموز وعلائم کے واقف کار، ایمانی سائنس کے مربی ومرشد، منبعِ جود وسخا، وجہِ سکونِ قلبِ مسلم، صاحبِ اعلیٰ خصال، فخرِ ملت، نازشِ ہندوستان، آئینہ دارِ صفاتِ محمدی، مسندِ علمِ نبوت کے درِ شہوار، اسلافِ کرام کے سچے جانشین، سرخیل امتِ محمدی، جانشینِ محمود، پرتوِ چراغِ محمدی، شیخِ عرب، شیخِ حرم، شیخِ عجم، حریت قوم ووطن کے بانی، شمعِ بزمِ عارفین وکاملین۔ درویشِ حق پرست، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور صدرِ جمعیۃ العلمائے ہند کی قربانیاں اور حب الوطنی نیز اسارتِ مالٹا کی لرزہ براندام کردینے والی داستانیں آج بھی ملک وقوم کے لئے ایک ایسا بیش قیمت سرمایہ ہیں، جس سے ہم نہ صرف ظاہری زندگی

سنوار سکتے ہیں بلکہ باطنی کیفیات اور علوم الہیہ سے بھی فیضان حاصل کر سکتے ہیں ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میری نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

محسنِ اکابر کی ایسی درخشندہ مثال کے بارے میں کچھ عرض کرنا مجھ جیسے ناکارہ اور ہیچ مدان کے بس کی بات نہیں، لہٰذا یہاں جو کچھ عرض کرنیکی کوشش کروں گا وہ محض تعمیلِ حکم ہے اور الامر فوق الادب کے مصداق ہے۔

دراصل ہندوستان کی آزادی کے ساتھ مسلمانوں کی قربانیاں شروع ہی سے جڑی ہوئی ہیں۔ آزادئ وطن میں حصہ لینے والے علماء کی فہرست بہت لمبی ہے، اور یہ سلسلہ ۱۸۰۱ء سے شروع ہوتا ہے جب کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور بہت سے حضرات نے اس کی داغ بیل رکھی یہ دور ۱۸۳۰ء تک چلا، اس کے بعد شاہ سید احمد شہید نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا آزادی کی جدوجہد پشاور سے لے کر راس کماری تک اور شملہ سے لے کر بمبئی تک شروع کی گئی، کمپنی کے اقتدار کے خلاف جنگ میں ستانوے فیصد مسلمان ہی شریک تھے۔ آزادی کا تیسرا دور مرشد عرب وعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے شروع ہوتا ہے، اس دور میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا عبدالقادر لدھیانوی بھی شامل ہیں، ان علماء ہند کی رہنمائی میں ہندوستانی مسلمانوں نے ایک جاندار انقلابی کروٹ لی۔ ان رہنماؤں نے انگریزوں کے خلاف بیس ہزار چھاپہ ماروں کو منظم کیا جن کو بعد میں انگریزوں نے ظلم وستم سے تباہ وبرباد کر ڈالا ایک اندازے کے مطابق تقریباً تین لاکھ مسلمان قتل کر دیئے گئے تھے، آزادی کا چوتھا دور اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن سے شروع ہوتا ہے اور حضرت شیخ الہند کی تحریک آزادئ وطن کو پورے جوش وخروش سے آگے بڑھانے

والے تھے، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی۔ حضرت مدنی کی ذات والاصفات، جامع کمالات تھی۔ ہندوستان کی سیاسی، ثقافتی اور سماجی نیز مذہبی زندگی پر آپ نے جو دائمی نقوش چھوڑے، وہ ہماری جدوجہد آزادی اور ملکی تاریخ کا ایک روشن ترین باب ہیں، اقبال نے ایسی ہی ہستیوں کے بارے میں کہا تھا۔ ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کسی عظیم صلاحیتوں والی بڑی ہستی کے ظہور کے اسباب بتانا مشکل ہے کیونکہ یہ اسباب عموماً ماحول، محرکات اور ترغیبات سے عبارت ہوتے ہیں۔ غیر معمولی عظمت رکھنے والے فرد کی یہ بھی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ سماج یا قوم کے لاشعور یا تحت الشعور کو متحرک کرنے والے اثرات وجذبات کو متشکل کر دیتا ہے۔ اسی طرح اپنی قوم کے ساتھ ایسے فرد کا گہرا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اِس سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ جب کسی عظیم اور تابناک شخص کا ظہور ہوتا ہے تو لوگ کیوں عقیدت و حیرت سے اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ معاشرے کی فلاح کا جذبہ اس کے الفاظ اور کارناموں سے نہ صرف ٹپکتا ہے بلکہ خوابوں کی تکمیل و تعبیر اس کے عمل سے واضح ہوتی ہے۔ ایسی عظیم الشان ہستی قوم کے دل و دماغ کو متحرک و متاثر کرنے والی نیم پختہ آرزوؤں اور نیم واضح تمناؤں سے غیر معمولی طاقت حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ معمولی لوگوں کی زندگی کی اصلاح کے عظیم الشان کام سے خود کو جوڑ کر باطنی قوت حاصل کر لیتی ہے۔ چنانچہ اسی طرح کی ایک شخصیت کا نام ہے۔ آقائی و مولائی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ۔ آپ کی کوششوں سے ہندوستان کی زندگی کے پُرسکون بہار میں سخت ہلچل پیدا ہوئی۔ آپ نے زندگی میں جو صعوبتیں اُٹھائیں اور جو صدمے برداشت کئے، وہ غیر معمولی انسانوں کا حصہ ہوا کرتے ہیں۔ اُن سے اہلِ ہند میں بیداری آئی اور مغرب کی اندھی اور گمراہ کن تقلید سے عوام الناس کو باہر آنے کا حوصلہ ملا۔ زندگی میں نئی تھرتھراہٹ پیدا ہوئی اور

آزادی کی تڑپ کا شعلۂ جوّالہ ہندوستان کے کونے کونے میں بھڑک اٹھا۔ شیخ الاسلام نے اسلامی تہذیب کے بیش قیمت ورثے کو گلے لگاتے ہوئے ملک و قوم کو آزادی اور حب الوطنی کی اہمیت سے واقف کرایا۔ اسلامی اقدار کا وقار اور احترام دنیا کو بتاتے ہوئے موصوف نے ہندوستان اور نئے زمانے کی للکار کو قبول کیا۔ جو لوگ اسلامی تہذیب سے بیگانہ ہو چلے تھے اور مغرب سے حاصل شدہ تحریکوں اور نظریات پر تکیہ کرنے لگے تھے اور روحانی سرمایہ کو ترک کر چکے تھے، ان میں ایسی تبدیلی پیدا کی کہ وہ قوم اور وطن کی داخلی زندگی اور تحریکوں کے ساتھ اپنا رشتہ مضبوط کر کے قوت و توانائی حاصل کر سکیں۔ حب الوطنی کو اگر ہمہ گیر معنوں میں استعمال کیا جائے تو بھی یہ میدان حضرت والا کی تمام تخلیقی صلاحیتوں اور بصیرتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی خدمات اتنے دائرہ ہائے عمل میں پھیلی ہوئی ہیں اور اتنی وسیع اور عظیم الشان ہیں کہ اگر موصوف کو جدید ہندوستان کے معمار اور خلّاق کا درجہ دیا جائے تو وہ بھی ناکافی ہے۔ وہ زندگی کو مکمل اور ناقابلِ تقسیم اکائی مانتے تھے۔ مختلف مذاہب اور آدرشوں نے آپ کی قوت کو محدود نہیں بلکہ وسیع سے وسیع تر بنا دیا۔ اپنی تحریروں، تقریروں اور ارشادات سے آپ نے تخیل اور وجدان میں محض تھرتھری ہی پیدا نہیں کی بلکہ انسانی زندگی کی حقیقی حالتوں اور کیفیتوں کو ایسا روپ دیا جسے اہلِ باطن ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اہلِ وطن کا اتحاد اور بالخصوص مسلمانوں کی اصلاح آپ کے پسندیدہ موضوعات تھے اور آپ کا اخلاص اس بارے میں آپ کو کبھی کبھی تلخ نوائی سے بھی نہیں روک سکا ؏

میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اس طرح آپ اسلامی تعلیمات کے سچے روحانی وارث تھے۔ حضرت والا کی ذات گرامی کا مطالعہ کرنے کے لئے موٹے طور پر آپ کی حیاتِ مبارکہ کو تین دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور خالص علمی خدمت کا تھا جو مدینہ منورہ میں قیام سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا آغاز ۱۳۱۶ھ سے شروع ہوتا ہے اور ۱۳۳۴ھ میں اسارتِ مالٹا پر ختم ہوتا ہے۔ اس سترہ برس کے عرصے میں آپ

تین بار ہندوستان آئے اور مختصر سے قیام کے بعد حجاز چلے گئے۔ آپ نے اس دوران تیرہ برس مدینہ منورہ میں علمِ دین کی نشرواشاعت میں خود کو مشغول رکھا۔ اس دوران ممتاز عالمِ دین، مُفسّر مولانا عبدالحق مدنی نے بھی مدینہ طیبہ میں حضرت ہی سے تعلیم پائی۔

دوسرا دور مالٹا سے واپسی پر ۱۳۳۸ھ سے شروع کے ۱۳۴۶ھ تک کا ہے جس میں آپ نے دارالعلوم دیوبند کی صدارت عظمٰی پر متمکن ہوکر اس منصب کو رفعتیں عطا کیں۔ یہ زمانہ آپ کی سیاسی تحریکوں سے وابستگی، گرم جوشی، تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادی سے دلچسپی کا ہے۔ آپ نے فرنگی حکومت سے ٹکر لی۔ اور اس کے نتیجے میں قید وبند کی زندگی گزاری۔ آپ نے اپنی سیاسی بصیرت، تدبر مجاہدانہ، عزم و ثبات اور غیر متزلزل صبر واستقامت کا ثبوت دیا۔

تیسرا دور دارالعلوم کی صدارت ۱۳۴۶ھ سے لے کر وفات تک کا ہے جس میں آپ نے مسلمانوں کی فلاح وبہبود کی کفیل جماعت جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر کی حیثیت سے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اِس دوران آپ نے بہت سی تعلیمی، سیاسی، اصلاحی مہمات انجام دیں۔ آپ اس دور کے عظیم المرتبت انسان، عارف باللہ اور شیخ طریقت تھے۔ آپ کے لاکھوں مرید ہیں اور کتنے ہی پاکیزہ نفوس، معرفتِ الٰہی سے مسلسل سیراب ہورہے ہیں۔

حُبّ الوطنی کا جذبہ

حضرت مدنی کی کانگریس میں شمولیت اور سیاسی جلسوں کی شرکت عام طور سے ایک سیاسی سرگرمی خیال کی جاتی ہے لیکن اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ محض سرگرمی نہ تھی بلکہ عشق خداوندی کا مظاہرہ تھا۔ اور جہاد فی سبیل اللہ کی اعلیٰ مثال۔ مرحوم نے بچپن سے ہی جہاد کی تیاری شروع کر دی تھی اور نوجوانی میں یہ معمول بنالیا تھا کہ مئی جون

کی چمکتی ہوئی دھوپ میں گھنٹوں تپتی ہوئی ریت یا پتھر کے فرش پر چلا کرتے تھے اور جاڑوں کی کڑاکے کی سردی میں نیم برہنہ بیٹھے رہتے تھے۔ بعض دوستوں نے جب اس کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ آئندہ جیلوں میں اس سے زیادہ سختیاں بھگتنی ہوں گی۔

اس سلسلے میں خود حضرت مدنی کے اپنے قلم سے کچھ سنئے۔

انسان کی طبعی بات ہے کہ اس کو اپنے وطن عزیز سے اس قدر محبت ہوتی ہے، جو کہ دوسری جگہوں سے نہیں ہوتی۔ جس سرزمین میں وہ پیدا ہوتا اور پرورش پاتا ہے خواہ وہ کتنی ہی تکلیف دینے والی ہو، مگر انسان کو اس کا کانٹا، دوسری جگہ کے پھولوں سے اچھا معلوم ہوتا ہے مشہور شعر ہے۔

حب وطن از ملکِ سلیمان خوشتر　　　خارِ وطن از سنبل و ریحان خوشتر

مگر میں جب کہ اسکول میں پڑھتا تھا تو مجھ کو تاریخ اور جغرافیہ سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی اور ہندوستان کی پرانی تاریخی عظمتوں اور جغرافیائی قدرتی ہمہ گیر برکتوں نے نہایت گہرا اثر کیا اور پھر اہلِ ہند کی موجودہ بے کسیوں کا اثر روز افزوں ہوتا رہا۔ طالب علمی کے زمانے میں اس احساس میں ترقی ہی ہوتی رہی۔ اس زمانے کے ختم ہونے پر مجھ کو آزاد ممالک عرب، مصر، شام وغیرہ کی سیاحت اور قیام کی نوبت آئی۔ آزاد ملکوں کے باشندوں سے میل جول اور ان کی حالتوں سے آگاہی حاصل ہوئی۔ اس نے مجھ کو اپنے وطن کی محبت میں اور زیادتی پیدا کر دی اور اس احساس کو نہایت قوی کر دیا کہ آزادی کس قدر ضروری چیز ہے اور بغیر آزادی کے کسی ملک کے باشندے کس قدر بے بس اور اپنے وطن کی قدرتی فیاضیوں سے محروم ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ گورنمنٹ برطانیہ نے مجھ کو میرے آقا حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ساتھ، جو کہ مسلمانوں میں آزادئ ہند کے سب سے بڑے علمبردار تھے، گرفتار کر کے ایک مہینہ مصر میں سیاسی قید خانے میں رکھا۔ وہاں مصریوں کا آزادی پسند طبقہ

مقید تھا۔ اس کے بعد مجھ کو ہمراہیوں کے ساتھ مالٹا بھیجا گیا۔ جہاں پر آزاد ممالک یورپ اور ایشیا کے چوٹی کے سیاسی اور فوجی لوگ مقید تھے۔ ڈیڑھ ہزار آسٹرین، عرب تھے۔ اس کیمپ میں ہم کو بھی چار برس ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک رکھا گیا۔ جون ۱۹۱۹ء میں ہم کو ہندوستان لایا گیا۔ جب ہم یہاں پہونچے تو خلافت کی تحریک زوروں پر تھی۔ جلیان والا باغ کے واقعات رولٹ ایکٹ اور مارشل لا وغیرہ کی مختلف جگہوں پر زیادتیوں نے ہندوستان کے باشندوں میں کھلبلی ڈال رکھی تھی۔ نان کوآپریشن کی تحریک زوروں پر تھی۔ میں اس قدر متاثر ہوچکا تھا کہ میرا عقیدہ ہوگیا تھا کہ فرقہ داری کی تنگدلیوں سے نکل کر تمام ہندوستانی قوم کو اور جملہ باشندگانِ ہند کو آزاد ہونا ازبس ضروری ہے۔ میں نے بیرونی ممالک میں مشاہدہ کیا تھا کہ دوسرے ممالک میں ہندوستانی خواہ مسلمان ہوں یا ہندو ہوں یا پارسی وغیرہ، سب ہی بہ نظرِ حقارت دیکھے جاتے ہیں اور سب کو نہایت ذلیل غلام کہا جاتا ہے۔ سب کو ایک ہی قوم کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے، بالخصوص سید نسل والے ان سبھوں کو بہت ذلیل جانتے ہیں اور بات بات پر ایسے طعنے اور ذلت آمیز کلمات کہتے ہیں کہ جن کا تحمل مشکل ہے . . . . میرا قوی اور زوردار سیاسی عقیدہ ہے کہ جس طرح ہر انگریز، ہر فرانسیسی، ہر جرمنی، ہر امریکن، ہر جاپانی ضروری سمجھتا ہے کہ وہ اپنے وطن کو آزاد رکھے اور اپنے آپ کو کبھی کسی دوسری قوم کا غلام نہ ہونے دے اور ہر قسم کی قربانی کو اس راہ میں کم سمجھے، یہی فلسفہ ہر ہندوستانی کا بھی ہونا چاہیئے۔

حُبّ الوطن کی ایک اور مثال

۱۹۴۵ء کے بعد کا عرصہ نعرۂ تکبیر، انگریز نکل جاؤ، انقلاب زندہ باد کے پُرجوش نعروں سے گونج رہا تھا۔ مرادآباد میں حضرت شیخ الاسلام کی ایک تقریر تھی۔

اس دوران ایک صاحب کے جنازے کی نماز بھی حضرت والا کو پڑھانی پڑی۔ حضرت شیخ نے جب دیکھا کہ میت پر کفن کھدر کا نہیں ہے، تو ناراضگی ظاہر فرمائی۔ اس سے حضرت والا کی وطن دوستی اور حب الوطنی کے شدت جذبات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو صبر و برداشت، سادگی اور ایثار اور شجاعت و فراخ دلی کی اعلیٰ منزلوں پر دیکھنے کے متمنی تھے۔ آپ کو قیمتی غالیچوں سے نفرت تھی اور فقیری میں شاہی کے قائل تھے۔ مخملی قالین پر بیٹھنا گوارہ نہ تھا۔ آپ کی زندگی مجاہدانہ کردار کی روشن مثال تھی۔

مختصر حالاتِ زندگی

آپ کی پیدائش ۱۸۷۹ء بدھ کی رات کو گیارہ بجے بانگر مئو ضلع اناؤ میں ہوئی تھی۔ آپ کا تاریخی نام چراغ محمد ہے۔ دیوبند میں صفر ۱۳۰۹ھ میں گویا کہ بارہ سال کی عمر میں تشریف لائے۔ اور ۱۳۱۶ھ تک مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم، مولانا منفعت علی، مولانا غلام رسول، مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا حکیم محمد حسن صاحب، مولانا خلیل احمد صاحب، مولانا ذوالفقار علی، مولانا عبدالعلی اور حضرت شیخ الہند جیسے جلیل القدر علمار کی زیر تربیت رہے۔ آپ کے والد مرحوم سید حبیب اللہ صاحب نے ۱۳۱۶ھ میں شعبان کے مہینے میں مدینہ منورہ کے لئے ہجرت کی اور آپ ساتھ گئے۔ اس لئے آپ مدنی کہلاتے ہیں۔ ۱۳۱۶ھ میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت ہو کر سلوک کی منزلیں طے کیں۔ مکہ معظمہ پہونچ کر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے فیض روحانی حاصل کیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے پیر و مرشد تھے۔ آپ نے ۱۹۱۵ء میں انگریزوں کی زبردست مخالفت کی تھی۔ اور انگریز کی حکومت میں ہونا

گوارہ نہ کر کے مکہ معظمہ ہجرت فرمائی تھی۔ اس لئے حضرت شیخ الاسلام کو روحانیت میں اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔ حضرت شیخ الاسلام نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا کہ "خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام، اولیائے عظام، ائمہ فخام اور جناب باری عز اسمہٗ کو بارہا دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔"

شیخ الاسلام کے والد بزرگوار حضرت حاجی شاہ سید حبیب اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے۔ آپ کے پانچ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں۔

۱ ۔ حضرت مولانا حاجی سید صدیق احمد نور اللہ مرقدہ سب سے بڑے صاحبزادے تھے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ مجاز تھے۔

۲ ۔ ان سے چھوٹے بیٹے حضرت مولانا شاہ جی سید احمد صاحب تھے جو حضرت گنگوہی سے بیعت تھے آپ نے مدینہ منورہ میں مدرسہ علوم شرعیہ قائم کیا جو آج بھی ترقی کی راہ پر آگے بڑھ رہا ہے۔

۳ ۔ ان سے چھوٹے شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز تھے۔

۴ ۔ ان سے چھوٹے حضرت مولانا الحاج سید محمود احمد صاحب سابق قاضی القضاۃ حکومت سعودی عرب ہیں اس وقت مدینہ منورہ میں مقیم ہیں۔

۵ ۔ سب سے چھوٹے حضرت مولانا سید جمیل احمد صاحب تھے۔

۶ ۔ چھوٹی بہن تھی ریاض فاطمہ رحمۃ اللہ علیہا۔

حضرت شیخ الاسلام کی پہلی شادی موضع تتال پور ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔ اہلیہ کے انتقال کے بعد دوسری شادی قصبہ بچھراؤں ضلع مرادآباد میں قاری حکیم غلام احمد صاحب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان سے دو بیٹے ہوئے۔ اخلاق احمد، اشفاق احمد، دونوں کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی اہلیہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ دونوں بچوں اور بیوی کا انتقال اُس

وقت ہوا جب کہ آپ مالٹا میں اسیر تھے ۔ اہلیہ کے انتقال کے بعد حضرت شیخ کی شادی دوسری اہلیہ کی چھوٹی بہن سے ہوئی جس سے دو بچے ہوئے ۔ ایک صاحبزادہ (حضرت) مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ العالی اور دوسری صاحبزادی ماجدہ خاتون ۔ ماجدہ خاتون کا انتقال بچپن میں سلہٹ میں ہوگیا ۔ مولانا اسعد مدنی مدظلہ العالی کی والدہ محترمہ ۳۵ء میں انتقال فرماگئیں ۔ حضرت مدنی کی چوتھی شادی حضرت کے چچازاد بھائی سید بشیر الدین صاحب مرحوم کی منجھلی لڑکی سے ہوئی ۔ ان سے دو صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں تولد ہوئیں یعنی حضرت مولانا سید ارشد مدنی اور حضرت مولانا اسجد مدنی ۔ صاحبزادیوں میں محترمہ ریحانہ صاحبہ، محترمہ حسّانہ صاحبہ (مرحومہ) محترمہ عمرانہ صاحبہ، محترمہ صفوانہ صاحبہ اور محترمہ فرحانہ صاحبہ ۔ حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ العالی اس وقت ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور مذہبی زندگی میں رہنمایانہ فرائض انجام دے رہے ہیں ۔ آپ راجیہ سبھا کے ممبر رہ چکے ہیں، شیخ الاسلام کے سچے جانشین ہیں ۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب اور حضرت شیخ الاسلامؒ کے تمام خلفاء سے آپ کو بیعت کرنے کی اجازت حاصل ہے ۔ حضرت مولانا ارشد مدنی اس وقت دارالعلوم کے تعلیمی شعبے کے سربراہ ہیں ۔ تراویح میں قرآن کریم والہانہ انداز سے تلاوت فرماتے ہیں ۔ آپ کی آواز میں اس قدر سوز ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کے دوران مقتدیوں کے قلوب پر رقّت طاری ہو جاتی ہے ۔

بزرگوں کی نظر میں

حضرت شیخ الاسلام کی عظمت کا اعتراف بڑے بڑے بزرگوں نے کیا ہے، اس سلسلے میں چند بزرگانِ دین کی آراء ملاحظہ فرمائیں ۔

حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب فیض آبادی ثم المدنی آسمانِ علم و ہدایت کے آفتاب اور زہد و ورع

میں یگانہ اور جہادِ تخلیص وطن کے ایک ممتاز شہسوار ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان اُن کی ذات گرامی پر جس قدر فخر کریں کم ہے۔

حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپوری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک حضرت مدنی رشد و ہدایت اور علم و فضل کے درخشندہ آفتاب ہیں۔

عارف باللہ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری نے فرمایا کہ پہلے تو ہم یوں ہی سمجھتے رہے مگر وقت کی نزاکتوں اور ہنگامہ آرائیوں میں جب ہم نے اس مردِ مجاہد کو آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو جہاں شیخ مدنی کے قدم تھے وہاں اپنا سر پڑا دیکھا۔ حضرت اس وقت ہر دو منصب پر فائز المرام ہیں اور ملک و ملت کی خاطر باطل کے مقابلے میں حق کا دامن تھام کر جس مردانہ صورت میں استقامت اور استقلال کے ساتھ قربانیاں پیش فرما رہے ہیں، یہ شانِ حسینیت کا مظاہرہ ہے۔

حضرت مولانا عزیر گل نے فرمایا کہ درحقیقت یہ وہ قابلِ فخر ہستی ہے کہ جس کی اطاعت میں مسلمانانِ عالم کی دین اور دنیا کی بھلائی اور آزادیٔ ہند کا راز مضمر ہے۔ تبلیغی جماعت کے بانی اور مادر زاد ولی حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کو راقم الحروف نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ "حضرت مدنی کی شان میں کوئی نازیبا بات یا گفتگو معصیت سے خالی نہیں"۔

ذاتی مشاہدہ اس موقع پر راقم الحروف کو دو ایک واقعات اور بھی یاد آرہے ہیں جن سے حضرت مدنی کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

میں سہارنپور میں اسلامیہ انٹر کالج میں زیر تعلیم تھا۔ کبھی کبھی شام کے وقت حضرتِ مولانا زکریا صاحب کے یہاں چلا جاتا تھا۔ وہاں عصر کے بعد عام محفل ہوتی تھی۔ ایک شام میں نے دیکھا کہ محفل میں حضرت مولانا زکریا صاحب کے ساتھ ساتھ حضرت رائے پوری اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ بھی تشریف فرما ہیں۔ اس چوک میں جہاں کہ

عام حاضری ہوتی تھی ایک چبوترہ تھا۔ یہ تینوں حضرات اس پر تشریف فرما تھے۔ اس دوران ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لے کر آیا۔ اس چھوٹے بچے کے ہاتھ میں قاعدہ بغدادی تھا اور یہ شخص حضرت مولانا زکریا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کرنے لگا کہ بچے کی بسم اللہ کرا دیجئے۔ حضرت مولانا زکریا صاحب نے بچہ کے ہاتھ میں قاعدہ دے کر اسے حضرت رائے پوری کی خدمت میں پیش کر دیا اور حضرت رائے پوری نے اس بچے کو حضرت مدنی کے سامنے کر دیا اور حضرت مدنی نے اس بچے کی بسم اللہ کرائی۔

میرے والد محترم حضرت مولانا محمد مشفع حسین، استاذِ فارسی دار العلوم دیوبند ایک زمانے میں کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے انٹر کالج میں اردو فارسی کے استاذ تھے۔ میں بھی اس ادارے میں زیر تعلیم تھا۔ حضرت مدنی اکثر و بیشتر کاندھلہ تشریف لے جاتے تھے۔ ایک بار حضرت مدنی، حضرت مولانا زکریا صاحب اور کچھ دیگر اصحاب جن میں والد بزرگوار اور راقم الحروف بھی شامل تھا، کاندھلہ میں عیدگاہ کے قریب شام کے وقت آئے۔ یہیں قبرستان بھی تھا اور غالباً کسی قبر کے پاس بیٹھ کر اِن بزرگوں کو کچھ مراقبہ کرنا تھا۔ اسی دوران مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ حضرت مولانا زکریا صاحب نے اذان دی۔ ابھی اذان مکمل ہونے نہیں پائی تھی کہ حضرت مدنی نے صف بندی کر کے تکبیر پڑھنی شروع کر دی تاکہ حضرت مولانا زکریا صاحب مجبوراً امامت کے لئے آگے بڑھ جائیں۔ مگر مولانا زکریا صاحب نے اذان سے فارغ ہو کر جب یہ صورتِ حال دیکھی تو حدیث پڑھی جس کا مفہوم تھا کہ جو اذان کہے، تکبیر بھی اُس کا حق ہے۔ یہ سننا تھا کہ حضرت مدنی فوراً نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھ گئے۔

مہمان نوازی

حضرت کے آستانے پر جو بھی آتا، سب سے پہلے یہ دریافت کیا جاتا کہ آپ نے کھانا کھایا۔ تمام مہمان بلا کسی امتیاز ایک ہی دسترخوان پر صبح کی چائے، دوپہر کا کھانا، بعد ظہر چائے اور رات کا کھانا تناول فرماتے حضرت والا مہمانوں کا خود خیال رکھتے اور ان کی خدمت کو بڑی اہمیت دیتے، مہمان نوازی

کے تحت کسی بھی آنے والے کو کسی طرح کی تکلیف کا احساس نہ ہونے دیا جاتا۔ کھانے پر آنے والوں کی حاضری ہوا کرتی تھی، ایک بار میرے استاد محترم ماسٹر محمود الحسن، وائس پرنسپل اسلامیہ انٹر کالج سہارنپور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میری خواہش یہ ہوئی کہ میں اپنے استاد کو اپنے ساتھ گھر پر کھانا کھلاؤں، مگر ماسٹر صاحب تو حضرت کے مہمان تھے۔ میں کیسے لے جاسکتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ حضرت کے سامنے بول سکوں۔ میں نے والدِ محترم سے کہا کہ میری طرف سے حضرت والا سے عرض کر دیجئے کہ میرے استاذ کو دوپہر کے کھانے پر میرے گھر آنے کی اجازت مرحمت فرما دیں۔ والد بزرگوار نے حضرت شیخ سے میری خواہش ظاہر کی۔ شیخ نے فرمایا کہ قطاع الطّریق ہے یہاں لوگ اصلاحِ نفس کے لئے آتے ہیں۔ تو مرغن غذائیں کھلانا چاہتا ہے۔ اِس کے بعد مسکراتے ہوئے اجازت دے دی اور میں اپنے استاد محترم کو اپنے ساتھ لا سکا۔ حضرت مدنی کے کاشانہ پر جتنی چارپائیاں تھیں، سب میں دونوں طرف پائنتی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ ہر بزرگ پائنتی بیٹھنے کی کوشش کرتا اور یہ اصرار ہوتا کہ حضرت آپ سرہانے تشریف رکھیں۔ اس قیل وقال کو دور کرنے کے لئے غالباً یہ پینتی کی ایجاد ہوئی ہوگی۔ غرضیکہ احساس تواضع سے کسی بھی لمحہ غافل نہیں ہوتے تھے۔

قناعت

حضرت مدنی کو زندگی میں بہت سے اعلیٰ ترین مناصب پیش کئے گئے مثلاً —— یہ کہ برطانوی سرکار نے آپ کی سرگرمیوں کو دیکھ کر ترغیب و تحریص کے طور پر ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے لئے آپ کو مبلغ پانچ سو روپے ماہانہ پر آنے کی دعوت دی۔ اس زمانے میں یہ رقم بہت کثیر تھی۔ مگر حضرت نے انکار فرما دیا، حکومتِ مصر نے آپ کو جامع ازہر میں شیخ الحدیث کے لئے مبلغ ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ، مکان اور موٹر کار کی سہولتیں دینا چاہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی آمد و رفت کا سال میں ایک بار کرایہ بھی دینے کی پیش کش کی گئی۔ اس زمانے میں دارالعلوم میں آپ کو صرف

ڈیڑھ سو روپے ماہانہ ملتے تھے مگر حضرت نے وہاں جانے سے بھی انکار کر دیا۔

انکسار

حضرت والا اپنی تعظیم کے لئے کسی کا کھڑا ہونا گوارہ نہیں فرماتے تھے۔ ایسے موقعوں پر آپ احادیث کا حوالہ دے کر ڈانٹتے تھے۔ مجلس میں سب سے کمتر جگہ بیٹھتے۔ البتہ پوری مجلس اور حاضرین کا رخ آپ ہی کی طرف ہو جاتا تھا کیونکہ صدر ہر جا کہ نشیند صدر است۔ آپ کی مجلس نہایت باوقار ہوتی تھی۔ لغویات اور بیہودہ گفتگو کا اس میں ہرگز گذر نہ تھا۔ خاموش رہ کر آدابِ محفل ملحوظ رکھے جاتے۔ کسی کو کچھ پوچھنا ہوتا تھا، یا کوئی بات کہنی ہوتی تو اس کا جواب نہایت سنجیدگی کے ساتھ حضرت شیخ کی زبانِ مبارک سے ہی سنا جاتا تھا۔ آپ کی پوری زندگی جذبۂ جہاد اور خدمت خلق کا جیتا جاگتا نمونہ رہی ہے۔ آپ کی تواضع وانکساری، روحانی کمالات، عزم واستقلال، خدمتِ خلق، مہمان نوازی، سیاسی تدبر اور فہم وفراست، خدا ترسی اور شان عبودیت کو انسانیت کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

کتابیں

آپ کے خطوط کا مجموعہ مکتوبات شیخ الاسلام آج بھی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔ اصلاح تزکیہ نفس، اور روحانی تربیت اور ایثار وسلوک کی محفلیں آج بھی ان مقدس اور متبرک مقاصد کی یاد تازہ کرتی ہیں جن کے لئے انسان کو روئے زمین پر بھیجا گیا۔ آپ نے زندگی بھر کن کن مختلف طریقوں سے انسانوں کو اللہ کی رضا جوئی، اتباعِ شریعت، پابندی سنت، دیانت، اور حسنِ خلق کی تاکید فرمائی، اِن سب کا مطالعہ اِن خطوط سے ہو سکتا ہے۔ ان کے علاوہ شہابِ ثاقب، نقشِ حیات بھی آپ کی زندگی کے مطالعہ کے لئے ضروری ہیں۔ شہاب ثاقب میں عقائد کی وضاحت تفصیل سے کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ آپ کے درس پر مبنی احادیث کی تفاسیر بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ان سے طلبا کی کثیر تعداد آج بھی فیضیاب ہو رہی ہے۔ احادیث کے درس سے متعلق یہ دلپذیر تقاریر معلومات کا خزانہ ہیں، سفرنامہ اسیرِ مالٹا ہندوستان کی جنگِ آزادی کے بہت سے اہم گوشوں کو بے نقاب

کرتا ہے۔

تعلیمات

حضرت شیخ کی پوری زندگی خلوت وجلوت میں یکساں تھی۔ آپ کی زندگی کھلی کتاب ہے۔ اس کا کوئی گوشہ صیغۂ راز میں نہیں ہے۔ آپ اس دورِ الحاد اور بے دینی میں روشنی کا مینار تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن ایک نور تھے تو شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی اسی نور کی ضیا اور چمک تھے۔ یہ نور ماحول میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا درس دینے کے لئے جگہ جگہ پھیلا۔

قومی اتحاد کی تلقین

آپ نے فرمایا کہ مصیبت کے وقت میں ازبس ضروری ہوتا ہے کہ اپنے جھگڑوں کو چھوڑا جائے اور مشترکہ مصیبت کو دور کرنے کی انتہائی کوشش عمل میں لائی جائے۔ گاؤں میں آگ لگتی ہے، سیلاب آتا ہے، تو لوگ اپنے پرانے جھگڑوں، نسلی امتیازات، اختلافِ عقائد کو بھلا دیتے ہیں اور سب آگ بجھانے میں لگ جاتے ہیں۔ یہی حال ہم لوگوں کا ہونا چاہئے۔ آپ نے بتایا کہ اسلام ایک زندہ مذہب ہے۔ اس کی بنیاد ایسے اصولوں پر قائم ہے جن کی صداقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ وہ فقط ایک سماجی مذہب کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس سے بھی بلند و بالاتر ایسے عقائد اور اعمال کی تلقین کرتا ہے جن کی افادیت آپ زندہ شہادت ہے۔ یہ مذہبِ اسلام حیاتِ بعد الموت کے بنیادی عقیدے پر کائناتِ انسانی کو رشد و ہدایت کی دعوت دیتا ہے۔ معاش اور معاد کی فلاح و بہبود کا پیغام سناتا ہے۔ انسان کی انسانیت معراجِ ترقی پر جب ہی پہونچ سکتی ہے جب انسان کے سامنے یہ پختہ یقین ہو کہ صرف ایک خدا اور صرف ایک خدا ہی پرستش کے لائق ہے، جس کا کوئی شریک نہیں اور عزت و ذلت اور موت و زندگی اسی کے ہاتھ ہے۔

آپ نے عدم تشدد کے اصولوں کو اپنایا، ہندوستان کی جد وجہد کی آزادی میں آپ نے جس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، وہ تاریخ ہند میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اپنے

استاذ حضرت شیخ الہند کے حکیمانہ جوش عمل کے علمبردار تھے۔ آپ صحیح معنی میں جانشینِ شیخ الہند ہیں۔ آپ کا فرمانا تھا کہ علم کا نتیجہ رہبانیت نہیں بلکہ علم کو سیاست کے میدان میں رہنما ہونا چاہئے۔ اس سے اسلام کا مذہب کی حیثیت سے اور مسلمانوں کا ملت کی حیثیت سے وقار رہ سکتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان، ہندوستانی قومیت کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ اس لئے ملک کی آزادی انہیں ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ شیخ الاسلام نے بہت عرصے پہلے یہ کہا تھا کہ ہندوستان کی آزادی دنیا کی پسماندہ اور کمزور قوموں کی آزادی کی پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ چنانچہ یہی کچھ دیکھنے میں آیا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد دنیا کی بیشتر کمزور قوموں کو آزادی مل سکی حضرت مدنی مشرق کے روحانی چمنستان کی بربادی کا بڑا سبب مغرب کی اخلاقی گراوٹ کو جانتے تھے۔ بظاہر وہ سیاسی جدوجہد کے لئے کوشاں تھے لیکن بباطن وہ روح کی اخلاقی بلندیوں کے لئے بے چین رہے۔

مختصر یہ کہ شیخ الاسلام کی حیاتِ مبارکہ، خاندانی شرافت، زہد و تقویٰ، خلوص و ایثار محبتِ رسول اور اتباعِ سنت، علم و عمل، روحانی فیوض و برکات، ملکی سیاست اور جنگِ آزادی نیز حب الوطن کے بلند اصولوں کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ اس پر شیخ الہند محمود حسن کے نقوش مرتب ہوئے۔ آپ فقیہ اور پیشوائے ملت حضرت مولانا گنگوہی کا پرتو جلیل تھے۔ آپ نے بھولی بھٹکی قوم کو صراطِ مستقیم پر لانے کی کوشش کی۔ اتنی جامع کمالات شخصیت صدیوں اور قرنوں کے بعد پیدا ہوا کرتی ہے۔ آپ کی حیاتِ مبارکہ کا کوئی بھی گوشہ ہو، علمی فیوض و برکات ہوں، محاسنِ اخلاق ہوں، مجاہدے ہوں، سیاسی معرکے ہوں، مجھ ایسے بے پایہ شخص کا اس سلسلے میں قلم اٹھانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ یہ منصب تو انہیں کا ہے جو حضرت والا مرتبت کی عظمتوں کے امین ہیں۔ میں نہ اس کا اہل ہوں، نہ اس کی جرأت کر سکتا ہوں، البتہ مولانا رشید الوحیدی صاحب کے حکم کی تعمیل میں یہ جسارت کی ہے۔ ؎

خاموش در ثنائے تو حد ثنائے تست

زندگی کے ابتدائی دور میں والد صاحب کی وفات کے بعد جب مجھے اپنی تھوڑی بہت جائیداد پر اختیار حاصل ہوا تو چند ایسے لوگوں کی معیت مجھے مل گئی کہ میں آوارہ گردوں کی صف اول میں کھڑا ہو گیا مجھے یہ آوارہ لوگ استاذ کہنے لگے، اور استاذ مانے لگے، ابھی میری عمر صرف اکیس سال تھی، کسی قدر سنبھلا تو مسلم لیگ کے سرگرم نوجوانوں میں شامل ہو گیا، ۱۹۴۸ء کی فروری میں جمعیۃ علمائے صوبہ بہار کا سالانہ جلسہ سمستی پور ضلع دربھنگہ میں ہونا قرار پایا، سمستی پور سے چندہ لینے کے لئے کچھ لوگ ضیا گھاٹ آئے لیکن میں نے چندہ دینے سے صاف انکار کر دیا، کیونکہ میں مسلم لیگ کا حامی تھا، میرے دوست چودہری عتیق اللہ صاحب نے اپنی اور میری طرف سے چندہ دے دیا، میرے دوست کٹر جمعیۃ علمائی اور کانگریسی تھے، انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم کو بھی جلسہ میں چلنا ہو گا، کیونکہ مدنی صاحب مدظلہ العالی بھی تشریف لا رہے ہیں۔ میں ان سے مرید ہونے جا رہا ہوں۔ تم بھی چلو تقریر بھی سنو گے اور ملاقات بھی ہو جائے گی، میں نے چلنے کا وعدہ کر لیا اور تاریخ مقررہ پر سمستی پور جلسہ گاہ میں پہونچ گیا، بعد مغرب جلسہ شروع ہوا۔ مجمع بہت زیادہ تھا، جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی، پہلے قرآن حکیم کی تلاوت کی گئی تھی، اس کے بعد ساجد لکھنوی نے مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہانپوری کا کلام جو حضرت رح کی شان میں تھا ترنم کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔

وہ جس کی روح قدسی سے جہاں میں انقلاب آیا
کہ جس کے در سے دشمن بھی ہمیشہ کامیاب آیا
مدینہ کے در و دیوار اسکو یاد کرتے ہیں
حرم سے لے کے فرمان نبیؐ جو بے حجاب آیا
وہ جس کی ذات امداد و رشیدی فیض کا سنگم
وہ جس کے روپ میں محمود و قاسم بے نقاب آیا
ملایا ہند کے بچھڑے ہوؤں کو جس کے نغموں نے
جو شیخ الہند محمود الحسن کے ہم رکاب آیا
مجدد ہے جو ہندوستان میں قومی تخیل کا
دلائل میں جو لے کر شاہد ام الکتاب آیا
زمانہ ناموافق اہل دوراں سب کے سب دشمن
نہ قدموں میں تزلزل اور نہ لب پر کچھ عتاب آیا
جو ہیرو انقلاب نو کا تھا اگلے زمانوں میں
جمعیتہ کے افق پر وہ درخشاں آفتاب آیا
محدث اور مدرس مرشد کامل سیاست داں
وہ دورہ ملک کا گردوں کو بھی جس سے حجاب آیا
کہ جس کے فیض سے جاہل بھی عارف بن گیا یکدم
نگاہ مست سے مخمور ہر ہر شیخ و شاب آیا

جس وقت ساجد صاحب نے یہ شعر پڑھا، کہ جس کے فیض سے جاہل بھی عارف بن گیا یکدم۔ تو میرے قلب میں یہ شیطانی وسواس پیدا ہوا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک جاہل آدمی شیخ رح کے فیض سے عارف (اللہ والا) ہو جائے، خیر تقریریں ہوئیں

رات کا پروگرام ختم ہوا سامعین و مقررین صاحبان اپنی اپنی قیامگاہ پر چلے گئے۔
دوسرے دن جلسہ گاہ میں حاضر ہوا، حضرت مدظلہ کا قیام محمد صدیق صاحب ٹھیکیدار کے یہاں تھا، عصر کے بعد حکیم ہاشم صاحب مرحوم جو کہ سمستی پور میں طبابت کرتے تھے ان کے یہاں پہونچا چونکہ میرے دوست چودھری عتیق اللہ وہیں قیام فرما تھے حکیم صاحب مرحوم نے عتیق اللہ صاحب کے لئے حضرت کے پاس سفارش کی تھی کہ بیعت کرلیں، حضرتؒ نے وعدہ کرلیا تھا کہ بعد مغرب بیعت کرلوں گا، نہ معلوم کیوں میرے دل میں بھی یہ خواہش ہوئی کہ میں بھی مرید ہوجاؤں، میں نے حکیم صاحب سے عرض کیا کہ میرے لئے بھی سفارش کردیں تو وہ ہنسنے لگے اور فرمایا کہ یہ کھیل تماشا ہے کہ جو چاہے مرید ہوجائے تم اپنی شکل دیکھو اور لباس پر غور کرو کہ تمھارے چہرے پر ڈاڑھی مونچھ نہیں ہے، لباس بھی انگریز جیسا ہے، میں سفارش نہیں کرونگا ہملوگ ٹھیکیدار صاحب کے یہاں تھے کہ مغرب کا وقت ہوگیا لوگ وضو کررہے تھے میں بھی وضو کرکے نماز کی جگہ صف اول میں بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد مغرب کی جماعت شروع ہوئی حضرتؒ نے امامت فرمائی، میں حضرت کے پیچھے ہی کھڑا تھا نماز ختم ہوئی تو حضرت اپنی جگہ پر جاکر بیٹھ گئے میں لالٹین اٹھاکر حضرتؒ کے قریب رکھ کر دائیں جانب بیٹھ گیا، مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی نے بآواز بلند فرمایا کہ جن لوگوں کو بیعت ہونا ہے وہ بیٹھے رہیں، باقی حضرات باہر چلے جائیں، میں چپ چاپ بیٹھا رہا تاکہ لوگوں کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ بغیر سفارش کے بیٹھ گیا ہے، تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک تلقین فرماکر دعاء فرمائی اور سب لوگوں کو شجرہ دیدیا گیا۔
اسکے بعد میں نے پانچ روپیہ داہنے ہاتھ میں رکھ کر پیش کئے حضرت نے فرمایا کیا ہے، میں خاموش رہا پھر فرمایا بولتے کیوں نہیں، میں نے آہستہ سے کہا کہ حضرت نذرانہ ہے۔ یہ سنکر حضرت کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا اور فرمایا کہ روپیہ اپنے

اپنے پاس رکھو، اور سب لوگ اٹھ جائیں، سب لوگ کمرہ سے باہر چلے آئے اور مجھ کو برا بھلا کہنے لگے، میں وہاں سے حکیم صاحب کے یہاں چلا آیا، حکیم صاحب نے بھی بہت ڈانٹا، میں نے کہا کہ پیر لوگ تو مرید کرنے کے بعد نذرانہ لیتے ہیں اس لئے پیش کیا تھا، مختصر یہ کہ میں اپنے کئے پر افسوس کرتا رہا اور حضرت کے سامنے جاتے ہوئے گھبراتا تھا، دوسرے دن یکم مارچ ۴۸ء کو حضرت رہ کا پروگرام صبا گھاٹ بلاسپور جانے کا ہوا اسلئے کہ مولانا عبدالوہاب علیہ الرحمہ بیمار تھے ان کی عیادت کرنا ضروری تھا حضرت صبا گھاٹ تشریف لائے، میں نے مولوی زکریا صاحب جو کہ حضرت رہ کے ساتھی تھے اور میرے خالو تھے ان سے سفارش کرا کے اپنے شجرہ پر حضرت رہ سے اپنا نام لکھوا لیا، اسی روز سے مجھ پر رحمت کی بارش کا دروازہ کھول دیا گیا اور آج تک رحمت کی بارش جاری وساری ہے۔ اور قوی امید ہے کہ یہ رحمت کی بارش قیامت تک ہوتی رہے گی۔

مرید ہونے کے ایک سال بعد جب میں پہلی مرتبہ ٹانڈہ پہونچا تو میں فُل پینٹ پہنے ہوئے تھا غالباً شوال کی دوسری تاریخ تھی، مہمان رخصت ہو رہے تھے جو لوگ تعلیم والے تھے ان کو سلوک کی تعلیم دی جارہی تھی، یکے بعد دیگرے لوگ حجرے میں جاتے تھے اور سبق لے کر واپس آتے تھے، حضرت رہ کے کئی خلفاء موجود تھے، مجھ سے کہا کہ آپ غسل کر کے کپڑے تبدیل کریں، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور کہا کہ جب تک حضرت رہ سے ملاقات نہ ہوگی نہ غسل کروں گا نہ کپڑے بدلوں گا، اتنے میں اندر سے ناشتہ چائے آگئی میں نے جیسے ہی چائے پینی چاہی حضرت رہ حجرہ سے نکل کر میری پشت پر دو قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو کر السلام علیکم فرمایا، میں نے گھوم کر دیکھا اور وعلیکم السلام کہتا ہوا مصافحہ کیلئے بڑھا قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں حضرت نے قدم مبارک بڑھا کر مجھکو اپنے سینہ سے لگا لیا اور دیر

تک سینہ سے لپٹائے رکھا، اس کے بعد مصافحہ کیا، اور فرمایا کہ چائے پی کر سو جاؤ، تکان دور ہو جائے گی، میں جب تک حضرت کے یہاں رہا حضرت اپنے ساتھ ایک ہی رکابی میں کھلاتے رہے، اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت کی مجھ پر کس قدر شفقت اور عنایت تھی، میں نے جب بھی حضرت سے دعا کے لئے کہا کہ حضرت دعا فرمادیں، حضرتؒ نے دعا فرمادی اور میں بیت اللہ شریف کی زیارت سے سرفراز ہوتا رہا، حضرت میرے غریب خانہ پر سات مرتبہ تشریف لائے اور اللہ نے مجھ کو نوازا اور حج و زیارت کے لئے بار بار بلاتے رہے اور بلا رہے ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ بھی اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک کے طفیل اور حضرت کی دعا برکت سے نوازیں گے۔

میرے بزرگو اور دوستو کیا یہ زندہ کرامت نہیں ہے کہ میں آوارہ گردوں کی صف اول میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا اور استاذ کہلاتا تھا مگر آج مجھے شیخ الاسلام کے غلاموں میں ممتاز حیثیت دی گئی ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کو
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

تحریک مدح صحابہ

عبدالحی فاروقی۔ ایم۔اے (عربی) ایم۔اے (معاشیات)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح (۱۸۷۹ – ۱۹۵۷) کی ذات گرامی مختلف النوع صفات کی حامل تھی، ایک طرف اگر آپ کی ذات زیب دہِ مسندِ تدریس تھی تو دوسری طرف خانقاہ رشد و ہدایت میں مخلوق کے لئے تزکیۂ نفس اور تعلق مع اللہ پیدا کرنے کا ذریعہ تھی، اسی طرح اگر ضرورتِ وقت کے مطابق انھیں پرورشِ لوح و قلم کرتے ہوئے تصنیف و تالیف میں مشغول دیکھا جا سکتا تھا تو دوسرے اوقات میں اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبودی اور ملک و ملت کی خیر خواہی میں ہمہ تن مصروف پایا جاتا تھا، حضرت شیخ کی زندگی کے ہر پہلو پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے آپ کی ساری عمر مجاہدانہ قیادت اور سرفروشانہ کارناموں سے معمور رہی ہے، مسلمانانِ ہند کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں تھا جس میں آپ نے قولاً اور عملاً رہنمائی نہ فرمائی ہو، آپ نے ہر ظلم و عدوان کے خلاف آواز بلند کی اور ہر طاغوتی طاقت، فراعنۂ وقت اور نمرودانِ زمانہ سے فیصلہ کن ٹکر مول لی۔

انگریز نے ہندوستانی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے جہاں اور بہت سے

دجل وفریب کئے وہیں اس نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فرق باطلہ کو بھی درپردہ شہ دیکر مدمقابل لاکر کھڑا کر دیا تھا، برٹش گورنمنٹ کی ہر وقت یہی کوشش رہا کرتی تھی کہ مسلمانوں کے خلاف برابر محاذ آرائی قائم رہے تاکہ وہ آپسی جھگڑوں میں الجھ کر اپنی اجتماعی ملّی قوت کو بروئے کار نہ لاسکیں، اسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لکھنؤ کے شیعوں کو آمادہ کیا گیا کہ وہ اہلِ سنت کی ہر مذہبی تقریب پر اپنی دل آزاری کا لیبل لگا کر اُسے بند کرانے کی کوشش کریں چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۰۴ء سے لکھنؤ میں شیعہ سنی کشمکش کا سلسلہ شروع ہوا، وہاں زمانۂ قدیم سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ محرم کے پہلے عشرے میں شیعہ اپنے جلوس عزا نکالتے تھے اور مقامی سنی بھی اپنی مذہبی ناواقفیت کی وجہ سے اس میں شریک ہوتے تھے لیکن ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۵ء میں شیعوں نے بعض مخفی طاقتوں کے بل پر اپنے فرقہ میں مذہبی بیداری پیدا کرنے کے لئے اپنی مجالس اور جلوس ہائے عزا میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی شان میں بے ادبی کرنے کی نیت سے "تبرا" شروع کیا، ظاہر ہے کہ یہ بات اہلِ سنت والجماعت کے لئے کسی حال میں بھی قابلِ برداشت نہ تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہر میں شیعہ سنی کشیدگی پیدا ہوگئی اور فسادات شروع ہوگئے چنانچہ آئندہ برسوں میں سنیوں نے اپنی مذہبی تقریبات شیعوں سے الگ کرلیں کیونکہ وہ اپنی مذہبی محافل میں ذکرِ رسول ؐ کے ساتھ ساتھ ذکر اصحاب رسول ؐ بھی کرتے تھے۔ یہ چیز کوئی نئی نہ تھی، آغاز اسلام ہی سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ ہر مقرر اپنی تقریر میں اور ہر مصنف اپنی تصنیف کے آغاز میں حمد خداوندی کے بعد جہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجتا ہے وہیں آپ کے اصحابِ کرام رض کا بھی ذکر خیر کرنا ضروری سمجھتا ہے، صحابہ رض کی اسی تعریف وتوصیف کا نام "مدح صحابہ" ہے۔

شیعوں کی تبرے بازی اور مدح صحابہ سے نفرت کی انتہا یہاں تک پہونچ گئی کہ وہ مسلمانوں کی ہر مذہبی تقریب کو اپنی دل آزاری قرار دینے لگے اور حکومت سے مطالبہ کرنے لگے

کسان پر پابندی عائد کی جائے۔ حکومت یوپی نے ان اختلاف کا حل تلاش کرنے کے لئے ۱۹۰۸ء میں ایک تحقیقاتی کمیشن مسٹر ٹی۔ سی پگٹ (T.C.P Piggott) کی سرکردگی میں مقرر کر دیا، جس میں مسلمانوں کی طرف سے امام اہلِ سنت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی[1] نے نمائندگی کی تھی۔ اس کمیشن نے شیعوں کی حوصلہ افزائی اور حمایت میں سال کے تین دن (عشرۂ محرم، چہلم اور ۲۱ رمضان) میں مدح صحابہ پڑھنے پر پابندی عائد کر دی[2]۔ اس نامناسب

---

[1] حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی ۳ ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ کو قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد مولوی حافظ ناظر علی ضلع فتحپور یوپی میں تحصیلدار تھے۔ کتب درسیہ تمام مولانا سید عین القضاۃ صاحب حیدرآبادی ثم لکھنوی بانی مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ سے پڑھیں جو حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ۱۳۱۶ھ میں تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں دارالعلوم ندوۃ العلماء، مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ اور مدرسہ عالیہ عربیہ امروہہ یوپی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ لیکن جلد ہی ملازمتوں کا سلسلہ ختم کر کے ساری زندگی تصنیف و تالیف اور وعظ و تبلیغ میں بسر کی، ۱۳۱۸ھ میں اپنا مشہور فقہی رسالہ "علم الفقہ" ماہنامہ کی شکل میں نکالا، پھر ۱۳۲۲ھ میں ہفت روزہ اخبار "النجم" لکھنؤ سے جاری کیا جو ۱۹۲۷ء تک نکلتا رہا۔ ۱۳۵۱ھ میں لکھنؤ میں ایک دینی ادارہ "دارالمبلغین" کے نام سے قایم کیا جو اب بھی بحمد اللہ باقی ہے، آپ نے تقریباً ۵۰ کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کیں، جن میں علم الفقہ چھ جلدوں میں، ترجمہ اُسد الغابہ، ترجمہ تاریخ طبری، ترجمہ ازالۃ الخفا، سیرت خلفاء راشدین، نفحۂ عنبریہ، قاتلان حسین کی خانہ تلاشی اور تفسیر آیاتِ قرآنیہ ۲۲ حصوں میں قابل ذکر ہیں۔ رد قادیانیت، رد بدعت کے علاوہ رد شیعیت میں بھی آپ نے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ اسی بنا پر آپ کو "امام اہلِ سنت" کے خطاب سے نوازا گیا۔ سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ ابو احمد صاحب بھوپالی سے آپ کو بیعت و خلافت حاصل تھی۔ ۱۹۶۲ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

[2] النجم لکھنؤ، ۷ محرم ۱۳۲۷ھ

فیصلہ سے مسلمانوں کے جذبات کو بے حد ٹھیس پہونچی اور وہ مسلسل اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہے اور گرفتاریوں و جرمانوں کی شکل میں قربانیاں پیش کرتے رہے مگر اس کا کوئی حل نہ نکل سکا بلکہ اس کے برعکس ضلع انتظامیہ اور شیعہ حکام نے مل کر ایک منصوبہ بند سازش کے تحت سال کے تمام ہی دنوں میں مدحِ صحابہ پر پابندی عائد کرادی جس سے نہ صرف لکھنؤ اور یوپی بلکہ پورے ملک کے مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی، چنانچہ اپنے اس مذہبی حق کو واپس لینے کے لئے مسلمانوں نے سول نافرمانی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس طرح احتجاج، گفت و شنید اور گرفتاریوں کا سلسلہ سالہا سال تک چلتا رہا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

اس نازک صورت حال کے پیش نظر امام اہل سنت مولانا لکھنوی نے مدح صحابہ کی شرعی حیثیت اور حکومت کی طرف سے اس پر عائد کردہ بندش پر غور و خوض کرنے کے لئے ۱۷ ستمبر ۱۹۳۶ء کو ایک کل ہند علماء کانفرنس لکھنؤ میں طلب کی جس میں مختلف مسلک سے تعلق رکھنے والے علماء حضرات نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے علاوہ سحبان الہند مولانا احمد سعیدؒ ناظم جمعیۃ علماء ہند، ابوالمحاسن مولانا محمد سجادؒ نائب امیر شریعت بہار، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید علی حسنؒ مختار جونپوری، مولانا ظفر الملک علویؒ ایڈیٹر الناظر لکھنؤ، مولوی محی الدین قائدؒ ایڈیٹر الجمعیۃ دہلی، مولانا عبدالمومن فاروقیؒ ایڈیٹر النجم لکھنؤ، مولوی محمد احمد کاظمیؒ ایم۔اے، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰنؒ لدھیانوی، مولانا عبدالرحیم فاروقیؒ، مولانا قطب الدین عبدالوالیؒ فرنگی محلی، مولانا عنایت اللہؒ فرنگی محلی، حجۃ اللہ مولانا محمد شفیع فرنگی محلیؒ، مولانا محمد عتیق فرنگی محلیؒ، مولوی محمد اسمٰعیل ذبیحؒ، ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ، مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوریؒ، مولانا امام الدین پشاوریؒ، مفتی اعظم مولانا مفتی کفایت اللہؒ صدر جمعیۃ علماء ہند دہلی، مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، چودھری خلیق الزماں جیسے علماء، اہل الرائے، دانشور، قانون داں اور عمائدین شہر نے شرکت کی۔ تحریک مدح صحابہ میں حضرت شیخ الاسلامؒ کی شمولیت کا ثبوت سب سے

پہلے اسی کانفرنس سے ملتا ہے۔ آپ نے مدح صحابہ کی شرعی حیثیت اور حکومت کی موجودہ روش پر بالتفصیل روشنی ڈالتے ہوئے جلسۂ عام میں فرمایا۔

"مدح صحابہ امر مستحب و مستحسن ہے، شرعی اصول ہے کہ جب کوئی ظالم جماعت، فرد یا جابر حکومت اور جفا کار رائی کسی امر مستحب کی بندش کرے اور مسلمانوں کو مجبور کرے تو شرعاً اس امر کا کرنا واجب ہو جاتا ہے اور منع کرنے والی جماعت کا یہ فعل مداخلت فی الدین کہا جاتا ہے۔ جس طرح گائے کی قربانی مستحب ہے لیکن جب غیر مسلم افراد کی طرف سے اس پر امتناعی نوٹس جاری ہو تو اس وقت مسلمانوں کے ذمہ قربانی واجب ہو جاتی ہے، اسی طرح مدح کرنا بھی مستحب تھا مگر حکومت کی دخل اندازی کی وجہ سے اب سارے مسلمانوں پر واجب ہو گیا ہے کہ دامے درمے سخنے جس طرح بھی ممکن ہو اس قابل نفرت قانون سے آزادی حاصل کریں، اگر یہاں کے مقامی مسلمان قربانی دیتے دیتے اکتا جائیں یا ہمت ہار جائیں تو قرب و جوار کی بستیوں کے رہنے والے مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے[1]۔"

علماء کانفرنس کی نشستوں میں مختلف الخیال علماء اور اصحاب علم نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور متفقہ طور پر یہ اعلان کیا کہ مدح صحابہ کرنا ہمارا مذہبی حق اور ایک ضروری شعار اہلِ سنت ہے اور اس پر کسی قسم کی بندش عائد کرنا مداخلت فی الدین ہے۔

اس کانفرنس کے بعد تحریک مدح صحابہ اور بھی زیادہ شدت اختیار کر گئی اور پورے ملک میں اس کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ دوسرے شہروں اور دور دراز صوبوں سے مسلمانوں کے جتھے لکھنؤ آنے اور گرفتاریاں پیش کرنے لگے۔ اس تحریک کو چلانے کے لئے حضرت امام اہل سنتؒ نے ایک "مدح صحابہ" کمیٹی کی تشکیل کی تھی جس کے سکریٹری مولانا ظفر الملک علویؒ مقرر کئے گئے تھے۔ مدح صحابہ کمیٹی آئینی طور پر اور پر امن

---

[1] النجم لکھنؤ ۲۵ر ستمبر ۱۹۳۶ء

بات چیت کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کرانے کی خواہاں تھی لیکن مجلس احرار کے پرجوش نوجوانوں نے سول نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے اسے عوام کے ہاتھوں تک پہونچا دیا تھا ورنہ حضرت امام اہل سنتؒ اس خالص مذہبی مسئلہ کو آئینی بات چیت کے ذریعہ حکومت سے حل کرانا چاہتے تھے۔

مسلمانوں میں بے چینی اور اضطراب بڑھتا جارہا تھا اور مسلسل احتجاجی مظاہرے جاری تھے جس سے متاثر ہوکر ۱۰ر نومبر ۱۹۳۶ء کو یوپی اسمبلی میں مدح صحابہ کی حمایت میں مختلف جماعتوں کے مسلم نمائندوں نے تحریک التوا پیش کر دی جس پر بھرپور بحث ہوئی۔ اس دن ایوان میں سوائے تحریک مدح صحابہ کے اور کوئی دوسرا مسئلہ زیر بحث نہیں آسکا، اس مباحثہ میں حصہ لینے والوں میں حافظ محمد ابراہیم، نواب زادہ لیاقت علی خاں، حاجی نثار اللہ، کنور جمشید علی خاں، سید ظہور احمد ایڈوکیٹ، حاجی رشید الدین، سید یوسف علی، مولوفصیح الدین، ہادی یار خاں اور جناب غضنفر اللہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان تمام کاوشوں کے نتیجہ میں حکومت یوپی نے مجبور ہوکر ۱۹۳۷ء میں ایک دوسرا تحقیقاتی کمیشن مقرر کر دیا جو السپ کمیشن (Allsop Cammission) کے نام سے مشہور ہے، اس کمیشن کے دو ممبر تھے، ایک الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس السپ اور دوسرے علیگڈھ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ایچ۔ ایس راس (H.S. RASS)، کمیشن کو یہ تحقیق کرنا تھا کہ امتناع مدح صحابہ کے سلسلہ میں حکومت کی عائد کردہ پابندیاں کس حد تک صحیح ہیں اور ضلع حکام نے اِس وقت جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ نہیں، ۲۰ر اپریل ۱۹۳۷ء کو کمیشن کی کاروائی شروع ہوئی، سب سے پہلے اس میں علماء اہل سنت کی گواہیاں اور بیانات شروع ہوئے۔ کمیشن کے سامنے حضرت مدنیؒ کے علاوہ امام اہل سنت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنویؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ دہلوی اور مولانا ظفر الملک علویؒ نے بھی اپنے بیانات دیئے۔ کمیشن میں سب سے پہلے سنی علماء کی

طرف سے، مدح صحابہ کی شرعی حیثیت واضح کرنے کے لئے شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ پیش ہوئے، پہلے ان سے چند سوالات اس طرح کے کئے گئے جس سے ان کی مذہبی پوزیشن واضح ہو جائے چنانچہ حضرت نے بالترتیب ان سوالات کے جواب میں ارشاد فرمایا۔

"میں سنی المذہب ہوں، میں نے دارالعلوم دیوبند میں چھ سال رہ کر علم کی تکمیل کی اور پھر بعض فنون کی تکمیل مدینہ منورہ جا کر کی اور مدینہ منورہ ہی میں بارہ سال تک درس و تدریس کی خدمات انجام دیں اور اب نو سال سے دارالعلوم دیوبند کا صدر مدرس ہوں۔ دارالعلوم دیوبند وہ مذہبی اور مرکزی ادارہ ہے جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیائے اسلام میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔"

اس کے بعد آپ نے فرمایا۔

"صحابہ کرامؓ کی تعریف کرنے کا حکم ہماری مذہبی کتابوں میں تاکید کے ساتھ موجود ہے، خلفاء راشدینؓ کی تعریف کرنا مستحب ہے لیکن اگر اس سے روکا جائے تو وہ فرض ہے، یہ قاعدہ ہے کہ کسی ایسے امر کو کہ جس کی شریعت نے اجازت دی ہو اگر کوئی طاقت منع کرے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ جب تک ان میں قوت ہو اس کو انجام دینے کی کوشش کریں، جس جگہ صحابہ کرامؓ کے متعلق غلط فہمی پھیلائی گئی ہو تو اس جگہ یہ فعل مستحب واجب ہو جاتا ہے، صحابہ کرامؓ کی تعریف ہر جمعہ کے خطبہ میں عیدین کے موقع پر اور حج کے زمانے میں جہاں سال میں ایک مرتبہ دنیا کے مسلمان ایک جگہ جمع ہوتے ہیں پڑھنا ضروری ہے۔ مذہبی تقریریں میں بھی صحابہ کا ذکر کرنا مستحب قرار دیا گیا ہے۔"

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آپ نے مزید فرمایا۔

"صحابہؓ کی تعریف محض اس لئے نہیں کی جاتی کہ کسی کی دل آزاری ہو بلکہ مذہب خود اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ جلسوں اور اجتماعات میں ان کا ذکر کیا جائے

اور کرنا بھی یہی چاہیئے کیونکہ انہوں نے بڑے عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں۔
محرم کی دسویں تاریخ کو اگر شہدائے کربلا کا ذکر کیا جائے تو یہ لازم ہے کہ ان کے
ساتھ صحابۂ کرام رض کی بھی تعریف کی جائے تاکہ مخالف فرقوں سے مشابہت نہ ہو...."

شیعہ وکیل مرزا حیدر مہدی کے ایک سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا:

"مدح صحابہ کا جلوس نکالنا اور نظمیں پڑھنا بدعت نہیں ہے .... ہر زمانے
میں مدح صحابہ کا طریقہ جداگانہ رہا ہے اس لئے یہ موجودہ طریقہ بھی بدعت کے
زمرے میں نہیں آتا ہے چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے
میں ایک شخص نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی برائی کی تو آنحضرت صلعم نے حکم دیا تھا
کہ ابوبکر کی تعریف میں مجمع عام میں قصیدہ پڑھا جائے۔"

تعزیہ داری کیوں حرام ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

"محرم کے موقع پر تعزیہ داری میں وہی ساری باتیں کی جاتی ہیں جن کو دشمنانِ
اہل بیت نے حضرت حسین رض کو شہید کرنے کے بعد کی تھیں۔ انہوں نے اپنے
گھروں میں روشنی کی تھی، چراغاں کیا تھا، مجلسیں منعقد کی تھیں، دلدل نکالے
تھے اور شہداء کے سروں کو نیزوں پر پھرایا تھا، یعنی وہ تمام باتیں جو دشمنانِ اہلِ بیت
نے حضرت حسین رض کو شہید کرنے کے بعد کی تھیں وہی سب آج تعزیہ داری میں
ہوتی ہیں اس لئے اس کو حرام سمجھا جاتا ہے۔ اس کے حرام ہونے کے اور بھی بہت
سے اسباب ہیں۔" [1]

حضرت مدنی رح کا یہ بیان ایک گھنٹہ تک ہوتا رہا، اس کے بعد عدالت برخواست ہو گئی، حضرت
مدنی رح کی اس شہادت سے جو چیز نمایاں طور پر سامنے آئی وہ مدح صحابہ کے مسئلہ کا شرعی وجوب
تھا، آپ نے اپنے بیان میں شیعہ سنی اتحاد پر بھی کافی روشنی ڈالی تھی لیکن یہ صاف صاف کہہ

---

[1] النجم لکھنؤ ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء

دیا تھا کہ جب تک وہ ہمارے مذہب میں مداخلت اور ہمارے شعائر کی توہین کرتے رہیں گے اس وقت تک سنی ان کے ساتھ کسی طرح کا اتحاد نہیں کریں گے۔

حکومت یوپی نے مختلف وجوہ کی بنا پر السپ کمیشن کی رپورٹ کو عرصہ تک دبائے رکھا، بالآخر جنوری ۱۹۳۸ء میں حضرت مدنیؒ نے مولانا آزاد سے گفتگو کر کے کمیشن کی رپورٹ کو شائع کرا دیا، کمیشن کی اس رپورٹ سے مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہونچا، اس میں بھی حسب سابق مدح صحابہ کا حق تسلیم کرتے ہوئے سابقہ تمام پابندیوں کو برقرار رکھا گیا تھا چنانچہ اس فیصلہ سے مسلمانوں کا کوئی بھی طبقہ مطمئن نہیں ہوا اور ہر ایک کو مایوسی ہوئی۔ عوام تو عوام تھے علمار کرام بھی اس فیصلہ سے بالکل متفق نہیں تھے چنانچہ ملک کے مقتدر اور معروف علمار نے ایک متفقہ بیان شائع کیا جس کا متن یہ تھا:

"مدح صحابہ کا متنازع فیہ قضیہ کا جو فیصلہ حکومت یوپی نے ابھی حال ہی میں شائع کیا ہے، ہم نے اسے پڑھا اور ہم افسوس کے ساتھ اس امر کے اظہار پر مجبور ہیں کہ حکومت نے سنیوں کا مذہبی قانونی اور اخلاقی حق ان کو دلانے میں نہ صرف کوتاہی کی ہے بلکہ معاملہ کی اہمیت کو نظر انداز کر کے سنیوں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کیا ہے اگرچہ بظاہر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ سنیوں کو نجی اور پبلک مقامات پر مدح صحابہ (رضی اللہ عنہم اجمعین) پڑھنے کا حق حاصل ہے لیکن ماضی قریب میں حکومت کے عمال نے اس حق کو استعمال کرنے کے راستہ میں جو مزاحمت کی ہے اس کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ صدور فیصلہ کے بعد حکومت نے اس تسلیم شدہ حق کو استعمال کرنے سے سنیوں کو اسی فرسودہ عذر بارد کے ساتھ محروم کر دیا جو عمال سابق پیش کر رہے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ حکومت کا یہ فیصلہ اور طرز عمل لکھنؤ کے اسی ہزار (۱۹۳۷ء میں) سنیوں کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ ہمیں خطرہ ہے کہ حکومت کے اس فیصلہ سے لکھنؤ اور صوبہ متحدہ کے سنیوں کے مذہبی جذبات میں سکون و اطمینان کی جگہ ہیجان اور اشتعال پیدا ہوگا۔

اگر حکومت نے سنیوں کا یہ حق جسے وہ خود تسلیم کر چکی ہے نہ دلایا اور اپنے طرز عمل کی اصلاح نہ کی تو اگر سنیوں نے اس کے نتیجہ میں غم و غصہ اور از خود رفتگی کے عالم میں خلاف ورزی احکام کا طریقہ اختیار کر لیا تو وہ معذور ہوں گے اور اس صورت میں تمام مسلمانوں کی ہمدردیاں لکھنؤ کے سنیوں کے ساتھ ہوں گی اور مسلمانانِ ہندان کی ہر ممکن امداد میں دریغ نہ کریں گے اور اس تمام کشمکش کی ذمہ داری صوبہ متحدہ (یوپی) کی حکومت پر ہوگی۔[1]

اس بیان پر جن علماء کے دستخط تھے ان میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہؒ صدر جمعیۃ علماء ہند دہلی، قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ مظاہر العلوم سہارنپور، مولانا اسعد اللہ صاحبؒ مظاہر العلوم، مولانا عبدالحق مدنیؒ مہتمم مدرسہ شاہی مراد آباد، مولانا احمد سعید صاحبؒ ناظم جمعیۃ علماء ہند دہلی، مولانا سید محمد میاں صاحبؒ مراد آباد اور مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ وغیرہ شامل تھے۔

کمیشن کی مایوس کن رپورٹ اور حضرت مدنیؒ کے ذریعہ حکومت سے گفت و شنید کے تمام دروازے بند ہو جانے کی وجہ سے ۱۱ر نومبر ۱۹۳۸ء کو امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ اور ان کے رفقاء نے سول نافرمانی کرنے کا فیصلہ کر لیا، اس خبر کے پھیلتے ہی حکومت نے فوراً ایک دوسرا اعلانیہ جاری کر دیا جس کے الفاظ یہ تھے:

سنیوں کو مدح صحابہ پڑھنے کا حق گذشتہ ۳۵ سال سے زیر بحث رہا ہے، موجودہ حکومت نے اپنے رزولیوشن میں صراحتاً اس حق کو تسلیم کر لیا ہے، جہاں تک اس حق کو استعمال کرنے کا سوال ہے سنیوں کو اس امر کی آزادی ہے کہ وہ اپنے مکانوں مسجدوں اور میلاد کی محفلوں میں بغیر کسی مزاحمت کے مدح صحابہ پڑھ سکتے ہیں۔
..... کچھ عرصہ سے حکومت اس بات کا ارادہ کر رہی ہے کہ سنیوں کو مذکورہ بالا طریقوں پر برسر عام مدح صحابہ پڑھنے کی اجازت دی جائے مگر اس کے لئے ضروری

---

[1] اخبار آفتاب لکھنؤ ۷ر اکتوبر ۱۹۳۸ء

ہے کہ شہر کی فضا پر امن ہو.......“ ؎۱

اس اعلان سے کچھ امید پیدا ہوئی کہ سنیوں کے حقوق کی پائمالی شاید اب ختم ہو جائے گی اور مدح صحابہ پر جو پابندیاں عائد ہیں وہ اٹھالی جائیں گی چنانچہ اس مذہبی حق کو استعمال کرنے کے لئے امام اہلِ سنت مولانا عبدالشکور صاحبؒ لکھنوی نے فروری ۱۹۳۹ء میں یوم فاروقیؓ منانے کا اعلان کیا، جیسے ہی یہ اعلان شائع ہوا حضرت لکھنویؒ اور ان کے تمام رفقاء کو گرفتار کر لیا گیا، اس خبر سے تمام مسلمانوں میں بے چینی و اضطراب پیدا ہو گیا اور ایک ملک گیر ایجی ٹیشن شروع ہو گیا، غیر منقسم ہندوستان کے اطراف واکناف سے مسلمانوں نے لکھنؤ پہونچکر گرفتاریاں دینا شروع کر دیں یہاں تک کہ تقریباً چار ہزار شیدائیان صحابہ نے یوپی کی مختلف جیلیں آباد کر دیں۔ ۷ / مارچ ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ میں ٹیلہ شاہ پیر محمد سے تقریباً ستر ہزار افراد نے مظاہرہ کیا جس میں صرف خواتین کی تعداد چار ہزار تھی۔ اس موقع کی منظر کشی کرتے ہوئے حضرت شیخ الاسلامؒ تحریر فرماتے ہیں:

”صوبے کے اطراف وجوانب ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر حصہ میں جوش وخروش کی لہر دوڑ گئی یہاں تک کہ بمبئی، پنجاب، فرنٹیر اور بنگال وغیرہ سے بھی قانون شکنی کے لئے جتھے آنے لگے اور یہ سلگتی ہوئی آگ شعلہ مارنے لگی۔ بعض بعض ایام میں گرفتاریوں کی تعداد ساڑھے پانچ سو کے قریب تک پہونچ گئی اور اس طرح منظم طریقہ پر سول نافرمانی واقع ہوئی کہ دیکھنے والے عش عش کرنے لگے۔ مسلمانوں کے اس قدر جوش وخروش اور ہماری جدوجہد کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا وہ ہو کر رہا۔“ ؎۲

فدائیان صحابہ کے اس بے پناہ ہجوم سے شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ نے بھی خطاب فرمایا تھا،

؎۱ اودھ اخبار لکھنؤ ۱۲/ نومبر ۱۹۳۸ء ؎۲ ”مسئلہ مدح صحابہ پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا بصیرت افروز بیان“ ۳-۴ مرتبہ مولوی مشتاق احمد لدھیانوی جوائنٹ سکریٹری مجلس احرار اسلام یوپی۔ مطبوعہ لکھنؤ۔

سارا مجمع آپ کے ارشادات عالیہ کو گوش دل سے سن رہا تھا، اسی خطاب کے درمیان ایک خاتون نے حضرت مدنیؒ کی خدمت میں ایک مکتوب اور کچھ رقم ارسال کی، مکتوب کا مفہوم یہ تھا کہ جب تاریخ اسلام میں اس قسم کی مثالیں موجود ہیں کہ خواتین نے جہاد میں شرکت کی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہمیں سول نافرمانی کی اجازت نہیں دی جاتی۔ حضرتؒ نے اس کا جواب اس طرح سے دیا:

"ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ عورتیں اس جہاد میں شریک ہوں۔ شریعت نے عورتوں کی صف نماز باجماعت میں بھی سب سے پیچھے رکھی ہے اس لئے انہیں جہاد میں اُسی وقت شرکت کی اجازت ہوگی جبکہ خدانخواستہ مردوں میں کوئی باقی نہ رہے گا۔"[1]

حضرت مدنیؒ کو بے حد دکھ تھا کہ مسلمان بے قصور و خطا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں اور حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی چنانچہ آپ نے بہ نفس نفیس خود بھی سول نافرمانی میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا اور مجلس احرار بھی آپ کے ساتھ شامل ہوگئی، اس موقع پر حضرتؒ نے ایک طویل بیان جاری فرمایا جس میں مدح صحابہ کی مذہبی حیثیت اور اس کے وجوب کو ثابت کرتے ہوئے شرعی طور پر مسلمانوں سے اپیل کی کہ:

"مسلمانوں کو چاہیے کہ بعد نماز جمعہ جلسہ کریں اور اس میں گورنمنٹ کے اس فعل پر کہ اس نے مسلمانوں کے مذہبی، انسانی و شہری حق مدح صحابہ میں ناجائز مداخلت کرکے ان کے جذبات کو ایسی ناقابل برداشت ٹھیس پہونچائی ہے جس کی وجہ سے ہزاروں مسلمان پروانہ دار جیل کی کوٹھریوں میں بند ہوچکے ہیں صدائے احتجاج بلند کریں اور مطالبہ کریں کہ وہ جلد از جلد مدح صحابہ کے جلسے و جلوسوں پر سے ہر قسم کی پابندی اٹھالے اور جس طرح دوسری اقوام اور مذاہب کے لئے آزادی

---

[1] "مسئلہ مدح صحابہ پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا بصیرت افروز بیان" ص۳-۴ مرتبہ مولوی مشتاق احمد مطبوعہ لکھنؤ۔

ہے کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کے جلسے وجلوس پبلک مقامات پر عمل میں لا سکتے ہیں
اسی طرح سنیوں کا بھی عمل وحق تسلیم کرلے اور انہیں جاری کرائے ..... ہمیں
چاہیے کہ ہم ان مجاہدین ملت کو مبارکباد دیں جنہوں نے مذہب وملت اور
حق قومی کے لئے اپنے آرام وراحت کو تجتے ہوئے قانون شکنی اور سول نافرمانی
اختیار فرمائی ہے"۔ [1]

اس بیان سے یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ تحریک مدح صحابہ سے حضرت مدنی نوراللہ مرقدہ کو کس قدر تعلق ودلچسپی تھی اور وہ ہر طرح سے اس کے کتنے حامی وناصر تھے اسی طرح جمعیۃ علمار ہند اور مجلس احرار بھی شروع ہی سے اس تحریک کے ساتھ وابستہ وشریک رہی ہے۔ جمعیۃ علمار ہند نے اپنے دسویں سالانہ اجلاس دہلی میں تحریک مدح صحابہ کی حمایت میں ایک تجویز منظور کی تھی جس کا متن یہ ہے:

"جمعیۃ علمار ہند کا یہ جلسہ حکومت یوپی کے اس طرز عمل پر جو اس نے مدح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قضیہ میں لکھنؤ میں اختیار کیا ہے اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتا ہے جبکہ اس نے اصولاً تسلیم کر لیا ہے کہ پبلک مقامات پر بھی مدح صحابہ کرنے کا سنیوں کو حق ہے، اس کے باوجود اس نے مولانا عبدالشکور صاحب، مولانا ظفرالملک صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب وغیرہ کو صرف ایک جلسہ کا اعلان شائع کرنے پر گرفتار کرکے ایک ایک سال کی سزا دے دی۔ یہ کارروائی سراسر ناانصافی اور بے آئینی پر مبنی ہے۔ حکومت پر لازم ہے کہ وہ جلد از جلد اپنی اس غلطی کا تدارک کرے اور گرفتار شدہ اشخاص کو فوراً رہا کرے اور سنیوں کو اپنے شہری اور مذہبی حق کے استعمال کا موقع بہم پہونچائے۔ لکھنؤ کے سنیوں نے اپنے اس حق کے حاصل کرنے کے لئے مجبور ومضطرب ہو کر سول نافرمانی شروع کی ہے،

---

[1] "مدح صحابہ کا شرعی پروگرام"، از حضرت مدنی ص ۴ مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنؤ ۱۳۵۸ھ

یہ جلسہ سنیوں کو اس اقدام پر مبارک باد دیتا ہے اور مسلمانوں سے توقع رکھتا ہے
کہ وہ اپنے اس مطالبہ کو حاصل کرنے کے لئے سرفروشانہ جدوجہد جاری رکھیں گے
یہ جلسہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ہائی کمانڈ سے پرزور درخواست کرتا ہے کہ وہ
حکومت یوپی کو ہدایت کرے کہ وہ سنیوں کے تسلیم کردہ حق پر سے پابندیاں اٹھائے
اور اپنی غلطی کا جلد از جلد تدارک کرے۔" [1]

حضرت مدنیؒ نے وجوب مدح صحابہ کے بارے میں تفصیل کے ساتھ سکریٹری مجلس تحفظ ناموس صحابہ لکھنؤ کے نام اپنے خیالات تحریر کئے تھے اس میں خالص علمی اور فقہی نقطۂ نظر سے مدح صحابہ کے وجوب کے دلائل، حکومت کے طرز عمل پر تنقید اور مسلمانوں کو ایک شہری اور ملی حق کو حاصل کرنے پر مبارکباد دی تھی اور عام مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ہر طرح سے اس تحریک میں اپنا تعاون پیش کریں۔ [2]

حضرت مدنیؒ جس زمانے میں تحریک مدح صحابہ میں قائدانہ حصہ لے رہے تھے اور مجلس احرار کے پرجوش اور ولولہ کار اراکین بے مثال قربانیاں پیش کر رہے تھے اس وقت بھی بعض حضرات کو اس تحریک کے بارے میں شرح صدر نہیں تھا اور وہ اس کی مخالفت کرتے تھے، ان کی اس غلطی کو محض "خطاء اجتہادی" ہی کہا جا سکتا ہے، تحریک مدح صحابہ کا حق پر ہونا اور حضرت مدنیؒ کا اس حق بات میں بھرپور تعاون کرنے کی تائید اور قبولیت کا اندازہ ایک خواب سے کیا جا سکتا ہے جس کا ذکر باعث عبرت ہے۔ صوفی محمد ادریس صاحب مجلس احرار کے سخت مخالف تھے اور تحریک مدح صحابہ کی بھی مخالفت

---

[1] جمعیۃ علماء ہند۔ دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام ص۷۵۱-۷۵۲، ۱۹۱۹ء تا ۱۹۴۵ء جلد دوم، مرتبہ پروین روزینہ، اجلاس یازدہم دہلی، مارچ ۱۹۳۹ء زیر صدارت مولانا عبدالحق مدنی، مطبوعہ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد پاکستان۔

[2] مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم ص۱۷۰-۱۷۷، مکتبہ دینیہ دیوبند ۱۹۵۹ء

کیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ اس حال میں مسجد میں داخل ہوئے کہ بدن پر سرخ کپڑے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ بھائیو مجھکو معاف کر دو: میں نے ہمیشہ آپ لوگوں کی مخالفت کی ہے لیکن آج مجھ کو یقین کامل ہو گیا ہے کہ آپ ہی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے اور دلارے ہیں۔ یہ کہہ کر روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اور ارد گرد لوگ جمع ہو گئے جب ہوش آیا تو کہنے لگے کہ حسب معمول میں کل دن بھر مجلس احرار کے خلاف شہر میں پروپگنڈا کرتا رہا۔ رات کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ امین آباد[1] میں ایک تخت بچھا ہوا ہے اور اس پر ایک سبز پوش بزرگ جن کا چہرہ آفتاب کے مانند چمک رہا تھا تشریف فرما ہیں اور اُن کے چاروں طرف ہزاروں نورانی چہرے والے حضرات دو زانو بیٹھے ہوئے درود و سلام پڑھ رہے ہیں، اتنے میں میں نے دیکھا کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نانا جان! آپ کی امت شیعوں کے پروپگنڈے سے متاثر ہو کر مجھ پر طرح طرح کے الزام لگاتی ہے اور ہر طرح کی گالیاں دیتی ہے۔ اس پر حضورؐ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا کہ کیا حال ہو گا میری امت کا؟ ایک حسین کو کربلا میں شہید کیا اور دوسرے حسین کو ہندوستان میں ذلیل کر رہے ہیں۔ پھر خواب ہی میں دیکھتا ہوں کہ سڑک پر سرخ پوش مسلمان مدح صحابہ پڑھتے ہوئے جا رہے ہیں۔ آنحضورؐ نے ان کو بلایا اور سب کی پیشانیوں کو چوما۔ میں بھی دوڑا کہ حضورؐ کی قدم بوسی کروں مگر آپؐ نے فرمایا کہ اس کو دربار سے نکال دو، یہ شخص جن کو میں پیار کرتا ہوں اُن کو گالیاں دیتا ہے اور جو میرے اصحاب کو گالیاں دیتے ہیں ان کی تعریف کرتا ہے اور ان کو اپنا سردار بناتا ہے۔ آپ نے اُن لوگوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جو دو زانو بیٹھے ہوئے تھے اور درود و سلام پڑھ رہے تھے کہ ان کی عزت میری عزت ہے۔[2]

:.: :.: :.: :.: :.:

---
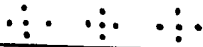
[1] لکھنؤ کا ایک مرکزی بازار اور پارک جہاں شہر کے اجتماعات وغیرہ ہوا کرتے تھے۔

[2] سیرت شیخ الاسلام، مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی بحوالہ الجمعیۃ دہلی۔ یکم اپریل ۱۹۳۹ء

حضرت شیخ الاسلام اور ان کے شاگرد

از:- عبدالعلی فاروقی ..... ایڈیٹر ماہنامہ البدر، لکھنؤ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی نسبت سے میں اپنے آپ کو اس اعتبار سے بہت خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے حضرت شیخ الاسلامؒ کی زیارت ایک مرتبہ اپنی بہت ہی کم سنی میں اسوقت ہوئی تھی جب وہ جد محترم امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقی نور اللہ مرقدہ سے ملاقات کے لئے ان کی قیام گاہ دار المبلغین پاٹا نالہ لکھنؤ تشریف لائے تھے اور میرے والد ماجد حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقی مدظلہٗ میری انگلی پکڑ کر اپنے استاذ بزرگوار سے اپنے کمسن بچہ کیلئے حصول برکت وسعادت کی دعا کرانے لے گئے تھے ـــــ اور حضرت شیخ الاسلامؒ کے سامنے مجھے پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "حضرت یہ خادم زادہ ہے اس کے لئے دعا فرمادیں" ۳۰ سال سے زائد عرصہ گذر جانے کے بعد بھی یہ تو اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ نے بڑی بشاشت کے ساتھ مسکراتے ہوئے اپنا دست مبارک میرے سر پر رکھ کر اپنی دعاؤں سے نوازا تھا.
لیکن کیا دعائیں دی تھیں؟ نہ اس کے شعور کی عمر تھی نہ ہی کلمات دعا یاد ہیں ـــــ
بس یہی ایک پہلی و آخری زیارت و ملاقات ہے جس کی بنیاد پر میں اپنے کو ان خوش بختوں میں شمار کرا سکتا ہوں جن کو حضرت شیخ الاسلامؒ کی زیارت کی سعادت

حاصل ہوئی تاہم گھر کی چہار دیواری سے لے کر درس گاہوں تک اور درسگاہوں سے لے کر عمومی مجالس تک اپنے خاندانی بزرگوں اساتذۂ کرام، علمائے امت، زعمائے قوم اور ہم عصروں کو حضرت شیخ الاسلام کی شخصیت پر اس طرح متفق اور ان کی عظمت کے بیان میں اس طرح رطب اللسان دیکھا کہ نگاہ تصور نے ہمیشہ ان کو اپنے روبرو بلکہ بالکل قریب ہی پایا۔

حضرت شیخ الاسلام رہ کی شخصیت کے جس ایک پہلو نے مجھے انتہائی متاثر کیا اور متاثر ہی نہیں کیا بلکہ جسے میں نے ان کی لافانی عظمت، زہد و تقدس، علم و ورع اور حلم و غمگساری کے شاہد عدل کے طور پر پیش کر کے ہمیشہ سرخروئی حاصل کی وہ ان کی اپنے شاگردوں میں بے مثال محبوبیت ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کے شاگردوں میں علمی، سیاسی، فکری اور نظریاتی اختلافات بہت نظر آئے لیکن ہر ایک اپنے شیخ کی ذات گرامی پر متفق ملا، جس کسی سے بھی شیخ مدنی کا ذکر چھیڑ دیجئے۔ اپنی کتاب ماضی کے اوراق الٹ الٹ کر اور مزے لے لے کر شیخ کی محبتوں، چاہتوں، مجاہدوں اور عظمتوں کا بیان کرتا نظر آئے گا۔

اس خوش نصیبی کو بھی تحدیث نعمت کے طور پر بیان کرنے میں سعادت سمجھتا ہوں کہ مجھے شیخ الہند رہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب رہ کے چند شاگردوں کی زیارت ہوئی ہے اور صرف زیارت ہی نہیں بلکہ ان کے ایک شاگرد رشید فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب سے بخاری شریف کا درس لینے کا بھی شرف حاصل ہوا۔۔۔ شیخ الہند رہ سے زیادہ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری کے شاگردوں کی زیارت و ملاقات اور شرف مجالست سے مشرف ہوا، اور پھر شیخ الاسلام کے شاگردوں سے تو براہ راست سب سے زیادہ فیض حاصل کیا۔

حضرت شیخ الہند رہ کے شاگردوں کی عظمت کا حال کیا بیان ہو کہ اس کا ایک نمونہ

خود حضرت شیخ الاسلام رحمہ تھے، حضرت علامہ کشمیری کے شاگردوں میں ہمارے شیخ حضرت مولانا فخرالدین احمد صاحب اور فخرالاماثل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ جیسی شخصیتیں ہیں جن کے علمی مقام کے ادراک سے مجھ جیسا بے بضاعت عاجز و قاصر ہے۔

لیکن شخصی عظمتوں سے قطع نظر اس حقیقت کے اظہار میں کچھ باک نہیں کہ جو محبوبیت حضرت شیخ الاسلام رحمہ کی ان کے شاگردوں میں دیکھی وہ کسی دوسری جگہ نظر نہ آسکی! مثل مشہور ہے کہ تالی کبھی بھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، پھر یہ کیسے سوچا جا سکتا ہے کہ شیخ الاسلام رحمہ کے شاگردوں کی یہ مثالی چاہت و فداکاری خود شیخ کی کسی بے مثل عنایات کے بغیر ہی ہے۔

حضرت شیخ الاسلام رحمہ کے شاگرد اپنے شیخ کی عظمت کے قصیدے سناتے ہوئے کئی ایسی باتیں بتاتے ہیں جو سننے والوں کو بڑی تعجب خیز لگتی ہیں، مثلاً یہی ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ شیخ دور و دراز کے پرمشقت سفر سے تھکے ہارے واپس آتے اور تھوڑی دیر بھی آرام کئے بغیر دارالعلوم آجاتے، گھنٹہ بجتا، طلبہ جمع ہو جاتے اور سبق شروع ہو جاتا ـــــ حیرت کی کچھ یہ بات نہیں ہے کہ شیخ اس طرح انتھک محنت کیونکر کر لیتے تھے اور بسا اوقات ۲۴ گھنٹوں میں صرف ۳-۴ گھنٹے آرام کر کے بقیہ ۲۰-۲۱ گھنٹے مسلسل کام کر لیتے تھے کہ یہ مجاہدہ شیخ کی ذاتی کرامت قرار پائیگا، اور جہاد بالنفس تو اللہ والوں کا کام ہے ہی ـــــ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ وہ طالب علم کس مٹی کے بنے ہوئے تھے جو گرمیوں کے دنوں کی لو اور جھلسا دینے والی دھوپ کے بعد آنے والی راتوں کی ٹھنڈی ہواؤں کو نظر انداز کر کے اور جاڑوں کے گرم گرم لحافوں کو چھوڑ کر آنکھیں ملتے اور نیند کو بھگاتے ہوئے گھنٹے کی آواز سنتے ہی شیخ کے درس میں حاضر ہو جاتے تھے ـــــ شیخ تو اپنے احساس فرض و ذمہ داری سے مجبور ہو کر اپنے آرام

کو سمجھتے تھے لیکن ان کے ان شاگردوں کے دل میں کون سا جذبہ کارفرما تھا کہ وہ اپنے شیخ کی آمد کی اطلاع پاتے ہی کچی نیندوں سے جاگ کر دوڑتے بھاگتے درسگاہ میں پہونچ جاتے تھے، ایسا ہونا بلکہ بار بار ہوتے رہنا کیا اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ شیخ کے شاگردوں کو اپنی میٹھی میٹھی نیند سے بھی زیادہ اپنے شیخ کی زیارت ان کی مصاحبت اور ان کے درس میں شرکت محبوب تھی؟

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت شیخ الاسلام کے دور کو آج کے دور پر اور ان کے شاگردوں کو آج کے شاگردوں پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شاگرد کا اپنے استاذ سے ایک زبردست روحانی رشتہ ہوا کرتا تھا اور ہر طالب علم کا دل اپنے ہر استاذ کی محبت وعظمت سے سرشار ہوا کرتا تھا —— تو انحطاط زمانی اور گردش لیل ونہار کو تسلیم کرنے کے باوجود بھی یہ عقیدہ لاینحل ہی سا رہتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے والے حضرت شیخ الاسلامؒ کے وہ شاگرد ظاہر ہے کہ تنہا ان ہی کے شاگرد نہیں ہوا کرتے تھے. دیگر اساتذہ کی عظمت سے مجال انکار نہیں لیکن وہ شاگرد جس طرح حضرت شیخ الاسلام کو محبوب رکھتے تھے اور ان کی وفات کے بعد ان کی محبت سے جس طرح ان کے سینے لبریز رہے وہ بات دیگر اساتذہ کے لئے کیوں نہ ہوئی؟ اس جگہ پر اپنی اس بات کے ثبوت میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے شاگرد اور عالم اسلام کی ایک عظیم شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو کی شہادت کو پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں، حضرت شیخ الاسلام سے اپنی وابستگی اور دیوبند کے زمانۂ قیام میں اپنی دلچسپی کا حال سناتے ہوئے مولانا رقمطراز ہیں۔

. دیوبند کے قیام میں میرے لئے دلبستگی کا واحد ذریعہ مولانا کی ذات گرامی تھی، میری ذہنی وتعلیمی پرداخت اس انداز سے ہوئی تھی کہ میرے

لئے وہاں کی درسی و مدرسی ماحول میں دلچسپی کا کم سامان تھا لیکن مولانا
کی ایک نگاہ التفات، ایک تبسم، کسی وقت شفقت سے کچھ پوچھ لینا
سارا بوجھ ہلکا کر دیتا اور دل دیر تک اس کا مزہ لیتا رہتا۔[1]

حضرت مولانا نے اپنے سلسلہ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ ان کی اپنی مخصوص ذہنی و تعلیمی پرداخت کی وجہ سے اپنے زمانۂ قیام میں دیوبند کے ماحول سے دلچسپی ہی کم رہی اور ایک حضرت شیخ الاسلام رح ہی کی شخصیت ان کی دل بستگی کا ذریعہ تھی، لیکن جن لوگوں کو دیوبند کے ماحول سے پوری پوری دلچسپی رہی اور وہ دارالعلوم کی چہار دیواری سے مانوس رہے، ان کے اپنے اساتذہ سے گہرے روابط رہے، ان کا معاملہ بھی حضرت شیخ الاسلام رح کی ذات کے سلسلہ میں مولانا سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں رہا۔ اور ان کی محبتوں کا مرکز اور چاہتوں کی انتہا بھی حضرت شیخ الاسلام کی ذات گرامی ہی رہی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام کے شاگرد اپنے دیگر اساتذہ کی عظمت کا حال بیان کرتے ہیں، ان کے علمی مقام پر گفتگو کرتے ہیں، ان کے خلوص وللہیت اور ان کی شفقتوں عنایتوں کے واقعات سناتے ہیں اور ان کی پاکیزہ داستان زندگی چھیڑتے ہیں ــــــ لیکن شیخ الاسلام کے تذکرہ کے وقت ان کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہو جاتی ہے اور جس قلبی انشراح کا پتہ چلتا ہے وہ دیگر اساتذہ کے سلسلے میں نہیں دکھائی دیتا۔

ہمارا متجسس ذہن اس فرق کی وجہ یہ دریافت کرتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام نے اپنی عظمت کا حجاب اپنے خوردوں سے اٹھا لیا تھا ــــــ ان کی کتاب زندگی کے تین نمایاں عنوان ہیں، وہ دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین، رئیس تعلیمات، اور ایسے ممتاز شیخ الحدیث تھے جن کو ۱۸ برسوں تک مسجد نبوی میں بیٹھ کر جوار روضۂ انور

---

[1] پرانے چراغ حصہ اول ص ۱۰۲ مطبوعہ سنہ ۱۹

میں حدیث پاک کا درس دینے اور قال صاحب ھذہ الروضہ کہہ کر روایت حدیث کا شرف بھی حاصل تھا، دوسری طرف وہ ایک ایسے مرشد کامل اور شیخ طریقت تھے جن کو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ جیسے مردان باصفا سے نہ صرف طہارت قلب کی سند حاصل تھی بلکہ ارشاد عام کی اجازت بھی تھی —— ان کی کتاب زندگی کا تیسرا عنوان جو بظاہران دونوں سے جوڑ کھانے والا نہیں معلوم ہوتا یہ تھا کہ تحریک آزادیٔ ہند اور استخلاص وطن کی صف اول کے رہنما تھے اور مسلسل ۵۰ برس تک فرنگی اقتدار کے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار بنے رہے اور بالآخر اس اقتدار کا سر قلم کر کے ہی دم لیا۔

عظمت کی یہ وہ بنیادیں ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ ایک خاص طرزِ زندگی اور ایک جائز رعب و دبدبہ کو چاہتی ہے، لیکن زندگی کا یہی طرز اور شخصیت کا یہی رعب و دبدبہ خوردوں کے لئے ایک حجاب بن جاتا ہے اور یہ حجاب حد فاصل بن کر خوردوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ "زیادہ حد ادب" کے پابند رہیں۔ —— شیخ الاسلامؒ نے یہ چاہا کہ ان کے چھوٹے خصوصاً ان کے شاگرد ان سے اتنے مانوس رہیں کہ وہ اپنے ہر دکھ درد کو بے روک ان سے بیان کر سکیں، اسی لئے شیخ الاسلامؒ نے اپنی عظمت کا حجاب اس طرح اپنے شاگردوں سے اٹھایا کہ وہ "شوخ" ہو گئے، لیکن بلاشبہ شاگردوں کی یہ شوخی وہ تھی جو ایک ٹوٹ کر چاہنے والی ماں سے اس کے ننھے ننھے بچے کیا کرتے ہیں، جس میں عظمت کو پامال کرنے کا کہیں دور دور بھی خیال نہیں ہوتا۔

شاگردوں کی یہ شوخی اور شیخ الاسلام کی ناز برداری کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اپنے والد ماجد مدظلہٗ کا بار بار کا بیان کردہ ایک واقعہ یاد آرہا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ۔

"میرے دورۂ حدیث شریف کے سال کی بات ہے کہ ایک —— دن شیخ الاسلامؒ

کے یہاں سبق ہو رہا تھا دن کے ۱۲ بج چکے تھے اور حضرت کی تقریر جاری تھی، طلبہ گوش بر آواز تھے اور حضرت بھی پورے انہماک کے ساتھ حدیث پر کلام فرما رہے تھے گھڑی کی سوئیاں جوں جوں آگے بڑھ رہی تھیں ہمارے ایک تالقانی ساتھی کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، لیکن ہم میں سے کسی کو اس کا احساس نہ تھا، جب اس حدیث پر کلام ختم کرنے کے بعد حضرت نے تلاوتِ حدیث کرنے والے طالب علم کو آگے بڑھنے کا حکم دیا تو تالقانی ساتھی نے اپنی گرجدار آواز میں شیخ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "سبق بند کرد" شیخ کے ساتھ ساتھ تمام طلبہ کی نگاہیں بھی تالقانی کے چہرے پر جم گئیں، ایک طرف طلبہ کے چہروں سے تالقانی کی اس گستاخی اور حد سے بڑھی ہوئی جرأت پر ناگواری کے آثار نمایاں، دوسری طرف حضرت "شیخ الاسلام" کا چہرہ ہر قسم کی ناگواری و گرانی کے تاثر سے پاک، بلکہ ردعمل یہ کہ شیخ نے مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں تالقانی سے سوال کیا "سبق کیوں بند کردوں؟"۔

تالقانی ناسمجھ نہ تھا وہ اپنے شیخ کی عظمت سے بھی بے خبر نہ تھا، نہ ہی اسکی اس "جرأت رندانہ" کے پس پردہ گستاخی کا کوئی جذبہ کارفرما تھا، بلکہ وہ اپنے شیخ کا مزاج آشنا تھا، اسی لئے اس نے طلبہ کی گھورتی ہوئی نگاہوں کی پروا کئے بغیر شیخ کے استفسار کے جواب میں اسی کڑک کے ساتھ کہا۔ "ہم بھوکا ہے"!

شیخ نے اپنی مسکراہٹ کچھ اور گہری کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں بوڑھا آدمی ہو کر بھوکا بیٹھا پڑھا رہا ہوں، تم جوان ہو کر بھوکے نہیں پڑھ سکتے؟"

طلبہ نادم و شرمسار مگر شیخ کے لحاظ میں تالقانی کو روک بھی نہیں سکتے ۔۔۔۔ لیکن تالقانی کو بھی حالِ دل سنانے کا بہترین موقع ملا تھا، پھر بھلا وہ طلبہ کی برہمی کو خاطر میں لاکر "شیخ کی عنایتوں" سے اپنے کو محروم کیوں کرتا؟۔ تالقانی نے شیخ کے جواب میں کہا۔

"تم صبح اچھا اچھا ناشتہ کر کے گھر سے آتا ہے، ہم صبح سے بھوکا پڑھتا ہے"
تالقانی کا جواب سنکر شیخ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، کتاب بند ہوگئی اور سبق ختم ہونے کا اعلان کر دیا گیا —— پھر شیخ اپنے ساتھ اس تالقانی طالب علم کو "مدنی منزل" لے گئے، اس کو اپنی خصوصی نگرانی میں کھانا کھلوایا اور تاکید کے ساتھ یہ حکم فرمایا کہ کل سے صبح کا ناشتہ تم میرے ہی ساتھ کروگے۔ ——

کہنے کو تو یہ صرف ایک واقعہ ہے جس سے حضرت شیخ الاسلام رح سے اپنے ایک بھوکے شاگرد کو کھانا کھلانے اور اس کے ناشتہ کا انتظام کرنے کا حال معلوم ہوتا ہے، لیکن کیا میرے والد ماجد یا ان کے وہ تمام ساتھی جن کی نظروں کے سامنے یہ واقعہ گذرا اسے صرف ایک واقعہ کی حیثیت دے کر گذرنے کو تیار ہوں گے؟ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شیخ الاسلام کا یہی تو وہ برتاؤ تھا جس نے ان کو لافانی محبوبیت عطا کی۔

مسلم شریف کی ایک روایت ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب حق تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو حضرت جبرئیل امین سے بلا کر فرماتے ہیں کہ میں اپنے اس بندے سے محبت کرتا ہوں تو تم بھی اس سے محبت کرو! تو اس سے حضرت جبرئیل محبت کرنے لگتے ہیں، پھر وہ آسمان میں پکار کرتے ہیں کہ فلاں شخص سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتے ہیں اس لئے تم بھی اس سے محبت کرو! اس پکار کو سنکر آسمان والے یعنی فرشتے اس شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اس شخص کو زمین والوں یعنی انسانوں میں بھی قبولیت عامہ اور محبوبیت عطا ہو جاتی ہے"!

حضرت شیخ الاسلام کی قبولیت و محبوبیت کو دیکھ کر یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں

ہے کہ یہ منجانب اللہ بواسطہ حضرت جبرئیل علیہ السلام واجب کردہ محبوبیت ہے کیونکہ حضرت شیخ الاسلام کی کتاب زندگی میں ان کی اپنے شاگردوں، مریدوں اور خوردوں کے ساتھ بے تکلفی اور خوردوں کی بے حجابیوں اور جرأتوں کے کچھ ایسے واقعات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جن کے ہوتے ہوئے ایک عام آدمی کی عظمت اور مرجعیت کو ختم ہوجانا چاہیئے، لیکن شیخ الاسلام کے تاج عظمت کے لئے وہی واقعات تابندہ نگینے بن گئے، اور اس سے ان کی محبوبیت دوچند ہوگئی. مثلاً کوئی پیر اپنے مرید سے روپے چھین چھین کر مٹھائی منگوائے تو عام حالات میں تصور کیا جاسکتا ہے کہ ایک مرید ہی نہیں بلکہ باخبر ہونے والے دوسرے مریدوں پر بھی اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ اور پیر کی ساکھ کس طرح گرجائے گی؟ لیکن شیخ الاسلام کے دربار میں ہم ایسے پروانہ صفت مریدوں کو دیکھتے ہیں جو اپنی جیب اور بٹوے میں روپے بھر کر لاتے اور سراپا شوق بن کر وہ اس ساعت سعید کا انتظار کرتے جب شیخ الاسلام، ان سے مانگ کر اور ان کو حکم دیکر نہیں بلکہ ان سے چھین کر مٹھائی منگوائیں اور اپنے شیخ کے اس لذت بخش قرب سے بہرہ ور لطف اندوز ہوتے رہیں۔

لیجئے شیخ الاسلام کے حوصلہ بڑھانے، داد جرأت عطا کرنے اور شوخیوں کے جواب میں بارش عنایات کرنے کا کچھ حال ان کے ایک شاگرد مولانا سید انظر شاہ کشمیری کی زبان قلم سے ملاحظہ فرمایئے۔

> "بخاری شریف کا سبق سال کے آخری حصے میں شب میں بھی ہوتا گرمیوں کی مختصر راتیں اور شب کی مسلسل مشغولیت کی بنا پر کچھ طلبہ مصروف خواب ہوتے، قریب کا کوئی طالب علم حضرت والا کو مطلع کرتا تو ایک خاص لہجے میں "رئیس النائمین" کو ارشاد ہوتا کہ "اٹھئے اٹھئے مٹکے میں غوطہ لگا کر آیئے"۔۔۔۔ غریب طالب علم اپنی جگہ سے اٹھتا

تو اس کے عقب سے مزید یہ حملہ ہوتا کہ ہائے کیا بھری محفل میں رسوائی ہوئی: اس پر پوری درسگاہ زعفران زار بن جاتی۔

اتفاقاً ایک روز ایسا ہی حادثہ خود حضرت والا کو بھی پیش آگیا ہوا یوں کہ ایک طویل سفر سے واپسی کے بعد فوراً ہی درسگاہ میں تشریف لے آئے، سفر کی صعوبتوں کی بنا پر نیم جاں ہو رہے تھے، چند ہی لمحات کے بعد اس قرینے و سلیقے سے بیٹھے بیٹھے مصروف خواب ہوئے کہ جسم میں جنبش کا نام ونشان نہ تھا۔ معمول یہ تھا کہ حدیث پر کچھ ارشاد فرمانا ہوتا تو تقریر شروع ہو جاتی اور اگر سابق میں یہ مضمون گذر چکا تو فرماتے "چلئے" اور اس روز حدیث ہوتی رہی اور حضرت کا مسلسل سکوت، طلبہ محسوس کر گئے کہ حضرت مصروف خواب ہیں، قرأت حدیث روک دی گئی تاکہ آپ کے آرام میں خلل نہ آئے، پھر اس سکوت پر حضرت بیدار ہو گئے، طلبہ کا اصرار کہ حضرت والا بھی اٹھ کر وضو فرمائیں، بہت دیر ردوقدح ہوتی رہی، بالآخر کھانے کی دعوت پر اس دلچسپ جنگ کا اختتام ہو گیا[1]۔

استاذ، وہ بھی شیخ مدنی! درس حدیث، وہ بھی مسجد نبوی کے مدرس کا! درسگاہ، وہ بھی دارالعلوم دیوبند کی، لیکن شیخ کی گرانمایہ عنایتوں اور طلبہ کی عطا کیش جرأتوں کی یہ طویل داستان اس غلط فہمی اور بے راہ روی میں مبتلا نہ کرے کہ اصرار اور ردوقدح کر کے دعوت کرانے والے اور مہر و وفا اور خلوص و آگہی کی اس داستان کو "دلچسپ جنگ" سے تعبیر کرنے والے طلبہ عظمت شیخ سے اپنے سینوں کو محروم کر بیٹھے تھے، یا یہ "مجلسی بے تکلفیاں" محبوبیت کے سوا اور کوئی نتیجہ ظاہر کرتی تھیں، چنانچہ خود مولانا انظر شاہ

---

[1] دارالعلوم دیوبند نمبر ماہنامہ الرشید لاہور شمارہ فروری مارچ ۱۹۷۶ء ص ۳۱۶

ہی سے سنیئے کہ اس مشک بیز واقعہ نے ان کے دل ودماغ پر کیا اثر ڈالا - وہ تحریر کرتے ہیں کہ

"۳۰ سال سے زائد اس واقعہ پر گذر رہے ہیں مگران حسین یادوں سے دل ودماغ آج تک لبریز ہیں، سر پر عربی سبز رومال، عبا زیب تن، پاؤں میں خفین، چوڑا چکلا جسم، وجیہہ چہرہ، گھنی داڑھی، پر نور و پر ہیبت آنکھیں، جب مصروف خرام ہوتے تو حقیقتاً امیر المومنین فی الحدیث چلتا پھرتا نظر آتا، اسّی سے متجاوز سن مبارک تھا مگر بینائی اس قدر طاقتور کہ رات کا درس، قسطلانی، مطبوعہ مصر میں ہوتا اور کسی چشمے کے بغیر ؎

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں"[1]

حدیث کی کتابوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عجیب اور جامع دعا ملتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں - اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی اعین الناس کبیرا یعنی اے اللہ مجھے اپنی نگاہوں میں چھوٹا اور دوسروں کی نگاہوں میں بڑا بنا دے -

حضرت شیخ الاسلام ؒ کی زندگی کو سامنے رکھ کر پورے وثوق اور اطمینان کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ دعائے نبوی ان کے حق میں مقبول ہو گئی تھی، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ اپنی نگاہ میں تو اتنے چھوٹے تھے کہ رات کو ۱۲ بجے کے بعد اپنے ایک عام اور غیر اہم دیہاتی مہمان کی نادانستہ فرمائش کو پورا کرتے ہوئے اس کے لئے حقہ تازہ کرتے اور آگ جلا کر اور پھونک کر انگارے بنا کر چلم بھر کے اس کے سامنے پیش کرتے اور جب مہمان اپنی اس نادانستہ فرمائش پر شرمسار ہو کر کہتا کہ حضرت مجھے نیند میں یہ احساس نہ ہو سکا کہ جس سے چلم بھرنے اور حقہ تازہ کرنے کو کہہ رہا ہوں وہ آپ کی ذات گرامی

---

[1] دارالعلوم دیوبند نمبر ماہنامہ الرشید لاہور شمارہ فروری مارچ ۱۹۷۶ء ص ۳۱۶ -

ہے، تو اس کی معذرت کو گاؤ خر کرتے ہوئے فرماتے، بھائی کچھ حرج نہیں ہے، میں نے اپنے والد ماجد کے لئے خوب خوب چلمیں بھری ہیں اس لئے مجھے اس میں کوئی زحمت یا تکلیف نہیں ہوئی[1]

اور یہ بھی اپنی نگاہوں میں اپنے کو کمتر اور چھوٹا سمجھنے ہی کی بات ہے کہ ٹرین پر سفر کرتے ہوئے ایک ضعیف العمر آدمی کو کراہتے ہوئے سنتے ہیں جو اپنا منھ ڈھانکے اور پیر پسارے بنچ پر لیٹے ہیں لیکن اعضا شکنی کی وجہ سے بار بار کراہنے لگتے ہیں، حضرت شیخ الاسلامؒ ان کی یہ حالت دیکھ کر پیر دبانے لگتے ہیں اور جب کافی دیر پیر دبوا چکنے کے بعد وہ منھ کھول کر دیکھتے ہیں تو حضرت کو پہچان کر شرمسار ہو جاتے ہیں مگر حضرت انھیں پھر سے باصرار تمام لٹاتے ہیں اور ان کے پیر دباتے ہیں[2]

اور دوسروں کی نگاہوں میں بڑائی کا یہ عالم کہ ان کے شاگرد، مریدین اور عام معتقدین نہیں، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مرحوم، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب، اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری جیسے افاضل واکابر بھی حضرت شیخ الاسلامؒ پر قلم اٹھاتے ہیں تو یہ کہتے ہوئے کہ ؎

داماں نگہ تنگ ـــــ و گل حسن تو بسیار

ہمیں علم ہے حضرت شیخ الاسلامؒ کی مجاہدانہ زندگی میں ایک دور وہ بھی آیا جب ان کو ہندوؤں کا ایجنٹ اور "شیخ الہنود" ہی نہیں کہا گیا بلکہ "مسئلہ قومیت" کے سلسلہ میں شیخ کے اپنے نظریہ کی بنیاد پر اچھے خاصے معتبر سمجھے جانے والے اور فکر و نظر کے حامل اصحاب کی طرف سے "شیخ الاسلامؒ" کے سچے مسلمان ہی ہونے میں شک کیا جانے لگا تھا، ہم کو یہ بھی تسلیم ہے کہ آج بھی شیخ الاسلامؒ سے نظریاتی اور سیاسی اختلافات رکھنے والے لوگ اپنے دلائل کے ساتھ موجود ہیں۔

---

[1] ماخوذ از الجمعیۃ دہلی شیخ الاسلام نمبر ص ۱۲۰ ۔ [2] حوالہ مذکورہ ص ۱۴۸، ۱۴۷

تاہم رفع الزامات کرنے کے بجائے اگر صرف اس پر غور کریں کہ کیا مخالفتوں کے ان طوفانوں نے شیخ کی محبوبیت میں کچھ کمی کر دی؟

تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ نہیں ہرگز نہیں! بلکہ مخالفت کا سیلاب تھمنے اور طوفان سر سے گذرنے کے بعد کل کا مخالف بلکہ شاتم بھی آج شیخ کا نام عظمت سے لینے اور ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔ اور یہی وہ بنیاد ہے جس کی وجہ سے ہم یہ کہتے ہیں کہ

حق تعالیٰ نے شیخ الاسلام رح کو جب اپنا محبوب بنا لیا تو جبرئیل امین ع کے ذریعہ فرشتوں کو محبوب بنانے کا حکم فرمایا
اور پھر بحکم خداوندی زمین کی مخلوق بھی ان کو محبوب رکھنے پر مجبور ہوئی

نور اللہ مرقدہ
رحمۃ اللہ علیہ
رحمۃ واسعۃ

❊

دارالعلوم دیوبند میں

حضرت شیخ الاسلام کے دورِ طالب علمی پر ایک نظر

تحریر ———— محمد سلمان منصور پوری مدنی منزل دیوبند

گردوپیش زمانہ اپنی رفتار پر چل رہا تھا سورج کا طلوع وغروب بھی معمول کے مطابق تھا۔ موسموں کی نیرنگیاں بھی لوگوں کو گرویدہ بنا رہی تھیں۔ لیکن ایک چیز کی کمی پورے غیر منقسم ہندوستان میں شدت سے محسوس کی جاتی تھی۔ کہ یہاں کے باشندے آزادی جیسی عظیم نعمت سے محروم تھے۔ اور ایک نہایت جابر وسفاک حکومت کے خونخوار چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ بظاہر پورا ملک کاسہ لیسی کی فضا سے مسموم تھا تاریخ ہند کا بدترین دور تھا۔ پورے مادر وطن کی دولت سمٹ کر سات سمندر پار جارہی تھی۔ اور اس ملک کے باشندے مفلس وقلاش ہوتے جارہے تھے۔ سرکاری نصاب تعلیم میں اخلاقی تعلیم کی جگہ فرقہ پرستی تعصب اور تنگ نظری کی اشاعت نے لے لی تھی [1]

پیدائش انہی خیالات کے درمیان ۱۹ ر شوال المکرم سنہ ۱۲۹۶ھ میں ضلع اناؤ کے ایک چھوٹے سے قصبہ بانگرمؤ میں ایک ولی اللہ کے گھر ایک انسان جنم لیتا ہے۔ نسب کا سید اور حسب کا کریم ہے۔ چہرے سے نجابت کے آثار نمایاں ہیں مستقبل کا قائد ہے۔ دین کی بے لوث خدمت گذاری اپنے مقدر میں رکھتا ہے۔ مگر ابھی نہ اسے معلوم ہے نہ دیکھنے والوں کو کہ یہ آگے چل کر عظمت کا مینار بننے والا ہے۔ والد محترم سید

---

[1] تفصیل دیکھیے نقش حیات ص ۱۳۳/۱ تا ص ۳۳۶/۱

حبیب اللہ[1] نے اپنے اس خوش بخت فرزند کا نام حسین احمد تجویز کر کے نسبت حسینی اس کی طرف منتقل کر دی ہے۔

الہداد پور (ٹانڈہ) ابھی طفولیت کی ابتدا تھی کہ بانگر مئو سے وطن مالوف الہداد پور (ٹانڈہ) منتقل ہو گئی چند دن کھیل کود کی آزادی رہی۔ لیکن جب عمر چار سال کی ہوئی تو یہ آزادی ختم کر دی گئی۔ والدین محترمین نے اپنے مثالی لخت جگر کی غیر معمولی تربیت کی ابتدا کی۔ اپنے ہم عصر ساتھیوں سے ملنے جلنے اور ان کے ساتھ کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ اگر کبھی غیر شعوری طور پر حکم عدولی کا ارتکاب ہو جاتا تو تنبیہ الغافلین کے استعمال میں بھی رد رعایت سے کام نہ لیا جاتا۔ بڑے بھائی سید احمد بھی اس نگرانی میں والدین ماجدین کی پوری مدد کرتے۔

ابتدائی تعلیم اور احیاء سنت والد محترم کا معمول تھا کہ جب بچے کی عمر چار سال کی ہوتی تو اس کو پڑھنے بٹھا دیتے چنانچہ

---

[1] سید حبیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ نہایت جفاکش، مدبر اور صاحب کشف بزرگ تھے اعلیٰ درجہ کے عامل تھے حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ سے اجازت منامی حاصل تھی۔ اس بنا پر ٹانڈہ کے دو آدمیوں کو بیعت بھی کیا تھا۔ حضرت گنج مراد آبادیؒ کے سنہ ۱۳۱۳ھ میں انتقال کے بعد آپ کا دل ہندوستان سے اچاٹ ہو گیا اور اپنے پورے خاندان کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کرنے کی تگ و دو میں لگ گئے۔ بعض لوگوں نے اس زمانہ کی راستہ کی پریشانیاں ذکر کر کے روکنا چاہا تو فرمایا: اگر مجھ کو یہ کہا جائے کہ تجھ کو توپ کے منہ پر باندھ کر گولہ چلائیں گے اور تو مدینہ منورہ پہنچ جائے گا تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ بالآخر سنہ ۱۳۱۶ھ میں ہجرت فرمائی۔ مگر خدا کی قدرت کہ مدینہ منورہ میں تدفین کی تمنا پوری نہ ہو سکی۔ اور سنہ ۱۳۲۵ھ میں ابذر یا نویل میں انتقال ہوا اور وہیں دفن کئے گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ (نقش حیات صـ ۳۳ و صـ ۳۴)

یہی مستقبل کے شیخ الاسلام حسین احمدؒ کے ساتھ بھی کیا گیا۔ تعلیم کی ابتدا گھر سے ہوئی۔ والدہ ماجدہؒ[1] نے اپنے پیارے فرزند کو بغدادی قاعدہ شروع کرایا! اور ساتھ ہی والد صاحبؒ کے اسکول میں درجۂ اول میں داخلہ کر دیا گیا ___ اپنی زندگی کے طول وعرض میں احیائے سنت کا کارنامہ انجام دینے والا یہاں بھی غیر اختیاری طور پر احیائے سنت کرتا نظر آتا ہے والد محترم نے ایک بکری پالی تھی۔ اور اس ننھے طالب علم حسین احمد کو یہ ذمہ داری دی تھی کہ ایک میل کی دوری پر واقع اسکول جاتے وقت اور فارغ اوقات میں بکری اور اس کے بچوں کو جنگل لے جاکر چرایا کرو۔

۴۔ ۵ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے بظاہر یہ ذمہ داریاں پہاڑ معلوم ہوتی ہیں۔ یہ پابندیاں قید نظر آتی ہیں۔ یہ داروگیر ظلم دکھائی دیتا ہے۔ مگر یہ باتیں عام انسانوں کے لئے ہوں تو ہوں ___ جو لوگ اس عالم میں آفتاب بن کر چمکتے ہیں۔ ان کی ابتدا انہی نام نہاد مظالم سے ہوا کرتی ہے۔ جن کی قسمت میں خدمت دین کے لئے کانٹوں پر چلنا لکھا ہوتا ہے انھیں شروع ہی سے کانٹوں کے بستر پر لٹا کر تربیت دی جاتی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ سال کا عرصہ گذر گیا۔ جوں جوں عمر بڑھ رہی تھی آپ کے کمالات نکھرتے جا رہے تھے اب آپ اپنی خداداد صلاحیتوں والدین کی سخت نگرانی اور پڑھنے میں محنت کی وجہ سے ۱۲ سال کی مختصر عمر میں بہترین اردو لکھنے پڑھنے لگے تھے۔ حساب دانی اور جغرافیہ فہمی میں اپنے ساتھیوں پر فائق تھے۔ دوسری طرف قرآن پاک

---

[1] والدہ محترمہ ٹانڈہ کے باوقار خانوادۂ سادات سے تعلق رکھتی تھیں نہایت عابدہ زاہدہ خاتون تھیں۔ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت کا تعلق تھا۔ باوجود کثیر الاولاد ہونے کے ہمیشہ شب خیز اور تہجد گذار رہیں۔ آپ کا اخیر تک معمول تھا کہ روزانہ دو سو مرتبہ سورہ اخلاص پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ فرماتی تھیں۔ ۱۳۲۲ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال ہوا اور جنۃ البقیع میں مدفون ہوئیں (نقش حیات ص۲۷)

ناظرہ مکمل کرنے کے بعد فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی شروع کرادی گئی تھیں۔ اب آپ کو خالص علمی ماحول میں نشو ونما کی ضرورت تھی۔ آپ کی پیاس بجھانے کے لیے علوم کے سمندروں کی حاجت تھی والد محترم کی دوررس نگاہوں نے اس ضرورت کو بھانپ کر علم دین سکھانے کی خاطر اس لاڈلے فرزند کو اپنے سے جدا کرنے کا تہیہ کرلیا۔

دارالعلوم میں آمد

چنانچہ صفر ۱۳۰۹ھ میں والد محترم سید حبیب اللہ رح کے خاص رفیق جناب منشی فیروزالدین صاحب کو یہ سعادت بیسر آئی۔ کہ ان کے ساتھ حضرت شیخ الاسلام رح کو برصغیر کے عظیم علمی مرکز دارالعلوم دیوبند بھیجا گیا۔ دارالعلوم کو قائم ہوئے اس وقت صرف ۲۳ سال گذرے تھے۔ اکابر ومشائخ کی ایک بڑی تعداد یہاں موجود تھی۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا تو کہنا ہی کیا! حضرت مولانا عبدالعلی صاحب، مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور بہت سے بزرگوں کا اجتماع تھا۔ ہر شخص اپنی منفرد حیثیت کا حامل تھا۔ گویا علم کے دریا موجزن تھے اور تشنگان علم اپنے اپنے ظرف کے مطابق سیرابی حاصل کررہے تھے۔ دیوبند پہنچ کر حضرت شیخ الہند رح کے مکان پر قیام ہوا۔ عمر کم تھی اس لئے حضرت کے گھر میں آمد ورفت کی سعادت بھی حاصل ہوتی اور خانگی خدمات اور حسابات وخطوط لکھنے کے باعث مستوراتی منشی کے نام سے مشہور ہوگئے[1]

دارالعلوم میں پہلا سال ۱۳۰۹ھ ۱۸۹۲ء

اس سال دارالعلوم میں ۲۷۲ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ حاجی سید عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ مہتمم اور حضرت شیخ الہند رح صدر مدرسی کے فرائض انجام دیتے تھے[2]۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رح نے حضرت شیخ الہند کے حکم سے تبرکاً میزان وگلستاں شروع کرائیں جو آپ نے اپنے برادر اکبر مولانا صدیق احمد صاحب کے پاس پڑھیں[3]۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل

---

[1] نقش حیات ص ۴۴ ج ۱   [2] روداد سالانہ دارالعلوم دیوبند ۱۳۰۹ھ   [3] نقش حیات ص ۴۴ ج ۱

کتب بھی درج ذیل اساتذہ کے پاس پڑھیں۔ اور امتحان میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل کی۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے[۱]

نمبر شمار	اسمار کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعام	کیفیت
۱	دستور المبتدی	شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ	۱۹	۲۰	سراجی	تقریری
۲	صرف میر	مولانا حکیم محمد حسن صاحب	۲۰	۲۰	قطبی	〃
۳	زبدہ	〃	۲۰	۲۰	مصباح	〃
۴	نحو میر	〃	۱۹	۲۰	میر قطبی	〃
۵	پنج گنج	〃	۱۹	۲۰	مراح الارواح	〃
۶	میزان و منشعب	مولانا صدیق احمد صاحبؒ (برادر اکبر)	۲۰	۲۰	ہدایۃ الصرف	〃

(**نوٹ**) اس سال دار العلوم میں حضرت مدنیؒ کے علاوہ آپ کے دونوں برادران (مولانا صدیق احمد صاحب، مولانا سید احمدؒ) اور مشہور مناظر اور اہل حدیث عالم مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ زیر تعلیم تھے۔ مولانا امرتسری ہدایہ جلد ثانی اور بعض دوسری کتب پڑھتے تھے۔

دوسرا سال ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء دار العلوم میں امسال طلبہ کی تعداد ۲۸۸ تھی، حاجی

---

[۱] حضرت شیخ الاسلامؒ کے اسباق و نمبرات وغیرہ کی یہ تمام تفصیلات مولانا افضال الٰہی دامت برکاتہم کی مرتب کردہ مختصر کتاب "شیخ الاسلام بحیثیت طالب علم" اور اس زمانہ کی طبع شدہ دار العلوم دیوبند کی روداد وں سے ماخوذ ہیں۔ البتہ ترتیب میں حضرات اساتذہ کے اعتبار سے تبدیلی کی گئی۔ اور کچھ خانوں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ ۱۳۰۹ھ کے متعلق یہ تفصیل روداد دار العلوم میں احقر کو نہیں ملی۔ غالباً اس سال حضرتؒ دار العلوم میں باقاعدہ داخل نہیں تھے۔ کیونکہ صفر میں تشریف لائے جبکہ داخلہ کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے مولانا افضال الٰہی دامت برکاتہم پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے مرتب کردہ رسالہ سے بعینہ یہ نقل کر دیا گیا۔ "مرتب"

سید عابد حسین صاحبؒ صدر مہتمم اور مولانا فضل حق صاحب مہتمم تھے۔[۱] حضرت شیخ الاسلامؒ اپنی عمر کے چودھویں مرحلہ میں داخل ہوچکے تھے۔ زیادتی عمر کے ساتھ ساتھ ذہانت اور شوق علمی میں بھی قابل رشک اضافہ ہورہا تھا جس کا کچھ اندازہ اس سال پڑھی ہوئی کتابوں میں حاصل کردہ مندرجہ ذیل نمبرات سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

نمبر شمار	اسمار کتب	حضرات اساتذہ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعامی	کیفیت
۱	فصول اکبری	حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ	۲۰	۲۰	حمد اللہ، فیوض الحرمین	تقریری
۲	مراح الارواح	حضرت شیخ الہندؒ	۲۱	۲۰		〃
۳	مفید الطالبین	〃	۲۰	۲۰		〃
۴	زنجانی	〃	۱۹	۲۰		〃
۵	کافیہ	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ	۲۳	۲۰		〃
۶	ہدایۃ النحو	〃	۲۱	۲۰		〃
۷	ایساغوجی	حضرت مولانا صدیق احمد صاحب	۱۸	۲۰		〃
۸	صغری		۲۰	۲۰		〃
۹	کبری		۱۹	۲۰		〃

تیسرا سال ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۴ء

اس سال مادر علمی میں تشنگان علوم نبوی کی تعداد بڑھ کر ۲۹۸ ہوگئی تھی۔ شوری نے مولانا فضل حقؒ کی جگہ مولانا محمد منیر صاحبؒ کو اہتمام کے منصب پر فائز کیا تھا۔[۲] نظام تعلیم۔ اصول تربیت میں نمایاں ترقی ہوئی تھی۔ غرضیکہ اس مرکز علمی میں علوم نبوت کی شمعیں آب وتاب کی ساتھ روشن تھیں۔ اس منور ماحول میں حضرت مدنیؒ ترقی کی شاہراہ

---

[۱] روداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۱۰ھ [۲] روئیداد سالانہ دارالعلوم دیوبند بابت ۱۳۱۱ھ

پر رواں دواں تھے۔ اس سال بھی سالانہ امتحان میں اعلیٰ کامیابی نے بڑھ کر آپ کے قدم چومے ملاحظہ فرمائیے! آپ کی محنتوں کا پھل ...

نمبر شمار	اسمار کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعامی	کیفیت
۱	شرح تہذیب	حضرت شیخ الہندؒ	۲۱	۲۰	قاضی مبارک[1] : [illegible]	تقریری
۲	تہذیب	″	۲۲	۲۰		″
۳	نفحۃ الیمن	″	۱۹	۲۰		″
۴	مرقات	″	۱۹	۲۰		″
۵	اصول الشاشی	مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ	۱۹	۲۰		″
۶	منیۃ المصلی	″	۲۱	۲۰		″
۷	شرح جامی بحث فعل	″	۲۰	۲۰		″
۸	شرح جامی بحث اسم	مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ	۱۸	۲۰		تحریری[1]
۹	قدوری		۲۰	۲۰		تقریری
۱۰	میزان منطق		۲۰	۲۰		

چوتھا سال سنہ ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۵ء حضرت مدنی کی عمر اس وقت سولہ[16] برس کی تھی۔ اب تک پڑھی ہوئی کتابوں کا امتحان تقریری ہوتا تھا۔ جس میں آپ ہمیشہ فائق رہتے تھے۔ مگر اس بار پہلی مرتبہ اکثر کتابوں میں تحریری سوالات حل کرنے کی نوبت آئی تھی۔ دارالعلوم کے تحریری امتحان کے مشکل ہونے کا رعب دماغ پر طاری تھا۔ اس لئے سال رواں کے امتحان میں آپ کی بعض کتابوں کے نمبرات حدِ امتیاز سے گر گئے[2] مگر یہ وقتی تخلف آپ کے بلند پایہ عزائم

---

[1] اس سال صرف اسی کتاب کا امتحان تحریری ہوا۔ دیکھئے روداد دارالعلوم بابتہ سنہ ۱۳۱۱ھ ص۲۷۔ [2] حضرت نے نقش حیات ص۱۶۲ میں اس بات کو بایں الفاظ ذکر فرمایا ہے۔ " جب تک ابتدائی کتابیں ہوئی (بقیہ ص پر)

میں جمود پیدا کرنے کے بجائے تلاطم خیزی کا سبب بن گیا۔ نتیجہ حسب ذیل ہے!

نمبر شمار	اسمار کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعامی	کیفیت
۱	قطبی تصورات	حضرت شیخ الہند	۱۸	۲۰	نمبر زائد از اصل ہیں۔ بغیر	تحریری
۲	قطبی تصدیقات	″	۱۶ ۲/۳	۲۰		″
۳	تلخیص المفتاح	حضرت مولانا خلیل احمدؒ شارح ابی داؤد	۱۸	۲۰		تقریری
۴	خلاصۃ الحساب	حضرت مولانا منفعت علی صاحبؒ	۱۷ ۲/۳	۲۰		تحریری
۵	کنز الدقائق	مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ	۱۹	۲۰		تقریری
۶	اقلیدس		۱۶ ۲/۳			تحریری

نوٹ) امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ اس سال دار العلوم میں بخاری شریف، ترمذی شریف، ہدایہ اخیرین وغیرہ کتابیں پڑھتے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب صدر مدرس مدرسہ عبد الرب دہلی۔ اور موجودہ مہتمم دار العلوم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب زید مجدہم کے والد ماجد مولانا مشیت اللہ صاحب بھی حضرت شاہ صاحب کے ساتھ اکثر کتب میں شریک تھے[۱] شوال ۱۳۱۲ھ میں مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لے آئے[۲] اس سال دار العلوم کی باوقار مجلس شوریٰ مولانا محمد منیر صاحب

(بقیہ صـــ کا) جن کا امتحان تقریری ہوتا تھا امتحانوں میں عمدہ اور اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوتا رہا۔ مگر جب تحریری کتابیں آئیں (درجۂ وسطیٰ اور اوپر کے درجہ کی وہ کتابیں جن میں تحریری امتحان ہوتا تھا ان میں پہلے سال کی چھ کتابوں میں سے تین میں فیل ہو گیا" الخ۔ [۱] روئیداد سالانہ دار العلوم ۱۳۱۲ھ ص ۷۶ وغیرہ۔ [۲] بیس بڑے مسلمان ص ۵۱۱ از عبد الرشید ارشد۔

کی جگہ حضرت مولانا حافظ احمد صاحب خلف الصدق حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو اہتمام کی گراں قدر زمہ داری سونپی[1] اور موصوف ۱۳۴۱ھ تک ان زمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

پانچواں سال ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۶ء

پچھلے سال امتحان میں نمبرات کا اوسط گھٹ جانے کی وجہ سے اس سال ابتدا ہی سے آپنے کتابوں میں محنت تیز کردی تھی انتہائی دل جمعی کے ساتھ تکرار ومطالعہ میں وقت گذاری کرتے رہے۔ تاآنکہ امتحان سالانہ کا وقت آگیا۔ اب آپ نے اپنے راحت وآرام کو تج کر کے امتحان کی تیاری شروع کردی۔ آپنے اس سال سے یہ طریقہ اختیار کیا کہ امتحان کی رات میں ممتحنہ کتاب شروع سے اخیر تک مطالعہ فرماتے۔ اور اگر نیند کا غلبہ ہوتا تو نمکین چائے کا انتظام کرتے جس کی وجہ سے نیند پر قابو ہو جاتا اس طریقہ کو اختیار کرنے سے آپ کو تحریری امتحان کی مشکلات پر غلبہ حاصل ہوگیا[2] اور سال گذشتہ کے مقابلہ میں اس سال تحریری امتحان میں اعلی نمبرات آپ کے مقدر میں آئے۔ جن کی ایک جھلک یہ ہے!

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعامی	کیفیت
۱	شرح عقائد نسفی	حضرت شیخ الہندؒ	۱۹	۲۰	-	تحریری
۲	ہدایہ اولین	مولانا حکیم محمد حسن صاحب	۱۸ ۲/۳	۲۰	مسلم کامل	〃
۳	مختصر المعانی	〃	۱۸ ۲/۳	۲۰		〃
۴	ملا حسن	〃	۱۹ ۱/۳	۲۰		〃
۵	سلم العلوم	〃	۱۹	۲۰		〃
۶	شرح وقایہ	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب	۱۹	۲۰		〃
۷	نور الانوار	مولانا غلام رسول صاحب بغوی	۱۹	۲۰		〃

[1] روداد دار العلوم ۱۳۱۲ھ [2] نقش حیات ص۴۶ د ص۴۷

۸	حسامی	مولانا غلام رسول صاحب بغوی	۱۸	۲۰		تحریری
۹	رشیدیہ	مولانا محمد منفعت علی صاحبؒ	۱۴	۲۰		〃
۱۰	میبذی	〃	۱۳	۲۰		〃
۱۱	ہدایۃ الحکمۃ	〃	۱۲	۲۰		〃

(**نوٹ**) اس سال ۲۲ ربیع الاول کو حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ ایک سو پانچ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے[۱]۔ دارالعلوم میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ مسلم شریف، ابوداؤد شریف اور صدرا وغیرہ پڑھتے تھے۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ بھی بعض کتابوں میں حضرت شاہ صاحب کے ہم سبق تھے[۲]۔

چھٹا سال سنہ ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۷ء اس سال حضرت مدنیؒ نے دارالعلوم کے فاضل اساتذہ اور قابل فخر ہم سبقوں کے جھرمٹ میں فن حدیث کی ابتدائی منزل میں قدم رکھا۔ جوں جوں وقت گذر رہا تھا۔ آپ کی طبیعت سلیمہ تمام علوم سے ہٹ کر حدیث اور صاحب حدیث (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی طرف راغب ہو رہی تھی۔ استاذ کل حضرت شیخ الہندؒ کی عنایتیں بھی روز افزوں تھیں اس بار بھی آپ نے اپنے روایتی امتیاز کو برقرار رکھا۔ دیکھئے۔

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعام	کیفیت
۱	مطول	حضرت شیخ الہندؒ	۵۰	۵۰	[illegible] ملا جامی	تحریری
۲	میرزاہد رسالہ	مولانا محمد منفعت علی صاحبؒ	۵۱	۵۰		〃
۳	میرزاہد ملا جلال	〃	۲۸ ۲/۳	۵۰		〃
۴	مشکوٰۃ شریف	مولانا غلام رسول بغوی صاحب	۵۰	۵۰		〃
۵	شمائل ترمذی شریف	〃	۵۰	۵۰		〃

[۱] نقش حیات ص ۳۲ و تذکرہ فضل رحمٰنؒ (مولانا علی میاں زید مجدہم) ص ۹۴ [۲] روداد دارالعلوم بابت سنہ ۱۳۱۳ھ ص ۳، ص ۵

۶	دیوان متنبی	مولانا حبیب الرحمن عثمانی صاحب	۴۹½	۵۰		تحریری
۷	مقامات حریری	"	۴۲	۵۰	..	"

(نوٹ) اس سال حضرت مدنیؒ کے ساتھیوں میں آپ کے برادر اکبر مولانا سید احمد صاحبؒ اور مفتی کفایت اللہ صاحبؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی کتابیں آپ سے کچھ اعلیٰ تھیں[۱]۔ میاں سید اصغر حسین صاحبؒ اس سال نور الانوار، سلم العلوم وغیرہ پڑھتے تھے[۲]۔ اس سال امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے آخری مرتبہ گنگوہ میں دورۂ حدیث شریف پڑھایا[۳]۔ اس آخری جماعت میں مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ (والد ماجد حضرت شیخ سہارنپوریؒ) شریک تھے۔ بعض تعلیمی ضرورتوں کی وجہ سے سال رواں میں امتحان میں اعلیٰ نمبرات بیس سے بڑھا کر پچاس کر دیئے گئے[۴]۔

ساتواں سال ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء

اس سال شروع ہی سے حضرت شیخ الاسلامؒ کے دل و دماغ فرحت و شادمانی، مسرت و انبساط سے معمور تھے۔ یہ غیر معمولی بشاشت محسن انسانیت، فخر دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی احادیث مبارکہ سے حد درجہ اشتغال کی بدولت تھی۔ دورۂ حدیث شریف کا یہ مبارک سال دیکھتے ہی دیکھتے گذر گیا۔ تا آں کہ امتحان کا پر رونق زمانہ آ گیا۔ جبکہ دار العلوم کی فضائیں رات دن بحث و تکرار کی دلنواز آوازوں سے معمور رہتی ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے شاندار امتیاز کو برقرار رکھنے کے لئے جی جان سے محنت کی۔ بالآخر آپ کی محنتوں کا ثمرہ اس صورت میں ظاہر ہوا . . . .

---

[۱] روداد دار العلوم ۱۳۱۴ھ [۲] حوالۂ مذکورہ ص۸ [۳] بیس بڑے مسلمان ص۱۶۹

[۴] روداد دار العلوم و نقش حیات ص

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعام	کیفیت
۱	بخاری شریف	حضرت شیخ الہندؒ	۴۹	۵۰	نام معلوم نہیں	تحریری
۲	ترمذی شریف	″	۵۰	۵۰		″
۳	ابوداؤد شریف	″	۵۰	۵۰		″
۴	نسائی شریف	مولانا عبدالعلی صاحبؒ	۴۸ ۲/۳	۵۰		″
۵	موطا امام مالک	حضرت شیخ الہندؒ	۴۹ ۲/۳	۵۰		″
۶	موطا امام محمد	″	۵۰	۵۰		″
۷	حمد اللہ	مولانا عبدالعلی صاحبؒ	۴۶ ۲/۳	۵۰		″
۸	جلالین شریف	مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ	۴۰	۵۰		″
۹	قاضی مبارک	مولانا غلام رسول بغوی صاحبؒ	۴۰	۵۰		″

(**نوٹ**) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا دارالعلوم میں یہ آخری سال تھا[۱]
حضرت مولانا میاں سید اصغر حسینؒ حسامی، مقامات وغیرہ پڑھتے تھے[۲] اسی سال
حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ دوبارہ حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں دیوبند حاضر ہوئے[۳]
اور حضرتؒ نے انھیں اپنی تحریک سے وابستہ کرلیا۔ اسی سال حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
کانپور چھوڑ کر مستقل طور پر تھانہ بھون میں اقامت گزیں ہوگئے[۴] رمضان المبارک میں
حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کاندھلہ میں پیدا ہوئے[۵] اور اسیر مالٹہ
مولانا وحید احمد مدنی (برادرزادہ حضرت مدنیؒ) کی پیدائش بھی اسی سال ہوئی[۶]

---

[۱] رو ئیداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۱۵ھ صفحہ ۸۴ و بیس بڑے مسلمان صفحہ ۴۱۹ فراغت کے وقت آپ کی عمر ۲۲ سال تھی۔
[۲] روداد دارالعلوم ۱۳۱۵ھ صفحہ ۸۹ [۳] دیکھئے "مولانا سندھی کی سرگذشت کابل" از مولانا عبداللہ الغازی صفحہ ۱۰
[۴] بیس بڑے مسلمان صفحہ ۳۱۳ [۵] آپ بیتی صفحہ ۲۴ ج ۲ [۶] حیات شیخ الہند صفحہ ۲۷

آخری سال ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۹ء اس سال حضرت مدنیؒ اپنی عمر کی بیسویں منزل میں تھے۔ صحاح ستہ سے فراغت ہو چکی تھی فنون اصول فقہ وغیرہ کی ادق کتابیں زیر درس تھیں۔ اب آپ کے ذہن میں صلابت۔ فکر میں شستگی اور تکلم میں شائستگی آگئی تھی۔ دار العلوم اپنے مستفیدین کو معرفت حق، انابت الی اللہ اور عشق نبوی کا جو متبرک جذبہ عطا کرتا ہے۔ اس کے مبارک آثار آپ کی ذات سے عیاں ہونے لگے تھے علم میں رسوخ اور زیر درس کتابوں پر عبور کا یہ حال تھا کہ مدرسہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ نمبر ۵۰ ہونے کے باوجود آپ صدرا جیسی مشکل کتاب میں ۷۳ نمبروں کے حقدار سمجھے گئے۔ ملاحظہ کیجئے اس سال کے امتحان کا نتیجہ!

نمبر شمار	اسمار کتب	حضرات اساتذہ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعام	کیفیت
۱	بیضاوی شریف	حضرت شیخ الہندؒ	۵۰	۵۰	نسائی شریف نظام العوامل	تحریری
۲	حاشیہ خیالی	״	۴۷	۵۰		״
۳	ہدایہ آخرین	״	۴۵	۵۰		״
۴	صدرا	مولانا عبد العلی صاحب	۷۳	۵۰		״
۵	سبعہ معلقہ	״	۵۲	۵۰		״
۶	ابن ماجہ شریف	״	۵۰	۵۰		״
۷	تصریح	״	۵۱	۵۰		״
۸	مسلم شریف	״	۴۹	۵۰		״
۹	توضیح تلویح	״	۴۵	۵۰		״
۱۰	شمس بازغہ	״	۴۵	۵۰		״
۱۱	سراجی	مولانا منفعت علی صاحبؒ	۴۰	۵۰		״
۱۲	نخبۃ الفکر	حضرت شیخ الہندؒ	۴۵	۵۰		״

درس نظامی کی اکثر کتب سے اب آپ فارغ ہو گئے تھے۔ قیام دار العلوم کے اس ساڑھے سات سالہ عرصہ میں ۱۷ فنون کی تقریباً ستر کتابیں۔ گیارہ اساتذہ عظام سے آپ نے پڑھیں۔ کچھ کتابیں اور پڑھنے کی تمنا تھی۔ مگر والد محترم سید حبیب اللہؒ نے شعبان ۱۶ھ میں مدینہ منورہ ہجرت کا اعلان فرمایا۔ آپ نے کمال ادب کے ساتھ مشفق والد صاحب سے مادر علمی میں رہ کر مزید علمی پیاس بجھانے کی درخواست کی۔ مگر والد صاحب اپنے مبارک موقف پر قائم رہے۔ بالآخر اسی سال شعبان میں آپ والد صاحب اور خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ تشریف لے گئے[1] اس طرح دار العلوم میں باقاعدہ طالب علمی کا یہ دور ختم ہو گیا۔

دار العلوم میں دوبارہ اسباق میں شرکت

مدینہ منورہ پہنچ کر آپ تعلیم و تعلم میں مشغول رہے۔ بیچ میں ہندوستان آنا بھی ہوا مگر خواہش کے باوجود دار العلوم میں زیادہ قیام نہ ہو سکا۔[2] بالآخر ۱۳۲۶ھ میں قدرتاً ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ آپ کو ہندوستان تشریف آوری اور دار العلوم میں حضرت شیخ الہندؒ کے اسباق میں شرکت کا موقعہ مل گیا۔[3] آپ نے ذیقعدہ ۲۶ھ سے شعبان ۲۷ھ تک شیخ الہندؒ کے درس بخاری و ترمذی شریفین میں بالالتزام اور جد و جہد کے ساتھ شرکت کی۔[4] یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سال شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین مراد آبادیؒ اور علامہ ابراہیم بلیاویؒ بھی بخاری و ترمذی کی جماعت میں شریک تھے۔[5] حسن اتفاق کہ اس زمانہ میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ بھی دار العلوم میں مقیم تھے۔

---

[1] تفصیل دیکھیے۔ نقش حیات ص [2] نقش حیات ص ۱/۴۳ یہ سفر آپ کا مصائب سے بھرپور تھا۔ اسی سفر میں حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے آپ کو دستار خلافت مرحمت فرمائی۔ [3] نقش حیات ص ۱/۱۱۹ و ۱۲۰۔
[4] نقش حیات ص ۱/۱۲۲ [5] روداد دار العلوم ص ۱۶۳ و ص ۱۶۴ بابتہ ۱۳۲۶ھ

اور شیخ الہندؒ سے استفادہ کرتے تھے۔ حضرت مدنیؒ کی تشریف آوری کے بعد درس شیخ الہند کا کیا رنگ انھوں نے دیکھا۔ انہی کی زبانی سنئے!

"ان ہی دنوں میں جب شیخ الہند جیسے شیخ وقت سے پڑھنے کا موقعہ میسر آیا تھا حضرت شیخ مدنیؒ اچانک مدینہ منورہ سے دیوبند تشریف فرما ہوئے۔ اور تشریف لاکر مسجد نبوی کے حلقۂ حدیث کا شیخ درس طالب علم بن کر طلبۂ بخاری کی جماعت میں شریک ہوگیا۔ شیخ الہند استاذ تھے اور شیخ مدینہ شاگرد۔ درس کے جس حلقہ کا یہ رنگ قائم ہوگیا ہو وہاں غریب طلبہ کا وجود اگر عدم بن کر نہ رہ گیا ہو تو اس کے سوا اور ہوتا کیا؟ قاری بخاری کے اب شیخ مدنی تھے۔ اور سارے طلبہ سامع بن گئے۔ اب کیا بتاؤں کہ اس عجیب وغریب درس میں کیا دیکھا کیا سنا؟ جنھوں نے نہیں دیکھا؛ در نہیں سنا سوچ ہی کر ان کو اندازہ کرنا چاہیے کہ ایک کہنہ مشق فاضل جلیل طالب علم بن کر اپنے حد سے زیادہ شفیق استاذ گرامی سے کیا پوچھتا تھا اور کیا جواب پاتا تھا۔ سوال وجواب کی خاص منزل تک پہنچنے کے بعد یہ واقعہ ہے کہ طلبہ کی اکثریت بازو ڈال کر بیٹھ جاتی تھی۔ ایک ایک مسئلہ پر شیخ ہند اور شیخ مدینہ کے درمیان دیر تک گفتگو ہوتی رہتی میدان کے دو کھلاڑیوں کے داؤ پیچ کا یہ تماشہ بڑا دلچسپ تماشہ تھا"[1]

شعبان ۲۷ھ تک آپ دارالعلوم میں بحیثیت طالب علم ہی مقیم رہے۔ پھر شوال ۲۸ھ

---

[1] یہ اقتباس مولانا مناظر احسن گیلانی کے مضمون "احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن" ماخوذ ہے۔ جو رسالہ دارالعلوم میں کافی عرصہ تک سلسلہ وار چھپتا رہا۔ پھر تذکرہ دیوبند نے اسے شائع کیا۔ "تذکرہ" دیوبند اپریل ۱۹۶۶ء ص ۱۰

میں مجلس شوریٰ نے آپ کو مدرس مقرر کیا اور علیا درجات کی کتابیں آپ سے متعلق کیں۔ اسی سال دستار بندی کا عظیم الشان جلسہ بھی ہوا جس میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے بعد حضرت مدنی کی دستار بندی کی گئی۔ آپ کو تین دستار عطا کی گئی تھیں[1]۔ ایک سبز دستار دار العلوم کی طرف سے۔ دوسری حکیم مسعود صاحب (صاحبزادہ حضرت گنگوہی) کی طرف سے اور تیسری حکیم احمد صاحب رام پوری کی طرف سے۔

خاتمہ یہ ہے اس ذات والا صفات کے دور طالب علمی کی ایک جھلک جس نے آگے چل کر تصوف کے مشکل ترین مقامات کو پاپیادہ طے کیا۔ گنبد خضرا کے سائے میں بیٹھ کر سالہا سال علوم نبوت کے دریا بہاتا رہا۔ مہینوں اس کے ذکر جہری سے مدینہ منورہ کے جنگلات اور ویران مقامات گونجتے رہے۔ جو سیاست ملی اور دینی خدمات کے سنگلاخ میدانوں میں بلا خوف وخطر کود کر ہمیشہ باطل کے خلاف سینہ سپر رہا۔ جو علمی تبحر اور روحانی صلاحیت میں ہزاروں نہیں لاکھوں پر بھاری رہا۔ دنیا اس کے قدموں میں ذلیل ہو کر آئی مگر اس نے اس کی طرف نظر اٹھانی بھی گوارہ نہ کی۔ دنیوی اعزازات اس کے گھر غلام بن کر آئے۔ مگر اس فنافی اللہ نے دور ہی سے انھیں دھتکار دیا۔ جس نے اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر بھاگلپور اور سید پور میں اپنی ہی قوم کے ناعاقبت اندیشوں سے گالیاں اور پتھر کھائے۔ امرتسر کے اسٹیشن پر خاموشی سے جنونیوں کے ہاتھوں اپنے متبرک عمامہ جلاتے اور روندتے دیکھتا رہا۔ لوگوں نے اس کی عزت کو پامال کرنا چاہا مگر وہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ جب تک اس کی جان میں جان رہی، بدن میں حرارت رہی۔ وہ بندۂ خدا ایک لمحہ کے لیے بھی ملی خدمات سے غافل نہ رہا۔ ہزار ہا ہزار بندگان خدا نے جس کے دست حق پرست پر بیعت کر کے اپنی عاقبت سنوارنے کی سعادت حاصل کی۔ دار العلوم کے بام ودر جس کی صدارت تدریس اور ریاست حدیث پر سالہا سال نازاں رہے۔ جمعیۃ علماء ہند

---

[1] نقش حیات ص۱۲۵ ج۲۔ حکیم صاحب اس وقت دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔

جس کی عظیم قیادت پر فخر کرتی رہی۔ بقول شورش کاشمیری ...

ہیچ تھا اس کے لئے اندیشہ دار و رسن ۔ پائے استحقار سے دنیا کو ٹھکراتا رہا
خواجۂ کونین کے روضہ کی جالی تھام کر ۔ نور کے تڑکے دعا کو ہاتھ پھیلاتا رہا
ان کمالات و محاسن میں جواب اس کا نہیں ۔ اس قبیلہ میں کوئی بھی ہم رکاب اس کا نہیں

بالآخر وہ وقت بھی آیا جب یہ عظمت کا مینار اور آفتاب رشد و ہدایت ۱۳ ر جمادی الاول ۷۷ھ کو دیوبند میں غروب ہو گیا۔ ملت اسلامیہ ہند کا ناخدا اپنے خدا سے جا ملا۔ اور زندگی بھر کانٹوں پر بسر کرنے والا ایک عاشق ایزدی ابدی سکون کے لئے اپنے مولیٰ کے دامن رحمت میں روپوش ہو گیا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

ہزارہا ہزار افراد نے روتے ہوئے اپنے اس عظیم رہنما کو ابدی آرام گاہ پہنچانے کی سعادت حاصل کی۔ دارالعلوم نے اپنے اس عظیم اور مثالی فرزند کو اشک آلود نگاہوں سے رخصت کیا۔ دارالحدیث ایک عظیم محدث سے محروم ہو گئی۔ جمعیۃ علماء کو ایک زبردست قائد سے جدائی کا غم برداشت کرنا پڑا۔ شاعر انقلاب علامہ انور صابری تعزیتی جلسوں میں ع

بنا رد ح حسین احمد یہ دیوانے کہاں جائیں

پڑھ کر غم و اندوہ کے ماحول میں ارتعاش پیدا کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے منور کرے۔ اور ہم نالائقوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین
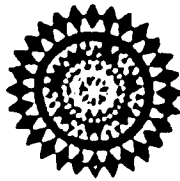
شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رو کی ہمہ گیر شخصیت کا ایک روشن پہلو سیاسی جدوجہد اور قومی و ملی خدمات ہیں، اس سیاسی جدوجہد کا آغاز کب اور کہاں سے ہوا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو گھر کے ماحول سے لے کر طالب علمانہ زندگی کے شب وروز کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے، لیکن دونوں کا الگ الگ جائزہ زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔

مولانا کے والد جناب سید حبیب اللہ صاحب کی ولادت ۱۸۵۷ء کے معرکۂ جہاد سے چند سال پہلے ہوئی تھی، اس لئے ان کو ۵۷ء کے واقعات وحالات سننے کا موقع ان لوگوں سے ملا جو براہ راست اس معرکہ سے متاثر ہوئے تھے یا ان لوگوں سے سننے کا موقع ملا جو اس کے معتبر راوی تھے، چونکہ معرکہ کے وقت سید صاحب کی عمر اتنی ہو چکی تھی جس میں جنگ وجدال کے واقعات سننے اور سنانے سے دلچسپی پیدا ہو جاتی

ہے، اس لئے بلا تأمل کہا جا سکتا ہے کہ اس معرکۂ خونیں میں انگریزوں نے ہندوستانیوں پر جو مظالم کئے تھے ان سے ضرور متأثر ہوئے ہوں گے اور کم سنی ہی میں انگریزی حکومت سے نفرت و بیزاری پیدا ہوئی ہو گی اور مستقبل کے حالات نے سید صاحب کے تأثر اور نفرت کی تصدیق کر دی۔

اس انگریز دشمنی کی ایک وجہ خود سید صاحب کے گاؤں اور خاندان کا براہ راست ۵۷ء کی زد میں آجانا بھی ہے، سید صاحب کے گاؤں الہٰ داد پور کو راجہ بھیٹی نے لوٹ مار کر اجاڑ دیا تھا، اور اس گاؤں کے باشندے اور سید صاحب کا خاندان نان شبینہ کا محتاج ہو گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ سید صاحب کی تعلیم مڈل اسکول سے آگے نہ بڑھ سکی اور ٹریننگ کر کے ملازمت پر مجبور ہو گئے۔

سید صاحب سلیم الطبع اور نیک آدمی تھے، اسی سلامتیٔ طبع نے ان کو حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے آستانۂ رشد و ہدایت تک پہونچایا، اور حضرت گنج مرادآبادی کے دامن فیض سے وابستہ ہو کر سلوک کی منزلیں طے کیں، آپ کو شیخ سے والہانہ عقیدت و محبت تھی اور شیخ بھی اپنے اس مسترشد پر خصوصی توجہ فرماتے تھے، چنانچہ سید صاحب اپنے شیخ کی وفات کا صدمۂ جانکاہ برداشت نہ کر سکے اور مزار پر آتے ہی بے ہوش ہو گئے، غالباً شیخ سے اس درجہ تعلق اور تقوی و طہارت کی بنا پر انگریزی سرکار کی ملازمت کے باوجود اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم سے باز رکھا حالانکہ مڈل تک کی تعلیم آپ کے بچوں نے مڈل اسکول ہی میں حاصل کی تھی اور صوبہ میں اول آئے تھے۔

بچوں کو اس منزل تک پہونچانے کے بعد یکایک ان کو عربی مدرسہ میں داخل کر دینا غیر معمولی بات تھی، لیکن جس بندۂ مؤمن کی انگریز دشمنی پر (جو عہد طفولیت میں پیدا ہو چکی تھی) مذہب کا پانی چڑھایا جا چکا ہو وہ کب اپنے جگر گوشوں کو طاغوتی نظام

کے حوالہ کرسکتا تھا۔ ان کے لئے شیخ الہند کی شفقت و محبت اور دارالعلوم دیوبند کی گود ہی راس آسکتی تھی، اور وہ راس آئی۔

یہ تھا وہ گھریلو ماحول جس میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی پرورش ہوئی اس میں ایک طرف زہد و تقویٰ کی پاکیزگی ہے تو دوسری طرف انگریزوں کے مظالم کی لرزہ خیز داستان، جس کے نتیجہ میں اس نونہال پر دونوں اثرات مرتب ہوئے، یہی وجہ ہے کہ مولانا کو اپنی اسکولی زندگی میں تاریخ و جغرافیہ سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی چنانچہ مولانا میدانِ سیاست میں آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو مجھ کو تاریخ اور جغرافیہ سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی اور ہندوستان کی پرانی تاریخی عظمتوں اور جغرافیائی قدرتی ہمہ گیر برکتوں نے نہایت گہرا اثر کیا اور پھر اہل ہند کی موجودہ بیکسیوں کا اثر روز افزوں ہوتا رہا، طالب علمی کے زمانہ میں اس احساس میں ترقی ہوتی رہی"۔ (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر)

یعنی گھریلو ماحول جو مزاج بنا رہا تھا اس کے نقوش دیرپا اور مؤثر ہو چکے تھے، ضرورت تھی کہ ان نقوش کو علم و دانش کے قلم سے سنوار کر مفید عام بنا دیا جائے چنانچہ یہی ہوا اور مولانا نے تاریخ و جغرافیہ کی روشنی میں ان واقعات کو محسوس کر لیا جن کا وہ خود مشاہدہ کر رہے تھے، پھر حضرت شیخ الہندؒ کی خصوصی تربیت و صحبت نے اس مزاج میں پختگی اور وسعت پیدا کر دی، آگے چل کر اسی کی روشنی میں مولانا نے اپنا سیاسی سفر طے کیا اور جب انھیں ہندوستان سے باہر جانے کا موقعہ ملا تو دیگر ممالک کی قوموں کے حالات و نظریات بھی سامنے آئے اور ان کی سیاسی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنا اور سمجھنے کی نوبت بھی آئی، مولانا اس بیرونی سفر میں کافی متاثر ہوئے اور حریت کی جو چنگاری اب تک دبی ہوئی تھی وہ بھڑک اٹھی چنانچہ مولانا نے مشرق وسطیٰ کی سیاحت کا ذکر

کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"مجھ کو آزاد ممالک عرب، مصر و شام کی سیاحت اور قیام کی نوبت آئی آزاد ملکوں کے باشندوں سے میل جول اور ان کے اوطان کی حالتوں سے آگاہی حاصل ہوئی۔ اس نے مجھ کو اپنے وطن کی محبت میں اور زیادتی پیدا کر دی اور اس احساس کو نہایت قوی کر دیا کہ آزادی کس قدر ضروری چیز ہے اور بغیر آزادی کے کسی ملک کے باشندے کس قدر بے بس اور اپنے وطن کی قدرتی فیاضیوں سے محروم ہوتے ہیں۔" (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر)

اسی سیاحت میں مولانا نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہندوستان کی آزادی میں ہر ممکن جد و جہد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ فرماتے ہیں۔

"ان امور کے مشاہدہ کی بنا پر مجھ میں وہ قومی جذبات پیدا ہونے ضروری تھے کہ جن کے ہوتے ہوئے میں ہندوستان کی محبت اور اس کی آزادی میں بیش از بیش سعی اور جد و جہد کرتا رہوں۔"

لیکن زمانۂ طالب علمی ختم ہونے کے بعد مولانا تادیر میدان سیاست میں قدم نہیں رکھ سکے اور قومی و ملی جذبات بھڑک کر ایک مدت تک کے لئے خاموش ہو گئے، اس لئے نہیں کہ مولانا کسی مناسب وقت کے انتظار میں تھے یا جادۂ حریت کی صعوبتوں نے ہمت کو مضمحل کر دیا تھا، بلکہ وہ اپنے والد محترم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور تھے، شیخ کے انتقال نے سید حبیب اللہ صاحب کو بالکل یخ بستہ کر دیا تھا زندگی کی ساری امنگیں سرد پڑ گئی تھیں۔ "ہجر یار" کی سوزش دن بہ دن بڑھتی ہی رہی، چین و سکون چھن گیا، بالآخر غلام ملک سے ہجرت کرنے کا عزم مصمم کر لیا اور عمر بھر کی بیقراری کو دربار رسالت کے آستانۂ قدس پر حاضر ہو کر دور کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں، اور اپنے پورے خاندان کو ترک وطن کے لئے آمادہ کر لیا، لیکن بہ نیت ہجرت ترک وطن پر اہل

وعیال کو مجبور نہیں کیا، شیخ الاسلام اپنی کتاب "نقش حیات" میں لکھتے ہیں کہ

"ہم لوگوں نے ہجرت کی نیت نہیں کی تھی کیونکہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ العزیز اور قطب العالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ العزیز نے ہجرت کی نیت کرنے سے منع فرمایا تھا اور یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہجرت کرنے والوں پر امتحانات شدید ہوتے ہیں جس میں اکثر لوگ پھسل جاتے ہیں، اور ہجرت توڑ کر وطن واپس چلے جاتے ہیں اور گنہ گار ہوتے ہیں صرف قیام کی نیت کرنا اگر احوال سازگار ہوئے تو قیام کرنا، ورنہ جب جی چاہے واپس ہوجانا۔"

اس عزم وارادہ کے ساتھ ۱۳۱۶ھ کے آخر میں ایک قافلہ حجاز مقدس کیلئے روانہ ہوا اور ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ کے آخری ہفتہ میں مکہ مکرمہ زادہا اللہ شرفا میں وارد ہوا، چونکہ زمانۂ حج قریب تر تھا اسلئے مناسک حج کی ادائیگی میں مصروف ہوگئے، حج سے فراغت کے بعد یہ قافلۂ نورانی سرچشمۂ نور سے منور ہونے کے لئے مدینہ منورہ روانہ ہوا اور منزل مقصود تک پہونچ گیا، یہاں قیام میں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، معاشی تنگی نے کیا دن دکھائے، مستقل ذریعہ آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے پورا خاندان کس زبوں حالی کا شکار رہا اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے یہاں تو اس سوال کا جواب دینا تھا کہ زمانۂ طالب علمی میں حضرت شیخ الہند نے اپنے سوز دروں کی آنچ سے شیخ الاسلام کے جذبۂ حریت کو جس طرح مشتعل کردیا تھا وہ سرد کیوں پڑ گیا وہ وجہ واضح الفاظ میں سامنے آگئی کہ سفر حجاز نے اس شعلۂ احساس کو جو زمانۂ طالب علمی سے سلگ رہا تھا دہکنے نہیں دیا۔

قیام مدینہ کے دوران مولانا علمی کمالات اور روحانی منازل طے کرنے میں مصروف ہوگئے، اسی سلسلہ میں ہندوستان کی آمد ورفت بھی جاری رہی اور حضرت گنگوہی نیز حضرت شیخ الہند اپنے روحانی وعلمی فیض سے مستفیض فرماتے رہے، خود مولانا نے قیام مدینہ

کے دوران اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

وہاں فقط علمی جدوجہد میں مشغول تھا

وہ علمی جدوجہد تعلیم و تعلم سے لے کر درس و تدریس تک جاری رہی، نو عمری کے باوجود مسجد نبوی میں آپ کا حلقۂ درس وسیع ہوتا گیا، اس دور کے علماء و مشائخ بھی مولانا کے تدریسی کمالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، لیکن اس تاثر کے جو نتائج منظر عام پر آئے وہ علمائے مدینہ تو کیا ہر سلیم الفطرت اور خدا ترس بندہ کے لئے افسوسناک ہیں، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مولانا کو درس و تدریس کی سہولت بہم پہونچائی جاتی، لیکن اسکے علی الرغم درس و تدریس کے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں، علمائے مدینہ حسد ورقابت کی آگ میں جل رہے تھے، بالآخر مولانا تنگ آکر مدرسہ سے مستعفی ہوگئے اور حسبۃً للہ مسجد نبوی میں درس جاری رکھا، اس حلقۂ درس میں اہل مدینہ کے علاوہ مصر، ترکستان، قازان کابل، بخارا، اور قزدین کے طلبہ بھی زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے، اس درس و تدریس کا سلسلہ تقریباً ۱۳ سال تک جاری رہا اس زمانہ میں مولانا کی علمی جدوجہد کا حال یہ تھا کہ شبانہ روز میں چودہ اسباق پڑھاتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

"حضرت گنگوہی قدس سرہٗ العزیز کی بارگاہ میں ان اسباق کی فہرست اور مشاغل کی تفصیل لکھی اور یہ عرض کیا کہ جو تعلیم طریقت کے شغل کی عالیجاہ نے فرمائی ہے جب اس کیلئے بیٹھتا ہوں تو نیند غالب آجاتی ہے، نیز خطرات و وساوس سخت پریشان کرتے ہیں، ادھر طلبہ کا اصرار بہت زیادہ ہے، مجبور ہو کر میں نے دن رات کا اکثر حصہ اسی میں صرف کر رکھا ہے، جواب میں حضرت گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "پڑھاؤ خوب پڑھاؤ" اس سے ہمت اور زیادہ بڑھ گئی، روزانہ چودہ سبق پڑھاتا تھا پانچ صبح کو تین یا چار ظہر کے بعد، دو عصر کے بعد، دو مغرب کے بعد، ایک

عشار کے بعد: (نقش حیات جلد اول)

اس تدریسی مصروفیت اور علمی جدوجہد نے سیاسیات کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کا موقعہ نہ دیا، نہ ہی استاذ گرامی مرتبت حضرت شیخ الہند نے اس مشغولیت سے دوسری طرف رُخ موڑنا مناسب سمجھا، حالانکہ مدینہ منورہ سے جب بھی مولانا ہندوستان تشریف لائے قیام حضرت شیخ الہند؟ کے دولت کدۂ علم وفضل پر رہا پھر بھی حضرت شیخ الہند نے جو تقریباً پچاس سال سے نہایت رازدارانہ طریقہ پر اسلامی انقلاب لانے کی جدوجہد اور خاکہ مرتب کرنے میں مصروف تھے، اپنے اس عزیز ترین شاگرد کو اس تحریک سے آگاہ نہیں فرمایا، معدودے چند افراد ہی اس تحریک سے واقف تھے، شیخ الاسلام اس رازداری کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ۔

"مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت شیخ الہند لوگوں سے بیعت جہاد لیتے ہیں، یہ تو خطرناک امر ہے انگریزوں کو اگر خبر ہوگئی تو دارالعلوم کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے..... چونکہ مجھے اس کی خبر نہیں تھی اس لئے میں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور عرض کیا کہ حضرت شیخ الہند سے دریافت کروں گا۔ واقعہ یہی تھا کہ باوجودیکہ حضرت مجھ پر بہت زیادہ کرم فرماتے تھے مگر اس وقت تک کسی کارروائی کی خبر نہیں کی گئی۔"

(نقش حیات ج ۲ ص ۲۰۳)

یہ ۱۳۳۱ھ کی بات ہے جب شیخ الاسلام، حضرت شیخ الہند کی خدمت اقدس میں مسلسل تین سال تک حاضر باش رہے لیکن اس راز کا انکشاف نہ ہوسکا ۱۹۱۵ء میں شیخ الاسلام اس راز سے واقف ہوسکے۔ جب حضرت شیخ الہند نے مدینہ منورہ میں قیام کے دوران مولانا کو اپنی تحریک سے آگاہ فرمایا۔

حضرت شیخ الہند؟ کا یہ سفر حجاز ان ہنگامی حالات میں ہوا تھا جب جنگ عظیم

کی افتاد ہندوستان کے مسلم قائدین پر پڑنے لگی تھی، مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں کو گرفتار کر کے جیل بھیجا جا چکا تھا، اندیشہ تھا کہ حضرت شیخ الہند اپنے رفقار کار کے ہمراہ گرفتار نہ کر لیے جائیں، اس سفر کے اسباب بیان کرتے ہوئے مولانا سید محمد میاں صاحب نے لکھا ہے کہ۔

"ہندوستان میں گرفتاریاں شروع ہو گئی تھیں، حضرت شیخ الہند بہت پریشان ہو گئے تھے کہ کہیں بیٹھے بٹھائے گرفتار نہ ہو جائیں، اور اس طرح ضروری جد وجہد کے اوقات تعطل میں بسر نہ ہوں لہذا وہ باہر نکل جانا چاہتے تھے، انھوں نے اپنے دوسرے مشیروں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی مشورہ کیا، مولانا آزاد کی رائے قطعی طور پر یہ تھی کہ باہر نہ جانا چاہئے اور یہیں بیٹھ کر کام کرنا چاہئے اگر اس اثنار میں گرفتاری ہو جائے تو اسے قبول کئے بغیر چارہ نہ ہوگا، وہ جانتے تھے کہ باہر جا کر کوئی کام نہ ہو سکتا تھا اور باہر رہ کر معطل بیٹھنے سے اندر رہ کر معطل ہو جانا بہر حال بہتر تھا، حضرت شیخ الہند نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے حجاز پہنچیں، وہاں سے ذمہ دار ترک وزیروں اور ماموروں سے ربط وضبط پیدا کر کے ایران وافغانستان کے راستہ یاغستان جائیں چنانچہ چند رفقار کے ساتھ حجاز چلے گئے۔ (تحریک شیخ الہند ص ۱۱۰)

حضرت شیخ الہند نے حجاز پہونچ کر اپنے منصوبہ کے مطابق انور پاشا (وزیر حربیہ ترکیہ) اور جمال پاشا گورنر شام سے ملاقاتیں کیں، یہ ملاقاتیں انتہائی رازدارانہ اور تخلیہ میں ہوئیں اور حضرت شیخ الہند نے تفصیل کے ساتھ تحریک کی کامیابی کے موضوع پر گفتگو کی اور غالب پاشا سے خصوصی ملاقات کر کے "غالب نامہ" حاصل کیا اور دیگر ضروری کاغذات کے ساتھ اس کو لکڑی کے ایک مخصوص صندوق میں رکھ کر ہندوستان اپنے رفقار کار

کے پاس ارسال کر دیا، اور خود حجاز ہی میں ٹھہر گئے۔

حضرت شیخ الہند کا ارادہ تھا کہ مدینہ منورہ میں چند دن قیام کے بعد استنبول روانہ ہوں گے، اس وقت تک حضرت شیخ الہند کی تحریک سے شیخ الاسلام ناواقف ہی رہے چنانچہ مولانا اپنی اس ناواقفیت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

میں اس وقت نہ مشن آزادئ ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہند نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا میں اس وقت تک فقط علمی جدوجہد میں مشغول تھا، اگرچہ مدینہ منورہ میں اس سے پہلے جبکہ محاذ سویز کے لئے متطوعین (والنٹیروں) کو بھیجنا شروع کیا گیا تھا ترغیب جہاد پر تقریر کرنے کی نوبت آئی تھی اور اس سے متاثر ہو کر کچھ لوگ اُس محاذ پر جہاد کے لئے مدینہ منورہ سے گئے تھے مگر اس کے علاوہ عملی جدوجہد کی نوبت نہیں آئی تھی، اب حضرت شیخ الہندؒ کے واقعات اور خیالات سنکر میں بھی متاثر ہوا اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی، یہ وقت میری سیاست کی ابتدا اور بسم اللہ کا وقت ہے اور یہی وقت مولانا خلیل احمد صاحب کی ابتدائی شرکت کا ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ آمین۔ (نقش حیات ج ۲ ص ۲۱۶)

علمی جدوجہد کی جولان گاہ سے یکایک میدان سیاست میں جست لگانا بڑے عزم وحوصلہ کی بات تھی ورنہ عموماً علمی شاہراہوں کے راہ گیر جادۂ سیاست سے کترا کر اپنے دائرۂ کار میں مصروف عمل رہتے ہیں، لیکن شیخ الاسلام کے لئے میدان سیاست کوئی اجنبی میدان نہ تھا نہ ہی اس راستہ کی مشکلات سے وہ ناواقف تھے، انھیں تاریخ

وجغرافیہ کی ورق گردانی سے سیاست کے پیچ وراسبت معلوم ہو چکے تھے اور پھر
گھریلو ماحول اور خانماں بربادی نے کیا کچھ کم سبق دیا تھا اس لئے عملی سیاست میں شمولیت
جذباتی اور وقتی فیصلہ نہ تھا بلکہ ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل دیدۂ ودانستہ کی جارہی تھی،
حضرت شیخ الہند نے صرف رہنمائی کا فریضہ انجام دیا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیام مدینہ کے دوران ترکی حکومت کے منصب داروں
سے ملاقات کرانے کا اہم کام حضرت شیخ الاسلام کے ذریعہ ہی انجام پذیر ہوا ورنہ
حضرت شیخ الہندؒ کو ناقابل تصور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا، اور ہو سکتا تھا کہ وہ
اپنے منصوبہ کی تکمیل نہ کر پاتے، یہیں سے حضرت شیخ الاسلام کی عملی سرگرمیوں کی ابتداء
ہوتی ہے اور حضرت شیخ الہند کی تحریک میں گرم خون بن کر دوڑنے لگتے ہیں، چنانچہ انور
پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات کے بعد حضرت شیخ الہند نے طائف میں غالب پاشا سے
ملاقات کر کے تفصیلی پروگرام طے کرنے کا خیال ظاہر کیا تو مولانا نے حسب سابق خندہ
پیشانی کے ساتھ معیت کی سعادت حاصل کی اور دونوں حضرات طائف پہنچے، قریب تھا
کہ تفصیلی گفتگو کے ذریعہ جہاد حریت میں کامیابی کی تدبیروں پر غور کر لیا جاتا مگر منزل
مقصود تک پہنچنے سے پہلے کمند ٹوٹ گئی اور آرزوؤں کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

صورت حال یہ ہوئی کہ طائف پہنچنے کے بعد غالب پاشا سے حضرت شیخ الہندؒ
کی ایک مختصر ملاقات ہوئی، اور تفصیلی ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا، لیکن اس تاریخ کے
آنے سے پہلے انگریزوں نے شریف حسین کے ذریعہ عربوں سے ترکوں کے خلاف
بغاوت کرادی اور طائف کا محاصرہ کر لیا گیا، تقریباً ڈیڑھ مہینہ محصور رہنے کے بعد حضرت
شیخ الہندؒ اور حضرت شیخ الاسلام کو طائف سے نکلنے کی سہولت میسر آسکی اور یہ حضرات
دس شوال ۱۳۳۴ھ کو مکہ معظمہ پہنچ گئے، لیکن اب مکہ مکرمہ کے حالات بدل چکے تھے، حجاز
پر شریف حسین کا قبضہ ہو چکا تھا، اور غالب پاشا گرفتار ہو کر پس دیوار زنداں مستقبل

کے فیصلہ کا انتظار کر رہے تھے، ان حالات میں حضرت شیخ الہندؒ جلد از جلد شریف حسین کے حدود حکومت سے نکل کر "یاغستان" پہنچنے کی تدبیریں سوچ رہے تھے، محاصرۂ طائف سے پہلے بھی واپسی کی صورتوں پر غور ہوا تھا لیکن کوئی محفوظ راستہ ہندوستان یا یاغستان پہنچنے کا سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ادھر حضرت شیخ الہندؒ کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی اور اس اندیشہ کا بار بار اظہار فرماتے تھے کہ شریف حسین کو انگریزوں نے اپنا آلۂ کار بنا لیا ہے اور انگریزی سرکار ہم لوگوں سے بدظن ہے اس لئے شریف حسین کے ذریعہ ہماری گرفتاری کسی بھی وقت ہو سکتی ہے، لیکن واپسی کا مسئلہ آسان نہ تھا حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ چند فداکار رفقاء بھی تھے جو حضرت شیخ الہندؒ کو تنہا چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہیں تھے، یوں بھی حضرت شیخ الہند کی تنہا واپسی مشکل تھی کیونکہ آپ کے ساتھ کتابوں کا ایک ذخیرہ بھی تھا اسکے علاوہ دیگر ضروری سامان بھی تھے جن کے حمل و نقل کے لئے بقول شیخ الاسلام چند سواریاں درکار تھیں پھر بھی حضرت شیخ الہندؒ کے شدید تقاضہ پر خفیہ روانگی کیلئے یہ انتظام بھی کر دیا گیا۔

لیکن روانگی سے پہلے وہ خطرہ پیش آ ہی گیا جس کا اندیشہ حضرت شیخ الہند بار بار ظاہر کر رہے تھے، جدہ سے شریف حسین کا تار پہنچ گیا کہ مولانا محمود الحسن اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر کے بھیجدو (نقش حیات ج ۲ ص ۲۲۲) یہ مرحلہ حضرت شیخ الہندؒ کے جاں سپاروں کے لئے انتہائی کربناک تھا، بہر صورت حضرت شیخ الہندؒ کو قید و بند اور دیگر صعوبتوں سے بچانا چاہتے تھے اس نقطۂ نگاہ سے رفقاء نے آپ کو روپوش ہونے پر مجبور کر دیا، دیگر رفقاء بالخصوص حضرت شیخ الاسلام سے پولیس نے پوچھ تاچھ کی اور جیل خانے بھیجدیا، اس خبر سے شیخ الہند مضطرب ہو گئے اور خود گرفتاری کے لئے روپوشی ختم کرنا چاہتے تھے لیکن ابھی رفقاء کو روپوشی ختم کرنے میں تذبذب تھا، کہ اسی اثناء میں کرنل ولسن نے اپنے ایک حکمنامہ کے ذریعہ شریف حسین کو گرفتاری کی

سخت تاکید کی، اس نے اپنے انگریز آقاؤں کی خوشنودی کے لئے حکم جاری کر دیا کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اگر شیخ الہند گرفتار نہ ہوئے تو ان کے دونوں ساتھیوں مولانا عزیر گل اور مولانا عبدالوحید کو گولیوں سے اڑا دیا جائے۔

حضرت شیخ الہند جو حضرت شیخ الاسلام کی گرفتاری سے دلگیر و مضطرب تھے وہ اپنے رفقاء کو گولیوں کا نشانہ کیسے بننے دیتے اطلاع ملتے ہی خود کو پولیس کے حوالہ کر دیا شیخ الہندؒ اور آپ کے جانباز رفقاء گرفتار کر کے جدہ بھیج دیئے گئے، شیخ الاسلام کو جیل میں اس گرفتاری کا علم ہوا تو طرح طرح کے خیالات اور اندیشوں نے انتہائی بے چین کر دیا، مولانا کی دلی تمنا یہ تھی کہ انجام کار کچھ بھی ہو۔ شیخ الہند کی معیت و رفاقت کا شرف حاصل رہے اور خدمت کے مواقع بھی ملتے رہیں، اس جذبہ کے تحت شریف حسین کو ایک مخلص دوست کے ذریعہ باور کرا دیا کہ شیخ الاسلام کو رہا کرنا یا شیخ الہند سے علیحدہ رکھنا خطرناک بات ہوگی اس لئے مولانا حسین احمد صاحب کو بھی شیخ الہندؒ کے قافلہ میں شامل کر دیا جائے۔ شریف حسین کی نظر میں یہ مشورہ انگریزوں کی خوشنودی کے لئے وقیع معلوم ہوا، اس نے ایک حکمنامہ کے ذریعہ بہ عجلت شیخ الاسلام کو جیل سے نکالکر جدہ حضرت شیخ الہند کے پاس پہنچا دیا۔

شیخ الاسلام کے اس عملی اقدام کی توجیہ کرتے ہوئے مولانا کے سوانح نگاروں نے ایک ہی بات الفاظ کے معمولی ردو بدل کے ساتھ لکھی ہے کہ مولانا کو اپنے استاذ و مربی حضرت شیخ الہند سے والہانہ عقیدت و محبت تھی ان کی پیرانہ سالی، ضعف و نقاہت اور بیماری کی وجہ مولانا یہ محسوس کر رہے تھے کہ الاستاذ کو ایک فداکار خادم کی ضرورت ہے ورنہ سفر اور قید میں بیحد تکلیف ہوگی، یہ سوچ کر مولانا مدنی رحمۃ اللہ نے اپنی گرفتاری کی تدبیر اختیار کی اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔

لیکن اس عدیم المثال قربانی کی یہ توجیہ عقل و شہادت کی دنیا میں بودی اور مضحکہ خیز

معلوم ہوتی ہے، پہلی بات تو یہی کہ فدا کار رفقار کی موجودگی میں یہ کیسے سوچا جا سکتا ہے کہ ایک عظیم المرتبت استاذ کو تکلیف اٹھانی پڑے گی، یا ایک بزرگ اور معمر شخص کا اجنبی ساتھی ہی خیال نہ رکھیں گے، اس گئے گذرے دور میں بھی عموماً ضعیفوں اور کمزوروں کا سہارا اجنبی مسافر بن جاتے ہیں اور ان کی راحت رسانی کا خیال رکھتے ہیں، پھر یہ بات بھی تو قرین قیاس نہیں ہے کہ شیخ الاسلام، حضرت شیخ الہند کے رفقار سے مطمئن نہیں رہے ہوں گے، ہندوستان سے حجاز تک کا طویل سفر جن رفقار کی معیت میں حضرت شیخ الہند نے طے کیا تھا تقریباً وہی پاک طینت، نیک نہاد حضرات قید فرنگ میں بھی ہم سفر تھے البتہ خانوادۂ شیخ الاسلام کے ایک فرد مولانا وحید احمد صاحب مرحوم کا اضافہ ہوا تھا، جن کی ذہانت اور وفا شعاری پر خود شیخ الاسلام کو مکمل اعتماد تھا، پھر یہ بات کیونکر تسلیم کرلی جائے کہ صرف جذبۂ خدمت کے باعث حضرت شیخ الاسلام نے آگ کے سمندر میں چھلانگ لگادی، بلاشبہ اس عدیم المثال کارنامے کا پس منظر تحریک شیخ الہند کی اہمیت اور شوق شہادت ہے، اسی نقطۂ نظر سے انھوں نے اپنے ایک ہمدرد دوست کے ذریعہ شریف حسین کو بدگمان کیا تھا، سفرنامۂ مالٹا کی متعدد عبارتوں سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت شیخ الہند نے قیام مدینہ کے دوران حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے سامنے تحریک کے جو مقاصد بیان کئے تھے وہ تمام تر اس اسلامی تحریک سے ہم آہنگ تھی جس کا ابتدائی خاکہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے تیار کیا تھا اور اس خاکہ میں رنگ بھرنے کی کوشش آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے کی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اس تحریک کے پہلے علمبردار شاہ عبدالعزیز صاحب ہی ہیں، آپ ہی کے فتویٰ جہاد نے انگریزی حکومت کے پائے چوبیں ہلا کر رکھ دیئے پھر آپ ہی کے تربیت یافتہ بزرگ حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید مجاہدین

کے جم غفیر کے ساتھ میدان جہاد میں سر بکف اتر آئے اور خالق کائنات کی بارگاہ میں سرخرو حاضر ہوئے رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ ۔

ان شہدائے بالاکوٹ کے معرکوں کے بعد تحریک جہاد کی سرگرمیاں ختم ہوگئیں اور بظاہر اس کے نشاۃ ثانیہ کی کوئی امید نہیں تھی لیکن جلد ہی حالات نے کروٹ بدلی اور فلسفۂ ولی اللہی کے نئے روشناس مجاہدین میدان عمل میں اتر آئے اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی قیادت میں ایک بار پھر شاملی میں معرکۂ کارزار گرم ہوا اور شکست کے باوجود انگریزوں کی نیند حرام ہوگئی ، کیونکہ معرکۂ بالاکوٹ میں ہزیمت خوردگی نے مجاہدین کی صفوں کو درہم برہم تو کردیا تھا لیکن ان کے جذبات جہاد افسردہ نہیں ہوئے تھے ، انھوں نے متعدد جتھے بنا کر لڑائیوں کا ایسا سلسلہ شروع کردیا تھا کہ انگریزوں کے دانت کھٹے ہوگئے اور بے شمار انگریز فوجی مارے گئے ، اس کی ایک جھلک ڈاکٹر ولیم ولسن ہنٹر کے الفاظ میں دیکھی جاسکتی ہے ۔

> میں ان بے غیرتیوں ، حملوں اور قتل و غارت گری کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا جو ۱۸۵۷ء میں سرحدی جنگ کا باعث ہوئے ، اس دوران مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا ، ایک ہی بات سے حالات کا بڑی حد تک اندازہ ہوجائے گا ، یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ سولہ جنگی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۲۵ ہزار ہوگئی تھی ، اور ۱۸۵۶ء و ۱۸۶۰ء تک ان فوجی مہموں کی گنتی بیس تک پہنچ گئی تھی ، اور باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک ہوگئی تھی ، بے قاعدہ فوج اور پولس اس کے علاوہ تھی ۔

(ہمارے ہندوستانی مسلمان از ہنٹر ص ۳۰ ، بحوالہ تحریک ص ۵۷)

اس کا نتیجہ بھی اسی ڈاکٹر ہنٹر کے الفاظ میں یہ ہوا کہ

"بہر حال جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا تو اس کے چپہ چپہ پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں۔" (حوالہ سابق)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بھی یہی خطرہ انگریزوں کو لاحق تھا، لیکن ان بزرگوں نے اس تحریک کا رخ موڑ کر از سر نو نیا میدان عمل اپنایا اور ایسے قائدین کی تربیت میں مصروف ہو گئے جو اس تحریک کو حکمت عملی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہونچا سکیں، نظر انتخاب مستقبل کے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی پر پڑی اور حضرت نانوتوی نے اپنے سوز دروں کی آنچ سے ان کے دل دردمند کو شعلۂ احساس بنا دیا پھر جب وہ دہکا تو شیخ الہند کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے، جو تحریک شیخ الہند کے آئینہ دار ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"میں اصل فطرت کے لحاظ سے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں جیسا کہ میری طویل زندگی اس کی شاہد ہے۔ میرا مطمح نظر ہمیشہ مذہب رہا ہے اور یہی وہ مطمح نظر ہے جس نے مجھے ہندوستان سے مالٹا اور پھر مالٹا سے ہندوستان پہنچایا۔ بس میں ایک لمحہ کے لئے کسی ایسی تحریک سے اپنے کو علیحدہ نہیں پاتا جس کا تعلق تمام جماعت اسلام کی فوز و فلاح سے ہو یا دشمنان اسلام کے حربوں کے جواب میں حفاظت خود اختیاری کے طور پر استعمال کی گئی ہو۔"

(نقش حیات ج ۲ ص ۲۵۴)

یہ تھا وہ عظیم مقصد جس کو حاصل کرنے کے لئے شیخ الاسلام نے مضطرب ہو کر قید و بند کی صعوبتوں کو لبیک کہا اور حضرت شیخ الہند سے جدہ میں جا ملے، یہ حضرات مکہ مکرمہ میں ۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء کو گرفتار ہوئے اور اسی دن جدہ پہنچا دیئے گئے، ۱۲؍ جنوری ۱۹۱۷ء کو مصری آگبوٹ کے ذریعہ مصر کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ اس قافلہ میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ

حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیر گل، مولانا وحید احمد فیض آبادی اور حکیم نصرت حسین فتحپوری تھے۔

۱۷ر جنوری کو یہ جہاز نہر سویز میں لنگر انداز ہوا اور ان حضرات کو مسلح سپاہیوں کی نگرانی میں جہاز سے اتار کر قاہرہ بھیج دیا گیا قاہرہ ریلوے اسٹیشن پر انگریز سپاہیوں کا ایک مسلح دستہ اس قافلہ کی نگرانی کے لئے پہلے سے موجود تھا ظہر اور عصر کی نمازیں ان حضرات نے اسی ریلوے اسٹیشن پر سنگینوں کے سائے میں ادا کیں۔ ان فرشتہ صفت انسانوں پر الزام تھا کہ یہ لوگ ترکی، ایران اور افغانستان میں اتحاد کرانا چاہتے ہیں اور ایک اجتماعی حملہ کر کے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، اور ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا چاہتے ہیں۔ (سفرنامہ شیخ الہند ص ۴۹ بحوالہ ماثر)

شام کو یہ قافلہ بذریعہ بس قاہرہ سے جیزہ پہنچایا گیا، اور "المعقل الاسود" نامی جیل میں قید کر دیا گیا، صبح ہوئی تو بیانات کا سلسلہ شروع ہوا، سب سے پہلے سالار قافلہ حضرت شیخ الہند کو دو مسلح انگریز فوجی شہرے گئے جہاں فوجی دفتر واقع تھا یہاں تین اچھی اردو جاننے والے انگریز بیان اور تفتیش کے لئے موجود تھے، تینوں نے یکے بعد دیگرے تحریک کے مقاصد اور منصوبہ کے تعلق سے سوالات کئے اور حسب ضرورت ان واقعات کے حوالے بھی پیش کئے جو سی آئی ڈی کی رپورٹ میں مندرج تھے، لیکن فوجی عدالت گواہ نہ ہونے کی وجہ سے مجبور نظر آ رہی تھی، ورنہ سی آئی ڈی کے اندراجات کے مطابق یہ تختۂ دار کے مستحق تھے، اس آئینی کمزوری کے باوجود حضرت شیخ الہند کو جیل کے اس خیمہ میں واپس نہیں کیا گیا جس میں آپ کے رفقاء محبوس تھے بلکہ جیل خانہ کی اس کوٹھری میں بند کر کے باہر سے مقفل کر دیا گیا جس میں پھانسی کے سزا یافتہ وقتی طور پر مقید کئے جاتے ہیں۔

اسی طرح دوسرے دن شیخ الاسلام کو دو مسلح فوجی اپنے دفتر لے گئے اور ان سے بیان لیا گیا، مولانا کا بیان دو دن تک جاری رہا، اس میں دنیائے اسلام کے واقعات، قوموں

کے عروج وزوال کے اسباب اور دیگر تاریخی وجغرافیائی معلومات فراہم کی گئیں، انگریز افسروں نے سوالات بھی کئے لیکن واضح طریقہ پر کوئی ایسا مواد فراہم نہ کرسکے جو تختۂ دار کا مجرم ثابت کرسکے چنانچہ مولانا کے بیان سے فوجی عدالت کو سخت جھنجھلاہٹ ہوئی اور وہ فوجی افسر بول پڑے کہ۔

ہمارے سامنے جو کاغذات ہیں ان میں تم لوگوں پر جو فرد جرم لگائی گئی ہے اس کی سزا سوائے تختۂ دار کے اور کچھ نہیں ہے مگر تم لوگ اقرار نہیں کرتے۔ (سفرنامہ شیخ الہند ص ۵۵)

دوسرے دن بیان مکمل ہوجانے کے بعد شیخ الاسلام کو بھی جیل خانہ کی ایک دوسری کوٹھری میں بند کرکے مقفل کردیا گیا، اسی طرح دیگر رفقاء قافلہ کو بھی بیان لینے کے بعد الگ الگ کوٹھریوں میں بند کردیا گیا لیکن لطیفہ یہ پیش آیا کہ جیل میں کوٹھریاں صرف چار تھیں اور قافلہ پانچ افراد پر مشتمل تھا اس لئے حکیم نصرت حسین صاحب کو حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ مجبوراً رکھا گیا۔

صورت حال یہ تھی کہ یہ حضرات تو اپنی کوٹھریوں سے نکل نہیں سکتے تھے، جیل کے دوسرے قیدیوں پر بھی سخت پابندی تھی وہ ان اعلیٰ درجہ کے مجرموں سے نہیں مل سکتے تھے خلاف ورزی کی صورت میں سخت سزا کے مستحق ہوں گے، اس اعلان کے بعد کس قیدی کی مجال تھی جو ان سے ملتا، ادھر قافلہ کا ہر فرد ایک دوسرے کے حالات سے بالکل بے خبر تھا، کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کس کے ساتھ کیا سلوک کیا جارہا ہے آثار وقرائن سے یہ یقین ضرور ہوچلا تھا کہ ہم لوگوں کو پھانسی کی سزا دی جائے گی، لیکن ان مردانِ حریت کے پیشانئ شفاف پر ہراسانی وغم کی سلوٹیں نمودار نہیں ہوئیں، صرف حضرت شیخ الہند کو اپنے وفادار رفقاء کے بارے میں یہ غم تھا کہ یہ میری وجہ سے جوانی میں تختۂ دار پر لٹکائے جائیں گے چنانچہ آپ نے اپنے اس درد کا اظہار اپنے رفقاء کے سامنے اس وقت مضطرب ہوکر کہہ دیا۔

جب یہ حضرات اپنی اپنی کال کوٹھریوں سے تفریح کرانے کے نام پر نکالے گئے تھے، اور جیل کی چہار دیواری کے اندران کو مسلح پہرہ دار تفریح کرا رہے تھے۔

مگر حضرت شیخ الہند کے اظہارِ غم پر ان مردان صفاکیش کے چہرے دمک اٹھے گویا یہ خندہ پیشانی کے ساتھ تختۂ دار کا استقبال کرنے کے لئے مستعد ہیں اور ہاری ہوئی بازی جیت کر آئے ہیں، شب و روز یوں ہی گزرتے رہے، قید خانہ میں اور وہ بھی کال کوٹھری کس بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا، آخری فیصلہ کے انتظار میں مہینہ پورا ہو رہا تھا کہ یہ اطلاع دی گئی کہ آپ لوگ اپنا اپنا سامان درست کرلیں، کل یہاں سے روانگی ہے، کہاں جانا ہے اور کس لئے جانا ہے؛ اس کا کوئی اشارہ نہیں ملا، البتہ دوسرے دن ۱۷ فروری ۱۹۱۷ء کو اطلاع کے مطابق بہ العقل الاسود سے اس قافلہ کو مسلح پولیس کی نگرانی میں نکالا گیا، اور قاہرہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا دیا گیا، یہاں سے بذریعہ ٹرین مسلح پولیس کی حفاظت میں یہ قافلہ اسکندریہ اسٹیشن تک لایا گیا، پھر ان قیدیوں کو اتار کر بندگاڑی کے ذریعہ بندرگاہ تک لائے اور ایک جہاز میں سوار کر دیا۔

۲۱ فروری ۱۹۱۷ء کو یہ جہاز جزیرۂ مالٹا کے ساحل پر لنگر انداز ہوا، اور شام کو ۷ بجے ان مردان صفاکیش کو پیدل مالٹا کے ایک قدیم قلعہ میں لے جاکر نظر بند کر دیا گیا، اس قلعہ میں تین ہزار قیدی پہلے سے مقید تھے، اس قلعہ میں وہی لوگ نظر بند کئے جاتے تھے جو انگریزی حکومت کی نظر میں انتہائی خطرناک اور باغیانہ ذہن کے لوگ ہوتے تھے، ان کے ساتھ کسی طرح کی کوئی رعایت نہیں کی جاتی تھی بلکہ وہ غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا جس سے انسانیت سرنگوں ہو جاتی ہے، طرح طرح کی اذیتوں و آلام و شدائد میں اس قسم کے قیدیوں کو مبتلا رکھنا انگریزی حکومت کی وفاداری اور ذریعۂ استحکام باور کیا جاتا تھا، اسی زاویۂ فکر کے تحت ان فرشتہ صفت انسانوں کے ساتھ بھی اذیت ناک سلوک کیا گیا، اور ضعف و نقاہت، بیماری و پیرانہ سالی کا لحاظ بھی ان کے انسانی حقوق سے خارج کر دیا گیا تھا۔

اس تکلیف دہ ماحول میں بھی ان عاشقان پاک طینت نے یکسوئی اور تقرب الٰہی کا وہ راستہ ہموار کرلیا جو آئندہ نسلوں کیلئے عملی نمونہ بن گیا، حضرت شیخ الہندؒ ترجمۂ قرآن کی عظیم الشان خدمت میں مصروف ہوگئے اور حکیم نصرت حسین صاحب کو بھی اسی کام میں مشغول کرلیا، حضرت شیخ الاسلام نے قرآن حکیم کا حفظ شروع کردیا اور اس کی تکمیل کرکے تراویح میں پورا قرآن سنانے کی سعادت بھی حاصل کرلی اور اخیر عمر تک رمضان المبارک میں قرآن حکیم پابندی کیساتھ سناتے رہے، اسی قید فرنگ میں مولانا عزیر گل اور مولانا وحید احمد مدنی صاحب کو انگریزی اور دیگر زبانوں کے سیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور ان دونوں حضرات نے کئی زبانوں میں مہارت پیدا کرلی، اسی طرح کی مصروفیات میں ان خدارسیدہ بزرگوں نے ۲۱ فروری ۱۹۱۷ء سے ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء تک کی طویل مدت گذاردی البتہ اسیریٔ فرنگ کے آخری ایام میں اس قافلۂ نورانی کو ایک صدمۂ جانکاہ سے دوچار ہونا پڑا وہ تھا حکیم نصرت حسین صاحب فتحپوری کا داغ جدائی جن کی قبر مالٹا کے راہگیروں کو ہندوستانی مجاہدین حریت کے اس قافلہ کی یاد تازہ کرتی رہے گی:

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

قید سے رہائی کے بعد انگریزی حکام نے ۲۰ مارچ ۱۹۲۰ء کو حفاظتی دستہ کے ساتھ اس قافلہ کو ہندوستان کیلئے روانہ کردیا جو تین مہینے بعد ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو بمبئی کے بندرگاہ پر اتار کر آزاد کردیا گیا جہاں خلافت تحریک کے رضاکاروں نے شاندار استقبال کیا، اور مولانا شوکت علی مرحوم خلافت کے عظیم اجلاس میں لے آئے، اسی اجلاس سے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی جدوجہد کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں مولانا کی قومی وملی خدمات، سیاسی بصیرت اور مجاہدانہ کارنامے روز روشن کی طرح بے غبار دکھائی دیتے ہیں ان کی تفصیلات مستقل عنوان کے تحت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

۵ ر دسمبر ۱۹۵۷ء کی شام کو ساڑھے تین بجے کے قریب جب بذریعہ ٹیلی فون دیوبند سے بطل حریت، مجاہد اعظم، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے انتقال پر ملال کی خبر وحشت اثر سہارنپور میں پہنچی تو لوگ دم بخود رہ گئے اور انھیں یقین نہیں آیا کہ حضرت والا اس دار فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے ہیں، لوگ بازاروں اور محلوں میں تحقیق حال کے لئے مضطربانہ انداز میں بھاگے بھاگے پھرنے لگے، ساڑھے چار بجے کے قریب دارالعلوم دیوبند کو شہر کے مختلف مقامات سے فون کئے گئے جس سے اس اندوہناک حادثہ کی مزید تحقیق ہو گئی، اور یہ معلوم ہو گیا کہ حضرت والا کی تجہیز و تکفین آج شب میں ہی عمل میں آئے گی، اس واقعہ ہائلہ کی تصدیق ہو جانے کے بعد یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی، اور مسلمانوں کے بازار محلے گلیاں اور مکانات ماتم کدوں میں تبدیل ہو گئے، پورے شہر میں مسلم دکانداروں کی دکانیں آناً فاناً بند ہو گئیں، ہر شخص کے چہرے پر حزن و ملال اور رنج و غم کے آثار صاف جھلکنے لگے ہزاروں آنکھوں سے اشکہائے غم ٹپکنے لگے، گھروں میں ہزاروں دختران اسلام ہچکیاں لے لے کر رونے لگیں، بچوں کے پھولوں کی طرح شگفتہ چہرے مرجھا گئے، غرض پورے شہر کے مسلم علاقوں کے در و دیوار سے ماتم کی صدائیں آنے لگیں، اور ایسا معلوم ہونے

لگا کہ آج شہر کے ہر مسلمان مرد، عورت اور بچے کا شفیق باپ مر گیا ہے وہ آج یتیم ہو گیا ہے اور اس کی تمام مسرتیں چھین لی گئی ہیں۔ اس وقت فضائے آسمانی پر ایک عجیب قسم کی سرخی نما اندھیری چھا گئی تھی جس نے دلوں کے اندھیرے کو اور زیادہ گہرا کر دیا تھا، پورے ماحول پر ایک عجیب ڈراؤنی اور وحشت ناک حالت طاری ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ آج اس شہر میں رہنے والے انسانوں کا ہی نہیں بلکہ پورے ملک، پورے ایشیا اور پورے عالم انسانی کا سرمایہ سکون و طمانیت لٹ گیا ہو۔

لوگ تحقیق حال ہونے پر ایک عجیب وحشت و سراسیمگی اور بدحواسی کے عالم میں دیوانہ وار دیوبند کی طرف چل پڑے جو شخص جس حال میں تھا اسی حال میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہزاروں اشخاص ٹرینوں کے ذریعہ گئے اور ہزاروں نے موٹر بسوں کاروں حتی کہ موٹر ٹھیلوں میں سفر اختیار کیا۔

بہت سی اسپیشل بسیں چلائی گئیں اور بہت سی دوسری لائنوں پر چلنے والی گاڑیاں اپنے مقامات کا رخ چھوڑ کر دیوبند کی طرف مڑ لیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سے قافلے اپنی منزل مقصود کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں اور قافلہ کا ہر فرد اس کا خواہشمند ہے کہ وہ پہلے منزل سے ہمکنار ہو جو لوگ ٹرینوں سے گئے ان کی تعداد بھی کئی ہزار تھی، دیوبند کے اسٹیشن پر جب ہزارہا دیوانگان حسین احمد کا یہ قافلہ پہنچا تو دیوبند کے اسٹیشن کے عملہ نے حضرت شیخ الاسلام سے عقیدت و محبت رکھنے والوں کیساتھ نہایت شریفانہ سلوک کیا لوگ تانگوں میں اور پیدل مدرسہ کی طرف چل دیئے ان جانے والوں میں شاید ایک آدھ شخص ہی ایسا ہو گا جو آہستہ چل رہا ہو ورنہ کوئی نہایت تیزی کے ساتھ جھپٹ رہا تھا اور کوئی دیوانوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں سب لوگ دنیائے اسلام کی اپنے طرز کی واحد یونیورسٹی اور ہندوستان کے جہاد حریت کی سب سے بڑی جہادی دار العلوم دیوبند پہنچ گئے جہاں ہزارہا انسانوں کا جم غفیر اپنے محبوب

اور مقدس رہنما کے جنازے کے گھر سے باہر لائے جانے کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا
پورے دیوبند کی ہزاروں برقع پوش مسلم عورتیں اپنے روحانی باپ اور پیر و مرشد شیخ الاسلام
حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب کے مکان پر آجا رہی تھیں کوئی سسکتی جاتی تھی تو کوئی
ہچکیاں لیتی ہوئی آتی تھیں، یہ عجیب دلدوز اور صبر آزما منظر تھا۔ بعد نماز عشاء تقریباً
۹½ بجے اس مقدس اور عظیم ہستی کا جنازہ باہر آگیا جس کے تقدس و عظمت کے سامنے
اس صدی کی بڑی سی بڑی اور اہم سے اہم شخصیت نے سر نیاز خم کیا۔ انسانوں کا بے پناہ
سمندر اس وقت موجود تھا۔ درجنوں اشخاص اس موقع پر کچلے گئے اور بمشکل تمام
اٹھ سکے، شیخ الاسلام کا جنازہ دارالعلوم کے صدر دروازہ سے احاطہ دارالعلوم میں داخل
ہوا اور پھر بہزار دقت دارالحدیث کے شاندار ہال میں اس جگہ پہنچا دیا گیا جہاں حضرت
شیخ الاسلام نے سالہا سال حدیث نبوی کا درس دیا ہے اور ان کے ہزار ہا شاگردوں نے
اس چشمۂ علم و عمل سے فیضان حاصل کیا ہے، اسکے بعد اس آفتاب علم دین اور ماہتاب
سیاست و حریت کا دیدار شروع ہوگیا۔ خدا کی قسم اس وقت کا نقشہ کھینچنے سے میرا قلم
بالکل قاصر و عاجز ہے اور میں ہی کیا کوئی بھی اہل قلم خواہ اسے اپنے قلم پر کتنا ہی ناز کیوں نہ ہو ان
کیفیات کا صحیح نقشہ نہیں کھینچ سکتا جو اس وقت وہاں طاری تھیں۔

میں نے بڑے بڑے لوگوں کے جنازے میں شرکت کی ہے، بہت سے علماء و صلحاء
کا سفر آخرت دیکھا ہے لیکن جو بات میں نے اس وقت دیکھی وہ کبھی نہ دیکھی تھی، ایک
عجیب کیفیت تھی ایک عجیب عالم تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج زندگی کی تمام مسرتیں چھن گئی
ہیں، آج محفل ہستی بالکل اجڑ گئی ہے آج باغ عالم کا گوشہ گوشہ ویران ہوگیا
ہے۔ دل پوچھ رہا تھا کہ ع

اُٹھ گیا کون یہ محفل سے کہ جس کے غم میں
در و دیوار سے آتی ہے صدا ماتم کی

سوگ کس کا ہے زمیں اور فلک کو اتنا۔
اوڑھ رکھی ہے انھوں نے جو ردا ماتم کی

اور میں روش صدیقی کے الفاظ میں دل سے کہہ رہا تھا کہ اے نادان۔ آج اٹھ گیا ہے ایک مرد عظیم۔ انسانیت کی آبرو، عرفان وایقان کا محمل، شریعت کا ہادی، طریقت کا مرشد، مدرسہ وخانقاہ کی رونق، جرأت وہمت کا کوہ گراں، جنگ آزادی کا عظیم رہنما، حب وطن کا بحر مواج، عزم واستقلال کا ہمالہ، حلم وانکسار کا سدا بہار گلستاں، جود وکرم کا ابر گہربار، علم وعمل کے افق کا آفتاب، خطیب شعلہ فشاں، بادیٔ اعظم کا والہ و شیدائی، دنیائے اسلام کا مخدوم، دین حنیف کی شمع جاوداں، حریم چشتیاں کا چراغ ابد افروز، شاہ ولی اللہ کے علم وایقان کا امین، ارشادات رشیدیہ کا محرم، اخلاص امدادیہ کا نقش کامل، شیخ الہند، اسیر مالٹا کی زندہ تصنیف، مسجد نبوی کا شیخ التدریس، دیوبند کا صدر العلوم اور شیخ الحدیث، اس مجاہد اعظم، قربانی کے پیکر مجسم، زاہد پاک باطن، مظہر اخلاق وانسانیت، آفتاب شریعت وطریقت، قائد عالم اسلام ورہنمائے اعظم کا جسد مبارک دار العلوم کے مرکزی ہال میں اس جگہ رکھا گیا جہاں بیٹھ کر سالہا سال تک اس چشمۂ علوم دینیہ نے سیکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں تشنگان علوم کی پیاس بجھائی تھی اور انھیں سیراب کیا تھا۔ اللہ اللہ کیا تعلق خاطر تھا، اس مرد مومن کو اس قطعۂ ارضی سے کہ جہاں بیٹھ کر اپنی قیمتی زندگی گذاری تھی وہاں موت کے بعد آئے بغیر چین نہ پڑا اور اس طرح ایک بار پھر اس مکان کو موقع ملا کہ وہ جی بھر کر اپنے مکین کو دیکھ سکے اور اس کے در و دیوار اس کا آخری دیدار کرسکیں۔

حضرت شیخ کا جسم مبارک دودھ کی طرح سفید اور آب زمزم میں دھلے ہوئے کھدر کے سفید کفن میں لپٹا ہوا تھا آپ نے زندگی بھر کھدر پہنا، کھدر ہی کا استعمال کیا اور مرنے کے بعد بھی کھدر ہی کا کفن آپ کے حصہ میں آیا۔

جنازہ قبلہ رخ رکھ دیا گیا اور ان تیس چالیس ہزار مشتاقان دید کو جو دارالعلوم کے وسیع احاطہ مولسری و احاطہ دفتر میں اور باہر سڑک پر کھڑے ہوئے تھے قطار در قطار ہال کے اندر آنے کی اجازت دی گئی تاکہ وہ ہال کے ایک دروازہ سے داخل ہو کر اس گنجینۂ علم اور پیکر عمل پر آخری نگاہ ڈالتے ہوئے خاموشی کے ساتھ دوسرے دروازے سے باہر نکل جائیں، میں نے دارالعلوم کی چھت پر چڑھ کر دیکھا ہے کہ نیچے لوگوں کی بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ جو شخص جہاں پھنس گیا تھا وہاں سے نکلنا تو درکنار اپنا ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتا تھا، لوگ آپس میں اس قدر ملے اور بھیچے ہوئے کھڑے تھے کہ اگر اوپر سے کوئی بہت ہی چھوٹی چیز بھی نیچے پھینک دی جاتی تو وہ ہرگز زمین تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

جس وقت ایک کونے سے ریلا آتا تھا تو دوسرے کونے تک کے لوگ اس طرح ہلتے تھے جیسے کسی بڑے تالاب یا سمندر میں لہریں ہلتی ہوئی چلی جاتی ہیں، میں نے دارالحدیث کی بالائی منزل کے جنگلے پر کھڑے ہو کر حضرت شیخ الاسلام کا خوب دیدار کیا۔ اگرچہ وہاں بھی بہت بھیڑ تھی اور آسانی سے دیکھنا بہت مشکل تھا لیکن میں کسی نہ کسی طرح دیکھتا ہی رہا، کبھی اپنے طویل القامت ہونے کا فائدہ اٹھا کر اور پنجوں کے بل کھڑے ہو کر لوگوں کے سروں کے اوپر سے دیکھتا اور کبھی لوگوں کے پاؤں میں بیٹھ کر ان کی ٹانگوں کے درمیان سے جھانکنے لگتا کبھی ایک جنگلے پر سے دیکھتا کبھی دوسرے سے لیکن اس کے باوجود دل نہیں مانا اور میں بھی نیچے جا کر انسانوں کے اس سمندر میں مل گیا جو اندر جانے کے لئے ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور آخر کار کسی نہ کسی طرح میں بھی اس حال میں داخل ہو گیا جہاں یہ آفتاب شریعت محو خواب تھا اور بجائے دوسرے دروازے سے باہر نکلنے کے ہال میں رک گیا۔ مجھے چند لوگوں نے جو دو رویہ لائن بنا کر کھڑے ہوئے تھے بازو سے پکڑ کر باہر نکالنا چاہا، لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ میں ہرگز باہر نہیں جاؤں گا اور آج نہایت قریب سے جی بھر کر اس آفتاب شریعت و طریقت کو دیکھوں گا جس کی طرف آج سے پہلے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔

بقول اسعدی صاحب شیر چونکہ اس وقت سویا ہوا تھا اس لئے انھیں بھی اچھی طرح دیکھنے کی جرأت ہوگئی ورنہ بیداری کے وقت وہ بھی کبھی اس طرح دیکھنے کی جرأت نہ کرسکے۔

میں جوں جوں حضرت شیخ کے منور چہرے کو دیکھتا تھا، مجھے اپنے خانۂ دل میں روشنی ہوتی نظر آتی تھی اور بخدائے لم یزل میں نے اس موقع پر جتنا کسب نور کیا نہ آج تک کبھی کیا نہ آئندہ کرسکوں گا، اس وقت شیخ الاسلام کی زیارت کا جن ہزاروں خوش بختوں کو شرف حاصل ہوا ہے وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ ایسا نور، اتنا سکون، اور چہرے پر اس قدر تازگی و شگفتگی انھوں نے کبھی نہ دیکھی ہوگی، آنکھیں بند، منہ بند، لیکن لبوں پر ایسی مسکراہٹ کہ جس پر دل خود بخود نثار سفید نورانی داڑھی اور پیشانی پر چمکتا ہوا سجدہ کا نشان ۔۔۔ حسن کا ایک گلزار کھلا ہوا تھا اور جی چاہتا تھا کہ اس گلزار کو تمام عمر یوں ہی دیکھتے رہئے اسی طرح اس کی بہار لوٹتے رہئے، تین گھنٹے کے بعد نماز جنازہ کے لئے صفیں لگنے لگیں، اگرچہ اس وقت بھی دہلی اور میرٹھ سے آنے والوں کا تانتا بندھ رہا تھا لیکن دیر زیادہ ہوجانے کی وجہ سے نماز شروع ہوگئی اور ٹھیک ساڑھے بارہ بجے الحاج حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث جامعہ مظاہر علوم سہارنپور نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ایماء پر نماز جنازہ پڑھائی۔ نماز کے بعد حضرت شیخ کا جنازہ دارالعلوم کے دار جدید سے ہوتا ہوا شمالی دروازہ سے باہر لایا گیا اور حضرت شیخ کے مکان کے سامنے سے ہوتا ہوا قبرستان لے جایا گیا، قبرستان اگرچہ وہاں سے بمشکل ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ہوگا لیکن مجمع کی کثرت کے باعث یہ فاصلہ دو گھنٹوں میں طے ہوا اس وقت بعض اخباری نمائندوں نے فوٹو بھی لئے، میں بھی ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا ہوکر جنازہ کا جائزہ لینے لگا، لوگوں کی بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ جنازہ کا آگے بڑھنا دشوار ہو رہا تھا، میں نے اس بلند

ٹیلے پر سے جب جنازہ کو دیکھا تو بالکل ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی سمند میں روشنی کا مینار نظر آرہا ہو، اور رفتہ رفتہ یہ مینارۂ روشنی وہاں پہنچ گیا جہاں بانیٔ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور شیخ الاسلام کے استاذ محترم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ ان کا انتظار کر رہے تھے۔

اور پھر عین اس وقت جس وقت کہ روزانہ شیخ الاسلام تہجد میں اپنے رب کے حضور حاضر ہوتے تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حاضر ہو گئے، میں نے بہت سے بزرگوں کو اس موقعہ پر یہ کہتے ہوئے سنا کہ آج تک ہم نے یہ دیکھا نہ سنا کہ خاص تہجد کے وقت جو خدا کا اپنے بندوں سے ملاقات کا خصوصی وقت ہے کوئی شخص دفن ہوا ہو، یہ اعزاز حضرت شیخ کو ہی حاصل ہوا کہ وہ اس خاص وقت میں روزانہ کی طرح اپنے آقا کی خدمت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حاضر ہو گئے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ !

حضرت شیخ الاسلام اور دارالعلوم دیوبند

عبدالملک فاروقی، استاذ جامعہ حسینیہ عملا پور، ٹمکور، کرناٹک

قطب العالم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق کچھ لکھتے وقت قلب پر ایک عجیب قسم کی ہیبت و عظمت طاری ہو جاتی ہے حالانکہ ناچیز راقم الحروف نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت نہیں کی، اور نہ ہی آپ کا وہ مقدس و مبارک دور اپنی آنکھوں سے دیکھا جس میں شیخ الاسلام، شیخ طریقت تھے جب ایک عالم آپ کو غیر منقسم ہندوستان کا ایک عظیم سیاسی رہنما مانتا تھا، ایک دنیا آپ کو محدث کبیر اور استاذ کامل سمجھتی تھی، ایک طائفہ آپ کو بے لوث مہمان نواز اور کبیر الزہاد تصور کرتا تھا، ایک جماعت کا خیال تھا کہ حضرت "شیخ الاسلام" کے اندر انسانیت و شرافت اپنی اعلیٰ ترین اقدار کے ساتھ موجود ہے، کچھ لوگ یہ سوچتے تھے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ عقیدۂ ختم نبوت کے جانباز محافظ، پاسدار ناموس صحابہ رض اور فرق باطلہ کے لئے شمشیر برہنہ تھے، جبکہ چند حضرات یہ کہتے تھے کہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر صابر و شاکر، باوجود قدرت کے بدلہ نہ لینے والا۔ بلکہ اوروں کے مظالم سہہ لینے والا ان کے دور میں دوسرا کوئی شخص نہ تھا

مادر وطن کو طوق غلامی سے نجات دینے کا مسئلہ ہو، برطانوی سامراج کا قلع قمع ہو، قادیانیت کی بیخ کنی ہو یا مودودیت کے سڑتے گلتے ناسور پر نشتر زنی، وہ ہر مرض کا علاج تھے وہ ہر درد کا درماں تھے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے عظیم مجاہدانہ کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے، آپ کی جلیل القدر خدمات پر لکھی صاحب قلم شخصیات کی شاندار لائبریریز اور کتب خانے موجود ہیں آپ کی حیات مبارکہ کا شاید ہی کوئی پہلو بچا ہو جس پر سے آپ کے عشاق نے پردہ نہ اٹھایا ہو، زیر نظر مقالہ کی تحقیق کے وقت ناچیز راقم کے لئے انتخاب موضوع ایک مسئلہ تھا، حیات شیخ الاسلام پر قلم کاری کو بڑی جسارت سمجھتا تھا، اپنی کم علمی، جہالت اور بے بضاعتی سد راہ بنی ہوئی تھی، قلم کی موضوع پر گرفت نہ ہو پا رہی تھی (جس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی ہیبت و عظمت کا بڑا دخل تھا)

بہت غور و فکر کے بعد، شیخ الاسلام کی دارالعلوم دیوبند سے وابستگی ایک ایسا عنوان سجھائی دیا جس پر ذہن فکری راہوں پر چل پڑنے پر آمادہ نظر آیا۔ مذکورہ عنوان کے انتخاب کی ایک وجہ یہ ہے کہ ناچیز راقم کے دیوبند میں تعلیمی قیام کے دوران قطب عالم شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کو پڑھنے کا موقعہ ملا۔ مقالہ بڑا بے ربط اور ادبی چاشنی سے ناآشنا ہے، ناچیز راقم کو اس کا پورا پورا احساس ہے مگر پھر بھی ہمت کر کے قلم اس لئے اٹھایا کہ شاید اسی بہانے میں بھی ان لوگوں کی فہرست میں شامل ہو جاؤں کہ جن کے بارے میں اگر بالفرض محشر میں یہ اعلان ہو جائے کہ جن جن لوگوں نے حیات شیخ الاسلام پر کچھ بھی لکھا ہو، وہ سب جنتی ہیں، اور ان سب کی مغفرت کی جاتی ہے، زہے نصیب! کیا ہی خوشی کا موقعہ ہوگا؟ کتنے نصیبہ ور ہوں گے وہ صاحب قلم جو اس مبارک زمرے میں شامل ہونگے

کتاب گل میں بطرز جدید لکھا ہے
کسی نے اپنے لہو سے تری کہانی کو

حضرت شیخ الاسلامؒ کے احسانات جہاں ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں پر بے حد ہیں وہیں حضرت اقدس کے گراں بار احسان سے دارالعلوم بھی مستثنیٰ نہ رہ سکا، اگر میں یہ کہوں کہ دارالعلوم اپنے روز تخلیق سے جس ذات اقدس کے قدوم میمنت لزوم کی راہ تک رہا تھا وہ شخصیت حضرت شیخ الاسلامؒ کے علاوہ کوئی دوسری نہ تھی، تو شاید مبالغہ نہ ہوگا، بالخصوص آپ نے دارالعلوم کو اس وقت سنبھالا دیا جب بڑے بڑے جلیل القدر اور صاحب کمال فرزندان دارالعلوم مادر علمی سے گریزاں ہو گئے تھے دارالعلوم کی مسند صدارت کو آپ نے اس وقت رونق بخشی جب طلبۂ دارالعلوم نے تعلیمی مقاطعہ یا اسٹرائک سے اپنے آپ کو روشناس کرادیا تھا، جب اساتذۂ دارالعلوم گروہوں میں بٹ گئے تھے، جب دارالعلوم کے در و دیوار تیز و تند نعروں سے دہل رہے تھے، جب قال اللہ وقال الرسول کی لافانی صدا سے جھومنے والی محرابیں آپسی چپقلش کے صدمے سے شق ہوگئی تھیں، اندرون دارالعلوم اس دہکتے ہوئے آتش فشاں کو آپ نے جس طرح سرد فرمایا وہ حقیقۃً آپ ہی کا حصہ تھا۔

دارالعلوم میں آپ کی آمد سے متعلق صاحب "اسیران مالٹا" مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زور قلم کی شاہکار یہ چند سطور کس قدر جامع ہیں ملاحظہ فرمائیے لکھتے ہیں۔ "سلہٹ میں آپ کو وہ سب کچھ میسر تھا جو ایک جلیل القدر عالم شیخ طریقت اور رہنمائے قوم کے شایان شان ہو، مگر جب مہتمم دارالعلوم کی طرف سے دعوت نامہ پہنچا تو آپ کی ضمیر کی آواز یہی تھی کہ دارالعلوم کا مفاد ان تمام مفادات سے مقدم ہے جو اس وقت حاصل اور مستقبل کے لیے متوقع ہیں، دارالعلوم اس وقت وادئ پرخار تھا مگر کارزار سیاست کے سیف و سنان آپ کو کانٹوں کا عادی بنادیا تھا لہٰذا اس

نے سلہٹ کے چمن زار کو الوداع کہا اور دارالعلوم کے خارستان کو اپنا نشیمن بنالیا آپ کے اخلاص کی برکت تھی کہ بادصرصر کے جھونکے ختم ہوئے اور دارالعلوم شاہراہ ترقی پر تیزی سے قدم بڑھانے لگا، اور بقول مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی "حقیقت یہ ہے کہ آپ کے عہد میمنت مہد میں دارالعلوم کی شہرت میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور مسند رشد و ہدایت تو اس شان سے کبھی کر دیوبند کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، آپ ایک ہی وقت میں شیخ وقت بھی تھے اور محدث بے بدل بھی، آپ کی غرباء پروری اور مہمان نوازی کی بدولت دیوبند کا چھوٹا سا قصبہ گلزار ابراہیم معلوم ہوتا تھا۔"

(اسیران مالٹا ص ۱۲۹)

حضرت شیخ الاسلام کے سبھی سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ جب حضرت شیخ الاسلام دارالعلوم تشریف لائے اس سال طلبہ دورۂ حدیث کی تعداد ۳۴ تھی، یہ آپ کے وجود باجود کی برکت تھی کہ پھر اس ۳۴ کے عدد نے ارتقائی منازل ہی طے کیے۔ ایک روایت کے مطابق یہ ترقی پذیر عدد ۲۰۸ تک پہنچ گیا تھا جو پہلے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھا، پھر تقریباً ۳۲ سال تک آشیانۂ نبوی کے اس شیریں مقال بلبل کے ترانے فضاء دارالعلوم کو طرب انگیز بناتے رہے۔

یہ تجزیہ بھی خوب ہے کہ قیام دارالعلوم سے لے کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دور تک جتنے فضلا دارالعلوم نے دیئے اس سے کہیں زیادہ تنہا حضرت شیخ الاسلام کے دور میں دارالعلوم نے علماء پیدا کیے۔ جس سال حضرت کا وصال ہوا، یعنی ۱۹۵۷ء میں اس سال تک فضلاء دارالعلوم کی تعداد ہمیں ۶۶۳۰ ملتی ہے ان میں سے تنہا حضرت شیخ الاسلامؒ کے تلامذہ کی تعداد ۳۸۵۶ ہے، باقی ۲۷۷۴ دوسرے شیوخ حدیث کے تربیت یافتہ ہیں۔

اس سے قبل کہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دارالعلوم آمد کے اسباب و علل پر

بحث شروع کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمہید کے طور پر سحر بیان مقرر اور مفسر قرآن کریم حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ جذباتی تحریر لفظوں کے قافلے میں شامل کرلوں، جو ان حالات پر ایک شاندار تبصرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ رقم طراز ہیں:

"ان تمام مجاہدات کے بعد ان کی وہ تعلیمی خدمات جو انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں انجام دی ہیں اور اُن اندرونی خلفشار کے زمانہ میں جبکہ دارالعلوم کی حیات خطرے میں تھی، دارالعلوم کی سرپرستی فرما کر دارالعلوم کو سنبھالا اور بچا لیا ہے حضرت شیخ کا یہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی عظمت و صداقت کا صلہ دربار رسالت سے تو مولانا مدنیؒ کو ملے گا ہی، لیکن دارالعلوم کے درو دیوار اور وہاں کی خاک کے پاک ذرے بھی مولانا مدنیؒ کے خلوص پر قیامت کے دن شہادت دیں گے۔"

۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء کا زمانہ ہے، حضرت شیخ الاسلام سلہٹ میں علم ونور اور رشد و ہدایت کے چشمے بہا رہے ہیں کہ آپ کو نائب مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب عثمانیؒ کا مکتوب گرامی ملتا ہے جس میں دارالعلوم کی طرف سے آپ کو دیوبند آنے کی دعوت دی جا رہی ہے (مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ حضرت شیخ کے اساتذہ میں سے تھے پھر حضرت شیخ کیوں نہ دعوت کو قبول فرماتے) دیوبند پہنچکر آپ مہتمم و نائب مہتمم دارالعلوم حافظ احمد صاحبؒ اور مولانا عثمانی سے ملاقات فرماتے ہیں، یہ دونوں حضرات دارالعلوم کے پیچیدہ احوال اور دھماکہ خیز فضا سے آگاہ کر کے آپ کو دارالعلوم کی مسند صدارت پر متمکن ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ انتہائی انکساری سے کام لیتے ہوئے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار فرما دیتے ہیں، ارباب اہتمام کا اصرار اور آپ کا انکار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

حضرت شیخ الاسلام بخوبی جانتے تھے کہ قوانین دارالعلوم کی رو سے کوئی بھی ملازم دارالعلوم کے زمانۂ ملازمت میں سیاست سے کنارہ کش رہے گا، اور یہ ایک کام حضرت کے دائرہ اختیار سے باہر تھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں سیاست کوئی شغل بیکاری یا تضیع اوقات کا مشغلہ نہ تھی، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ "سیاست" آپ کے یہاں عبادت کا درجہ رکھتی تھی تو بیجا نہ ہوگا، سیاست کی جو تعریف فی زمانہ کی جاتی ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی لغت میں وہ تعریف نہ تھی، آپ کی کتاب حیات میں سیاست کے معنی تھے خدمت خلق، مسلمانوں پر خصوصاً اور برادران وطن پر عموماً، مظالم کے خلاف صف آرائی، غیور ہندوستانی ہونے کی وجہ سے فرنگی گوروں کے زیر اثر رہنے سے انکار، ہندوستان کے اندر مسلمانوں کے تاریک مستقبل کو روشنی کے مینار تک لے جانے کا خواب، اور یہ بحث ان الفاظ کے ساتھ یہیں پر ختم کی جا سکتی ہے کہ سیاست حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں فنا فی الشیخ کا ایک پرتو تھی، آپ نے اپنے محبوب شیخ اور استاذ محترم حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے سیکھا تھا کہ فرنگی قوم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اور صحابہؓ کے عاشقوں کی دشمن ہے، اس کے ساتھ کبھی صلح نہ کرنا، آپ کو یہ بات باور کرائی گئی تھی کہ مسلمانوں کے تابناک مستقبل کا سفر گوروں کی روانگی سے شروع ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ مگر آج کا مؤرخ بڑے درد سے یہ لکھے گا کہ فرنگی ملعونوں نے اپنے ترکش کا آخری تیر کچھ اس انداز سے پھینکا کہ وہ سیدھا مسلمانوں کے دل میں پیوست ہوگیا، اور پھر یہ دل ٹکڑوں میں بٹ گیا، کبھی جسد اسلام کو "پاکستان" کی صورت میں تراز دیا گیا تو کبھی بنگلہ دیش کے نام پر اس کے جسم کو تار تار کیا گیا ؂

میں بولتا ہوں تو الزام ہے بغاوت کا

میں چپ رہوں تو بڑی بے بسی سی ہوتی ہے

بات کہیں کی کہیں پہنچ گئی۔ ذکر ہو رہا تھا حضرت شیخ الاسلامؒ کے دارالعلوم آنے کا

جس دن آپ دارالعلوم پہنچے اسی دن بعد نماز ظہر حضرت مہتمم و نائب مہتمم صاحب دیگر اکابرین کی معیت میں شیخ الاسلام کی قیام گاہ حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ کے دولت کدہ پر پہنچے اور پھر از سر نو اصرار فرمایا۔ اور حسب سابق حضرت رحمہ اللہ کا انکار اپنی جگہ پر قائم رہا بالآخر حافظ احمد صاحب مہتمم دارالعلوم نے بڑے مایوس ہو کر آپ سے فرمایا "یہ دارالعلوم بزرگوں کی امانت ہے اس کی خدمت جتنی ہم پر فرض ہے اُس سے زائد آپ پر۔ اگر آپ دارالعلوم میں تشریف نہیں لا رہے ہیں تو ہم بھی دارالعلوم سے دستبردار ہوتے ہیں۔ اب دارالعلوم باقی رہے یا فنا ہو جائے، خدا کے سامنے ہم اور آپ برابر کے جواب دہ ہوں گے"

حضرت مہتمم صاحب کی اس ترہیبی تقریر کے بعد سیدنا شیخ الاسلام کیلئے انکار کی گنجائش ختم ہو گئی تھی۔ "تذکرہ شیخ مدنی" کے مؤلف حضرت مولانا ارشد حسن عثمانی اس مکالمہ کے بعد کی واقعہ نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں، انھی کی زبانی سنیئے۔

"الحاصل حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ حافظ احمد صاحب کا انتہائی احترام فرماتے تھے فرمایا کہ: میں حکم کی تعمیل کے لئے مجبور ہوں مگر حضور یہ فرمادیں کہ میں انگریز کے خلاف حضرت شیخ الہندؒ کی تجاویز کو پورا کرنے کی کوشش میں لگا ہوں اور جب تک زندہ ہوں انگریز کے خلاف کروں گا یہاں تک کہ ملک آزاد ہو انگریز گورنمنٹ کا وجود ہندوستان میں باقی نہ رہے، اور دارالعلوم کی پالیسی یہ ہے کہ کسی تحریک میں کوئی ملازم حصہ نہ لے گا۔ اس کے جواب میں حضرت حافظ احمد صاحب اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ نے ایک زبان ہو کر فرمایا کہ "آپ دارالعلوم کے تمام قوانین سے مستثنیٰ رہیں گے"

اس جگہ یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان شرائط کا اظہار کر دوں جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم کی انتظامیہ کو پیش کی تھیں ان میں سے معدودے چند گر

اہم شرائط درج ذیل کی جا رہی ہیں۔

۱:۔ جو خبریں میری نسبت آپ دونوں حضرات تک پہنچیں ان پر کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے خود مجھ سے بلاواسطہ اس کی تحقیق کر لی جائے۔

۲:۔ ڈھاکہ یا اضلاع بنگال میں اگر اصلاح تعلیمات کے لئے ایک یا دو مہینہ قیام کی ضرورت ہو تو وہاں جانے کی اور نظام مکمل کرنے کی اجازت ہو۔

۳:۔ قومی و ملکی خدمات کی انجام دہی اور اس کی تحریکات کے اجرا میں کوئی رکاوٹ عمل میں نہ آوے۔

۴:۔ مدرسہ میں روزانہ دو یا تین گھنٹہ سے زیادہ صرف نہ کر سکوں گا باقی ماندہ اوقات میں اپنے دوسرے کام سرانجام دوں گا۔

۵:۔ ماہوار ایک ہفتہ تک مجھ کو اجازت ہو کہ قومی تحریکات میں بلا طلب اجازت صرف کر سکوں۔

۶:۔ مدرسہ کے وہ معاملات جن میں وہ گورنمنٹ سے موالات کرتا ہے مجھکو کسی قسم کا تعلق نہ ہوگا۔

۷:۔ شعبۂ تعلیم کے تنقید قوانین پر نظر اور غور کی اجازت دی جائے اور ان میں سفارشیں قبول کی جائیں۔

۸:۔ جماعت متخالفہ سے ربط و اتحاد کی بنیاد پر مجھ کو کبھی کسی پارٹی کا مخصوص فرد نہ شمار کیا جائے اور نہ مجھ کو کسی شخص یا پارٹی سے علیحدگی پر مجبور کیا جائے۔

۹:۔ مجھ کو کبھی کسی جگہ چندہ کے لئے نہ بھیجا جائے۔

۱۰:۔ جو اوقات میری خدمات تعلیمیہ کے ہوں ان کی پابندی میں جو کچھ تقصیر ہو جائے اس پر حساب کر کے میری تنخواہ سے کاٹی جائے در صورت عدم قطع اور عدم حساب دائرۂ اہتمام مسئول و ذمہ دار ہوگا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ان شرائط پر مجلس شوری نے غور کیا اور آپ جیسی نایاب ہستی کے حصول کے پیش نظر آپ کی شرطیں مانی گئیں، سیدنا شیخ الاسلام کا تقرر صدر مدرس کے عہدہ پر بمشاہرہ ۵۰؍ مقرر ہوا اور اراکین شوری نے مذکورہ رقم کی کمی پر آپ سے معذرت طلب کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ رقم آپ کے شایان شان ہرگز نہیں پھر بھی اگر قبول فرمالیں تو ہم سب شکر گذار ہوں گے۔

دارالعلوم کے شیخ الحدیث بن جانے کے بعد آپ نے اپنے زیر درس بخاری شریف و ترمذی شریف کو مقرر فرمایا، حقیقت یہ ہے کہ آپ نے ان مقدس کتب کا حق ادا کر دیا اسباق کی آپ اس قدر پابندی فرماتے تھے اور وہ بھی پیرانہ سالی میں کہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا چاہے آپ کتنے ہی دور دراز کے سفر سے آرہے ہوں خواہ کسی قدر تکلیف ہو آپ سیدھے دارالحدیث تشریف لاتے اور سبق شروع فرما دیتے، دوپہر میں دھوپ کی شدت ہو، لو چل رہی ہو، آسمان آگ برسا رہا ہو یا شدت حرارت سے زمین تڑخ رہی ہو مگر آپ اسی ذوق و شوق کے عالم میں دارالحدیث کی طرف رواں دواں ہو جاتے، بارش کے زمانے میں راستہ کیچڑ آلود ہو یا بوندا باندی جاری ہو آپ عشق حدیث رسول میں درسگاہ کی طرف رواں دواں ہو جاتے، آخر عمر میں جب کمزوری حد سے بڑھ گئی تو ایک دن مکان سے درسگاہ تک جس کی مسافت تقریباً تین سو قدم ہے آنے کے لئے بیچ میں شمالی گیٹ پر ضعف کی وجہ سے دربان دارالعلوم کی کرسی پر بیٹھ گئے، سواری بارہا خدمت اقدس میں پیش کی گئی مگر آپ نے قبول کرنے سے انکار فرمایا، درس حدیث کیلئے آپ ہمیشہ پاپیادہ تشریف لاتے تھے۔

دوران سبق روحانی تربیت بھی فرماتے رہتے تھے، تقریر اس انداز پر فرماتے کہ طلبہ کے اندر سلوک کے مراحل طے کرنے کا جذبہ موجزن ہو جاتا، غار حرا، رویائے مبشرہ وغیرہ میں توجیہ پر اور حدیث جبرئیل میں "فان لم تکن تراہ فانہ یراک" پر ایسی رقت

انگیز تقریر فرماتے کہ مجمع تڑپ اٹھتا۔

انتہائی صاف ستھرے اور معطر لباس میں دار الحدیث تشریف لاتے، احتراماً اکثر دو زانو ہو کر تشریف رکھتے۔ درس کے وقت انتہائی بے تکلف ہو جاتے، بیچ بیچ میں لطیف مزاح بھی فرماتے تھے مقصد یہ ہوتا تھا کہ طلبہ بے تکلف ہو کر استفادہ کر سکیں اور اشکالات پیش کرنے میں جھجھک محسوس نہ کریں، شبینہ اسباق میں خصوصاً بہت زیادہ بے تکلف ہو جاتے تھے۔

درسگاہ میں داخل ہوتے ہی پہلے آپ سلام فرماتے، طلبہ جواب آہستہ دیتے تھے، ایک دن آپ نے رعب دور کرنے کے لئے فرمایا" دیکھو سلام کرنا سنت ہے اور جواب دینا واجب ہے، تم لوگ نہیں دیتے میرا کیا نقصان؟ طلبہ اسی دن سے باواز بلند" وعلیکم السلام" کہنے لگے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس سے بہت خوش ہوئے۔

علم کا بے پناہ احترام فرماتے تھے، راستہ میں کہیں اگر کاغذ کا پرزہ پڑا ہوا مل جاتا تو فوراً اٹھالیتے اور فرماتے" اس کاغذ کے ذریعہ علم کی حفاظت ہوتی ہے"

علم اور دار العلوم سے حضرت کی وابستگی کو کہاں تک ذکر کیا جائے، حقیقت تو یہ ہے کہ دار العلوم کی تاریخ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے، اور حضرت مدنی علیہ الرحمہ کی مبارک سوانح دار العلوم کے تذکرہ کے بنا نامکمل ہے، ناچیز راقم کے والد محترم جناب مولانا عبد الحی صاحب فاروقی مدظلہٗ کی حقیقی خالہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ اور مولانا سید ارشد صاحب مدظلہٗ استاذ حدیث دار العلوم دیوبند کی والدہ محترمہ جنھیں ہم سب اہل خانہ" آپا" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اکثر میرے بچپن میں حضرت شیخ الاسلام کے گھریلو قصے سنایا کرتی تھیں، اور آپ کی متروکہ اشیاء کو بھی اکثر آپا کے ذریعہ دیکھنے کا موقعہ ملتا تھا جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں، تحدیث بالنعمۃ کے طور پر شوق کے

عالم میں لکھ گیا۔

آج شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ ہمارے درمیان مادی طور پر نہیں ہیں مگر آپ کی مبارک یاد، آپ کی تصانیف، آپ کے خلفاء و تلامذہ آپ کے قائم کردہ دینی مدارس قومی و ملی ادارے، آپ کے ملفوظات، فرمودات وعظ و تقریر کے بیش بہا ذخیرے، آپ کی جمعیۃ علماء ہند، آپ کا دارالعلوم دیوبند آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔ میں اپنی بات کو ان الفاظ کے ساتھ یہیں روکتا ہوں۔ یا سیدی آج آپ کو دنیا سے انتقال فرمائے تقریباً اکتیس سال پورے ہو رہے ہیں، ہم عہد کرتے ہیں کہ آپ کی تعلیمات و مواعظ پر عمل پیرا رہینگے، اور آپ کے انہی شاہکاروں کی صورت میں ہم ہمیشہ آپ کو اپنے درمیان رکھیں گے، تاکہ آپ کی روحانی حیات کا سلسلہ قرنوں اور صدیوں پر محیط ہو جائے اور پھر یہ زنجیر کبھی نہ ٹوٹے۔

سب لوگ سمجھتے ہیں کہ تم لوٹ گئے ہو،
تم ساتھ تھے، تم ساتھ ہو، تم ساتھ رہوگے

(نوٹ) اس مقالے کی ترتیب و تدوین میں مذکورہ کتب سے مدد لی گئی۔

۱۔ اسیران مالٹا : مولانا سید محمد میاں صاحب ؒ
۲۔ تذکرہ شیخ مدنی : مولانا راشد حسن صاحب عثمانیؒ
۳۔ شیخ الاسلام نمبر جلد اول : مولانا محمد عثمان صاحب فارقلیطؒ
۴۔ چند نایاب اور غیر مطبوعہ خطوط : مرتبہ افضال الٰہی دیوبندی
۵۔ مآثر شیخ الاسلام : جناب اسیر ادروی صاحب

از:۔ جلیل احمد قاسمی رام نگری

کی

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کا شعور کے ابتدائی دور سے یہ طریقہ رہا ہے کہ جب کوئی فرد کسی حیثیت سے غیر معمولی ترقی حاصل کرلیتا ہے تو ملک کے باشعور طبقے کے ذمہ دار افراد اسکی شخصیت کو اور اُجاگر کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں، یورپ، ایشیا میں ہر جگہ یہی اصول کارفرما ملے گا، اس مختصر سے مقالہ کا دامن اتنا وسیع و فراخ نہیں ہے کہ میں ان قابل قدر ہستیوں کے اسمائے گرامی اور کارناموں کی ایک طویل فہرست پیش کرسکوں، العاقل تکفیہ الاشارہ پر عمل کرتے ہوئے میں اپنے ملک کی ان مقتدر ہستیوں میں سے جنہوں نے اپنے ناقابل فراموش کردار، مجاہدانہ طرز زندگی اور ایثار و قربانی کے پاکیزہ جذبہ سے بقائے دوام حاصل کرلی ہے اور اس الہامی شعر کے سچے نمونے بن گئے ہیں سہ

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اور آج ہم ان کے سایۂ عاطفت اور حقیقی راہنمائی سے محروم ہوکر اپنی بدقسمتی پر خون کے آنسو بہارہے ہیں حضرت جگرمرادآبادی نے ایسے ہی اہلِ دل

اور اہل ہمت اشخاص کیلئے کہا ہے۔

جان کر من جملۂ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

ہمارے ملک میں منجملہ ان مقتدر ہستیوں کے گذشتہ صدی میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رہ کی ذات والاصفات اپنے علمی تبحر، اعلیٰ کردار، خوش اخلاق، مجاہدانہ انداز اور روحانی اقدار کے لحاظ سے بے مثال رہی ہے۔

دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں مشکل سے ملسکیں گی کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی انسان کے اندر یہ گوناگوں اوصاف جمع ہوں اور ان صفات کے مطابق شاندار کارنامے بھی مرتب ہوں، اسے ہم خداداد صلاحیت ہی کہہ سکتے ہیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طرف حدیث پاک کی مسند درس و تدریس پر بیٹھ کر علوم و فنون کے دریا بہا کر تشنگان علم دین کو سیراب فرمایا، اور آج یہ فارغان علم دین حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے باقیات صالحات کی حیثیت سے دنیا کے گوشہ گوشہ میں اشاعت اسلام و تبلیغ دین میں مصروف ہیں۔

دوسری طرف حضرت رحمۃ اللہ علیہ جنگ آزادی کے سپہ سالار اور مرد میدان کی حیثیت سے جرأت و ہمت کے ساتھ سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ اور اپنی زندگی کے آخری لمحات تک سینہ سپر رہتے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ حضرت رحمۃ اللہ مدت دراز تک مسلسل جمعیۃ علمائے ہند کے صدر رہے، جمعیۃ علماء ہند کے ملی، ملکی، مذہبی، سماجی اور اقتصادی مسائل حل کرنے والی ہندوستانی مسلمانوں کی ایک نمائندہ جماعت ہے، جس نے جنگ آزادی کے ابتدائی

دور سے لے کر آج تک برابر ملک وملت کی خدمت کی ہے اور کر رہی ہے۔

حضرت رہ کے دور صدارت میں کتنے ہی پیچیدہ موڑ آئے، مخالف ہوائیں چلیں لیکن حضرت شیخ رہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے اور ذرہ برابر قدموں میں لغزش نہیں آئی، اپنوں اور غیروں کے طعن وتشنیع سنتے رہے سب کچھ ہوا لیکن۔

ع آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

تاریخ شاہد ہے کہ سرخیل مجاہدین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ہمراہ مالٹا کی جیل میں قید وبند کی صعوبتیں صبر وتحمل کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے استاذ محترم کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف رہے، ہندوستان کو آزاد کرانے میں نمایاں حصہ لیا اور انقلاب کے بعد صبر آزما اور دل ہلا دینے والے واقعات کا ہر ہر موڑ پر مقابلہ کرتے رہے۔

فتنۂ ارتداد کے موقعہ پر ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے اس فتنہ کا پوری جدوجہد سے قلع قمع کیا اور آج الحمد للہ ان کی نسلیں اشاعت اسلام اور تبلیغ دین میں مصروف ہیں، بیکسی ومایوسی کے عالم میں اپنے بھائیوں کو وطن نہ چھوڑنے کی تلقین کی جس کے نتیجہ میں اس وقت سے کہیں زیادہ تعداد میں آج مسلمان ملک میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ ترقی کر رہے ہیں۔

متروکہ جائیداد (ایوی کوئی پراپرٹی) کے سلسلہ میں جب مسلمانوں کی جائدادیں ان کے قبضہ سے نکالی جا رہی تھیں اس وقت کے ماحول میں ہمت وجرأت سے کام لے کر کروڑہا روپے کی جائیدادیں واگذاشت کرائیں، جن کا پھل دوسری اور تیسری پشت والے آج بھی کھا رہے ہیں۔

مسلمانوں کی مرقومہ جائدادوں کو جو ابتری کی حالت میں تھیں اور برباد ہو رہی تھیں بچانے کے لئے پارلیمنٹ سے وقف ایکٹ منظور کرایا، مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کیلئے

ایک نظام بنا کر دینی ...... ، تعلیمی بورڈ تشکیل دیا جس کا سلسلہ اب تک قائم ہے اور نتیجہ خیز ہے۔ فرقہ وارانہ فساد کے موقعہ پر مصیبت زدہ افراد کی تالیف قلوب کی، دوبارہ بسانے کی جد و جہد کی، مالی امداد بہم پہونچائی ایسے بہت سے امور خیر و رفاہی کام انجام دیئے اور دے رہی ہے اس کی تفصیلات اس مختصر مقالہ میں ناممکن ہیں ، یہ "مشتے از خروارے" ہے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہ کارنامے ظاہر ہے طاقت کے بل بوتے پر نہیں ہو سکتے ، یہ خدا داد صلاحیت روحانی طاقت اور غیبی تصوف تھا جس نے حضرت رہ کو ہر ہر قدم پر کامیابی عطا کی

اس سے ہٹ کر اگر نظر ڈالی جائے تو موصوف رہ ایک غوث ،ایک قطب ، ایک صاحب نسبت مرد خدا..... کی حیثیت میں جلوہ گر نظر آتے ہیں، دن میں اگر میدان کارزار گرم کرتے ہیں تو راتوں کو مالک حقیقی کے حضور میں چشم گریاں ہو کر توبہ و استغفار کے ساتھ آہ و بکا کرتے نظر آتے ہیں، شاعر نے سچ کہا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت رہ کی زندگی کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو روحانیت و للٰہیت کے کرشمے جا بجا اور قدم قدم پر کرامت کی شکل میں آنکھ والوں کو نظر آئیں گے

دنیا کی تاریخ میں ان اولوالعزم ہستیوں میں آپ کا شمار ہے جنھوں نے اپنی زندگی میں جس منزل پر پہنچنے کا ارادہ کیا ، اس منزل پر اپنی زندگی ہی میں پہنچ کر کامیابی حاصل کی ، آج حضرت والا کی یاد میں حضرت کی نسبت سے یہ سیمنار منعقد ہوا ہے اور کثیر تعداد میں حضرت سے تعلق رکھنے والے حضرات نے اس میں حصہ لیا ہے ، وہ سب حضرات و کارکنان قابل مبارکباد اور لائق تحسین ہیں ، اس موقعہ پر یہ اظہار خیال کرنا میری رائے میں بے موقع

نہ ہوگا کہ صرف سیمنار منعقد کرنا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی و کردار کے ہر ہر پہلو پر روشنی ڈالنا کافی نہ ہوگا، اگر حضرت کی یاد کے ساتھ حضرت کے بتائے ہوئے کردار و عمل کے سانچے میں ہم اپنی زندگیوں کو نہ ڈھال سکیں، حضرت کی حقیقی یاد یا صحیح عقیدت مندی صحیح معنوں میں اسی وقت صحیح ثابت ہو سکتی ہے جب ہم اپنی زندگیوں میں انقلاب لائیں اور ہر ہر قدم پر حضرت رہ کے کردار و عمل کی تقلید کریں اور حضرت کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کا عزم کریں۔

آئیے ہم سب اس مبارک موقعہ پر عہد کریں کہ آج سے ہم اپنی زندگی میں انقلاب لائیں گے اور ہر طرف پھیلی ہوئی برائیوں کو تا حد امکان دور کرنے کی جد وجہد جرأت و ہمت کے ساتھ کریں گے

ہمت بلند دار کہ نزدیک خدا و خلق
باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی

ابتدائی حالات اور جنگ آزادی میں عظیم کردار

چمن اجڑا ہے جس کو منبع لطف و کرم کہیے
یہ غنچے جس سے کھلتے تھے بہ بستانِ محبت کے

ریاست علی قاسمی، امداد الاسلام کماپور، بلند شہر یو پی

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور دیگر اسلامی درسگاہیں وہ مردم ساز کارگاہیں ہیں جن کی نظیر ملنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ ان اداروں نے وہ نابغۂ روزگار شخصیات پیدا کی ہیں جن کے علم و فضل کا سکہ آج بھی رواں دواں ہے لیکن ان کارگاہوں کے ڈھلے ہوئے کل پرزوں کی نمائش نہیں کی گئی، نہ ہی ان کے اربابِ کار نے نمود و نمائش کو پسند کیا، غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ حقائق خود منکشف ہو جاتے ہیں انگلی رکھ کر بتلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آفتاب عالمتاب اپنی ضیا پاشیوں کو خود منوالیتا ہے، کسی کے تعارف کا محتاج نہیں ہوتا۔ فضلاء دیوبند کے آفتابان

علوم کا بھی یہی حال ہے، ان کی طرف متوجہ کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی انھوں نے خود اپنی فیض رسانیوں سے تمام تشنگان علوم کو اپنی طرف کھینچ لیا اور ایک عالم ان کی ضوفشانیوں سے آج بھی منور ہے۔

عصر حاضر کی مہذب دنیا میں پروپیگنڈہ ہی اصل سرمایہ ہے، یعنی شخصیات پروپیگنڈہ کے بغیر قدآور تسلیم نہیں کی جاتی ہیں، ایک شخصیت کو قدآور تسلیم کرانے کے لئے پوری مشینری حرکت میں آجاتی ہے اور گماشتے اس کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہو جاتے ہیں، تب کہیں جاکر وہ شخصیت آسمان شہرت پر ستارہ بن کر نمودار ہوتی ہے اس کے برعکس فضلاء دیوبند آج بھی پروپیگنڈہ سے ناآشنا ہیں پھر بھی علماء ہیں کہ آسمان شہرت پر آفتاب بن کر نمودار ہوتے ہیں اور اپنی کرامتوں کا قائل بنالیتے ہیں۔

انھی جلیل القدر اور بلند پایہ علماء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح کی بھی ذات گرامی قدر تھی، حضرت مدنی رح اپنے علم و فضل، صلاح و تقوی خداترسی خداشناسی، عزم و ہمت، دلیری بے باکی، سادگی و بے تکلفی، مجاہدہ نفس و جذبۂ جہاد استقامت و استقلال اور ایمان و عمل کے لحاظ سے علماء دیوبند ہی میں نہیں بلکہ علماء اسلام میں یکتائے روزگار تھے۔

آج کے اس مبارک سمینار میں مولانا مدنی رح ہی کی حیات طیبہ کے بعض گوشوں پر روشنی ڈالنے کا ارادہ ہے۔

مولانا مدنی رح کی ولادت باسعادت ۱۹ ر شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء بروز دوشنبہ بوقت گیارہ بجے شب قصبہ بانگرمئو ضلع اناؤ میں ہوئی جہاں ان کے والد ماجد اردو مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے، آبائی وطن قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے، تاریخی نام چراغ احمد ہے۔ اور وفات ۱۲ ر جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ مطابق ۵ ستمبر ۱۹۵۷ء کو ہوئی آپ نسباً حسینی سید ہیں آپ کا خاندان تقریباً انیس پشت قبل ہندوستان میں آیا

آیا تھا والد ماجد سید حبیب اللہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے ارشد خلفاء میں تھے، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی ۱۳۰۹ھ میں جبکہ عمر مبارک بارہ سال تھی آپ کو سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کی خدمت اقدس میں دارالعلوم دیوبند بھیجدیا گیا، گویا ایک صاف شفاف آئینہ کو آفتاب جہاں تاب کے سپرد کردیا گیا، حضرت شیخ الہند کی فراست کاملہ نے اس سعادت عظمیٰ کو پہچان لیا جس کے آثار آپ کے بشرہ مبارک سے عیاں تھے، حضرت شیخ الہند نے مخصوص شفقت کے انداز میں خود اپنی زیر تربیت رکھا اور باوجود کثرت مشاغل کے بڑی بڑی جماعتوں کو خارجی اوقات میں درس نہ دیتے تھے مگر شیخ مدنی کو بیشتر کتب خود پڑھائیں، سات سال کے عرصہ میں بعمر ۲۰ سال ۱۳۱۶ھ میں علوم متداولہ سے فراغت حاصل کرکے قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سے شرف بیعت حاصل کیا، ۱۳۱۶ھ میں آپ کے والد ماجد قدس سرہٗ نے جملہ اہل و عیال سمیت بغرض ہجرت بیت اللہ شریف کا قصد فرمایا تو آپ بھی ان کے ہمراہ ہوگئے وہاں آپنے اپنے مرشد و شیخ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ایماء سے سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے مراحل سلوک و طریقت طے کئے۔ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں چند ماہ رہ کر دار ہجرت مدینہ منورہ تشریف لے گئے جس کے چند ماہ بعد شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی دار فانی سے رحلت فرماگئے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے جوار رحمۃ للعالمین میں رہ کر وہ تمام فیوض و برکات حاصل کیں جو ایک باخدا انسان اس مجمع الجود والکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کرسکتا ہے، مدینہ طیبہ میں قیام کے دوران بیشمار ابتلاء و آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، بعض دفعہ فاقے بھی ہوئے چنانچہ متواتر چند ماہ اس حالت میں گذرے کہ ایک وقت میں تھوڑی سی مونگ کی دال میسر ہوتی تھی جس کو پکا کر گھر کے سب لوگ پی لیتے تھے، اور نہ جانے اس طرح کے کتنے ہی

حیرت انگیز واقعات ہیں جن کو صفحۂ قرطاس پر لانے کے لئے طویل وقت درکار ہے لیکن ان تمام مصائب و مشکلات کے باوجود حضرت مدنی،، کی پابندی اصول اور اتباع سنت نبوی میں کوئی لغزش نہ آسکی اور تمام آلام و احزان اور مصائب و تکالیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔

ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ میں ہندوستان تشریف لائے اور محرم ۱۳۲۰ھ میں دو سال سے زائد عرصہ قیام فرما کر مدینہ طیبہ واپس تشریف لے گئے۔ وہاں حرم نبوی میں حدیث تفسیر و فقہ کا اس شان سے درس دیا کہ قلیل مدت میں وہاں کے علماء میں امتیازی مقام حاصل کرلیا، طلبہ کی کثرت کی وجہ سے درس صبح کی نماز کے بعد سے عشاء کی نماز سے پہلے تک ہوتا تھا، یہ سلسلہ ۱۳۲۶ھ تک چلتا رہا، پھر ۱۳۲۶ھ میں دو بارہ ہندوستان تشریف لائے، اس دوران دارالعلوم دیوبند کے اراکین شوریٰ اور حضرات مہتممین نے آپ کو درس و تدریس کے لئے متعین کردیا اور طے کردیا کہ حسین احمد کو فی الحال ۳۵ روپے ماہوار پر مدرس مقرر کردیا جائے اور آئندہ جب بھی وہ ہندوستان تشریف لائیں تو ان کو بغیر اجازت مجلس شوریٰ مدرس کردیا جائے، چنانچہ تین سال کے بعد آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تیسری بار ۱۳۳۰ھ میں ہندوستان تشریف لائے اور چند ماہ قیام کے بعد تشریف لے گئے۔

۲۲ صفر ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء کو شیخ الہند اور دیگر حضرات کے ساتھ آپ کی گرفتاری عمل میں آئی، یہ گرفتاری ،، ریشمی رومال تحریک، کے سلسلے میں عمل میں آئی تھی جو آزادیٔ ہند کے لئے دیگر ممالک سے مدد حاصل کرنے کی غرض سے شیخ الہند نے شروع کی تھی اس سلسلے میں انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات بھی ہو چکی تھی اور انھوں نے مدد کا وعدہ بھی کیا تھا، ۸ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۲ فروری ۱۹۱۷ء کو مالٹا کے لئے روانگی ہوئی اور ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کو مالٹا پہنچے اور قید کردیئے گئے اور

اور تین سال سے زائد عرصہ قید میں بسر کرنے کے بعد مالٹا سے ۲ر جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ
مطابق ۱۲ر مارچ ۱۹۲۰ء کو روانہ ہو کر بمبئی پہنچے جہاں ۲۰ر رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق
۸ر جون ۱۹۲۰ء کو انھیں رہا کر دیا گیا، دوران قیام بمبئی میں گاندھی نے حضرت شیخ الہند
سے ملاقات کی، مولانا مدنی رح واپسی پر کانگریس کے ممبر بنے۔

نقش حیات جلد دوم میں خود رقم طراز ہیں

"میں اگرچہ پہلے سے کانگریس میں شامل نہ تھا مگر مالٹا سے واپسی پر کانگریس
کا ممبر بن گیا اور ہمیشہ جدوجہد آزادی میں شریک رہا اور قید وبند کے مصائب بھی
ملک کے لئے جھیلتا رہا"

۲۱ر فروری ۱۹۲۱ء کو قصبہ سیوہارا میں جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے
ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر فرمایا۔

"اگر ہم ساڑھے تینتیس کروڑ مرد و زن چھوٹے بڑے، ہندو مسلم ایک ہوجائیں
تو بڑی سے بڑی قوت ہم پر ظلم و شدائد کی بارش نہیں برسا سکتی، گولیاں اور توپ
کے گولے تو درکنار بجلی جیسی قوی چیز بھی اس ریگ کے تودے میں نفوذ نہیں کرسکتی"

جولائی ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا کانفرنس کراچی میں پولیس اور فوج میں بھرتی
ہونے یا اس کے لئے ترغیب کو حرام قرار دینے کی تجویز پیش کی اور پاس ہوئی، اس
بنا پر آپ اور مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی وغیرہ کو ۱۸ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار کر لیا
گیا، مقدمہ چلا، یہ مقدمہ مقدمۂ کراچی کے نام سے مشہور ہے، اس مقدمہ میں مولانا
محمد علی جوہر نے فرمایا۔

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ریزولیوشن پڑھ کر سنایا، یہ میں نے اس
شخص کی تجویز پر پیش کیا جس کو میں اپنا آقا، سردار اور بزرگ کہنا فخر سمجھتا ہوں
وہ مولانا سید حسین احمد مدنی رح ہیں۔

مولانا مدنی رہ نے بڑی دلیری اور حق گوئی سے فرمایا کہ

"اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی چھیننے پر تیار ہے تو مسلمان اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہونگے اور میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کر دوں گا"

اس پر مولانا محمد علی جوہر نے مولانا مدنی رہ کے قدم چوم لئے تھے، بالآخر یہ جنگ آزادی برابر جاری و ساری رہی اور حضرت مدنی رہ اور دیگر اکابرین کی یہ کوشش بار آور ہوئی اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہمارے ملک ہندوستان کو اغیار کے زور استبداد سے نجات حاصل ہوگئی۔ بس آگے کیا تحریر کروں یہ بکھرے ہوئے تاثرات کا ایک اجمالی خاکہ ہو سکتا ہے اس میں کوئی مصور حقائق کی رنگ آمیزی کر کے اس کو مؤثر اور دلکش بنا سکتا ہے دعا ہے رب ذوالجلال حضرت مدنی رہ کو وہاں کی راحت نصیب فرمائے ع

خدا بخشے بڑی ہی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

نیز حضرت کے جانشین اور صاحبزادگان کو شر و اعدار سے محفوظ فرمائے، آمین۔

از: محمد شفیق الحق بگاسباڑی، سلہٹ بنگلہ دیش

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

کنگش کنان بزم عظام! قطب عالم حضرت شیخ رح کی حیات مقدسہ کے اتنے مختلف گوشے ہیں کہ ہر ایک گوشہ مستقل مضمون و مقالہ کا محتاج ہے، باوجود اس کے حق ادا نہ ہوگا نہ آئندہ نسلیں اس کا یقین کر سکتی ہیں کہ واقعی اس پر فتن دور میں کوئی ایسی فوق العادت ہستی تھی، مسلمانوں کے زوال و ادبار کے دور میں اخلاق کی پستی کے عہد میں، اخلاص کے فقدان کے زمانہ میں، ایسی محیر العقول جامع کمالات شخصیت کا وجود اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک کرشمہ تھا۔

میں اس وقت آپ کے سیاسی بصیرتوں سے صرف ایک روشنی پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جس کو آپ نے ۱۹۴۵ء کے آواخر میں جب کہ آزاد ہند فوج کے کیپٹن شہنواز کو پھانسی سے رہائی ہوئی تھی اور مظفر نگر میں آپ کا خیر مقدم کیا گیا تھا، اس تقریب پر رات کے گیارہ بجے حضرت رح کا بیان شروع ہوا، اس میں آپ نے فرمایا تھا کہ یہود و نصاریٰ اسلام کے بنیادی دشمن ہیں، اگر ہندوستان متحد رہ کر آزاد ہو گیا تو وہ خود دنیا کی طاقتوں میں صف اول پر شمار ہوگا، اور اس کی دعوت پر تمام دنیا کے مسلم ریاستوں کو اکٹھا کر کے ایک متحدہ محاذ قائم کیا جا سکتا ہے جو یہود و نصاریٰ کے خلاف ایک زبردست چیلنج ہو کر دن بدن ترقی کر کے ترقی کے زینوں پر چڑھتا چلا جائیگا، اگر خدا نخواستہ یہود و نصاریٰ کا بنایا ہوا پلان و پروگرام کامیاب ہو گیا اور ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی تو یہود و نصاریٰ کی طاقت پروان چڑھے گی اور دنیا کی دوسری اقوام غلامی کی زنجیروں میں

جکڑ بند ہوتے چلے جائیں گے ۔ خصوصاً مسلمانوں پر ظلم و ستم کی بجلیاں گرتی چلی جائیں گی اور پرسان حال کوئی نہیں رہے گا ، مسلمانوں کی پستی اور انحطاط کی کوئی حد نہ رہے گی ۔ غرض کہ آپ ــــ ہندوستان کی متحدہ آزادی کو ہندوستانیوں کے ہر مرض کا علاج اور منقسمہ آزادی کو ہندوستانیوں کی شکست اور یہود و نصاریٰ کی صبح امید سے تعبیر فرماتے تھے ۔ چنانچہ آج یہود نے دنیا میں تخریبی کارروائی کے لئے شیعیت اور مودودیت کو اپنا آلۂ کار بنایا ہے جو دن بدن اپنے تخریبی پروگرام کو آگے بڑھا رہے ہیں اور مسلمانوں کے افق پر ظلم و ستم کے بادل امنڈ امنڈ کر آ رہے ہیں افسوس کہ اگر ہندوستان کے سیاسی حلقے حضرت کی سیاسی گہرائی تک پہونچ کر اس کی قدر کرتے اور بلا اختلاف آپ کی اطاعت قبول کر لیتے تو آج دنیا کی طاقتوں میں ہندوستان کا نمبر اول ہوتا اور آج چار دانگ عالم میں مسلمان ظلم و ستم کے تختۂ مشق نہ بنتے ۔ آمین ۔